رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ

ماہنامہ

نئے اُفق

کراچی

naeyufaq.com

Pakistanipoint
Learning Point

10
دستک
مشتاق احمد قریشی

11
گفتگو
عمران احمد

18
اقرأ
طاہر قریشی

20
دختر وطن
زرین قمر

50
سلگتے چنار
عالی مان آفاقی

52
موت کی آہٹ
شبانہ اسلم

66
زہریلی
مونا شہزاد

72
وجود حیات
عرفان رامے

94
بلیک ایگل
صبیح الحسن

98
مجرم کون
مرزا صہیب اکرام

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

دفتر کا پتا: 81 نیپیئر بیرکس، ہاکی کلب آف پاکستان، اسٹیڈیم نزد آنچل پریس کراچی 75510

106 نوبل کاز — شہزاد خان

122 قلم پارے — یاسین صدیق

126 بساط گر — وحید سلطان

150 سات سلام — صفدر علی حیدری

154 اترن — عنبرین اختر

158 جیدی قباچہ — رانا زاہد حسین

170 راز سربستہ — ثناء اللہ خان احسن

174 ذوق آگہی — عثمان عبداللہ

178 خوش بوئے سخن — نوشین اقبال نوشی

180 عشق پیچاں — قرۃ العین سکندر

www.naqabat.pkpoint.com

خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ آنچل پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی، 74200 فون نمبرز 021-35680771/2

فون 03008264242 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل: Info@naeyufaq.com

دستک

مشتاق احمد قریشی

پورے بھارت میں نئے شہریت قانون نے آگ لگا رکھی ہے ہر طرف غصے سے بھرے عوام سڑکوں پر نکلے احتجاج کر رہے ہیں حیدر آباد دکن کے مسلم لیڈر اسد اویسی نے تو برسرِ عام کہہ دیا ہے کہ تقسیم ہند کے وقت قائد اعظم کے دو قومی نظریہ کی مخالفت کر کے بڑی غلطی کی آج جب مسلمانوں کو ختم کرنے انہیں قتل عام کرنے کا قانون بنا دیا گیا ہے تو مسلمانوں کو اپنی شہریت کے لیے اپنی شناخت کے لیے جن مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا اس سے ممکن ہی نہیں کہ کوئی عام مسلمان شہری یہ ثابت کر سکے کہ وہ واقعی ہندوستانی شہری ہے ان کا کہنا ہے کہ اب ہم اپنے ہی گھر میں اپنے ہی شہر میں اپنے ہی وطن میں جہاں ہمارے پرکھوں کی ہڈیاں دفن ہیں جہاں صدیوں سے ہمارے اباؤ اجداد رہتے بستے آئے ہیں اب ایک دم سے اس مٹی کے لیے اس اپنے دیس کے لیے ہم کو اجنبی بنا دیا گیا ہے صرف اس لیے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اب ہندو شدت پسند جماعت ہم سے ہمارے شہری وطنی حقوق چھینے گی۔ یہ وطن اُتنا ہی ایک مسلمان کا ہے جتنا کسی ہندو یا اور کسی بھی اقلیت کا ہے یا ہو سکتا ہے۔ یہ ہندوستان کسی کے باپ کی جاگیر نہیں ہے کہ جس کا جو جی چاہے کرتا پھرے۔ اس زمین میں ہمارے اباؤ اجداد کا لہو شامل ہے ہم اسے اپنا لہو دے کر بھی بچائیں گے ہمیں ہندو بالادستی کسی طرح قبول نہیں۔ دراصل اس طرح آر ایس ایس کو قتل و غارت گری کا کھلا لائسنس دے دیا گیا ہے۔

بھارتی سرکار اگر واقعی مسلمانوں سے جان چھڑانا چاہتی ہے تو اُس کا آسان ترین حل وہ ہی ہے جو تقسیم ہند کے لیے قائد اعظم محمد علی جناح نے پیش کیا تھا یعنی بھارت اپنے تمام مسلم اکثریت والے علاقوں کو اپنے سے الگ کر دے یا مسلم علاقوں کے رہنے والوں کو اختیار دے کہ وہ اپنا الحاق جس سے چاہیں کر کے ہندوؤں کی جان چھوڑ دیں۔ ویسے بھی اب مسلمانوں کو سنبھالنا بھارت کے بس کی بات نہیں رہی۔ بھارت ایک چھوٹے سے مقبوضہ مسلم اکثریت علاقے کشمیر کو اپنی دس لاکھ جوانوں پر مشتمل جدید ترین اسلحہ سے لیس افواج کے باوجود قابو نہیں پا سکا تو پورے بھارت میں جگہ جگہ بکھرے بے قابو ہونے والے مسلمانوں کو کیسے قابوں کر سکے گا جبکہ کئی علاقوں میں پہلے ہی بھارت سے آزادی کی تحریک چل رہی ہے اب جب کہ بھارتی حکمرانوں نے خود ہی مسلم جذبات کے بارود کے ڈھیر کو چنگاری دیکھا دی ہے تو اب وہ کیسے امید کر سکتا ہے کہ بھارت کی مسلم قوت کو کچل کر قابو پا لے گا۔ انہی مسلم جذبات کا لوہا گرم ہے اسے ایک چوٹ کی ضرورت ہے یہی موقع ہے جب بھارتی مسلمانوں کو ہندوتوا سے نجات دلائی جا سکتی ہے نیا پاکستان کا خواب دیکھنے دیکھانے والوں کو اللہ ایک بڑا موقع دے رہا ہے اسے سوچنے سمجھنے کی نظر نا کیا جائے اقوام متحدہ میں مسلم اُمہ کی طرف سے بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ غیر انسانی رویوں اور ہندو جانبداری کیخلاف ریفرینڈم کرانے کے لیے مسلم اُمہ کی طرف سے ایک مشترکہ قرارداد پیش کرائی جائے تا کے مسلمان اپنے اختیار سے ہندوتوا سے آزادی علیحدگی اختیار کر سکیں پاکستان کے وزیر اعظم عمران خان کو چاہیے کہ وہ وزیر خارجہ اور اُن سے متعلق تمام سفارتی ذرائع کو کام میں لائیں اور مسلم ممالک کو آمادہ کریں اور ایک نئی مضبوط متفقہ قرارداد کا مسودہ تیار کیا جائے اس طرح کامیابی کا کسی قدر ہی سہی امکان ہو سکتا ہے۔ بھارت جو مسلم اقلیت سے نجات چاہتا ہے، آج اس کے مسلم مخالف رویوں نے ثابت کر دیا کہ قائد اعظم کا دو قومی نظریہ بالکل درست تھا بلکہ آج پھر درست ثابت ہو گیا ہے بھارتی مسلم قیادت ہی نہیں مسلمان بھی اب قائل ہو رہے ہیں کہ اب ہندوؤں کے ساتھ رہنا نبھانا ممکن نہیں رہا ہندو اپنی اکثریت کے بل پر مسلمانوں کو تگنی کا ناچ نچانا چاہتے ہیں۔ یہی موقع ہے کہ پاکستان جرات کرے اور مسلمانان بھارت کی نا صرف اخلاقی حمایت کرے اور بین الاقوامی پلیٹ فارم پر اُن کی حمایت میں مسلم ملک کو بھرپور طریقے سے آمادہ کرے کشمیری بھارتی مسلمانوں پر ظلم و تشدد کے پیش نظر اقوام متحدہ کا ہنگامی اجلاس بلایا جائے کشمیری اور بھارتی مسلمانوں پر ہونے ہونے والے ظلم و ستم پر اقوام عالم بھارت پر دباؤ ڈالے اور یہ بھی ممکن ہے اللہ پاکستان کی کوشش کو رنگ لگا دے اور کشمیر اور بھارت کے مسلمانوں کی مشکل آسان ہو جائے۔ ایک مسلم مملکت ہونے کے تعلق سے یہ ہمارا فرض بھی بنتا ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کی ہر طرح مدد کریں۔ بھارت کے طول ارض میں ہونے والے احتجاجی مظاہروں میں بلا خوف و خطر پاکستان زندہ باد کے نعرے گونج رہے ہیں ، اگر بھارتی حکمرانوں نے کہیں غلطی سے بھی پاک بھارت جنگ چھیڑ دی تو اسے نا صرف بیرونی طور پر منہ کی کھانا پڑے گی اور عبرت ناک شکست کا سامنا ہوگا اور اندرونی طور پر بھی منہ کے بل گرے گی شاید اللہ نے مسلمانوں کو ظالم کے ظلم سے نجات کا کوئی وسیلہ کوئی راستہ بنا دیا ہو اللہ کشمیری بھارتی مسلمانوں کی حفاظت کرے مسلمانوں کو سرخرو کرے۔ آمین

گفتگو

عمران احمد

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں اور مہاجر وہ ہے جو ان کاموں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے ممنع فرمایا۔ ابوعبداللہ (امام بخاری رحمہ اللہ) نے فرمایا اور ابومعاویہ نے کہ ہم کو حدیث بیان کی داؤد بن ابی ہند نے، انہوں نے روایت کی عامر شعبی سے، انہوں نے کہا کہ میں نے سنا عبداللہ بن عمرو بن عاص سے، وہ حدیث بیان کرتے ہیں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے (وہی مذکورہ حدیث) اور کہا کہ عبدالاعلیٰ نے روایت کیا داؤد سے، انہوں نے عامر سے، انہوں نے عبداللہ بن عمرو بن عاص سے، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

صحیح بخاری: حدیث نمبر 10

عزیزان کرامی..... السلام علیکم ورحمتہ اللہ

ستمبر ۲۰۲۰ کا شمارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی کوشش کی ہے کہ کہانیوں کا چناؤ مزید سخت اور بہتر کیا جائے۔ آپ کے تبصرے کو خطوط کی شکل میں یا واٹس ایپ میسج کی شکل میں مجھ تک پہنچتے ہیں انہی کو مدنظر رکھ کر کہانیوں کا چناؤ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اب اس میں کہاں کامیاب ہو رہا ہوں یہ آپ کے تبصرے بتا رہے ہوتے ہیں، اس بار اکثریت کے خطوط میں حوصلہ افزا باتیں تھیں مگر یاسین صدیق کا تبصرہ تعریف کے ساتھ تنقید بھی تھی، میں ان کی باتوں کو درگزر نہیں کروں گا کیونکہ ہر قاری کو مطمئن کرنا میرا کام ہے۔ انسان کے کام پر تنقید نا ہو تو وہ کبھی بھی اپنی خامیوں کو درست نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں یاسین صدیق کا شکر گزار ہوں اور ان کی جند باتوں کا جواب بھی دوں گا وہ اس لیے کہ یہ سوالات ایسی بہت سے قارئین کے ذہنوں میں ہوں گے جو ڈائجسٹ تو پڑھتے ہوں گے مگر تبصرہ نہیں کرتے ہوں گے۔ پہلا اعتراض سلسلے وار کہانیوں پر اٹھایا گیا کہ رسالے میں اتنی ساری سلسلے وار کہانیاں نہیں ہونی چاہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ مستقل سلسلے وار کہانیاں دو ہی ہیں ایک بساط گر اور دوسری وجود حیات اس کے علاوہ دختر وطن اور عشق پیچاں طویل ناول ہیں دختر وطن اگلے ماہ ختم ہو گی جب کی عشق پیچاں اس ماہ اختتام پذیر ہو گی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ابتدائی اور آخری صفحات ناول کے لیے مخصوص ہوتے ہیں کبھی تو ناول ایک بار میں مکمل ہو جاتا ہے کبھی طوالت کی صورت میں اسے کئی حصوں میں شائع کرنا مجبوری ہو جاتا ہے۔ امید ہے کہ سلسلے وار کہانیوں کے سلسلے میں ابہام دور ہو گیا ہو گا۔ باقی رہ جاتا ہے کہانیوں کا معیار تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ آپ نے جن کہانیوں کا حوالہ دیا ان میں سے کتنے مصنفین حیات ہیں یا ان کے پائے کا لکھنے والے موجود ہیں؟ ہمیں اب نئے لکھنے والوں میں سے اچھے اور معیاری لکھنے والے تلاش کرنے یا انہیں سنوارنے ہوں گے۔ ان شاء اللہ کوشش جاری ہے۔ اچھا اور معیاری اور موجودہ حالات میں شائع ہونے والے مواد سے بہتر کہانیاں پڑھنے کو ملیں گی۔ اب چلتے ہیں آپ کے محبت ناموں کی جانب جہاں آپ سب کی محنت اور لگن سے لکھے گئے محبت نامے منتظر ہیں۔

اللہ رکھا چوہدری ..... ہارون آباد۔ اگست کے شمارے پر تبصرہ شروع کرتے ہیں اللہ کے بابرکت نام سے جو دلوں کے حال بخوبی جانتا ہے، دیکھتی آنکھیں، سنتے کانوں کو رکھا چوہدری کا عاجزانہ السلام علیکم! سب سے پہلی نظر فہرست پر جا ٹھہری۔ اس بار تو کمال ہو گیا سارے ستارے ایک ہی بار جھلملا اٹھے، میری دعا ہے سدا یونہی جگمگاتے رہیں آمین۔ گفتگو کا سلسلہ حدیث مبارک صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع ہوا اس بار تو حدیث میں بہت بڑا سبق تھا ہم نوجوانوں کو چاہیے کے بوڑھے لوگوں کا خیال رکھیں ان سے محبت سے پیش آئیں۔ بامدولت نے یہ بات نوٹ کی ہے کہ آج کل کا تو بس موبائل ہو اور ہمیں کسی دوسرے کی فکر ہی نہیں سب بھول گئے ہیں ہم کہ دنیا میں آنے کا مقصد کیا ہے؟ سر عمران احمد صاحب کا سوال کہ بہترین تبصرے کا چناؤ کریں۔ میں کسی ایک کا انتخاب نہیں کر سکتا سب نے اتنی محبت سے لکھا ہے یہ لکھنے والا ہی جانتا ہے اگر کوئی کسی پر لکھتا ہے تو وہ اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ میں تو سب کو ووٹ دوں گا سب کی محبت قابل داد ہے۔ میں تو چاہتا ہوں محمود احمد جائی، وقاص عمر، روی بھائی اور ریاض بٹ سب ہر ماہ تبصرہ کیا کریں شکریہ۔ صاحب صدر کی کرسی محسن علی طاب صاحب کو سونپی جاتی ہے، بہت، بہت مبارک ہو بہت ہی عمدہ تبصرہ کیا دوسرے نمبر پر عروشمہ خان آپی نے بھی اچھا تبصرہ کیا۔ شہزاد خان پیارے بہت عمدہ تبصرہ اور میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ تسلیم شیخ آپی بہت ہی عمدہ تبصرہ اس بار کمال کر دیا۔ عالی مان آفاقی زبردست بہت عمدہ تبصرہ۔ آصف اکرم بھٹی فلمی ہیرو جیسا نام زبردست تبصرہ۔ میرے استاد صاحب محمد یاسین صدیق سر آپ کی تو کیا ہی بات ہے اتنا عمدہ تبصرہ کمال کر دیا۔ ماشاء اللہ۔ ظہیر ملک پیارے بھائی لاجواب تبصرہ اور سب سے لمبا تبصرہ کھل کر ہر کہانی کے بارے لکھا آپ کو میری طرف سے دو ووٹ ایک ساتھ۔ شہزادی حفصہ آپی بہت ہی عمدہ لکھا۔ اقراء میں سر طاہر احمد قریشی صاحب علمی خزانے سے بھرپور سلسلہ لے کہ آتے ہیں ہر دفعہ ہماری اصلاح کی غرض سے اس دفعہ لفظ المجیب کی ترجمہ و تشریح کے ساتھ حاضر ہوئے جس میں علم سے بھرپور باتیں پڑھنے کو ملیں سر بہت ہی داد آپ کے لیے۔ ''دختر وطن'' محترم مدرس قمر آپی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ سب سے پہلے تو دو بول کو کتابی شکل میں آنے پر بہت، بہت مبارک ہو۔ بات کروں دختر وطن کی تو پہلی قسط کی طرح یہ بھی زبردست رہی وطن سے محبت قابل داد ہے۔ ''خونی کتاب'' شہزاد خان نے تو ڈرا کے رکھ دیا میں تو دعا کرتا رہتا ہوں رستے سے کوئی کتاب ملے اس کا مطالعہ کروں یہ میرا خواب ہے اللہ کرے خواب ہی

رہے۔ کیوں کہ آپ کی کہانی نے ڈرا دیا ہے اکرم کا ہنستا بستا گھر برباد ہوگیا۔ اور چھوٹی بچی کی موت نے تو رولا ہی دیا اتنی ظالم کتاب۔ ''سنہری دھوپ'' دستگر شہزاد بھائی نے تو کمال ہی کر دیا شکنتلا کی کہانی بہت ہی عمدہ لکھی جب بھی لکھتے ہو صفحہ قرطاس پر موتی بکھیر دیتے ہو۔ بہت سی داد اللہ پاک عبداللہ جیسا شوہر ہر بیٹی کے نصیب میں لکھ دے۔ آمین۔ اس دفعہ ''وجود حیات'' کی جگہ دستگیر شہزادی کی کہانی کا ٹائٹل شائع ہوگیا غلطی سے ہی ہوا ہوگا۔ لیکن کہانی کو ہم کیسے بھول سکتے ہیں۔ یہ قسط بھی بہت عمدہ رہی ایسا لگ رہا ہے، رباب اس دنیا میں نہیں رہی اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ ''جیت کی نشانی'' ہبرا کارمل جمالی یار اتنی زبردست کہانی شیر خان اور بھوت خان کی بہت ہی عمدہ کہانی لکھی۔ بھوت خان تو سچ میں ہی بھوت تھا۔ پڑھتے ہوئے ہی ڈر لگا بھوت خان سے لیکن شیر خان بہت چالاک نکلا ایک بات ہے یہ شیر خان کا کارنامہ اب نہیں بھولے گا۔ کہانی میں ایک جگہ تو میں ڈر گیا وجہ یہ بنی کے بھوت خان کی جگہ جب شیر خان کی گردن ان چاروں کو اٹھاتے ہوئے پڑھا تو حیران ہوگیا کے کتنے لالچی ہیں لیکن بعد میں پھر پتا چلا کے وہ شیر خان کی گردن نہیں بلکے وہ بھوت خان کی گردن اٹھاتے ہیں پیارے آپ کے ایک بار نام غلط لکھنے کی وجہ سے اتنا گھوما کے بعد میں پتہ چلا کے کیوں گھوما۔ ہم تو اپنی سوچ کے گھوڑے ضرور دوڑاتے ہیں چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ ''چال'' سجاول خان صاحب کو سب سے پہلے تو اتنی عمدہ تحریر شائع ہونے پر بہت بہت مبارک ہو۔ شروع میں ہی اتنی لڑائی دیکھی کے مجھے لگا کتے لڑ رہے ہیں انسان نما حیوان۔ ویسے ایک بات بہت پریشان کرتی ہے آخر کب تک لڑکیوں والا معاملہ ختم ہوگا۔ آج میں آپنے دوست کے ساتھ باہر گیا جس کے دو بچے ہیں ماشاء اللہ تو ایسے ہی باتیں کرتے کرتے بتانے لگا کے الحمدللہ اب بھی رات کو تین لڑکیوں سے باتیں کر کے سوتا ہوں تو میں حیران ہوگیا۔ سب کو یہ پیار محبت کھیل لگتا ہے۔ چال کہانی بھی وہ ہی لڑکیوں والے چکر میں گھومتی نظر آئی الیانا نے اپنی عزت بچانے کے چکر میں بلال کو زہر دے دیا چھاوہ تو مر گیا لیکن پیٹ میں جو بچا ہے جیسے جیسے بڑا ہوگا اس کے سامنے رہی گا اپنی غلطی کا احساس ہوتا رہے گا الیانا کو بہت ہی عمدہ سزا زبردست کہانی ویل ڈن۔ ''چھوٹا چور'' محمد سلیم کر دنے علی خان کی کہانی تو بہت عمدگی سے بیان کیا اور کہانی نے اپنا سفر مکمل کیا مجھے یہ کہانی سو فیصد سچی لگی اکثر ہی ایسا ہوتا میں نے دیکھا ہے یہ امیر لوگ پتا نہیں کب مہربان ہوں گے۔ علی خان پہلی بار اس بدقسمت کی دکان پر آیا تو ہاتھ زخمی کروالیا جب دوسری بار آیا تو لاش گر گئی لیکن دونوں ماں بیٹے کی موت نے تو ایک ایسا صدمہ دیا مجھے ایسا لگا جیسے علی خان اور اس کی ماں کی لاش میرے سامنے ہے۔ ضمیر حسین کی باتیں بہت اچھی لگی بے شک چھوٹے چور کو ہی سزا ملتی ہے بڑا چور تو پکڑا ہی نہیں جاتا نہ اس کو سزا دی جاتی ہے۔ ویل ڈن پیارے۔ ''بساط گر'' وحید سطان ویل ڈن پیارے بھائی ملک ہشام آخر کا کامیاب ہو ہی گیا اور اس نے مہر النساء کو اغواہ کر لیا۔ نہیں تو ملک ہشام پر افسوس کے ساتھ غصہ آتا ہے۔ ملک ایک کامیابی مبارک ہو آگے آگے دیکھتے ہیں ہوتا ہے کیا۔ ''صراط مستقیم'' ''ریاض بٹ صاحب اس ماہ بہت عمدہ تحریر لے کر حاضر ہوئے ساری کہانی میں اتنا تجسس اتنی لمبی ہونے کے باوجود کہانی نے بور نہیں ہونے دیا۔ بٹ صاحب کو کافی عرصے سے پڑھ رہا ہوں ماشاء اللہ بہت ہی عمدہ لکھتے ہیں۔ لکھتے رہیں۔ صراط مستقیم میں آخر بھائی ہی بھائی کا قاتل نکلا ویل ڈن زبردست تحریر پر بہت سی داد۔'' آریشن نومبر'' مونا شہزار آپی نے کرونا کے بارے میں معلومات بہت ہی اچھے سے سمجھائیں باقی کہانی بہت عمدہ رہی بہت سی داد۔ اس ماہ کی کہانیاں تو سب ہی اچھی تھی سو پرہٹ کہانی کا اکر پوچھا جائے تو میرا جواب ''سایہ'' کہانی ہی گئی۔ عبداللہ احمد حسن یار کمال تحریر لکھی میرے طرح پڑھنے والا اس کے سحر میں جکڑ گیا ہوگا۔ زارا کا بار بار چہرہ بدل جانا اور پھر اچانک ہی سب کچھ ختم ہو جانا تب باقی دیکھتے تو زارا سوئی ہوئی ملتی تھی۔ بہت عمدہ تحریر آخر ہر رات کے بعد دن ہے اور پھر اس کا بھی حل نکال لیا اور وہ خوشیاں واپس لوٹ آئیں ویل ڈن۔ ''راز سربستہ'' ثناء اللہ خان احسن صاحب نے تو اس بار حیران ہی کر دیا بہت سے سانپوں کے بارے میں اتنی عمدہ معلومات دی کچھ تو پہلے مجھے پتا تھا اکثر دادا بوتا سے رہتے ہیں۔ گھوڑوں والی بات نے تو حیران کر دیا سانپ کا زہر گھوڑے کے جسم میں اور پھر گھوڑے کا خون نکال کر اس سے پلازمہ کو علیحدہ کر کے واہ جی واہ میں ڈاکٹر بن گیا۔ شاندار تحریر پیارے بہت سی داد۔ لکھتے رہو ایسے ہی معلوماتی تحریریں۔ ''ذوق آگہی'' عثمان عبداللہ ویل ڈن زبردست سلسلہ میں یہ بھول گا اپنے سلسلے میں مجھے بھی جگہ دیں تاکے دس چاند لگا سکوں۔ اس بار بھی پہلے کی طرح سب نے بہت عمدہ لکھا۔ کسی ایک کا نام لے کر باقی سب کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ ''خوشبوئے سخن'' نوشین اقبال نوشی آپی نے بہت ہی عمدگی سے سب نظموں اور غزلوں کو ترتیب دی۔ ویل ڈن اس بار سب کی نظمیں، غزلیں کمال تھی لیکن مجھے تفسیر بابر بھائی کی غزل بہت اچھی لگی اب تک ان کی جو شاعری فیس بک پر موجود ہے پڑھ چکا ہوں۔ جی تو جس کا تھا انتظار آخر کار آ ہی گیا وہ شاہکار ''عشق پیچاں'' قرۃ العین سکندر آپی کی جب بات آئے تو کیا کہنے ایک نام ہے۔ سب سے زیادہ آنچل میں پڑھا ہے۔ کہانی کو بہت ہی عمدگی سے شروع کیا، اور پھر آگے آگے دری کا لاعلم ہونا شروع ہوگیا، مجھے ایسا لگ رہا ہے ایک بار ناکام ہونے کے بعد اب ساشا، دری کی جان لے کر ہی رہے گی۔ لیکن اچھا ساشا کے ساتھ بھی نہیں ہوگا۔ کیوں کہ ظلم جب حد سے بڑھ جائے تو وہ مٹ جاتا ہے۔ لیکن دری کی موت پکی ہے۔ چلیں اب دیکھتے ہیں اگلی قسط میں کیا ہوتا ہے۔ شاندار تحریر قرۃ العین سکندر ویل ڈن۔ اب اس دعا کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں سب لکھاری سدا خوش رہو آباد رہو اور اچھے اچھے تبصرے کرتے رہو۔ جزاک اللہ۔

شعزاد خان ..... صادق آباد: محترم جناب عمران احمد صاحب، السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ! امید ہے تمام رائٹرز، ریڈرز اور نئے اُفق ڈائجسٹ کا تمام اسٹاف بخیریت ہوگا۔ اگست 2020 کا شمارہ ہمیشہ کی طرح خوبصورت کہانیوں کے جھرمٹ میں موصول ہوا۔ سرورق کے حوالے سے اتنا کہوں گا کہ رباب فاطمہ صاحبہ نے اس رسالہ کے لئے بہت خدمات سرانجام دی ہیں اور ان کے بنائے گئے بہت سے خوبصورت اور پرکشش سرورق سرِفہرست ہیں۔ اس لئے جب بھی رسالہ کی اشاعت سے پہلے ٹائٹل فیس بک پیج پر لگایا جاتا ہے تو پہلی نظر میں یہی لگتا ہے کہ یہ ٹائٹل بھی انہی کا تخلیق کردہ ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب نئے اُفق میں ان کا پہلا تبصرہ شائع ہوا تھا تو ان کی خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔ لیکن کافی دنوں سے پیج میں ان کی غیر حاضری اور ان کے بنائے گئے سرورق کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ حسب روایت ''دستک'' سے شروع کرتے ہیں جس میں مشتاق احمد قریشی صاحب ہمیشہ کی طرح حالات حاضرہ پر نظر رکھتے ہوئے اور صحافتی اداروں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور ان کے مسائل کو اجاگر کرنے کے لئے پنجہ آزمائی کرتے دکھائی دیئے حالاں کہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ موجودہ حکومت سے کوئی بھی بہتری کی امید رکھنا پاگل پن ہی ہوگا۔ ''گفتگو'' میں عمران احمد صاحب ہمیشہ کی طرح ایک حدیث پاک سے شروعات کر کے ہمارے ایمان کو تازہ کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، خطوط میں محسن علی طاب، عروشہ خان کے خطوط بہت مختصر تھے، تسلیم شیخ صاحب کا تبصرہ بہت اچھا تھا ان کا شکریہ کہ انہیں میری کہانی ''شیطان کمڑی'' پسند آئی۔ عالی مان آفاقی صاحب کے تبصرے کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے

مترادف ہے بہت محنت اور لگن سے تبصرہ لکھتے ہیں، اچھا لکھتے ہیں اور کسی کو ناراض نہیں کرتے، مزید تبصروں میں آصف اکرم بھٹی، اللہ رکھا چوہدری، محمد یاسین صدیق اور ظہیر ملک صاحبان سب نے بہت اچھے تبصرے لکھے، شہزادی حفصہ صاحبہ نے بھی بہت محنت اور خلوص سے تبصرہ لکھا، میری طرف سے ان سب کو بہت بہت مبارکباد قبول ہو۔ ''اقراء'' میں البلیکے ناموں کے بارے میں تفصیل پڑھ کر ایمان تازہ ہوگیا، بے شک اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہے اور اپنے بندوں کی دعاؤں کو ضرور سنتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ دعا کی قبولیت کے لئے قرآن پاک میں دی گئی ہدایات پر عمل پیرا ہونا لازمی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔ سب سے پہلی کہانی ''دختر وطن'' زرین قمر صاحبہ کی تخلیق کردہ تھی جو ایک نازک دوشیزہ کی زندگی کے گرد گھومتی کہانی تھی۔ جس نے بہت سے مصائب کا سامنا کرتے ہوئے سامراجی قوتوں سے ٹکرلی، لازمی نہیں کہ کوئی بھی جنگ ہتھیاروں کے ساتھ ہی لڑی جائے اگر انسان شعور اور عقل رکھتا ہو تو بغیر خون بہائے بہت سے مقاصد میں کامیابی حاصل کرسکتا ہے، غرض اچھی اور بہترین کاوش تھی جس کے لئے وہ مبارکباد کی مستحق ہیں، اپنی لکھی کہانی ''خونی کتاب'' کے متعلق آراء کا منتظر رہوں گا، دیگر شہزادی کی ''سنہری دھوپ'' ایک بہترین اور خوبصورت کہانی تھی، انداز تحریر بہت اچھا تھا، حقیقت ہے کہ کوئی بھی منحوس نہیں ہوتا یہ سب توہمات پر مبنی باتیں ہیں، شکنتلا جوسنیل کمار کے لئے منحوس تھی۔ وہی عبداللہ کے لئے پارس بن گئی۔ ہیرل کارل جمالی صاحب کی ''جیت کی نشانی'' پڑھ کر پرانا یاد آگیا..... یاد کرتا ہے زمانہ ان ہی انسانوں کو، روک لیتے تھے جو بڑھتے ہوئے طوفانوں کو..... ایک لازوال کہانی تھی، حقیقت میں یہ جس صوبے کی کہانی ہے وہاں عزت کی خاطر لوگ مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں۔ اس علاقے کی ثقافت کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا۔ سجاول خان کی ''چال'' کسی نے سچ کہا ہے کہ کسی بھی چیز کی زیادتی انسان کے لئے نقصان کا باعث بن جاتی ہے۔ اس کہانی میں دولت کو موضوع بنایا گیا تھا جو جس کے پاس جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی اس کی ہوس مزید بڑھتی جائے گی۔ ہمارے سامنے قارون کی مثال موجود ہے جس کے خزانے کی چابیاں ستر اونٹوں پر لادی ہوتی تھیں۔ لیکن اس کا بھیانک انجام تاقیامت تک کسی کو نہیں بھولے گا۔ محمد سلیم کرد صاحب کی ''چھوٹا چور'' میں پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر انسان کے آخری حد تک جانے کی روداد تھی۔ جس میں ہمارے اس معاشرے میں بسنے والے خوبصورت چہروں کے پیچھے چھپے بھیانک اور مکروہ چہروں کی حیوانیت پر سے پردا اٹھایا گیا تھا۔ ایک اچھی اور سبق آموز کہانی تھی۔ وحید سلطان صاحب کی ''بساط گر'' قسط نمبر 5 اپنے تسلسل کو برقرار رکھے ہوئے ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے، دشمنی میں انسان کس قدر گر سکتا ہے یہ اس کہانی میں بالکل سچ دکھایا گیا ہے، اللہ ہمیں شیطان کی فریب کاریوں سے بچائے، آمین۔ ریاض بٹ کی ''صراط مستقیم'' بے ضمیر اور باضمیر کے تانوں بانوں میں الجھی ایک دلچسپ کہانی تھی، انسان کی زندگی میں خود کو بدلنے کے لئے صرف ایک لمحہ درکار ہوتا ہے۔ عدالت نے کبیر علی کو رہا کردیا تھا اور قدرت نے اسے موقع دے دیا تھا کہ وہ چاہے تو اب برائی کو چھوڑ کر ایک اچھی اور پاکیزہ زندگی کی شروعات کرسکتا تھا۔ مونا شہزاد صاحبہ کی ''آپریشن نومبر'' ان کی بہت سے لکھی گئی کہانیوں میں ایک اور بہترین اور حالات حاضرہ پر مبنی تحریر تھی، پڑھ کر حقیقت روشناس ہوئی۔ بے شک ان کے انداز تحریر میں بہت نفاست ہے اور بہت اچھا لکھتی ہیں۔ کرونا وائرس کی تباہ کاریوں پر چشم کشا تحریر تھی۔ اللہ پاک ہمیں جلد اس وباء سے چھٹکارہ دے، آمین۔ عبداللہ احمد حسن کی کی ''سایہ'' نیکی اور بدی کے درمیان گھومتی ایک اچھی تحریر تھی، حقیقت ہے کہ جن وانس بھی اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ مخلوق ہے اور ان میں بھی بہت سے نیک اور بد ہوتے ہیں، لیکن ان کی شر انگیزیوں سے بچنے کے لئے قرآن پاک میں رہنمائی موجود ہے، لیکن اس کے لئے یقین کی پختگی کا ہونا لازمی ہے۔ موجودہ دور میں ہم سیدھے راستے کو چھوڑ کر ایک شارٹ کٹ راستے کی تلاش میں اپنے ایمان کو بھی داؤ پر لگانے سے باز نہیں آتے۔ اللہ معاف کرے، ثناء اللہ خان احسن کی ''راز سربستہ'' سانپوں پر کی گئی تحقیق پر مبنی ایک جامع تحریر تھی جو ہمیشہ کی طرح ہماری معلومات میں اضافہ کا سبب بنتی ہے۔ بہت محنت سے لکھتے ہیں، عثمان عبداللہ کی ''ذوق آگہی'' میں میر رضوی، پرنس افضل، فرہان شیخ، اکرام الحق، مہرین آصف، ربیہ کرام، نور سحر شاہ، زویا خان، شبانہ امین، تابندہ جبیں، صنم ناز، سمیرا اجمیل، ثناء ریاض اور فریحہ شبیر سب کے انتخابات بہترین تھے۔ نوشین اقبال نوشی کی ''خوشبوئے سخن'' میں سیف خان سیف، زبیر قیصر، محمد اسلم جاوید، ہما شاہ، مختار حسین، حکیم خان حکیم اور روشانے سبعین کی غزلیات اچھی تھیں، اور آخری صفحات پر قرۃ العین سکندر کی ''عشق پیچاں'' سحر وجادو، روحانی طاقتوں کے گرد گھومتی ایک اچھی تحریر تھی، بہت محنت سے لکھی گئی کہانی کے لئے مصنفہ مبارکباد کی مستحق ہیں، اپنے مفاد کی خاطر انسان سچے رشتوں تک کو داؤ پر لگا دیتا ہے، نہ جانے خون سفید کیوں ہوجاتا ہے؟ سچے رشتوں کے درمیان ڈالیاں ڈول ہوتی ایک بہترین کہانی اس کی اگلی قسط کا انتظار رہے گیا۔ آخر میں دعا ہے اللہ پاک اس رسالہ کو مزید ترقی سے نوازے، آمین، اجازت چاہتا ہوں والسلام۔

عروشمہ خان..... بہاول پور:۔ السلام علیکم پیارے نئے افق قارئین ولکھاریوں کو عروشمہ خان کی طرف سے عید مبارک۔ گو کہ اس بار عید اداس تھی مگر پھر بھی شکر الحمدللہ ایک فرض ادا ہوا شدید گرمی اور کرونا کا خوف عید کی خوشی ماند کر گیا۔ اللہ پاک ہم سب کی قربانی قبول فرمائے آمین۔ اچھا جی اب آتی ہوں اس ماہ کے شمارے کی طرف سرورق عید کی مناسبت سے بہت رنگین اور خوبصورت لگا سب سے پہلے سر عرفان راے کی سلسلے وار کہانی ''وجود حیات'' پڑھی زندگی انجان راستوں کا سفر ہے۔ اس میں کون کہاں مل جائے کوئی نہیں جانتا کہانی مزید اچھی ہوتی جارہے۔ آپا زرین قمر کی کہانی کا دوسرا حصہ ''دختر وطن''، بہترین کہانی ہے۔ باقی عبداللہ احمد حسن کی کہانی ''سایہ'' اور ''راز سربستہ'' ثناء اللہ خان احسن کی تحقیق، دیگر شہزاد کی ''سنہری دھوپ'' بھی بہت اچھی کہانیاں تھیں ''چھوٹا چور'' محمد سلیم کرو کی کہانی غربت کے ہاتھوں تنگ انسان کی کہانی تھی بہت اچھی لکھی سر آپ نے۔ کرونا وائرس پر پیاری آپا مونا شہزاد کی زبردست کہانی تھی اور ہاں پیاری دوست قرۃ العین کی کہانی ''عشق پیچاں'' واااہ یعنی کمال ال لکھی آپ نے آپ کا لکھا بہت عمدہ اور پختہ ہوتا ہے۔ میری دعا ہے اللہ آپ کو مزید کامیابیاں دے آمین۔ شہزاد خان کی ''خونی کتاب'' اور قسط وار کہانی ''بساط گر'' وحید سلطان کی بہت زبردست کہانیاں تھیں۔ باقی سلسلے بھی اچھے ہیں شاعری بہت عمدہ تھی سر عمران قریشی جی اس بار میں بھی اپنی نظم بھیج رہی امید ہے آپ ردی کی ٹوکری کی نظر نہیں کریں گے۔ خطوط میں محسن علی طاب، عالی مان آفاقی بھائی، آصف اکرم بھٹی، شہزادی حفصہ، محمد یاسین صدیقی، سر شہزاد خان، تسلیم شیخ، ظہیر ملک کے خط اچھے تھے اور پیارے بھاء اللہ رکھا کا خط بہت مزے کا تھا۔ باقی شمارہ بھی خوب تھا۔

رباب فاطمہ..... اسلام آباد:۔ نئے افق کی انتظامیہ سمیت مصنفین، مبصرین اور خطوط کے شاہین کو سلام عرض ہے، کیسے مزاج ہیں سب کے؟ بکرا عید کیسی گزری امید ہے تو یہ پہلی عید تھی جو سو کر گزار دی۔ شمارہ ہاتھ میں آتے ہی پہلی نظر سرورق پر پڑی، سرورق بس ''اچھا'' تھا۔ نئے افق کے مزاج کے مطابق

نہیں لگا۔ لیکن ظاہر ہے یہ انتظامیہ اپرو کرتی ہے تو جیسے آپ سب کو اچھا لگے۔ سب کی کہانیاں پڑھ کر اب دل چاہا ہے میں بھی کچھ ٹوٹا پھوٹا سا لکھ کر بھیجوں شاید شائع ہو جائے۔ گفتگو میں سر عمران ہمارے لیے ایسی احادیث کا چناؤ کرتے ہیں جو نا صرف ہمارے ایمان کو تازہ کرتی ہے بلکہ ہمارے ضمیر کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ آپ کے لیے سلامتی کی دعائیں۔ خطوط میں محسن علی طاب کا خط دیکھ کر اچھا محسوس ہوا، پرانے لکھاری منظر سے غائب ہو جائیں تو کمی محسوس ہوتی ہے۔ امید کرتی ہوں آئندہ بھی لکھتے رہیں گے۔ عروشہ خان بہنا آپ نے پہلی مرتبہ خط لکھا بہت سادی داد قبول کیجیے، بہترین تبصرہ تھا آپ کا۔ اگلا خط شہزاد خان صاحب کا تھا ایک مکمل اور جامع تبصرہ، میرا تبصرہ پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ اگلا خط تسلیم شیخ تھا سرورق پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ آپ نے بھی خط کا حق ادا کر دیا۔ اگلا خط عالی مان آفاقی صاحب کا تھا، پہلی بار آپ کو پڑھا، میرا خط اور سرورق پسند کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے بھی زبردست اور جامع تبصرہ لکھا، بہت دعائیں۔ اگلا خط آصف اکرم بھٹی کا تھا سرورق کو سراہنے کے لیے سپاس گزار ہوں، خط پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ آپ کا بھی زبردست اور جامع تھا، خط کا حق ادا کر دیا۔ اگلا خط اللہ رکھا چوہدری کا تھا آپ نے تو شمارے کو عقاب کی نظر سے پڑھا ہے، بہت خوب۔ بہت اچھا لگا آپ کا تجزیہ ایسے ہی پڑھنا چاہیے، لکھاری کی ہر خوبی کو ہائی لائٹ کرنا چاہیے۔ میرا خط پسند کرنے کا بہت بہت شکریہ، سلامتی کی دعائیں۔ اگلا خط محمد یسین صدیقی کا تھا بہت اچھا خط لکھا آپ نے، تمام لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کی۔ بہت خوب۔ سلامت رہیں۔ اگلا خط ظہیر ملک کا تھا مکمل اور جامع تبصرہ، میرا تبصرہ پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ آپ کے قلم میں تاثیر ہے بہت، پہلا تبصرہ شائع ہونے کی بہت مبارکباد۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ اگلا اور آخری خط شہزادی حفصہ کا تھا پیاری بہن آپ کا خط کیوں شامل نہیں ہوگا، آپ نے ایسا کیوں سوچا..... سر عمران تو ہمیشہ نئے لکھاریوں کو جگہ دیتے ہیں، نا صرف جگہ بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ آپ نے بھی خط کا حق ادا کر دیا۔ سلامت رہیں۔ زرین قمر صاحبہ کی کہانی ''دختر وطن'' بہت زبردست، اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ اللہ نے آپ کے قلم میں کیسی گرفت عطا فرمائی ہے ماشاء اللہ بہت دعائیں۔ اگلی کہانی ''بساط گر'' از وحید سلطان بہت زبردست جا رہی ہے، اس کہانی کا انتظار رہتا ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ اگلی کہانی ''چال'' از قلم سجاول خان بہترین اور مثبت پیغام دیتی کہانی۔ بہت خوب اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ اگلی کہانی ''چھوٹا چور'' از قلم محمد سلیم صاحب کی جو معاشرے کی عکاسی کر رہی ہے، جسے پڑھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ جانے کب ہم ان مسائل سے باہر آئیں گے۔ سلامتی کی دعائیں بہترین موضوع پر قلمبند کیا ہے۔ اگلی کہانی ''جیت کی نشانی'' از قلم ہبرک کارمل جمالی کی تھی، بہت زبردست کہانی۔ سچ کہتے ہیں اپنے ضمیر اور خودداری کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، اور محنت میں برکت ہے۔ بہت خوب، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ ''آپریشن نومبر'' از قلم مونا شہزاد، آپ جب بھی لکھتی ہیں ہمیشہ منفرد اور اچھوتے موضوعات پر قلمبند کرتی ہیں۔ یہ کہانی بھی ایسی ہے جسے پڑھ کر بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ عبداللہ احمد حسن کی کہانی بہت زبردست تھی، سچ ہے دنیا میں ہر جگہ اچھائی اور برائی موجود ہے، ایسا نہیں کہ صرف ایک انسان میں اچھائی اور دوسرے میں برائی بلکہ یہ تمام خوبیاں اور خامیاں سب میں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ جس کا ایمان مضبوط اور اللہ کے قریب تر ہوگا وہی نیکی کے راستے پر چلے گا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ ''خونی کتاب'' از قلم شہزاد خان واہ کتنی زبردست کہانی لکھی ہے آپ نے، منفرد موضوع پر قلمبند کیا، سبق آموز تحریر جو مثبت پہلو دیتی ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ ''صراط مستقیم'' از قلم ریاض بٹ بہت زبردست تحریر لکھی آپ نے، دولت کی ہوس کبھی نہیں مٹتی یہ بڑھتی ہے صرف اور ایسی بڑھتی ہے جو تمام رشتوں کو بھی چوس لیتی ہے۔ بہت خوب بہت داد قبول کیجیے۔ ''سنہری دھوپ'' از قلم دستگیر شہزاد، بہت زبردست کہانی ہمیشہ کی طرح مثبت پہلو دیا۔ عزت سب سے اہم ہے، عزت نہیں تو سب کچھ بے معنی ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ ''عشق پیچاں'' از قلم قرۃ العین سکندر جب آپ کی تحریر لکھنے والی تھی سوچا تھا یہ تو پڑھی ہوئی سی مزہ نہیں آئے گا لیکن جب شمارہ ہاتھ میں آیا تو کہانی نے پہلے سے زیادہ مزہ دیا۔ یقیناً یہ لکھاری کی قابلیت ہے جو رب نے خاص عطا کی ہے۔ سلامت رہیں۔ ''ذوق آگہی'' اور ''خوشبو بے سخن'' نے ہمیشہ کی طرح انتخابات سے شمارے کو چار چاند لگائے۔ سب کے ذوق کی قدر کرتی ہوں بہت دعائیں۔ سلامت رہیں۔

ظہیر ملک ..... ہارون آباد: السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ نئے افق تمام قارئین کرام، مصنفین اور پیارے معزز سر عمران احمد صاحب امید ہے آپ سب اللہ کے فضل و کرم سے بخیر و عافیت ہوں گے۔ نئے افق اگست کے شمارے کا انتظار ہائے اللہ بہت زیادہ تھا۔ کیونکہ اس میں جب سے تبصرہ شائع ہونا شروع ہوا ہے اس کو پڑھنے کی لگن اور زیادہ بڑھ گی ہے۔ اکیس جولائی کو یہ شمارہ موصول ہوا لفافہ کھولا تو خوبصورت اور دلکش سرورق نے دل جیت لیا بہت ہی عمدہ کام کیا گیا ہے۔ ''دستک'' میں سر مشتاق احمد قریشی صاحب کو پڑھا جو ہر بار کی طرح اس بار بھی ایک انوکھا اور دلکش موضوع لے کر شریک محفل تھے۔ صحافت کس چیز کا نام ہے یہ تو نہیں جانتا لیکن آپ کی تحریر پڑھ کر صحافیوں کو سلام پیش کرتا ہوں جو کشمیر اور مسلمانوں پر ہونے والے ظلم کو دنیا کے سامنے لاتے ہیں۔ گفتگو میں عمران احمد صاحب ہمیشہ کی طرح خوبصورت حدیث مبارکہ کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے سبحان اللہ۔ سر اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ ماشاء اللہ آپ کا یہ اٹھایا جانے والا قدم زبردست ہے کہ دو تبصرے چننے میں جنہیں نئے افق انعام دیا جائے گا رائٹرز کی حوصلہ افزائی کے لیے اچھا اقدام ماشاء اللہ۔ مجھے جو تبصرے سب سے زیادہ پسند آئے اُن میں سر فہرست اللہ رکھا چوہدری صاحب اور عالی آمان آفاقی صاحب بہت اچھے تبصرے کیے ماشاء اللہ انہوں نے۔ اب آتے ہیں تبصروں کی محفل میں جہاں اس دفعہ پہلی نشست پر براجمان تھے ''محسن علی طاب صاحب'' عمدہ تبصرے کے ساتھ [''عروشہ خان'' محترمہ کا نام جانا پہچانا ہے آپ کو نئے افق کی دنیا قلب صمیم کے ساتھ دل کی گہرائیوں سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ عمدہ تبصرہ آپ کا ہر دفعہ کیا کریں اللہ زور قلم زیادہ کرے۔ محترم ''شہزاد خان صاحب'' بہت عمدہ تبصرہ کیا آپ نے۔ یونہی بزم رونق بنے رہیں۔ مجھ ناچیز کا نام لینے کا بہت شکریہ سلامت رہیں۔ پیاری بہنا تسلیم شیخ صاحبہ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح لاجواب اور بہت خوبصورت تھا بہت سی داد آپ کے لیے۔ ہائے عالی مان آفاقی صاحب کے تبصرے کی بات نہ کی تو کیا فائدہ تبصرہ کرنے کا بھیا چھا گئے آپ پچھلی بار کی طرح بہت لاجواب تبصرہ کیا آپ نے بہت شکریہ میرا ذکر کیا آپ نے۔ اللہ رکھا چوہدری صاحب کا تبصرہ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی ماشاء اللہ آپ کی محبت نئے افق کے لیے قابل ستائش ہے اللہ آپ کو مزید ترقیاں عطا فرمائے آمین۔ میرے پیارے استاد یاسین صدیق جو ہمیں فیس بکی دنیا سے باہر لے کر آئے اور ہمارے لیے ایک راہ متعین کی ان کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے حوصلہ افزائی کا بھیڑا اٹھایا اور ہمیں بھی اس میں شامل کیا، آپ کا تبصرہ بہت ہی جاندار اور کمال تھا ماشاء اللہ بہت سی داد۔ شہزادی حفصہ صاحبہ کا تبصرہ جاندار اور بہت پیارا تھا ماشاء اللہ ہر دفعہ کیا کریں خوشی ہوگی۔ ''اقراء'' ترتیب طاہر قریشی صاحب ہر بار کی طرح اس بار بھی علم سے بھرپور خزانے کے ساتھ جلوہ افروز تھے ''المجیب'' (دعاؤں کا قبول کرنے والا) لفظ کی ترجمہ و تشریح نہایت ہی قابل

رشک اور داد تحسین کے قابل تھی جسے پڑھ کر ایمان ایک بار تازہ ہو گیا اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔ زرین قمر صاحبہ کی سلسلہ وار کہانی ''دختر وطن'' عمدہ جا رہی ہے ماشاء اللہ بہت کمال یا کمال لکھتی ہیں اللہ آپ کے قلم کو مزید وسعتیں عطا کرے۔ محترم شہزاد خان کی خوف وخطر سے بھرپور کہانی پڑھ کر تو دل ڈر ہی گیا اتنی خوفناک کہانی یار میری تو ناقص رائے یہی ہے کہ ظلم کی جتنی مرضی لمبی رات ہو سویرا ضرور ہوتا ہے آپ کا اختتام تھوڑا پسند نہیں آیا ''خونی کتاب'' کا پتا ہی نہیں کی کہاں اور نہ اس کی کوئی حل نکالا آپ نے بقایا کہانی بہت خوبصورت اور کمال تھی۔ ''سنہری دھوپ'' محترم دستگیر شہزاد صاحب کہ قلم سے لکھی گئی انمول اور لاجواااااب کہانی جس میں بہت ہی خوبصورت انداز میں محبت بھی دکھائی گی اور کرائم بھی دکھایا گیا تھا۔ اپنی بیوی پر ہاتھ اٹھانا ایک کرائم ہے جو سنیل کمار جیسے احسان فراموش لوگ کرتے ہیں۔ لیکن جہاں برے لوگ ہوں وہاں اچھے بھی ہوتے ہیں جیسے عبداللہ کا کردار بہت پسند آیا جس نے ایک مظلوم کو نہ صرف سہارا دیا بلکہ اسے اپنے نام کے ساتھ بھی جوڑ لیا۔ بہت عمدہ کہانی دستگیر صاحب کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار۔ ''جیت کی نشانی'' ہبرک کارل جمالی کی لاجواااااب کہانی پر بہت سی داد ایک بہادر خان کا واقعہ پڑھ کر اچھا لگا لکھتے رہیں مزید بہتری کی ضرورت ہے اللہ قلم کی قوت میں اضافہ فرمائے۔ ''چال'' سجاول خان کمال اسٹوری شائع ہونے پر آپ کو بہت بہت مبارکباد اسٹوری پسند آئی ایک دو اماں کی غلطیاں تھیں۔ بہت ہی پیارا انداز بیاں آپ کا واقعی جوانی کا غرور اور دولت انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ بہت عمدہ اسٹوری پیش کی ماشاء اللہ بہت سی داد آپ کے لیے سلامتی کی دعائیں۔ ''چھوٹا چور'' محترم محمد سلیم کرد کو پہلے تو شاندار کہانی شائع ہونے پر بہت بہت مبارکباد۔ بہت ہی پیاری کہانی پیش کی آپ نے جسے پڑھ افسردگی کا شکار ہو گیا معاشرے کا سیاہ پہلو بیان کیا گیا ہے جہاں صرف سب پیسے کے غلام ہیں شاید جن کے دل اور ضمیر مر چکے ہیں۔ اپنے محل بنانے اور اپنی اعلیٰ شان وشوکت میں لوگ غریبوں کو بھول جاتے ہیں۔ یہ پیار اور غلیظ معاشرہ اللہ ہمیں ہدایت عطا فرمائے۔ ''بساط گر'' محترم وحید سلطان صاحب کی سلسلہ وار کہانی بہت عمدہ جا رہی ہے قسط نمبر پانچ بھی لاجواب ہے پچھلی قسطوں کی طرح ویلڈن سر کیپ اٹ اپ ماشاء اللہ بہت سی داد آپ کے لیے۔ ''صراط مستقیم'' محترم ریاض بٹ صاحب کی پہلی کہانی پڑھی اتنی لاجواااب کے میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں بیان کرنے کو واقعی سچ کہا سر آپ نے کسی ہو صراط مستقیم پر لانے کے لیے کسی چیز یا کسی واعظ ونصیحت کی ضرورت زندگی کا ایک واقعہ ہی بندے کو راہ راست پر لانے کے لیے کافی ہے۔ الفاظ کا چناؤ کمال تھا آپ کا زرا بھی کوفت یا دشواری نہیں ہوئی کہانی سمجھنے میں آپ کے لیے نیک تمنائیں لکھتے رہیں۔ ''آپریشن نومبر'' محترمہ مونا شہزاد صاحبہ بہت عمدہ معلوماتی تحریر پیش کی آپ نے جہاں سے کرونا کی شروعات ہوئی تھی۔ چین ہی تھا کہانی میں الفاظ کی روانگی متاثر کن لگی ظلم کی رات جتنی بھی لمبی ہو اس کی صبح ضرور ہوتی ہے بہت سی داد بقایا بہت ہی عمدہ کہانی ہے۔ ''سایہ'' محترم عبدالباسط احمد حسن صاحب کماااااال کہانی پیش کی آپ نے۔ بہت عمدہ کہانی اور سبق آموز اگر انسان کا بھروسہ ہو تو کسی بھی میدان میں وہ ہار نہیں مان سکتا۔ اس کہانی میں امام صاحب اور انعام کا کردار پسند آیا بہت ہی عمدہ کہانی پیش کی ماشاء اللہ نیک تمنائیں لکھتے رہیں۔ ''راز سربستہ'' محترم سر ثناء اللہ خان احسن صاحب کی معلومات سے بھرپور تحریر پڑھ کہ بہت کچھ جاننے کو ملا جو شاید پہلے نہ جانتے تھے۔ مجھے تو اب پتا چلا کہ سانپ بھی بچے جاتے ہیں اور اتنے مہنگے اب تو یہ بالکل بھی کئی ماہ ہو گئے ہیں دیکھے ہی نہیں بھی ہر چیز ناپید ہو رہی ہے خیر سر بہت شکریہ پچھلی بار کی طرح اس بار بھی عمدہ معلومات فراہم کی آپ نے۔ ''ذوق آگہی'' بہت پیارا عمدہ سلسلہ عثمان عبداللہ صاحب بہت پیاری ترتیب دیتے ہیں ماشاء اللہ۔ لیکن ہماری درخواست ہے نئے رائٹرز کو ایڈ کریں اس میں بقایا سب کے اسباق موتی بکھیرتے لفظوں سے بہت ہی شاندار تھے پڑھ کر خوشی بھی ہوئی اور بہت کچھ سیکھنے کو بھی مل گیا ماشاء اللہ۔ ''خوشبوئے سخن'' ایک منفرد لاجواب اور شاندار سلسلہ جسے ترتیب محترمہ نوشین اقبال نوشی نے دیا۔ بہت ہی پیاری ترتیب دی گئی ہے ماشاء اللہ سب کی شاعری کمال بلکہ لاجواب تھی۔ میری سب سے پسندیدہ شاعری اور نثری نظم اس سلسلے سر دستگیر شہزاد صاحب کمال کر دیا، بہت ہی پیاری شاعری کرتے ہیں بہت سی داد آپ کے لیے۔ ''عشق پیچاں'' محترمہ قرۃ العین صاحبہ کی کمال کہانی پہلی قسط تو لاجواب تھی ماشاء اللہ بھرپور انداز میں لکھی گئی کہانی کے لیے محترمہ کو بہت سی داد۔

محسن علی طاب ..... ساہیوال:۔ السلام علیکم پیارے بھائی عمران اللہ پاک آپ کو صحت ایمان والی لمبی عمر عطا فرمائے آمین شمارہ اگست نئے افق کہانیوں کے عین مطابق تھا۔ دستک میں مشتاق سر نے بہت اچھا لکھا اللہ پاک انہیں صحت عطا فرمائے آمین۔ گفتگو میں آپ کی باتیں پڑھیں، عمل کریں گے۔ سر طاہر نے بھی خوب لکھا، خطوط سب کے ہی اچھے تھے پر اپنا پہلا خط دیکھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ سلامت رہیں۔ مجھے جنہوں نے خطوط میں یاد رکھا ان سب کا دلی شکر گزار ہوں، دعائیں۔ مجھے جن کے خطوط پسند آئے ان کے اسماء گرامی ظہیر ملک۔ عروشہ خان۔ تسلیم شیخ۔ عالی مان آفاقی۔ شہزاد خان۔ اللہ رکھا چوہدری۔ سب آئندہ بھی حاضری دیں سب لازمی۔ اب آتے ہیں تحریروں کی طرف تو سب سے پہلے ''دختر وطن'' زرین قمر پہلے پڑھی اس بار بھی تحریر عمدہ تھی۔ ''آپریشن نومبر'' حقیقت محسوس ہوئی۔ ''صراط مستقیم'' ایک سبق آموز تھی۔ ''سنہری دھوپ'' میں محبتوں کے منفرد رنگ دیکھے۔ ''چھوٹا چور'' سے چھوٹا ڈان یاد آ گیا۔ معاشرہ ہی بندے کو ڈاکو بناتا ہے ورنہ جان بوجھ کر کوئی نہیں بنتا۔ ''جیت کی نشانی'' بھی اچھی تحریر تھی۔ ''خونی کتاب'' شہزاد بھائی بہت خوب لکھا۔ ''چال'' کا انجام خوب تھا۔ ''سایہ'' تحریر بھی عمدہ تھی سلسلے وار سلسلے ''بساط گر'' اور ''دو وجود حیات'' اچھے جا رہے ہیں باقی شمارہ اپنی مثال آپ تھا بشرط زندگی اگلے ماہ۔ ملاقات ہو گی۔

سیدہ حمائل فاطمہ ..... شیخوپورہ:۔ قابل احترام محترم عمران احمد بھیا! السلام علیکم! امید واثق ہے کہ خیریت سے ہوں گے۔ اللہ کریم آپ کو صحت والی لمبی عمر عطا فرمائے۔ آج کے مخدوش حالات کے پیش نظر دلی دعا ہے کہ اللہ رب العزت امت مسلمہ کے گناہوں، اور کوتاہیوں کو معاف فرمائے اور ہم سب کو اپنی امان میں رکھے۔ الٰہی آمین۔ اس وقت وطن عزیز انتہا مشکلات کا شکار ہے۔ جتنی بڑی زمین اتنی ہی بڑی مشکلات کی چادر سر پر تنی ہوئی ہے۔ حالات کی سنگینی یا دردانگیزی قلم وقرطاس اشکوں میں ڈھل رہے ہیں۔ ہر ذی روح خوف کے عالم میں ہے۔ رب العالمین تیرے کثیر وگنہگار انسان ہیں۔ میرے کریم اللہ تیری رحمت کے طلب گار ہیں۔ میرے پروردگار ہمارے حال پر رحم فرما۔ الٰہی آمین۔ اس وقت میرا وطن عزیز اندرونی وبیرونی مشکلات کا سامنا کرنے میں کوشاں ہے۔ ایسے وقت میں میرے ہم وطن بہن بھائیوں کو متحدہ ہو کر حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ جہاں آرمی اپنی سرزمین کی حفاظت میں سرگرداں اپنی ذمہ داریاں سنبھال رہی ہے ایسے ہی قلمکاروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے قلم کے سحر سے دکھ درد میں ڈوبی انسانیت کو ناامیدی کے سمندر سے باہر نکالیں۔ جی تو نئے افق میں یہ میرا پہلا خط ہے۔ میں اس رسالے کی خاموش قاری ہوں۔ ایک عرصے سے رسالے کو خاموشی سے پڑھتی آ رہی ہوں۔ مجھے یہ

کہتے ہوئے خوشی ہوگی کہ یہ دور حاضر کا بہترین رسالہ ہے۔ نئے افق کا سرورق بہترین دل مول لینے والا ہوتا۔ اب تک جو تحریریں میرے مطالعے میں آئیں، وہ بہترین ولاجواب رہیں۔ تمام خط بھی شاندار رہے۔ اس بار مجھے جن بہن، بھائیوں کے خط پسند آئے ان کے نام محسن طالب بھائی، ظہیر ملک، عروشمہ خان، تسلیم شیخ، عالی امان افاقی، شہزادی حفصہ، شہزاد خان اللہ رکھا چوہدری۔ ان کے خط بہترین رہے۔ مجھے جو کہانیاں پسند آئیں ''چھوٹا چور، سنہری دھوپ، صراط مستقیم، آپریشن نومبر، جیت کی نشانی اور خونی کتاب'' سلسلے وار بساط گرا بھی تھی۔ نسیم سیکہ صدف اور عالی مان آفاقی کی کہانیاں بہترین ہوتیں ہیں مجھ ان لکھاریوں کی کہانیوں بہت پسند ہیں۔ آگے بھی میں ان کی کہانیوں پڑھنے کی خواہش مند ہوں۔ امید ہے وہ ہمارے لیے بہترین کہانیاں تخلیق کریں گے۔ لاسٹ ٹائم آپی کے شوہر کی وفات کا بے انتہا دکھ ہوا تھا۔ اللہ کریم ان کے شوہر کی مغفرت فرمائے۔ اللہ دنیا میں آپی کے لیے ڈھیر ساری آسانیاں پیدا فرمائے۔ میں نو آموز لکھاریہ ہوں۔ میری بھی دلی خواہش ہے اس بہترین رسالے میں لکھنے کی۔ اور اس خواہش کی تکمیل کے لئے کہانی ''انا کی دیوار'' ای میل کر چکی ہوں۔ اب شدت سے اشاعت کا انتظار ہے۔ محسن علی طالب بھیا بہت بہت شکریہ آپ کی بدولت میں خط لکھنے کی ہمت کر پائی۔ ورنہ تو میں نے کبھی اس بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اچھا لگا لکھ کر۔ ان شا اللہ اب حاضری ہوتی رہوں گی۔ لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہمارا فرض۔ اپنی دعاؤں میں تمام امت مسلمہ کو یاد رکھیے گا :۔ اللہ نگہبان۔

یاسین صدیق ..... بورے والا۔: السلام علیکم! ہمیشہ کی طرح اس بار بھی شمارہ کافی دیر سے ملا، اس کی وجہ شاید گاؤں میں رہنا ہے، یہاں ڈاک کا نظام سست ہے، یا پھر ہمارے ڈاکیا کا کا کوئی کمال ہے۔ دو دن میں کہانیوں کا مطالعہ کیا، اور تبصرہ لکھنے بیٹھ گئے۔ اگست کا شمارہ ہونے کے باوجود اگست کے حوالے سے کوئی توشہ خاص میں شامل نہیں تھا۔ ایک دور تھا جب ہر ماہ ماہنامہ نئے افق خرید اکرتا تھا۔ پھر ہمارے شہر میں رفتہ رفتہ اس کے خریدار کم ہوتے چلے گئے اور ایک دن ایسا آیا کہ شہر میں ملنا مشکل ہو گیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس پر ادارے کو سوچنا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جو لکھ رہے ہیں ان کی کہانیوں میں وہ بات نہیں ہے۔ آپ ماہنامہ نئے افق میں شائع ہونے والی آج سے دس سال قبل کی کہانیوں کا آج کی کی کہانیوں سے موازنہ کر کے اس فرق کو جان سکتے ہیں۔ اس وقت محترمہ مشتاق احمد قریشی کی لکھی ہوئی کہانیاں بھی پڑھنے کو مل جایا کرتی تھیں۔ نئے افق کی پہچان عمران سیریز تھی اور اس میں ایک فلم کہانی بھی لکھی جایا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ دشمن دار، شہباز، سرفروش، قلندر ذات جیسی ناقابل فراموش کہانیاں۔ کہنا یہ ہے کہ کہانی کے معیار پر سمجھوتہ نہ کیا جائے۔ بے شک نیا رائٹر ہو یا پرانا۔ اس شمارے میں بہت کی کہانیوں نے بہت بور کیا لیکن ''دختر وطن'' اور ''وجود حیات'' دونوں کہانیاں زبردست ہیں۔ میں تبصرہ نگار دوستوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کا تبصرہ ایک آئینہ ہوتا ہے۔ اگر آپ سب اچھا کہتے رہیں گے تو آپ کے محبوب رسالہ کا معیار گرتا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ لازمی تنقید کی جائے۔ اس کا مطلب ہے ترازو میں ہر کہانی کو تولا جائے۔ اور سچا تبصرہ کیا جائے۔ کہانی میں مناظر، ڈائیلاگ، کردار نگاری سے جان ڈالی جاتی ہے۔ اس پر سونے پر سہاگہ انداز بیاں کرتا ہے۔ انداز بیاں ہی مصنف کی پہچان ہے۔ کیا آپ موجودہ عہد کے نئے مصنفین میں سے کسی کو اس کے انداز بیاں سے پہچان سکتے ہیں؟ اگست کے شمارے میں کل دس خطوط شائع ہوئے جن میں سے سات خطوط مرد حضرات اور تین خواتین کے تھے۔ محسن علی تاب صاحب اور محترمہ عروشہ خان نے مختصر اور جامع خطوط لکھے۔ سب سے طویل تبصرہ ظہیر ملک اور اللہ رکھا چوہدری نے کیا۔ گفتگو کی محفل میں یہ خوش خبری تھی کہ دو انعام یافتہ خطوط کا چناؤ کریں، انہیں انعام دیا جائے گا۔ میری نظر تو بار بار اپنے نام پر ہی جا رہی ہے۔ بہر حال عالی مان آفاقی اور محترم ظہیر ملک کا تبصرہ کافی جاندار تھا۔ کل بارہ کہانیاں اس شمارے میں شامل ہیں، جن میں سے پانچ قسط وار ہیں۔ قسط وار کہانیاں زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ کل بارہ کہانیاں میں سے آٹھ کہانیاں مرد لکھاریوں نے لکھی ہیں اور چار خواتین لکھاریوں کی ہیں۔ قسط وار کہانیاں کے بارے عرض کرنا ہے کہ اس کا شروع میں گذشتہ اقساط کا خلاصہ لکھا جانا چاہیے۔ جس سے بھی قسط وار کہانی لکھوائی جائے اسے ہر قسط کا خلاصہ لکھنے کا بھی کہا جائے تو اس مسئلہ کا حل نکل سکتا ہے۔ قسط وار کہانیاں میں ''وجود حیات'' محترم عرفان رامے کی ایک بہترین کہانی ہے۔ جس میں تسلسل بھی ہے اور زیادہ بکھری ہوئی نہیں ہے۔ کردار نگاری بھی ہے اور منظر نگاری بھی۔ دوسرے نمبر پر محترمہ زرین قمبری صاحبہ کی ''دختر وطن'' ہے۔ رہی ''بساط گر'' تو اس میں صرف واقعات ہیں اور زور بردستی کا ایکشن ہے۔ زیادہ کردار ہونے کی وجہ سے کوئی سمجھ نہیں آ رہی کہ کہانی کس بنیادی نکتہ کے گرد گھوم رہی ہے۔ ''خونی کتاب'' شہزاد خان صاحب کی ایک اوسط کہانی تھی۔ ''سنہری دھوپ'' دیگر شہزاد کا کہانی پر گرفت مضبوط تھی ''جیت کی نشانی'' ہبرک کارمل جمالی اور ''چھوٹا چور'' محمد سلیم کرد صاحب کہانیاں کسی حد تک سبق آموز ہیں۔ اس اندھیر نگری میں چھوٹے چور کو ہی سزا ملتی ہے بڑا چور تو پکڑا ہی نہیں جاتا نہ اس کو سزا دی جاتی ہے۔ ''چال'' سجاول خان اور ''صراط مستقیم'' ریاض بٹ صاحب میں سے ریاض بٹ کی کہانی نے کچھ متاثر کیا مستقل سلسلہ ''اقراء'' میں ہر ماہ کی طرح لاجواب سلسلہ اس بار الجیب کی ترجمہ و تشریح پڑھنے کو ملی ہیں۔ ''دستک'' میں محترم مشتاق احمد قریشی صاحب نے ذرائع ابلاغ کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ یہ ذرائع ابلاغ کا ہی کرشمہ ہے کہ آج کشمیر پر توڑے جانے والے ظلم و ستم کو جھوٹ سے چھپایا نہیں جا سکتا۔

عالی مان آفاقی ..... احمد پور شرقیہ: السلام علیکم وَ رَحمَۃُ اللہ وَبَرَکَاتہ عید الاضحیٰ کی مصروفیات سے نمٹتے نمٹتے جب کچھ فرصت ملی تو یاد آیا کہ اس بار نئے افق تو خریدا ہی نہیں۔ لیکن یہ سوچ کر مطمئن رہا کہ ساتال والے شاہ صاحب نے میری کاپی ضرور بچا رکھی ہوگی۔ وقت نکال کر جا پہنچا مارکیٹ۔ ٹائٹل کی اٹریکشن اور منفرد رنگ دور سے ہی بتا رہی تھی کہ میں نئے افق ہوں۔ آؤ میں تمہارا ہی منتظر ہوں۔ سو کنویں کی تلاش میں سراب پانے والے پیاسے مسافر کی طرح فٹ سے نئے افق کا تازہ شمارہ اٹھا لیا۔ شاہ صاحب کے ساتھ گپ شپ اور حالات حاضرہ کے ساتھ ساتھ رسائل کی سرکولیشن کے حوالے گفتگو کی غرض سے بیٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا بادلوں سے ڈھکے آسمان کے تصور کے ساتھ ہی دماغ کی بتی روشن ہو گئی۔ مزید تھوڑی سی دیر بھی یہاں رکنا نئے افق کی سلامتی کو خطرہ تھا۔ کہاں بے چارہ کاغذی ماہی البیلا بوندوں کی نمی سہہ سکتا تھا۔ لہٰذا شاہ صاحب کو بخلت میں رقم ادا کر کے تیزی سے واپسی کی راہ لی۔ میں نئے افق سمیت صحیح سلامت گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ لیکن ہونی ہو کر رہی اور آسمان نے دامن میں بھرے آبی خزانے زمین کی طرف الٹ دیے۔ میری حالت پانی میں بھیگ کر جو ہوئی وہ تو احباب سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن پانی نے نئے افق کی صحت پر کوئی اثر نہیں ڈالا بلکہ وہ مزید فربہ ہو کر اپنے سائز سے بھی دگنا ہو گیا۔ خیر جو ہوا سٹی پاؤ خارجی گفتگو بڑھتی جا رہی ہے۔ بلا تاخیر اب تبصرے کی طرف آتے ہیں۔ سرورق کے بارے اتنا کہوں گا کہ نئے افق کی پہچان ہی اس کے سرورق ہیں۔ ہمیشہ کی طرح چشم کو خوش تر کرتا انتہائی خوب صورت۔ نام نہیں لکھا کہ کس نے بنایا ہے۔ لیکن جس نے بھی بنایا ہے کمال کے رنگ و مناظر دیے ہیں۔ ویلڈن۔ مجھے پتا تھا کہ میری کہانی اس بار نہیں آئی۔ کیونکہ میں نے

بھیجی ہی نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی خوامخواہ فہرست پر نظر دوڑائی۔ اور یہ نظر دوڑانا بے کار نہیں گیا۔ دو کہانیوں کے اوپر ایک ہی صفحہ نمبر لکھا ہے جیت کی نشانی صفحہ نمبر 10 اور چال صفحہ نمبر 10 دیکھ لیں عمران بھائی اے گلاں چنگیاں نے حیں۔ مدت ہو چکی تھی مصروفیات میں گھر کر کسی سے سلجھی ہوئی گفتگو کیے۔ سیدھا گفتگو کے صفحات پر جا پہنچا۔ سوچا کچھ گپ شپ کا احتظاظ ہو۔ حدیث مبارکہ سے تربیت حاصل کرنے کے بعد پہلے نمبر پر لگنے والا محسن طاب کا تبصرہ پڑھا۔ کافی پابند انسان لگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو وقت کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ لیکن تبصرہ انتہائی مختصر تھا۔ دریا کو کوزے میں بند کرنا بھی تو اپنے آپ میں ایک کمال ہے۔ چند سطروں میں پورے پرچے پر تبصرہ بہت اچھا لگا۔ عروشہ خان کا لکھا جیسا تبصرہ بھی پورے پرچے پر محیط تھا۔ خوب۔ شہزاد خان نے مفصل تبصرہ کیا۔ ماشاء اللہ ایسے ہی سب کا حوصلہ دھاڑی رکھو دوست۔ تسلیم شیخ بہناب آپ ان شاء اللہ ہر ماہ مجھے اس محفل میں دیکھیں گی۔ سلامت رہیں سدا۔ رکھا چوہدری جی ان شاء اللہ ہر ماہ حاضر رہوں گا۔ آپ کا تبصرہ بھی دل پذیر و دلنشین ہے۔ میری کہانی ''ستم تقدیر'' کو پسند کرنے کا شکریہ۔ یسمین صدیق طالما ہن چھوڑ نہ جائیں۔ نئے افق کے صفحات آپ کی گفتگو سے نکھر جاتے ہیں۔ مجھے ہر ماہ آپ کے تبصرے کا اشتیاق رہے گا۔ ظہیر ملک اچھے دوست ہیں۔ تبصرہ پسند کرنے پر متشکر ہوں پیارے۔ انتہائی مفصل تبصرہ کیا آپ نے، جو کہ آپ کے مطالعہ کی دلچسپی اور نئے افق سے محبت و لگن کی دلیل ہے۔ شہزادی حفصہ ایک بہترین لکھاری ہیں۔ آتی رہیے گا۔ ''مستقل سلسلہ'' اقرا آنکھوں کا نور ہے۔ جزاک اللہ خیرا کثیرا۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب کی سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔ دختر وطن میں دلچسپی کا عنصر بے پایاں ہے اور لامحالہ یہ کہانی قارئین کے دلوں پر دھڑکن کے نقارے کی طرح بجتی رہے گی۔ زرین قمر آپا کے قلم میں جولانی ہے جو کہانی کی طولانی کو بتدریج سنوارے جا رہی ہے۔ شہزاد خان نے اس بار ''خونی کتاب'' لکھی۔ بہت اچھی کہانی ہے لیکن شبراتی بابا کی روحانیت کو انہوں نے شیطانی قوت کے آگے بے بس دکھایا ہے جو کہ کچھ پچتی گلی نہیں ہے۔ روحانیت میں بڑی طاقت ہے۔ مجموعی طور پر پسند کیے جانے کے لائق ایک بہترین کہانی ہے۔ ماشاء اللہ۔ سنہری دھوپ۔ دستگیر شہزاد کبھی کبھار آتے ہیں لیکن چھا جاتے ہیں۔ متشکک رویے ویسے بھی ہندوؤں کی پہچان ہیں۔ سنیل کے درندگی جیسے رویے نے عبداللہ کے دل میں انگڑائی لیتی کلی کو کھلنے کا موقع دے دیا۔ ایک لازوال تحریر کہ جس کی تعریف کا حق ادا کرنے کے لیے لفظ نہیں ملتے۔ اب پھر عرفان رامے کی سلسلہ وار کہانی پر گذشتہ کہانی ''سنہری دھوپ کا عنوان دے دیا گیا ہے۔ جبکہ کنفیشن وجود حیات کا ہے۔ خیر نظر انداز کرتے ہیں۔ لیکن یہ چیز پرچے کی مقبولیت میں رکاوٹ ہو سکتی ہے۔ ''جیت کی نشانی'' ہر گز کارل جمالی قبائلی پس منظر میں ہی لکھتے ہیں۔ دلچسپ اور رواں انداز لیے ایک تاریخی واقعے کو کہانی کی شکل میں کمال انداز میں پیش کیا۔ لیکن املا کی غلطیوں پر توجہ دی جاتی تو کہانی مزید نکھر جاتی۔ پھوٹا چوڑ محمد سلیم کردو کے داشگاف قلم سے ایک انوکھا شہ پارہ، جس میں معاشرے کا بھیانک چہرہ دکھایا گیا ہے جس پر سے کئی بار نقاب اتر چکا ہے لیکن ہمارے سر فرا پھر بھی ان ہی کے ساتھ ہیں۔ غربا بے چارے استحصال کی چکی میں ہی پس رہے ہیں۔ زندہ رہنے کی کوشش میں اٹھائے جانے والے انتہائی قدم کا پر درد احوال۔ بساط گر بدستور بچھ رہی ہے لیکن جی ہم تو ہانپ جاتے ہیں۔ ہولا ہتھ رکھو۔ صراط مستقیم ریاض بٹ صاحب نے ضمیر جاگنے پر اٹھنے والے طوفان کی کہانی سنائی۔ انسپکٹر خالد جیسے ذہین آفیسر کے سنگ تفتیش کے دائروں میں سفر کرتے مجھے اپنے آپ کو بھول جانا پڑا۔ ان کی اچھی عادت یہ ہے کہ قاری کا ہاتھ پکڑ کر نہ صرف چلتے ہیں بلکہ تفتیش اور جستجو میں قاری کو تکے لگانے کا موقع بھی دیتے ہیں۔ اس بار بھی میں نے کہانی میں دیے گئے ایک مبہم مقام پر بالکل صحیح اندازہ لگایا۔ کبیر علی سے ہی اصل بات کا پتا چلا اور وہ خود اپنے عیاش بھائی کا قاتل نکلا۔ آپریشن نومبر مونا شہزاد آپی نے لکھی۔ موجودہ حالات کے تناظر میں لکھا گیا ایک بہادرانہ سچ۔ مونا آپی کے قلم کو سلام کہ وہ ادب کی ہر صنف میں حقائق لکھتی ہیں۔ شیطان کے گماشتوں نے جو سازش کا جال بچھایا تو وہ خود ابلیس سے بھی بازی لے گئے۔ انسانیت کو مار کر اس کے مدفن پر ابلیس پیٹ پکڑ کر قہقہے لگائے جا رہا ہے۔ نگاہ تاج رہا ہے۔ یہ کسی کا یار نہیں۔ جو خدا کا نہیں ہو وہ تو کس کا ہوگا۔ یہ اپنے چیلوں پر بھی مصیبت کے وقت یہ کہہ کر پیٹھ دکھا جاتا ہے کہ میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں۔ اپنی سازش میں خود ہی پھنسے ہو خود ہی نکلو۔ کرونا وائرس ایک سازش کی پروردہ وبا، جس نے اپنے تخلیق کاروں کو بھی نہ بخشا۔ سازشی اژدہے خود بھی جال میں آ گئے اور پوری دنیا میں سراسیمگی پھیل گئی۔ بے شک شیطان کا مشن کامیاب ہوتا جا رہا ہے۔ اب جنگ لڑنے کے لیے ہتھیاروں کی ضرورت نہیں رہی۔ بی زمانہ سب سے بڑا ہتھیار خوف ہے۔ خوف و ہراس پھیلا کر اب جنگیں جیتی جائیں گی۔ مونا آپی کے اس جملے سے اتفاق ہے کہ وبائی آفتوں کی آمد سے تیسری جنگ عظیم کا آغاز ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو ہدایت اور نور ایمانی نصیب فرمائے۔ آمین۔ سایہ۔ عبداللہ احمد حسن کو کہانی کی اشاعت پر مبارک باد۔ سایہ نیکی اور بدی کی ازلی آویزش کا وہی پرانا رنگ دکھاتی لیکن اسلوب کا اچھا انداز لیے متاثر کن تحریر رہی۔ جنات کی کارستانیوں سے محفوظ اگر رہنا ہے تو قرآن پاک کو لازم پکڑ لو۔ اس کی ہر ہر آیت ہر پریشانی کے خلاف اسم اعظم کا درجہ رکھتی ہے۔ ''چال'' سجاول خان کو نئے افق میں خوش آمدید۔ یہ ایک تفتیشی کہانی ہے لیکن اس پر بھی کنفیشن غلطی سے ریاض بٹ کی کہانی ''صراط مستقیم کا دے دیا گیا ہے۔ اب کچھ قارئین ہوتے ہیں جو بغیر پڑھے کنفیشن کے سہارے ہی کہانی پر تبصرہ کریں گے اور ان کا چور پکڑا جائے گا۔ کیونکہ وہ دولت کے آزار کو لے کر نمونہ ہائے اسلوب و نگارش سے مبصر ہوں گے کہ یہ کہانی دولت کے گرد گھومتی ہے۔ لیکن میرا یہ تبصرہ پڑھ کر ان کا دماغ بھی گھوم جائے گا جب کھلے گا کہ یہ کہانی رقابت کے جذبے کو لے کر لکھی گئی ہے۔ ہاہاہاہاہا۔ بہت اچھی کہانی۔ جولیا نے اپنی ذہانت سے بے قصور ریاض کو بھی بچا لیا اور الیا اور اس کا بچہ بھی محفوظ رہے۔ ایک بات۔ اس کہانی میں مین کردار کو سکتر اش دکھایا گیا ہے اور جائے وقوعہ بھی مندر ہے۔ لیکن مندر میں پادری کا کیا کام جو آخر تک جولیا کے ساتھ ہوتا ہے۔ پادری کی جگہ پنڈت لکھتے تو اشکال نہ ہوتا۔ ''عشق بیچاں'' قرۃ آپی لکھیں اور شاہکار نہ ہو۔ ناممکن ہے۔ یہ کہانی پڑھ کر نئے افق میں ہی شائع ہونے والی محمد اعظم خان مرحوم کی ایک کہانی ''خالی دامن'' یاد آ گئی۔ بے شک اپنی تمناؤں کی تکمیل کی غرض سے غلط راستہ چننے پر انسان خالی دامن ہی رہ جاتا ہے۔ سفلیات کے جال میں موت کا چہرہ دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایک بوند پانی کا پیاسا پورا دریا بھی نہیں پی سکتا اور چاہ بھی نہیں کرنی چاہیے۔ اگلے ماہ تک کے لیے اجازت۔ بشرط زندگی ملاقات باقی ان شاء اللہ۔

انعام یافتہ تبصرے:۔ پہلا خط ظہیر ملک، دوسرا خط عالی مان آفاقی، انعام میں ان دونوں حضرات کو تبصرہ کا شمارہ ارسال کیا جائے گا، آپ اپنے پتے معہ فون اردو میں لکھ کر اس نمبر پر واٹس ایپ کر دیں۔ 03002250376

اقراء

ترتیب: طاہر قریشی

الوکیل
(کارساز)

الوکیل: اس کا اساسی مادہ (و ک ل) ہے اور صفتِ مشبہ نکرہ ہے' وکیل عربی میں ضامن اور گواہ کے لئے استعمال ہوتا ہے اور کام بنانے والے کو بھی کہا جاتا ہے' یہ لفظ کارساز' ذمہ دار' خودمختار قائم نگران' محافظ منتظم' عامل' وکالت کرنے والا اور مختارِ کل کے معنوں میں آتا ہے۔ عام زندگی میں ہم وکیل اسے کہتے ہیں جسے ہم اپنے کام اور معاملات سونپ دیتے ہیں۔ الوکیل صرف ذاتِ باری تعالیٰ کے لئے ہی استعمال ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اپنے بندوں کے رزق اور دیگر تمام ضروریات زندگی مہیا کرنے کی ازخود ذمہ داری لے رکھی ہے۔ اس لئے اللہ کی یہ صفتِ عظیم الوکیل استعمال کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان ہستی پر اس کے بندے بغیر دیکھے ایمان ویقین اور اعتماد رکھتے ہیں اور بھروسہ کرتے ہیں کہ وہی مالک الملک ہی اس طرح مدد کرسکتا ہے اور کررہا ہے۔

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے۔ (الزمر۔۶۲)

آیتِ کریمہ میں تین صفاتِ الٰہی بیان ہوئی ہیں۔ خالق' علی اور وکیل' اللہ تبارک وتعالیٰ جو تمام کائنات کا اور کائنات کی ہر ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے' ہر جاندار' غیر جاندار کا وہ اکیلا خالق ہے اور وہ تمام چیزوں پر پورا مالکانہ تصرف رکھتا ہے یعنی ہر چیز کا خالق بھی وہی ہے اور مالک بھی وہی ہے' وہ جس طرح چاہے' تصرف اور تدبیر کرے۔ ہر چیز اس کے ماتحت اور زیرِ تصرف ہے' کسی کو کسی بھی طرح سرتابی یا انکار کی مجال نہیں ہے۔ وکیل بمعنی محافظ اور مدبر کے ہے' ہر چیز اس کے سپرد ہے اور بغیر کسی شراکت کے وہ ان کی حفاظت اور تدبیر کررہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفتِ خالقیت ایسی حقیقت ہے جس پر کائنات کی ہر چیز گواہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا کسی بھی چیز کے بنانے' پیدا کرنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا اور یہ حقیقت ہے کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ کسی پیدا کرنے والے کے بغیر خودبخود پیدا نہیں ہوا ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ کائنات کی ایک ایک چیز کو اللہ تعالیٰ نے بڑی اعلیٰ منصوبہ بندی کے ساتھ بنایا اور پیدا فرمایا ہے کوئی بھی چیز نہ خودبخود پیدا ہوئی ہے اور نہ ہی کسی طرح اتفاقی طور پر پیدا ہوسکتی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ جس نے تمام عالم بلکہ عالمین کو پیدا کیا ہے وہی ہستی ہر چیز کی پوری طرح نگہبان بھی ہے کائنات کے تمام نظام اللہ کے چلائے سے ہی چل رہے ہیں' وہ اپنے منصوبے اور ارادے کے مطابق زمین وآسمان کو چلا رہا ہے' وہی عظیم تر ہستی اس سارے نظام کی نہ صرف نگہبانی کررہی ہے بلکہ پرورش بھی کررہی ہے' وہی اس سارے نظام کی کارساز ہے۔ پوری کائنات اللہ کے نظامِ قضا وقدر کے مطابق چل رہی ہے۔ یعنی اس دنیا کو اور کائنات کو پیدا کرکے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یونہی نہیں چھوڑ دیا وہ ہر ہر چیز کی پوری طرح خبرگیری کارسازی ونگہبانی بھی کررہا ہے' دنیا کی تمام چیزیں جس طرح پیدا کرنے سے وجود میں آتی ہیں' اسی طرح وہ اللہ کے باقی رکھنے سے باقی ہیں اور اللہ کی ہی پرورش کی وجہ سے وہ پھل پھول رہی ہیں اور اللہ کی ہی حفاظت ونگرانی میں کام کررہی ہیں۔

ترجمہ:۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ تمہارا رب! اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں' ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے' لہٰذا تم اسی کی

Waqar Azeem Pakistanipoint.com www.pakistanipoint.com

عبادت کرو اور وہ ہر چیز کا کارساز ہے۔ (الانعام۔۱۰۲)

آیتِ کریمہ سے پہلی آیتِ مبارکہ میں ربّ کائنات نے واضح فرمادیا ہے کہ ''خلق بھی اس کا ہے' علم بھی وہی رکھتا ہے۔'' جب یہ بات تسلیم ہوجائے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی واحد خالق ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ ہی بادشاہ و مالک ہے اور جب اللہ تعالیٰ ہی خالق و مالک ہے تو لازمی وہی رازق بھی ہے کیونکہ جب اللہ خالق و مالک ہے تو رزق کی فراہمی کی ذمہ داری بھی اسی کی ہے اور یہ رزق وہ اپنی مملکت سے دیتا ہے' جس میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عظیم مملکت میں جو کچھ بھی ہے یا جس جس سے انسان فائدہ اٹھاتے ہیں وہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں' جب تخلیق' ملکیت اور رزق سب کا سب اللہ کا ہے تو یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اللہ ہی سب کا پروردگار ہے' پالنے والا پرورش کرنے والا بھی ہے۔ لہٰذا یہ ہر انسان کا فرض ہوگا کہ وہ خصائص ربوبیت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔

یہ حقیقت ہے کہ قرآنِ کریم میں تخلیقِ کائنات اور تقدیرِ نظامِ کائنات کا ذکر اس لیے نہیں کیا جاتا کہ ان امور سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے وجود پر دلائل قائم کئے جائیں۔ خالق اور تقدیر کے حقائق تو قرآن مجید میں اس لئے لائے گئے ہیں کہ لوگ راہِ راست پر رہیں کسی بہکانے والے کے بہکائے میں نہ آجائیں اور اپنے اعمال وعقائد میں اللہ تعالیٰ کی الوہیت' اس کی حاکمیت اور اس کی مکمل بندگی کو نافذ کریں اور اللہ کے ساتھ کسی طور کسی کو قطعی شریک نہ کریں کہ یہی زندگی کی حقیقت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے لئے وکیل ہونا یعنی کارساز ہونا اس کی اہم صفت اور خصوصیت ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی مختار و منتظم ہے' ہدایت دینے والا ہے' حاکموں کا حاکم ہے' وہی سب کا کارساز' ہمدم نگہبان اور پروردگار ہے' اس کے سوا کوئی نہ اطاعت کے لائق ہے نہ ہی عبادت کے لائق ہے' ہر چیز کا خالق ہونے کے ناطے بھی وہی سب کا معبود حقیقی ہے' وہی کارساز ہمارا ہادی و رہبر بھی ہے۔ وہی حی وہی قیوم ہے۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں' صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں
☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔
☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کردیا ہے۔
☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
☆ ''گفتگو'' کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3' تاریخ تک مل جانے چاہیے' خطوط ای میل بھی کیے جاسکتے ہیں۔ editorufaq@naeyufaq.com
☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 81 ہیپر بیرکس، ہاکی اسٹیڈیم' کراچی۔

دختروطن

زرین قمر

اس نے ایک ایسی سرزمین پر جنم لیا تھا جہاں دنیا کے سامراجوں کی بھوکی نظریں اس کے وطن کی عزت سے کھیل رہی تھیں ، جینے کا حق چھینا جارہا تھا ،رہنا خاموش تھا۔ انصاف کے دروازے ان پر بند تھے اور دشمن چالاک اور عیار تھا وہ کھلی فضاؤں اور زمین کی تاریک گہرائیوں سے ان پر حملہ آور ہوتا تھا جس کا مقابلہ میدان جنگ میں ممکن نہیں تھا۔ تب نازک دوشیزہ نے خود کو خطروں میں ڈال کر ہونٹوں پر مسکراہٹیں سجالیں ، مستقبل داؤ پر لگا دیا اور نہتے ہاتھوں میدان میں اتر گئی، اس نے موسیقی کی جھنکار کو رزمیہ گیتوں میں بدل دیا ، رقص رنجیر شروع کردیا۔ اس نے کئی ملکوں میں یہ جنگ لڑنے کے لئے اسٹیج سجالئے افتاد زمانہ سے پل پل پردہ اٹھاتی ایک ایسی سچی کہانی جسے پڑھتے ہوئے آپ کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں گے۔"

ایسی قوم کا المیہ جس ہر دور میں دردناک حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا مگر ثابت قدمی ان کا شعار رہی تھی

چند لمحوں بعد مردانہ آوازیں بند ہوگئی تھیں، پھر بھاری قدموں کی آوازیں آئی تھیں اور دور ہوگئی تھیں، چند لمحوں بعد دور کہیں کوئی بھاری دروازہ کھلا تھا پھر بند ہوگیا تھا گھر میں اب مکمل خاموشی کا راج تھا، کچھ دیر بعد گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تھی اور پھر گاڑی وہاں سے روانہ ہوگئی تھی اور اس کی آواز بھی دور ہوتی چلی گئی تھی، جس کا مطلب تھا کہ اب کچھ لوگ جاچکے تھے، لیکن کامی اور آزادے یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہاں مزید کتنے افراد تھے۔

چند لمحوں بعد کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور ادھیڑ عمر عورت اندر داخل ہوئی تھی، اس کی نظریں ٹرے میں پڑے کھانے پر تھیں۔

"تم لوگوں نے کھانا نہیں کھایا؟ اب رات بھر بھوکے رہو گے....." اس نے ٹرے اٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر ٹرے لے کر وہ پلٹی تھی اور کامی نے نہایت پھرتی سے نیچے رکھا ہوا گلدان اٹھا کر پیچھے سے اس کے سر پر مارا تھا اور وہ لڑکھڑا کر نیچے گر گئی تھی، کھانے کی ٹرے اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی اور کھانا کمرے میں بکھر گیا تھا، عورت کے منہ سے اف کی آواز بھی نہیں نکلی تھی شاید وہ بے ہوش ہوگئی تھی، کامی نے آزادے کو اشارہ کیا تھا جو کرسی پر ساکت بیٹھی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کامی کے اشارے پر وہ اٹھی اور اس کے ساتھ تیزی سے کمرے سے نکل گئی تھی کامی احتیاط سے گھر میں چاروں طرف دیکھتا اندازے سے اس سمت بڑھ رہا تھا، جس سمت سے کچھ دیر پہلے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی تھی، گھر بہت بڑا اور شاندار تھا لیکن شاید اس وقت وہاں اور کوئی ذی روح نہیں تھا، کیونکہ کسی نے مداخلت نہیں کی تھی۔

کچھ ہی دیر میں وہ لوگ عمارت کے باہر تھے، وہاں بھی اب کوئی نہیں تھا، البتہ کچھ دیر پہلے وہاں سے جانے والی سیاہ سوک کے ٹائروں کے نشان فرش پر موجود تھے۔

تمہاری گاڑی ادھر جھاڑیوں میں ہے۔" آزادے نے جلدی سے ایک سمت اشارہ کیا اور پھر وہ دونوں بھاگتے ہوئے اس سمت چلے گئے۔ اندھیرا کافی ہوگیا تھا اور

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

آزادے انداز سے آگے بڑھ رہی تھی۔

گاڑی جھاڑیوں میں اپنی جگہ موجود تھی، گویا کسی کو بھی اس کی وہاں موجودگی کا علم نہیں ہوا تھا کامی تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا اور آزادے بھی اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ کامی نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی اور آہستہ سے ریورس کر کے آگے بڑھادی تھی اس عرصے میں آزادے نے پچھلی سیٹ پر رکھا اپنا پرس اٹھایا تھا اس اس میں سے اپنا موبائل نکال کر کامی کی والدہ کا نمبر ملایا تھا، دوسری طرف سے کال فوراً ہی ریسیو کر لی گئی تھی۔

''ہیلو؟ تم لوگ کہاں ہو؟'' دوسری طرف سے کامی کی والدہ کی پریشانی سے بھری آواز سنائی دی تھی۔

''ہم آ ہی رہے ہیں بس پروگرام کچھ لمبا ہی ہو گیا تھا۔'' آزادے نے جھوٹ بولا وہ نہیں چاہتی تھی کہ اصل بات بتا کر انہیں پریشان کرے، اس نے فیصلہ کیا تھا کہ گھر پہنچنے کے بعد وہ موقع دیکھ کر انہیں سب تفصیل بتادے گی۔

''تم نے اچھا کیا جو امی کو کچھ نہیں بتایا۔'' کامی نے بھی اطمینان کا سانس لیا، اس کی نظریں راستے کے اطراف میں مرکوز تھیں اور ذہن میں یہی خیال گردش کر رہا تھا کہ شاید اسے راستے میں کہیں اپنے ان دشمنوں کی کوئی جھلک یا نشانی نظر آ جائے، جنہوں نے اسے اغوا کیا تھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے کامی؟ کیا ہمیں والدہ کو سب بتا دینا چاہیے؟'' آزادے نے پوچھا۔

''بتانا تو ہوگا آزادے لیکن ہمیں پہلے ذہنی طور پر انہیں تیار کرنا ہوگا۔'' کامی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''آج کا دن بہت برا گزرا میں تو اس دن کو یادگار بنانا چاہتی تھی کامی۔''

''یادگار تو اب بھی بن گیا ہمیں ہمیشہ یاد آتا رہے گا کہ جب ہم اپنی خوشیاں سیلی بریٹ کر رہے تھے تو ہمیں اغوا کر لیا گیا تھا۔ شاید یہ کہانی ہمارے بچوں کے لیے بھی دلچسپ ہو۔'' کامی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم ہنس رہے ہو؟ تمہیں فکر نہیں کہ یہ کون لوگ تھے وہ یقیناً ہمارے دشمن ہی ہوں گے تب ہی تو انہوں نے تمہیں اغوا کیا، لیکن ان کا مقصد کیا تھا؟''

''یہ تو وقت کے ساتھ ہی پتہ چلے گا۔'' کامی نے کہا اور آزادے نے اس کے کاندھے سے سر ٹکا دیا۔ وہ بہت تھک چکی تھی، رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اور اسے شدید نیند آ رہی تھی، پھر اس کی آنکھ ایک ہلکے سے جھٹکے سے کھلی تھی جب کامی نے اپنے گھر کے گیراج میں کار روکی تو اس نے آنکھیں کھول کر گیراج میں موجود مدھم روشنی میں اس کی طرف دیکھا تھا وہ بھی اس پر جھکا بغور اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

''مستقبل کی زندگی میں پہلا قدم مبارک ہو۔'' کامی نے پیار بھرے لہجے میں کہا اور اس کا ماتھا چوم لیا، وہ چونک کر پیچھے ہٹ گئی تھی اور شرم سے اس کے گالوں پر سرخی پھیل گئی تھی، سورج طلوع ہو رہا تھا اور ہر سمت سنہری سی روشنی پھیلی ہوئی تھی کامی کی والدہ دروازے پر لپک گئی تھیں۔

''خیریت تو ہے؟ کیا ہوا؟ تم لوگوں کو بہت دیر لگ گئی۔'' انہوں نے تشویش سے پوچھا۔

''بتاتے ہیں ماں اندر تو چلیں۔'' کامی نے مطمئن لہجے میں کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے، صبح ہو رہی ہے تم لوگ ڈرائینگ روم میں چلو میں چائے بنا کر لاتی ہوں پھر بات کریں گے۔'' کامی کی والدہ نے کہا اور کچن کی طرف چلی گئیں۔

''تم آنٹی کو کیسے بتاؤ گے؟'' آزادے نے سرگوشی میں پوچھا۔

''یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔'' کامی کے لہجے میں کسی حد تک تشویش تھی۔

''اللہ نے ہمیں بال بال بچا لیا ہے کامی..... کوئی نیکی کام آ گئی ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو اللہ کے سوا اور کون بچا سکتا ہے میری والدہ نے بچپن سے یہی سکھایا کہ اللہ پر بھروسہ رکھو وہ ضرور تمہاری مدد کرے گا اور زندگی کے ہر مشکل وقت میں مجھے اس کا تجربہ ہوا ہے۔''

''ہاں، میں بھی اس بات کی گواہ ہوں..... تمہیں نہیں معلوم جب میں پانچ سال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ افغانستان چھوڑ رہی تھی تو کن حالات سے گزری تھی، میری والدہ نے اپنے نیلے ٹوپی دار برقعے میں مجھے اور میرے چھوٹے بھائی سیف کو چھپایا ہوا تھا، ہمیں خود کو مقامی لوگوں سے پوشیدہ رکھتے ہوئے ہجرت کرنا تھی، قدم قدم پر مشکلات کا سامنا تھا، راستے میں طالبان اور افغان سیکورٹی

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

فورسز کا سامنا تھا ہم جان ہتھیلی پر لے کر نکلے تھے پھر راستے میں اللہ کی مدد سے کئی لوگوں نے ہماری مدد کی اور ہم پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔"

"اللہ نے ہماری مدد تو کی ہے آزادے لیکن ہمارے ساتھ یہ ہوا کیا ہے؟ آخر وہ کون لوگ تھے؟"

کامی نے کہا اور اسی وقت اس کی والدہ چائے کی ٹرے لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

"کن لوگوں کی بات کر رہے ہو کامی؟" انہوں نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے کہا، ساتھ ہی چائے کا ایک کپ اٹھا کر آزادے کے ہاتھ مین پکڑا دیا تھا۔

"تم لوگ کافی تھکے ہوئے لگ رہے ہو بتاؤ تمہیں دیر کیوں لگی؟"

"دراصل ہم جس ہوٹل میں گئے تھے اچانک وہاں کچھ دہشت گرد آ گئے اور انہوں نے وہاں تخریبی کارروائی کی....."

"اور پھر کامی اس کی حقیقت جاننے کے لیے مجمعے میں گھس گئے اور وہ لوگ کامی ہی کو پستول کا نشانہ بنا کر وہاں سے اغوا کر کے لے گئے۔"

"اوہ..... کیا؟ میرے خدا..... پھر کیا ہوا؟ کامی تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچا؟" انہوں نے کامی کے جسم کو ہر طرف سے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں اللہ کا شکر ہے کہ ہم بچ گئے ہیں۔"

"مجھے تفصیل سے بتاؤ آخر ہوا کیا تھا وہ لوگ تمہیں ساتھ کیوں لے گئے۔"

"میرے خیال میں انہوں نے صرف جائے حادثہ سے بچ نکلنے کے لیے مجھے ڈھال کے طور پر استعمال کا، میری بھی غلطی تھی کہ میں خواہ مخواہ اٹھ کر آگے پہنچ گیا اور انہوں نے مجھے قابو کر کے ڈھال کے طور پر استعمال کیا۔"

"پھر؟..... پھر کیا ہوا؟"

"پھر آزادے مجھے ڈھونڈتی ہوٹل کے باہر آئی تو وہ لوگ مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا رہے تھے، چنانچہ آزادے نے ہمارا تعاقب کیا۔" کامی نے کہا اس کی والدہ کا چہرہ زرد ہو گیا تھا اور وہ گہری سانس لیتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔

"پھر وہ لوگ مجھے بھی اس عمارت میں لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے جہاں انہوں نے کامی کو قید کیا تھا، ہم بہت مشکل سے جان چھڑا کر بھاگے ہیں؟" آزادے نے جلدی سے بات مکمل کی۔

"وہ لوگ کون تھے؟"

"ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے، انہوں نے افغانوں جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔" کامی نے کہا۔

"کہیں وہ افغانستان ہی سے تو تمہارے تعاقب میں نہیں آئے تھے؟"

"یہ بھی ہم نہیں جانتے۔" اس بار آزادے نے جواب دیا۔

"اللہ رحم کرے، اچھا تم لوگ آرام کرو تمہیں تو کل کینیڈا کے لیے روانہ ہونا ہے آزادے۔"

"نہیں ابھی ٹائم ہے میں صبح بات کروں گی۔" آزادے نے جواب دیا کیونکہ اسے کینیڈا جانے سے پہلے مختلف ملکوں میں اپنی پرفارمنس دیتے ہوئے جانا تھا، کینیڈا پہنچنے میں ابھی وقت تھا۔

دوسری صبح ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے اپنے موبائل پر ای میل چیک کیں جو دنیا کے مختلف ملکوں سے آئی ہوئی تھیں، ان میں کچھ ممالک کے سفارتخانوں کی میل بھی تھیں جو چاہتے تھے کہ وہ اس سفر کے دوران ان کے ٹی وی چینلز پر بھی پرفارم کرے، چنانچہ انہوں نے اس سے تاریخیں دینے کی درخواست کی تھی، اچانک اس کی نظر ایک ای میل پر پڑی جو نیلوفر نے بھیجی تھی جو اس کے آزادے شو پروگرام میں ٹی وی ون کی پروڈیوسر تھی جس میں اس سے فوراً واپس آنے کے لیے کہا گیا تھا اور بتایا تھا کہ ڈیوڈ کی ٹیم جانے کے بعد ITV نے ایک نئی ٹیم سے معاہدہ کر لیا تھا اور آزادے شو کا دوسرا حصہ جلد شروع کرنے کا ارادہ تھا، آزادے خود بھی یہی چاہتی تھی۔ یہ 2011ء کا زمانہ تھا، نیلوفر نے گیسٹ ہاؤس میں نئی ٹیم کے ساتھ میٹنگز شروع کر دی تھیں اور آزادے کو فوراً واپس آنے کے لیے میل کر دی تھی۔

"کامران..... کامران..... تم کہاں ہو؟" آزادے نے کامران کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اسے بڑی عجلت میں آوازیں دیں۔

"خیریت کیا بات ہے؟" کامران اس کے پیچھے ہی اپنے کمرے میں داخل ہوا تھا۔

"دیکھو؟ مجھے میل آئی ہے وہ مجھے واپس بلا رہے ہیں۔"

Waqar Azeem Pakistanipoint www.pakistanipoint.com

آزادے نے اپنا موبائل کامران کے سامنے کردیا اور وہ میل پڑھنے لگا۔

''پھر؟.....اب کیا کرنا ہے؟''

''تمہیں معلوم ہے..... یہ میرا شوق ہی نہیں میری زندگی کا مقصد بھی ہے میں جس انداز سے بھی اپنے ملک کے کام آسکتی ہوں حاضر ہوں، افغانستان میں تخریبی کارروائیاں بڑھ گئی ہیں۔ لوگ ذہنی تناؤ کا شکار ہیں ڈر ہے کہ جو حوصلہ وہاں کی خواتین اور نئی نسل میں آزادے شو سے پیدا ہوا تھا وہ معدوم نہ ہوجائے، چنانچہ دوسرا شو جلدی شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔''

''تو واپس جانا ہوگا۔؟'' کامران نے پوچھا۔

''ظاہر ہے۔''

''اور دوسرے ممالک میں جو میوزیکل شو کرنا تھے وہ؟''

''وہ فی الحال نہیں کرسکتے انہیں آگے بڑھادیں گے میں وکی سے بات کرتی ہوں جو کابل میں میرا اسسٹنٹ ہے وہ سارا معاملہ دیکھ لے گا۔'' آزادے نے کہا۔

''ملکی فوجوں اور تخریب کاروں میں جھڑپیں پھر شروع ہوگئی ہیں، میں بھی ابھی ٹی وی پر خبریں دیکھ رہا تھا۔'' وہ بتا رہے تھے کہ 2010 میں 2,777 لوگ مارے گئے ہیں۔ 2009ء اور 2010ء کے دوران جو جنگ ہوئی اس میں جو تباہی ہوئی اس سلسلے میں بہت سے اسکول، عمارتیں اور سڑکیں دوبارہ تعمیر کی جارہی ہیں اس کے علاوہ ٹیچرز، پولیس، ڈائریکٹرز اور انجینئرز کو تربیت دی جارہی ہے۔''

''ہاں، اور اب میں بھی اس سوسائٹی کا حصہ ہوں، مجھے بھی اپنا کردار ادا کرنا ہے، اگر میری ضرورت انہیں پہلے پڑ گئی ہے تو میں ضرور جاؤں گی۔'' آزادے نے کہا۔ ''میں بھی اپنے انداز میں افغانوں سے ان کی زبان میں گفتگو کروں گی اور بتاؤں گی کہ وہاں کی خواتین اور مرد اپنی زندگی کو بہتر کیسے بنا سکتے ہیں اور بچوں کو کس طرح مختلف انداز میں سوچنے اور ذہنی تناؤ کو دور کرنے کے بارے میں سکھایا جاسکتا ہے۔''

''آزادے اور کامی دوسرے ہی دن بڑی عجلت میں افغانستان کے لیے روانہ ہوگئے تھے، پھر جیسے ہی وہ کابل پہنچے تھے تو گیسٹ ہاؤس میں امریکن آرمی کی طرف سے آنے والا دعوت نامہ ان کا منتظر تھا جو بگرام ایئر فیلڈ سے بھیجا گیا تھا جو افغانستان میں سب سے بڑا آرمی کا بیس تھا اور کابل کے شمال میں چالیس میل کے فاصلے پر پروان صوبے میں واقع تھا اس کے علاوہ دوسرا دعوت نامہ کابل کے جنوب میں واقع ریش خور یو ایس آرمی بیس سے آیا ہوا تھا جو رش خور بالمیں واقع تھا وہ علاقہ ویران اور پہاڑی تھا جہاں فوجیوں کو تربیت دی جاتی تھی۔

''اوہ..... میں وہاں ضرور جاؤں گی۔'' آزادے نے اپنے کمرے میں پہنچ کر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا، کامی حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''ابھی تو ہم آئے ہیں اور کسی سے ملے بھی نہیں، بس نیلوفر سے باہر بات ہوئی ہے۔'' کامی نے کہا۔

''کوئی بات نہیں کامی..... ہمیں اپنی حفاظت کرنے والی فوج کا مورال بڑھانا ہے وہ چاہتے ہیں کہ میں انہیں افغان لڑکی اور ایسے ہی دوسرے ملی نغمے سناؤں اور ان کی خواہش ہے کہ میں ان کی طرف سے بڑے کھانے میں شرکت کروں، جس میں فوجیوں کے لیے وہ ایک اچھا پروگرام پیش کرنا چاہتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے یہ ان کی پاسنگ آؤٹ پریڈ کی تقریب ہے اور شاید کل ہے؟'' کامی نے پوچھا۔

''ہاں کامی آزادے بیڈ سے اٹھی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھول گئی کامی حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا وہ اتنی خوش تھی کہ سب کچھ بھول گئی۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں آزادے تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔'' کامی نے اس کے ماتھے سے بالوں کی لٹ ہٹاتے ہوئے کہا۔

''مجھے تم سے یہی امید تھی..... میں نے ان فضاؤں میں بموں کی وہ گھن گرج بھی سنی تھی کامی جسے سن کر مائیں خوف سے بچوں کو سینوں سے لگا لیتی تھیں جب لوگ خوف کی وجہ سے گھروں سے نہیں نکل سکتے تھے۔ مجھے وہ رات یاد ہے جس کی صبح کو ہمیں کابل سے روانہ ہونا تھا، تب بھی بمباری ہو رہی تھی اور میری نانی اور ماں بچوں کو اپنے جسم سے چمٹائے صبح ہوئے کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔'' آزادے نے سسکتے ہوئے کہا تو کامی نے اسے بانہوں میں لے کر دلاسہ دینے والے انداز میں خود سے چمٹا لیا۔

''مجھے یقین ہے وقت ضرور بدلے گا جب کسی قوم کے

www.pakistanipoint.com
waqarazeem

دوسرے افراد کے ساتھ ساتھ اس کی بیٹیاں بھی اس کی حفاظت کے لیے کمربستہ ہوجائیں تو اس ملک کو آزادی سے کوئی سانس روک سکتا ایک نہ ایک دن یہاں کے لوگوں کو بھی اپنے خوابوں کی تعبیر ملے گی۔"

"مجھے اسی دن کا انتظار ہے کامی..... میں چاہتی ہوں اس دن کی کامیابی میں میرا بھی حصہ ہو۔"

"ایسا ہی ہوگا آزادے۔"

دوسری روز کئی فوجی گاڑیاں گیسٹ ہاؤس کے گیٹ کے قریب آ کھڑی ہوئی تھیں اور آزادے کے سیل فون کی بیل بجی تھی۔

"ہیلو میڈم..... میں کیپٹن جان بول رہا ہوں آپ کے لیے وہیکل آ گئی ہیں آپ پانچ منٹ میں باہر آ جایئے ہم منتظر ہیں۔"

"او کے۔" آزادے نے کہا اور فون بند کردیا، تیار تو وہ پہلے ہی ہوچکی تھی، اس نے آئینے میں اپنے سراپے پر ایک تنقیدی نظر ڈالی، اس نے آج کی تقریب کے لیے ایک زیتونی کلر کی اونی فوجی اسٹائل کی جیکٹ پہنی تھی، جس میں گولڈ کے بٹن لگے تھے، اس کے ساتھ اسی رنگ کی پتلون اور کالے لونگ شوز تھے اور ایک اسکارف سر پر موجود تھا، اس نے لپ اسٹک درست کی اور تیار بیگ اٹھا کر کامی کو الوداع کہتی ہوئی گیسٹ ہاؤس کے اندرونی گیٹ سے باہر آ گئی جہاں دو امریکی فوجی گرے کیموفلیک یونیفارم میں اپنی مشین گنوں کے ساتھ موجود تھے اور ایک تیسرا فوجی ایک فوجی ایک آرمرڈ ہیوی وہیکل کے دروازے کے قریب کھڑا تھا، جس نے اسے دیکھتے ہی دروازہ کھول دیا تھا۔ گاڑی میں پہلے سے ITV کا ایک ملازم وکی اور سیکورٹی گارڈ موجود تھا۔ ان کے ساتھ آزادے بھی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ گاڑی فوراً ہی روانہ ہوگئی تھی اور اس میں لگا وائرلیس ریڈیو تھوڑی تھوڑی دیر بعد راستے کی سیکورٹی کی خبریں دے رہا تھا، جنہیں گاڑی کا ڈرائیور ریسیو کر رہا تھا۔

راستے میں آنے والی گاڑیوں، گھوڑوں، گدھے گاڑیوں، چھکڑوں اور کاروں سے بچتے بچاتے ان کی گاڑی تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی، کچھ ہی دیر بعد وہ رش خور کے آرمی ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے تھے۔

"یہ علاقہ کچھ عرصہ پہلے تو روسی پیرائیویرس کا بیس تھا۔"

ڈرائیور نے آزادے کو بتایا اور احاطے کے گیٹ میں داخل ہوگیا۔ جیسے ہی آزادے کی گاڑی رکی تھی ایک فوجی آگے بڑھا تھا اور بڑے اسمارٹ انداز میں گاڑی کا دروازہ کھول کر سہارے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا رہا تھا اور آزادے اپنی سیٹ سے اتر کر باہر آ گئی تھی۔ اس نے فوجی کے ہاتھ کا سہارا نہیں لیا تھا۔ ہر طرف تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور وہاں موجود زیادہ لوگ گرے کلر ہی کے مختلف یونیفارم پہنے ہوئے تھے پھر جب آزادے کو پنڈال کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو سب کی نظریں اس پر لگی ہوئی تھیں پھر ایک لائن میں کھڑے مختلف آفیسر سے اس کا تعارف کروایا گیا تھا، اس میں کیپٹن، میجر، کرنل سب شامل تھے۔ آزادے نے مسکراتے ہوئے سب سے مصافحہ کیا تھا۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" وہ ہر ایک سے کہہ رہی تھی اور دل ہی دل میں ان کے نام یاد رکھنے کی کوشش کر رہی تھی، اس کے بعد افغانی فوجیوں کی لائن تھی، جن سے آزادے فارسی میں بات کر رہی تھی، کچھ ہی دیر میں آزادی، وکی اور ITV کے سیکورٹی گارڈ کو ایک بڑے ہال میں پہنچا دیا گیا تھا۔ جہاں دوپہر کے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا اور انہیں ہیڈ ٹیبل تک رہنمائی کی گئی تھی۔

جہاں جرنلز اور فوجیوں نے خاموشی سے اپنی اپنی جگہ سنبھال لی تھی، پھر مہمان خاص کے طور پر آزادے بوفے اسٹائل فوڈ کاؤنٹر تک گئی تھی اور اپنی لیے خاص افغانی ڈش چاول، افغانی کباب اور تازہ روٹیاں پسند کی تھیں، اس کے علاوہ اپنی ڈش میں پیزہ اور فرائی چکن بھی ڈالی تھی اور واپس اپنی جگہ پر آ گئی تھی۔ کھانا بہت لذیذ تھا، لیکن آزادے نے بہت کم کھایا تھا، کیونکہ اسے تھوڑی ہی دیر میں اپنی مشہور اور پسندیدہ قومی نغمے پیش کرنا تھی جس کے لیے خوب صورت اسٹیج بنایا گیا تھا اور اس مصد کے لیے اسے ایک میوزیکل بینڈ بھی فراہم کیا گیا تھا جسے اس کے ان گیتوں کی ریہرسل کروائی گئی تھی، پھر لنچ کے بعد جب آزادے چائے پی رہی تھی تو ایک جنرل اسٹیج پر آیا تھا اور اس نے اعلان کیا تھا۔

"میں آپ سب سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنی مہمان آزادے کو خوش آمدید کہیں جو افغان ITV کے مقبول "آزادے شو" کی میزبان ہیں۔ یہ آپ کو اپنا مشہور نغمہ "دختر افغان" سنائیں گی۔ انہوں نے ایک سال پہلے

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

شخص سے پوچھا۔
''ہاں اس کا بھائی بھی ہے وہ تو بہت چھوٹا ہے، پانچ سال کا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔
''ان کا کوئی سرپرست ہے؟'' آزادے نے درمیان میں مداخلت کی۔
''پتہ نہیں جی، صبح یہ دونوں بچے یہاں موجود ہوتے ہیں جب میں دکان کھولتا ہوں وہ سامنے میری دکان ہے۔'' اس شخص نے سڑک کے پار ایک چائے کی دکان کی طرف اشارہ کیا۔
''میں ہی انہیں روز چائے پاپا پاڈبل روٹی دیتا ہوں، ناشتے کے لیے لیکن ان کے ساتھ کبھی کسی کو نہیں دیکھا۔''
''اچھا، ایسا کرو اس کے دوسرے بھائی کو لاؤ کدھر ہے؟'' آزادے نے کہا اور اس شخص نے قریب ہی سڑک کے کنارے کی طرف اشارہ کیا، جہاں ایک پانچ سالہ بچہ کھڑا رو رہا تھا، آزادے نے گارڈ سے اسے بھی لانے کے لیے کہا۔
''انہیں گاڑی میں بٹھالو۔ میں دیکھتی ہوں ان کے لیے کیا کرسکتی ہوں انہیں یوں بے سہارا چھوڑنا ٹھیک نہیں ہے۔'' آزادے نے کہا۔
''یہ کونسی جگہ ہے؟'' گارڈ نے اس شخص سے پوچھا۔
''آزادی چوک۔''
''ٹھیک ہے..... تم لوگ جاؤ..... ہم پھر آئیں گے۔'' گارڈ نے اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
گیسٹ ہاؤس میں پہنچنے کے بعد آزادے نے نیلوفر کو بلایا تھا اور بچوں کو اس کی حوالے کردیا تھا۔
''نیلوفر ان کے لیے یہاں کسی کمرے کا انتظام کردو ان کا خرچ میں دوں گی، مجھ سے نہیں ہوسکا کہ انہیں بے یارو مددگار سڑک پر چھوڑ دوں۔''
''جی ٹھیک ہے میں ہاشمی صاحب سے بات کروں گی کمرہ مل جائے گا۔'' نیلوفر نے کہا اور آزادے بچوں کو ہال مین چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی جہاں کامی اس کا منتظر تھا۔
''بہت دیر ہوگئی آزادے، میں پریشان ہو رہا تھا۔'' کامی نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''تم نے مجھے فون بھی نہیں کیا اور میرا فون ریسیور بھی نہیں کیا۔'' اس کے لہجے مین شکایت تھی۔
''اوہ..... میں نے دیکھا ہی نہیں، کیا تم نے کال کی تھی؟''
''ہاں..... کئی بار۔'' کامی نے جواب دیا۔
''اوہ..... سوری میں وہاں اتنی مصروف تھی کہ فون کی طرف دھیان ہی نہیں گیا، ویسے پروگرام کے دوران تو فون بند کردیئے جاتے تھے۔''
فریش ہونے کے بعد آزادے کافی دیر تک کامران سے باتیں کرتی رہی تھی، وہ دونوں اب بھی ان لوگوں کے بارے میں سوچ رہے تھے، جنہوں نے کامران کو عراق میں اغوا کیا تھا، لیکن سمجھنے سے قاصر تھے کہ وہ کون لوگ تھے اور ان سے کیا چاہتے تھے، شاید انہیں قسمت سے رہائی جلدی مل گئی تھی اور ایسا موقع ہی نہیں آیا تھا کہ ان کی دوسری ملاقات ان لوگوں سے ہوسکے ورنہ ضرور کچھ نہ کچھ بھید کھل جاتا، لیکن ایک مسلسل الجھن تھی جو آزادے کو تنگ کر رہی تھی۔
''حیرت ہے کامی کہ تم جانتے ہو کہ وہ لوگ کون تھے جنہوں نے تمہیں اغوا کیا اور نہ میں جانتی ہوں۔''
''ہاں، اور چونکہ ہم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، چنانچہ ان سے بچنے کے لیے بھی کچھ نہیں کرسکتے۔'' کامی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
''اگر دشمن کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہی تو اس سے بچنے کے لیے کوئی ترکیب اختیار کی جاسکتی ہے یا سمجھوتہ کیا جاسکتا ہے لیکن ایسی صورت حال میں تو کچھ ممکن نہیں۔'' آزادے نے جواب دیا۔
''اچھا ان باتوں کو جانی دو۔'' کامران نے آزادے کی پریشانی محسوس کرتے ہوئے اس کا دریان بٹایا اور اس کے نزدیک آبیٹھا۔
''یہ بتاؤ کہ اب کیا پروگرام ہے؟''
''اب مجھے دو بچوں کو ایڈجسٹ کرنا ہے۔'' آزادے نے کہا اور پیار بھری نظروں سے کامران کو دیکھنے لگی۔
''لیکن اس کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔''
''کون سے بچے؟ اور ان سے میرا کیا تعلق؟''
''میں جب آج واپس آرہی تھی تو راستے مین مجھے دو

بجے ملے وہ رات کے اس پہر آزاد چوک میں بھیک مانگ رہی تھے، بہت کم عمر ہیں میں انہیں ساتھ لے آئی ہوں اور نیلوفر کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ یہاں ان کی رہائش کا انتظام کر دے گی، لیکن میں چاہتی ہوں کہ مستقبل میں انہیں اپنے ساتھ ہی رکھوں۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟ بھلا یہ کیسے ممکن ہے..... تم یہاں اکیلی ہو تمہیں اپنے شوز کی ریکارڈنگ کروانا ہوتی ہے اور اس سلسلے میں مختلف جگہوں پر بھی جانا ہوتا ہے، تم بھلا ان کی دیکھ بھال کیسے کر سکو گی؟"

"اسی لیے تو تمہاری اجازت چاہتی ہوں۔" آزادے نے کامی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"یعنی؟"

"یعنی وہ ہماری شادی کے بعد بھی ہمارے ساتھ رہیں گے ہمارے بچوں کی طرح۔" آزادے نے کہا۔

"یہ آسان نہیں ہوگا آزادے، ضرور ان کے سرپرست ہوں گے جو جلد ہی انہیں حاصل کرنا چاہیں گے ایک نیا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔"

"نہیں ہوگا..... مجھ سے چھوٹے بچے کا رونا نہیں دیکھا جا رہا وہ صرف پانچ سال کا ہے بہت معصوم ہے، ابھی تو اسے ماں کی کیئر چاہیے بھلا کون سرپرست ہوگا جو اتنی چھوٹے بچوں سے بھیک منگواتا ہوگا؟"

"کچھ بھی ہو آزادے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا کہیں بعد میں پریشانیاں پیش نہ آئیں۔"

"کچھ نہیں ہوگا میں اس سلسلے میں ضروری کارروائی کر لوں گی تم صبح ان سے مل تو لو۔" آزادے نے پیار سے ضد کی ٹھیک ہے اب یہ بتاؤ کہ اپنے دوسرے میوزیکل سیشن کے لیے تمہارا کیا پروگرام ہے اب کون سے موضوعات پر کام کرنے کا ارادہ ہے ویسے تمہارا پہلا سیزن تو I.TV والوں کے ساتھ بہت اچھا رہا۔

"ہاں، صبح میں I.TV کے اس سیزن کی نئی ٹیم سے بھی ملوں گی اور پروگراموں کے مضوعات بھی منتخب کروں گی میرا ارادہ ہے اب بچوں کے موضوعات سے ذرا ہٹ کر شادیوں میں ہونے والے بے جا اخراجات، گھروں میں رہنے والی عورتوں پر ظلم کرنی کے بجائے ان کے بارے میں قسمت اندازِ فکر کی ترجمانی کرنا اور افغان عورتوں میں جرات

آپ دنیا کے کسی بھی خطے میں مقیم ہوں

نئے افق

ہم بروقت ہر ماہ آپ کی دہلیز پر فراہم کرینگے

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے ہر کونے میں 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے

6000 روپے

مڈل ایسٹ، ایشیائی، افریقہ، یورپ کے لیے

5000 روپے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر، منی گرام، ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہیں۔ مقامی افراد

ایزی پیسہ اکاؤنٹ نمبر
0316-0128216

موبی کیش اکاؤنٹ نمبر
0300-8264242

رابطہ: طاہر احمد قریشی 0300-8264242

نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز

81 نیپیئر بیرکس، ہائی کلب آف پاکستان
اسٹیڈیم روڈ آنچل پریس کراچی 75510

فون نمبرز: +922-35620771/2

naeyufaq.com

Info@naeyufaq.com

و بہادری پیدا کرنا تا کہ وہ اپنے خلاف بھڑکنے والی آگ کا مقابلہ کرسکیں، زبردستی کی شادیوں کو روکنا جو نا خوشگوار ازدواجی زندگی کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔"

"اس بار موضوعات زیادہ چیلنگ ہیں۔" کامی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں، منسٹری آف ویمنز افیئرز کے مطابق مارچ 1959 سے 1910ء تک 103 عورتیں ایسے حالات کا شکار ہوئیں اور انہوں نے خود کو آگ لگا کر خودکشی کری۔"

"کیا اس پر پروگرام کرنے کی اجازت مل جائے گی؟" کامی نے غیر یقینی سے پوچھا۔

"ملنا تو چاہیے، جب میرا پروگرام یہاں کے بچوں اور عورتوں میں ان کے حقوق کی آزادی کا احساس پیدا کرنا ہے تا کہ وہ تعلیم کی طرف راغب ہوں اپنے بہتر مستقبل کے لیے جدوجہد کرسکیں تو پھر ایسے موضوعات پر پابندی ہی نہیں ہونا چاہیے، میں کل کی میٹنگ میں اس سلسلے پر بھی بات کروں گی۔"

دوسری صبح آزادے نے ناشتے کی میز پر بچوں سے ملاقات کی تھی نیلوفر ان کے ساتھ تھی۔

"میں نے سیمان ہاشمی سے بات کی تھی انہوں نے فوراً ہی بچوں کے لیے کمرے کا انتظام کروادیا تھا۔ لیکن یہ رات بھر سوئے نہیں، میں بار بار ان کے کمرے میں جاتی رہی ہوں۔" نیلوفر نے بتایا تو آزادے نے پیار سے بچوں کی طرف دیکھا۔

"کیوں..... کیا بات ہے؟ آپ کیوں رو رہے تھے؟" اس نے بڑے بچے سے پوچھا۔

"ہمیں ڈر لگتا ہے۔" بچے نے جواب دیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"گل احمد خان۔" بچے نے جواب دیا۔

"اور تمہارے بھائی کا؟" آزادے نے چھوٹے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اپنا سینڈوچ کھا رہا تھا۔

"اس کا دل شاد احمد خان۔"

"اچھا گل خان یہ بتاؤ تمہیں کس بات کا ڈر ہے؟"

"وہ انکل ہمیں پھر لے جائے گا۔ وہ بہت مارتا ہے۔"

"کون انکل؟ کیوں مارتا ہے؟"

"وہ ہم سے سارے پیسے چھین لیتا ہے جو لوگ ہمیں دیتے ہیں اور مارتا ہے کہ پیسے زیادہ لایا کرو۔"

"وہ کہاں رہتا ہے؟"

"پتہ نہیں..... وہ رات کو آتا ہے کالی چادر اوڑھ کر اور پیسے لے جاتا ہے۔"

"اور تم؟..... تم لوگ رات کو کہاں سوتے ہو؟" آزادے نے پوچھا۔

"ادھر چوک پر ہی کسی دکان کے آگے سو جاتے ہیں۔" گل خان نے بتایا۔

"تمہارا گھر؟"

"نہیں..... ایک بم پھٹا تھا ہمارا گھر ٹوٹ دیا، دوسرے گھر بھی ٹوٹ گئے تھے، میرے ابو امی گھر میں دب کر مر گئے ہم دونوں باہر کھیل رہے تھے ہم بچ گئے، پھر ہم نے اپنے امی ابو کو بہت ڈھونڈا وہ نہیں ملے..... وہاں سے ایک انکل ہمیں ساتھ لے گیا۔"

"کہاں لے گیا؟" آزادے نے پوچھا کامی اس کے برابر بیٹھا غور سے بچے کی باتیں سن رہا تھا۔

"وہ ایک چھوٹا سا گھر تھا وہاں اس نے ہم دونوں بھائیوں کو دو دن رکھا..... ادھر اور بھی بچے تھے وہ ہمیں بھیک مانگنا سکھاتا تھا، پھر وہ ہمیں چوک پر چھوڑ گیا۔"

"اوہ، میرے خدا۔" آزادے نے دکھ سے کہا اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور وہ سوالیہ نظروں سے کامی کی طرف دیکھ رہی تھی، پیسے پوچھ رہی ہو کیا میں انہیں گود لے لوں؟ کامی نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا تھا اور آزادے کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"اب تم پریشان مت ہو..... تم یہیں میرے ساتھ رہو گے..... پڑھو گے..... میں تمہیں اسکول میں داخل کروادوں گی۔" آزادے نی کہا اور پیار سے دلشاد کے سر پر ہاتھ پھیرا جو بڑے انہماک سے ناشتہ کر رہا تھا، پھر اس نے نیلوفر کو ہدایت کی تھی کہ ان بچوں کے بارے میں میں پولیس اسٹیشن سے رابطہ کرے اور تحقیقات کروائی جائے۔

"ویسے میں یتیم خانے کے مالک میر واعظ عزیزی سے بھی رابطہ کروں گی وہ ضرور اس سلسلے میں میری مدد کریں گے اور جو بھی ضروری ہوئی وہ کارروائی بھی کریں گے۔" آزادے نے کہا۔ "فی الحال دو تین روز تم ان کا خیال رکھا گی؟"

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

''جی ہاں ضرور..... مجھے خوشی ہوگی اگر ان بچوں کے کام آسکوں۔'' نیلوفر نے جواب دیا۔

''اور میں؟ میرا کیا ہوگا؟'' کامی نے مزاحیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال کون رکھے گا؟''

''اس کے لیے میں کافی ہوں اور بہت اچھی طرح تمہارا رخ رکھ سکتی ہوں۔'' آزادے نے بھی اسی کے انداز میں ہنستے ہوئے جواب دیا تھا۔

''میں میٹنگ سے واپس آکر ان دونوں کو شاپنگ کے لیے لے جاؤں گی ان کے لیے کچھ کپڑے اور کتابیں خرید لوں گی۔'' آزادے نے کامی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم میرے ساتھ چلو گے۔''

''جی ضرور۔'' کامی نے ہنستے ہوئے سعادت مندانہ انداز میں کہا۔

کچھ دیر بچوں کے ساتھ گزارنے کے بعد آزادے I.TV کی میٹنگ اٹینڈ کرنے چلی گئی تھی جہاں نیا اسٹاف اس کا منتظر تھا۔

''تمہارے نئے سیزن کے پروڈیوسر اکرم شیخ ہوں گے۔'' سبحان ہاشمی نے اس کا تعارف ایک ادھیڑ عمر شخص سے کروایا جو نفیس قسم کا سوٹ زیب تن کیے تھا۔

''انہیں ایسے پروگرام کرنے کا بہت تجربہ ہے اور انہوں نے بہت سے ٹی وی چینلز کے لیے کام کیا ہے۔ ہم نے اپنی دوسرے سیزن کے لیے ان کے خدمات حاصل کی ہیں۔

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی محترم۔'' آزادے نے نرم لہجے میں کہا اور اسی وقت کمرے میں ڈیوڈ داخل ہوا۔

''اوہ مسٹر ڈیوڈ آپ؟'' آزادے نے حیرت سے کہا۔

''ہاں آزادے میں نے مسٹر ڈیوڈ سے درخواست کی کہ وہی تمہارے پروگرام کو پہلے کی طرح ڈائریکٹ کرلیں، چنانچہ اس بار بھی تمہارے ڈائریکٹر یہی ہیں۔'' ہاشمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بہت خوشی ہوئی مسٹر ڈیوڈ۔'' آزادے نے کہا تو ڈیوڈ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''مجھے بھی بہت خوشی ہوئی ہے آزادے، تمہارا پہلا سیزن کرنے کے بعد میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ تم میں بہت ٹیلنٹ ہے اور تم اپنے وطن کیلیے بہت کچھ کرنا چاہتی ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''بہت شکریہ مسٹر ڈیوڈ۔'' آزادے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''پھر ہاشمی نے ساری ٹیم سے ایک ایک کرکے آزادے کا تعارف کروایا تھا اور میٹنگ کا آغاز ہوگیا تھا۔ آزادے نے پروڈکشن ٹیم کو اپنے نئے موضوعات کے بارے میں بتانا شروع کیا تھا۔ اس بار بھی پہلے کی طرح ڈاکٹر محمد زمان رجبی ہمارے نفسیاتی ایکسپرٹ ہوں گے جو شادی شدہ جوڑوں میں جھگڑے کے بعد پیدا ہونے والے ڈپریشن، غصے اور ان کے بچوں میں احساس محرومی کے بارے میں بتائیں گے۔'' آزادے نے کہا۔

''میری کوشش ہوگی کہ اس بار بھی باہر جاکر کچھ ایسے لوگوں کے انٹرویوز لوں، ان کے حالات زندگی ریکارڈ کروں اور اس پروگرام میں پہلے وہ ویڈیو چلائی جائے اور پھر اس پروڈکشن ہو آخر میں ہم پیش آنے والے مسائل کا حل دیں گے اور پر پروگرام کے بعد ہماری کوشش ہوگی کہ اس پروگرام کے سامعین و حاضرین کے تاثرات جمع کریں اور ان کی خواہش کے مطابق اگلے پروگرام کا موضوع منتخب کیا جائے، اس طرح لوگوں کی دلچسپی پروگرام سے زیادہ بڑھے گی جب ان کی پسند کا موضوع چنا جائے گا۔'' آزادے نے کہا اس کی اس بات پر سب نی ہی اثبات میں سر ہلایا تھا۔

میٹنگ سے فارغ ہونے کے بعد آزادے کامران، نیلوفر اور بچوں کے ساتھ I.TV کی گاڑی میں بازار گئی تھی تاکہ بچوں کے لیے ضروری شاپنگ کرسکے، شاپنگ سینٹر میں جاکر بچے بہت خوش ہوئے تھے اور ان کو ان کی پسند کی چیزیں دلواتے ہوئے آزادے نے خیال رکھا تھا کہ ان کی پسند ہی کی چیزیں دلوائی جائیں، کتابوں کے ساتھ اس نے دو بیگ بھی لیے تھے پھر دوپہر کا لنچ انہوں نے شاپنگ سینٹر کے ریسٹورینٹ ہی میں کیا تھا۔

''تم کیا کھاؤ گے گل خان۔'' آزادے نے بڑے ٹرے بچے سے پوچھا، جب کہ کامی نے دلشاد کو اپنے برابر والی کرسی پر بٹھایا ہوا تھا۔

''میں کولڈ ڈرنک لوں گا۔'' گل خان نے کہا۔

''اور کھانے میں؟'' آزادے نے پوچھا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

''بریانی۔'' گل خان نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا، پھر آزادے نے سب کے لیے یہی منگوالیا تھا۔ دلشاد بھی مزے لے لے کر بریانی کھا رہا تھا اور کامی اس کی مدد کر رہا تھا۔

''آج ان بچوں کے ساتھ کھانا کانے میں واقعی بہت لطف آرہا ہے۔'' کامی نے کہا۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو۔

''دوسروں کے لیے جینا اور دوسروں کی خوشیوں کا خیال رکھنا ہی اصل زندگی ہے۔'' کامی کے لہجے میں انجانی خوشی تھی۔ ''یہ میرا پہلا تجربہ ہے، میں سوچ رہا تھا کہ تم ان بچوں کو کیسے سنبھالو گی لیکن صرف آج کی مصروفیت سے مجھے اندازہ ہوا کہ جیسے ہم واقعی زندہ ہوں کسی کے لیے کچھ کرنے کا احساس بھی کتنا خوش کن ہوتا ہے۔'' کامی بولتا جا رہا تھا اور آزادے اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''اگر تمہارا ساتھ حاصل رہا کامی تو میں شاید اس سے زیادہ کرسکوں۔'' آزادے نے پرامید لہجے میں کہا۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''کامی میں واپسی پر یتیم خانے اور افغان بینک کے مالک میر واعظ عزیزی سے ملنا چاہتی ہوں اور ان بچوں کے سلسلے میں ان سے بات کرنا چاہتی ہوں وہ ضرور میری مدد کریں گے تاکہ ان کی سرپرستی مجھے مل سکے۔'' آزادے نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں چلنے کے لیے تیار ہوں، لیکن تمہیں اپنے پروگرام کی تیاری کیل یے بھی جانا ہے۔'' کامی نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں، لیکن وہ تو مجھے رات آٹھ بجے جانا ہے ابھی وقت ہے ہم دو گھنٹے میں واپس گیسٹ ہاؤس پہنچ جائیں گے۔''

''پھر ٹھیک ہے۔'' کامی نے رضامندی دے دی اور شاپنگ سے واپسی پر وہ لوگ ''مراسطون'' چلے گئے، جہاں میر واعظ عزیزی اپنے دفتر میں ان کے منتظر تھے کیونکہ آزادے نے انہیں فون پر اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ انہوں نے بڑھ کر بڑے تپاک سے کامی سے ہاتھ ملایا تھا۔

''میں میر اسطون میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔'' میر واعظ نے کہا۔

''یہ میرے منگیتر ہیں اور میری طرح میوزیکل پروگرام کرتے ہیں۔'' آزادے نے کامی کا تعارف کرایا۔

''بہت خوب، تشریف رکھیں، یہ جان کر اور بھی خوشی ہوتی ہوئی کہ آپ کے مستقبل کے ہم سفر ہیں۔''

''بہت شکریہ عزیزی۔'' آزادے نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آج میں آپ کے پاس بہت ضروری کام سے آئی ہوں جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں بچوں اور عورتوں میں خاص دلچسپی رکھتی ہوں خاص طور سے ان بچوں اور عورتوں میں جو کسی ظلم کا شکار ہو رہے ہوں یا جن کے حقوق ان سے چھینے جا رہے ہوں۔''

''میں جانتا ہوں، خود ہمارے یتیم خانے کے لیے بھی آپ کی بہت خدمات ہیں۔'' عزیزی نے کہا۔

''میں یہاں اپنی خدمات یاد دلانے نہیں آئی بلکہ مزید آپ کی مدد مانگنے آئی ہوں۔''

''بتایئے میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں۔''

''دو بچے ہیں جنہیں میں گود لینا چاہتی ہوں۔''

''کون سے دو بچے؟ آپ بتائیں میں ابھی انتظام کروا دیتا ہوں۔ عزیزی نے فوراً کہا۔

''دراصل آپ ان بچوں کو نہیں جانتے وہ مجھے ایک سڑک سے ملے ہیں دونوں بھائی ہیں، گل احمد اور دلشاد احمد، ان کی عمریں نو اور پانچ سال ہیں ان کا دنیا میں کوئی نہیں ان کے والدین ایک بم بلاسٹ میں مارے گئے اور ایک اغوا کار نے انہیں اکیلا دیکھ کر اغوا کرلیا، پھر دونوں کو بھیک مانگنے پر لگا دیا۔ وہ سڑک پر ہی سوتے تھے، یہ مجھ سے نہیں دیکھا گیا اور میں انہیں ساتھ لے آئی۔''

مجھ سے کس قسم کی مدد چاہیے؟'' عزیزی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''میں ان بچوں کی قانونی سرپرستی کرنا چاہتی ہوں اس کے لیے کیا کرنا ہوگا آپ اس میں میری مدد کریں۔''

''بچے کہاں ہیں؟''

''وہ میری گاڑی میں ہیں۔''

''آپ کے منگیتر مسٹر کامران کو تو کوئی اعتراض نہیں ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ کچھ عرصے بعد جب شادی ہو جائے تو یہ بچوں کو اپنے ساتھ رکھنا نہ چاہیں اس طرح بچوں پر ظلم ہوگا۔''

''نہیں ایسا نہیں ہوگا، میں نے سوچ سمجھ کر ان کو

www.pakistanipoint.com

اجازت دی ہے۔"

"آپ گیسٹ ہاؤس میں رہتی ہیں شاید۔" عزیزی نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" لیکن بس کچھ عرصے کی بات ہے جب میرا میوزیکل پروگرام I.TV پر ختم ہوگا تو میں ان بچوں کو اپنے ساتھ کینیڈا لے جاؤں گی۔" آزادے نے جواب دیا۔

"آپ کے اس جذبے کی میں تعریف کرتا ہوں، میں اس کام میں آپ کی مکمل مدد کروں گا اور ضروری قانونی کارروائی مکمل کرکے آپ کو سرپرست بنادیا جائے گا اس کے لیے ضروری ہوگا کہ آپ اور کامران صاحب دونوں ان کے سرپرست والدین کی حیثیت سے کاغذات پر دستخط کریں گے۔"

"ہم تیار ہیں۔"

"ٹھیک ہے، پھر میری طرف سے آپ کے لیے ایک خوشخبری بھی ہے۔" عزیزی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا؟" آزادے نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ یہ کہ آپ کی خدمات کے سلسلے میں میں نے آپ کو ایک تحفہ دینے کا فیصلہ کیا ہے یہ تحفہ آپ کی شادی کا تحفہ بھی ہو گا۔"

"کیا مطلب؟ ابھی تو ہماری شادی نہیں ہوئی؟" آزادے نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ان شاء اللہ ہوجائے گی۔ یہ تحفہ واحد تحفہ ہوگا جو آپ کی شادی کا ہے، لیکن آپ کو شادی سے پہلے ملے گا۔"

"ایسا بھی کیا تحفہ ہے عزیزی صاحب؟" کامران نے پوچھا۔

"میں آپ کو آپ کی شادی کی خوشی میں ایک گھر تحفے میں دیتا ہوں۔"

"کیا؟ ایک گھر؟" آزادے نے حیرت اور خوشی سے کہا۔

"جی ہاں، آپ اس گھر میں کامران اور ان بچوں کے ساتھ خوشگوار زندگی گزاریں گی ویسی ہی زندگی جیسی آپ افغان بچوں اور عورتوں کی دیکھنا چاہتی ہیں، مثالی زندگی جس میں خوشیاں ہوں اور انہیں ان کے جائز حقوق ملیں ان پر ظلم نہ ہوں۔"

"اوہ عزیزی صاحب، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ مجھ پر اتنے مہربان ہوں گے۔"

"آپ پر نہیں آزادے، آپ کے اس کام پر جو آپ اس ملک کے لیے کررہی ہیں۔"

"میں ایسا کیا خاص کر رہی ہوں جناب، بس اپنی حیثیت بھر حصہ ڈالا ہے۔"

"آج کل کے ہنگامی حالات میں اور خاص طور سے انتہا پسند گروپوں کی موجودگی میں اس طرح کا کام ایک عورت کے لیے کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور اس کے لیے خطرات کے دروازے کھول دیتا ہے۔

"میں آپ کی بہادری کی داد دیتا ہوں اور میری داد یہ تحفہ ہے۔" عزیزی نے کہا۔

"میں اس تحفے کے لیے آپ کا بے حد مشکور ہوں جناب۔" کامران نی کہا۔

"گھر کی چابیاں آپ کو دو ہفتے بعد مل جائیں گی، مکان جو آپ کو دینے والا ہوں اس میں کچھ ڈیکوریشن کا کام باقی ہے پھر چابیاں ایڈریس کے ساتھ آپ کو بھجوادوں گا۔"

"بہت شکریہ عزیزی صاحب۔" آزادے نی کہا۔

"ان بچوں کی میں تصاویر لینا چاہتا ہوں اور ان سے کچھ باتیں بھی کروں گا، اجازت ہے؟" عزیزی نے پوچھا تو آزادے نے اثبات میں سر ہلایا جس کے بعد عزیزی نے آزادے کی گاڑی سے بچوں کو اپنے آفس میں بلوایا تھا، ان کی تصاویر بنوائی تھیں اور کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد ایک فارم بھر کر کامران اور آزادے سے اس پر دستخط کروالیے تھے۔

"ٹھیک ہے اب میں چلتی ہوں یقیناً آپ یہ کارروائی جلد مکمل کرلیں گے۔" آزادے نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ کام میں پہلی فرصت میں کروں گا؟"

"اچھا اب اجازت دیں۔" آزادے نے کہا اور کامران اور بچوں کے ساتھ دروازے کی طرف مڑ گئی۔

پھر دو ہفتہ تک آزادے اپنے پروگرام کی ریکارڈنگز میں مصروف رہی تھی جب اس کا شو آن ایئر ہوا تھا تو اسے کافی پسند کیا گیا تھا، آزادے اس پروگرام مین عورتوں کی طلاق کی مسائل بھی اٹھانا چاہتی تھی، کیونکہ بہت سی عورتوں سے اس کی میٹنگز ہوئی تھیں جن کے مسائل طلاق سے متعلق تھے، ان مسائل کی نزاکت آزادے سمجھ سکتی تھی۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

''ماں باپ کے درمیان ہونے والے لڑائی جھگڑے اور علیحدگی بچوں پر بہت برے اثرات ڈالتے ہیں۔'' آزادے نے اپنی پروڈیوسر اکرام سے کہا۔ ''اس طرح کے جھگڑوں سے فیملی ختم ہوجاتی ہے۔''

''میں اس بار یہی موضوع رکھنا چاہتی ہوں اور ڈاکٹر محمد فرمان رجبی سے درخواست کروں گی کہ وہ بھی ایسے جوڑوں کو کوئی اچھے مشورے دیں۔'' ازادے نی کہا تو اکرام شاہ نے اسے اجازت دے دی اور جب اس سلسلے میں وہ خواتین سے ملی تو انہوں نے اسے سراہا اور درخواست کی کہ وہ اس موضوع کو ضرور زیر بحث لائے۔

شو کے پروڈیوسر نے اس شو کو کچھ آرگنائزایشنز سے متعارف کروایا تھا، جن میں افغان منسٹری آف ومنز افیئرز اور یونائیٹڈ نیشنز ڈویلپمنٹ فنڈ فار وومن نے اس سلسلے میں بہت سی رپورٹس جمع کی تھیں جنہیں وائلینس اگنیسٹ وومن کے ڈیٹا بیس سے حاصل کیا گیا تھا۔ اس نے ان پروگراموں کے کرنی کے دوران شدت سے محسوس کیا تھا کہ عورتوں کے ساتھ اس ظلم میں ملک کی انتہا پسند تنظیموں کا بھی ہاتھ ہے جو عورت کو کم تر سمجھتیں اور ان کو ان کے حقوق نہیں دیتیں۔ انہوں نے تعلیمی نظام کو تباہ کردیا ہے، لڑکیوں کو اسکولوں سے دور کردیا ہے۔ ایسے میں اس نے اپنے پروگرام ہی کو عورتوں میں شعور جگانے کا ذریعہ بنایا۔

''تم جو کر رہی ہو وہ بہت خطرناک ہے آزادے۔'' ایک موقع پر نیلوفر نے اسے سمجھایا۔ ''تم اگر ان کو اتین کے حقوق میں پروگرام کروگی تو تم پر کافر ہونے کا فتویٰ لگادیا جائے گا۔

''مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں، میں اپنے اللہ کے آگے جوابدہ ہوں عورتوں کے حقوق کی تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بات کی ہے، انہوں نے کہا کہ تعلیم ہر مرد اور عورت پر یکساں فرض ہے، علم حاصل کرو چاہے چین بھی جانا پڑے۔

اپنے اس پروگرام کے بعد جب آزادے اسٹوڈیو سے باہر نکلی تو اس نے مائیک نیلوفر کی ہوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بہت مایوسی ہوئی ہے جو لوگ اس موضوع کی حمایت کررہے تھے پروگرام میں انہوں نے بولنے سے بھی انکار کردیا۔''

پروگرام نشر ہونے کے دوسرے دن پروڈیوسر نے اسے بتایا کہ I.TV کو دھمکی آمیز گمنام کالیں آرہی ہیں اور I.Tv اسٹیشن کو بم سے اڑانے کی دھمکیاں دی جارہی ہیں، پہلے بھی انہیں دھمکیاں ملتی رہی تھیں، لیکن انہیں نظر انداز کردیا گیا تھا مگر اس بار انتظامیہ خوفزدہ تھی جس پر آزادے برہم تھی۔

''پھر اب آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟'' اس نے اپنے پروڈیوسرز سے پوچھا۔

''میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' نیلوفر نے کہا۔ ''ویسے ان دھمکیوں سے میں بھی خوفزدہ ہوں اور یوں خوف کے ماحول میں کام کرنا ممکن نہیں، اب پروگرام کیسے کرنا ہے، اس کا فیصلہ انتظامیہ کی طرف سے آنے والے سرکولر کو دیکھ کر ہی کیا جائے گا۔''

اگلے روز I.TV کے ایک ایڈمنسٹریٹر کا ردار کی جانب سے ایک سرکلر جاری کیا گیا تھا۔

''چاہے افغان سوسائٹی کے کتنے ہی اہم مسائل کیوں نہ ہوں، لیکن جب تک ان معاملات پر انتظامیہ کی رائے نہیں لے لی جائے گی ان کو موضوع نہیں بنایا جائے گا، خاص طور سے ''طلاق'' کے معاملات پر بات نہیں ہوگی۔ یہ بہت حساس موضوع ہے اور ہمارے معاشرے میں اس پر آزادانہ بات نہیں ہوسکتی۔''

پھر یہ موضوع آزادے کے لیے بھی ممنوع ہوگیا تھا، اس کے بعد اس کے کئی پروگراموں کے موضوعات کو سینسر کیا گیا تا، اسے کامکرنی کی اتنی زیادہ آزادی نہیں رہی تھی اب اسے بھی دھمکی آمیز کالیں اور ای میل آنے لگی تھیں، جن سے وہ بھی خاص حد تک ڈر گئی تھی۔

اس واقعے کے ایک ماہ بعد اس کے سیل فون پر کال آئی۔

''السلام علیکم! آزادے نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا دوسری طرف سے اسے I.Tv ایڈمنسٹریٹر کی آواز سنائی دی۔

''اوہ کاردار آپ ہیں؟ کہیے کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا پھر وہ خاموش ہوکر دوسری طرف کی بات سنتی رہی تھی۔

''امریکن جھانی؟ وہ میرا انٹرویو لینا چاہتے ہیں؟ یہاں اسٹوڈیو میں؟'' اس نے پوچھا اور پھر کچھ سننے لگی۔

www.paksociety.com

"اچھا اسٹوڈیو میں نہیں؟ چلیں ٹھیک ہے میں آج انٹرویو دے سکتی ہوں کیونکہ آج میری چھٹی ہے، انٹرویو کس وقت ہوگا؟ کیا آپ وہاں ہوں گے؟ اوکے..... آپ ڈرائیور بھیج رہیں؟ ٹھیک ہے، میں انتظار کروں گی۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

جب سے آزاد نے وائٹ ہاؤس میں پرفامنس دکھائی تھی اور اس کے بعد "طلاق" کے موضوع پر پروگرام کرنے تک اس کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا لیکن اسے تعریفوں کے ساتھ ساتھ لوگوں کی مخالفت کا بھی سامنا تھا اگر اس کے چاہنے والے ہزاروں تھے تو ناپسند کرنے والے سینکڑوں میں تو ضرور تھے اس کی ہمت بندھانے والوں کے ساتھ ساتھ اسے دھمکیاں دینے والے بھی کارفرما تھے اس سب کے باوجود بین الاقوامی میڈیا اس میں دلچسپی رکھتا تھا اس نے ABC نیٹ ورک کے "Good morning amenic" کے پروگرام میں شرکت کی تھی CNN کے پروگرام بھی کیے تھے؟ انڈیا اور چائنیز ٹی وی کے پروگرام ہی کیے تھے BBC، CBC اس کے بعد پرنٹ پبلی کیشنز جیتے Cardion Publications نے بھی اس پر کہانیاں لکھی تھیں اور اسے "Opreal of Afghamistam" کا نام دیا تھا خود افغانستان میں ITV اور Tolo TV کے درمیان ایک سرد جنگ سی چھڑ گئی تھی اور وہ دونوں آزادی کو صرف اپنے TV کے لیے حاصل کرنا چاہتے تھے Tolo TV والوں نے اسے اپنے مقبول ترین پروگرام Afghan "Star" پر پروگرام کی دعوت دی تھی مجھ Ameri Canldo کے طرز پر تھا۔

آزادے امریکی صحافیوں سے انٹرویو کے لیے بڑے اہتمام میں تیار ہوئی تھی اس نے پتلون کے اوپر بلاؤز اور اونچی ہیل کی سینڈل پہنی تھی اور گلے میں موتیوں کی لمبی مالا ڈالی تھی کاردار نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا انٹرویو کیمرے کے ساتھ ہوگا یا صرف سوالات ہی پوچھے جائیں گے لیکن اس نے اپنے طور پر ایسی تیاری کی تھی کہ اگر کیمرے کے سامنے بھی جانا پڑے تو کوئی فرق نہ پڑے اس نے تیاری کے بعد حجاب پہنا تھا اور پھر اسے یاد آیا تھا کہ وہ اپنے سن گلاسز ITV کے ڈریسنگ روم میں بھول آئی ہے وہ عجلت میں ITV کے ڈریسنگ روم گئی تھی جہاں وہ میٹ سے ملی تھی جس کے ساتھ وہ کچھ دن پہلے یوس آرمی بیس رش خور گئی تھی۔

"آج تم اپنی چھٹی کے دن اتنی عجلت میں کہاں جا رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کابل میں کسی جگہ کاردار نے کچھ صحافیوں کے ساتھ میرا انٹرویو ارینج کیا ہے۔" آزادے نے کہا۔

"وہ لوگ یہاں کیوں نہیں آ گئے۔" میٹ نے پوچھا۔

"میں نے بھی یہ بات پوچھی تھی پتا نہیں وہ لوگ یہاں کیوں نہیں آئے۔"

"مت جاؤ۔" میٹ نے کہا۔

"کیا مطلب؟" آزادے نے میٹ کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بس..... مجھے عجیب سا لگ رہا ہے..... تم یہاں کے آرٹسٹ ہو اور وہ تمہارا انٹرویو لینا چاہتے ہیں جبکہ کاردار بھی یہاں کا ایڈمنسٹریٹر ہے تو انٹرویو بھی یہاں ہو سکتا ہے۔"

"ہاں..... لیکن امریکہ کے صحافی ہیں..... میں انٹرویو دینا چاہتی ہوں یہ بین الاقوامی شہرت کا سوال ہے۔" آزادے نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لیکن صحافیوں کو اس جگہ تمہاری فلم بنانا چاہئے تھی جہاں تم جاب کرتی ہو..... پرفارم کرتی ہو اور انہیں تو کچھ سوالات تمہارے اسٹاف سے ہی کرنا چاہئے تھے..... مجھے ان کا یہ انداز پسند نہیں آیا۔"

"لیکن یہ تو کاردار نے طے کیا ہے۔" آزادے نے کہا۔

"اسی وجہ سے تو مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔" میٹ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "میں نے اس کے بارے میں کچھ اچھا نہیں سنا ہے۔"

"تم تو پاگل ہو وہ ایسا نہیں۔" آزادے نے کہا اور میٹ کا جواب سنے بغیر سن گلاسز اٹھا کر کمرے سے نکل گئی گیسٹ ہاؤس پہنچنے کے بعد وہ کافی دیر تک کاردار کے ڈرائیور کا انتظار کرتی رہی تھی کچھ دیر بعد ایک قیمتی چمچماتی گاڑی گیسٹ ہاؤس کے گیٹ میں داخل ہوئی تھی جسے گارڈز

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

نے اندر آنے کی اجازت دی تھی کمپاؤنڈ میں آنے کے بعد گاڑی رکی تھی اور ڈرائیور باہر آیا تھا اور آزادے کو سلام کیا تھا جو وہیں کھڑی تھی ڈرائیور کو تنہا دیکھ کر آزاد حیران تھی۔

''گارڈز کہاں ہیں؟'' اس نے پوچھا تو ڈرائیور نے گاڑی کی طرف اشارہ کر کے اثبات میں سر ہلایا گاڑی میں ایک گارڈ بیٹھا تھا۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں۔'' ڈرائیور نے آزادے کو یقین دلانے والے انداز میں کہا اور آگے بڑھ کر پیسنجر ڈور کھول دیا پھر اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا اور آزادے کے اندر بیٹھتے ہی گاڑی کا بھاری دروازہ بند کر دیا تھا گارڈ اگلے حصے میں بیٹھا تھا اور اس کی گن اس کی گود میں رکھی تھی۔

آزادے نے گاڑی میں بیٹھتے ہی اپنے سن گلاسز آنکھوں پر لگا لیے تھے اور اپنا حجاب اپنے چہرے پر نیچے تک کھینچ لیا تھا حالانکہ گاڑی کے شیشے گہرے کلر کے تھے وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اسے دیکھ کر پہچان سکے اور خاص طور سے وہ انتہا پسند گروپ جو آج کل اسے بڑی دھمکیاں دے رہا تھا وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی ڈرائیور ٹریفک کے ہجوم میں بڑی مہارت سے راستہ بناتا کابل کے مہنگے ترین علاقے کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں مشہور اور امیر ترین لوگ رہتے تھے جن میں موجودہ سول وار کے ذمہ دار، تاجر اور سیاست دان بھی تھے۔

سفر کے اختتام پر اس کی گاڑی ایک عالیشان عمارت کے بڑے سے گیٹ میں داخل ہوئی تھی جسے گارڈز نے کھولا تھا جن کے ہاتھوں میں مشین گنیں تھیں پھر گاڑی عمارت کے اندرونی گیٹ پر رک گئی تھی ڈرائیور باہر آیا تھا اور آزادے کے اترنے کے لیے دروازہ کھولا تھا آزادے گاڑی سے باہر آئی تھی لباس کی شکنیں درست کی تھیں اور ڈرائیور کے ساتھ عمارت کے اندرونی گیٹ میں داخل ہوگئی تھی اندر اسے ٹھنڈک کا احساس ہوا تھا سنگ مرمر کا فرش اور اونچی سی خوب صورتی ہوئی چھت سے عمارت کی شان ظاہر ہو رہی تھی چند قدم جا کر ایک زینے کے قریب وہ دونوں رک گئے تھے یہ زینہ عمارت کے نچلے حصے میں جا رہا تھا آزادے نے حیرت سے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''نیچے۔''

''یہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں لیکن انٹرویو کرنے والے صحافی کہاں ہیں؟'' آزادے نے پوچھا لیکن ڈرائیور نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا یا شاید اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا وہ پیچھے ہٹ گیا تھا اور آزادے کو نیچے جانے کا راستہ دے دیا تھا آزادے سیڑھیاں اترتی نیچے جانے لگی تھی اور اس نے اپنا دھوپ کا چشمہ اتار دیا تھا اس کے پیچھے زینے کا دروازہ بند ہو گیا تھا زینے سے ہوتی ہوئی وہ ایک ہال سے داخل ہوئی تھی جہاں ایک کونے میں خوب صورت بار موجود تھا جہاں رنگ برنگی لائٹیں چمک رہی تھیں دو کونوں میں سیکورٹی کیمرے لگے ہوئے تھے آزادے کو یہ کمرہ دیکھ کر احساس ہوا جیسے وہ خفیہ کمرہ کوئی نائٹ کلب ہو وہ حیران تھی کہ یہ کس شخصیت کا گھر ہو سکتا ہے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کاردار اتنے مہنگی اور آسائش سے پر گھر کا مالک ہو سکتا ہے بار میں سامنے کی اسٹول پر کوئی شخص بیٹھا تھا جس کے سامنے ایک شراب کا گلاس رکھا تھا آزادے دھڑکتے دل سے آگے بڑھی اور اس شخص کو پہچان کر حیران رہ گئی۔

''اوہ، کاردار..... میں تو تمہیں پہچانی ہی نہیں۔ سلام وعلیکم۔'' اس نے کہا۔ ''تم کیسے ہو؟''

''ٹھیک ہوں۔''

''صحافی کہاں ہیں۔'' اس نے دوسرا سوال کیا۔

''اوہ، وہ بھی بس آ ہی رہے ہوں گے..... آؤ تب تک میرے پاس بیٹھو..... تم کیا لوگی؟''

''نہیں، شکریہ۔'' آزادے نے کہا اس کے لہجے میں ناراضگی تھی وہ سمجھ نہیں سکی تھی کہ کاردار نے انٹرویو کے لیے اسے وہاں کیوں بلایا تھا اور انٹرویو کرنے والے موجود نہیں تھے اور وہ اسے اپنے ساتھ شراب پینے کی دعوت دے رہا تھا اس کا یہ انداز آزادے کو بالکل پروفیشنل نہیں لگا۔

''آؤ یہاں میرے ساتھ بیٹھو۔'' کاردار نے اپنے سامنے رکھی کرسی کو تھپتھپاتے ہوئے کہا اور آزادے بغیر کچھ کہے آگے بڑھی اس نے خاموشی سے اپنا سفید کلر کا شولڈر بیگ کاؤنٹر پر رکھا اور دوسری کرسی گھسیٹ کر کاردار کے سامنے بیٹھ گئی۔

''میں جانتا ہوں کہ تم کامیابی حاصل کرنے کے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

لیے کتنی محنت کر رہی ہو۔'' کاردار نے کہا۔

''ایکسکیوز می۔'' آزادے نے ناگواری سے کہا اسے کاردار کا خود سے یوں ہمدردی جتانا اچھا نہیں لگا تھا۔

''تم بہت خوب صورت ہو یہی وجہ ہے کہ تمہارا شو تنا پسند کیا جاتا ہے اور تمہیں اس کا بھی احساس نہیں ہوتا کہ تمہاری خاطر کتنے لوگ اپنے دل ہار چکے ہیں۔'' کاردار نے ڈھٹائی سے کہا تب آزادے کو احساس ہوا کہ کاردار نشے میں تھا نہ جانے وہ کب سے پی رہا تھا اس نے پہلے کبھی آزادے سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔

''تمہارے بارے میں لوگ عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔'' کاردار نے اسے دھمکانے والے انداز میں کہا۔

''لوگوں کا کام تو باتیں کرنا ہی ہے وہ تو ہمیشہ ہی باتیں کرتے ہیں۔'' آزادے نے لاپرواہی سے کہا۔ ''اور ان کی یہ بات ہی غلط ہوتی ہے۔''

''لیکن ان سب باتوں میں سے ایک بات تمہارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔'' کاردار نے اسے طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے ساتھ ہر وقت جو وہ کافی رہتا ہے نا وہ تمہاری بدنامی کا سبب ہے لوگ اس کے اور تمہارے بارے میں باتیں کرتے ہیں اور اگر عام پبلک کو تمہارے اس راز کے بارے میں پتہ چل جائے تو کوئی بھی تمہارا شو پسند نہیں کرے گا شو بند ہو جائے گا اور تم افغانستان میں دوبارہ کام نہیں کر سکو گی۔'' کاردار نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا اور پھر آزادے غصے سے کھڑی ہو گئی اس کا چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ ہو گیا تھا۔

''میں جا رہی ہوں..... تم نے مجھے اس لیے بلایا تھا؟ میں یہاں اپنی بے عزتی کروانے نہیں آئی تھی نہ ہی مجھے تمہارا یہ دھمکیاں دینا پسند آیا ہے۔'' اس نے غصے سے کہا اس کے ساتھ ہی کاردار بھی کھڑا ہو گیا تھا اور تیزی سے آزاد کی طرف بڑھا تھا آزادے اسے طیش میں دیکھ کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی تھی کاردار کے ہاتھ میں پکڑا جام چھلک گیا تھا۔

''میں تمہیں ان الزامات سے بچا سکتا ہوں۔'' اس نے آزادے کے جسم پر چبھتی نظریں ڈالتے ہوئے کہا اور آزادے کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے گلے سے پکڑ لیا ہو۔

''میں جا رہی ہوں۔'' اس نے کاردار سے بچتے ہوئے کہا جو مسلسل اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور وہ پیچھے ہٹتی جا رہی تھی۔

''تمہاری پرورش تو مغرب میں ہوئی ہے تم وہاں کی پروان چڑھی ماڈرن لڑکی ہو..... بولو..... بول..... تمہاری کیا قیمت ہے؟'' کاردار نے جذبات سے کانپتی آواز میں کہا۔

''کیا؟ میں کوئی بکاؤ مال نہیں ہوں۔'' وہ چیخی۔

''تم..... تم..... تم ناقابل برداشت ہو۔''

''آزادے نے کاردار کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا جو اس کے سر پر پہنچ گیا تھا اور اسے پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا آزادے نے جلدی سے کاؤنٹر پر رکھا اپنا بیگ اٹھایا اور اس عرصے میں کاردار نے اس کے بال اپنی گرفت میں لے لیے اور اسے اپنی طرف کھینچا پھر اس نے اپنا چہرہ آزادے کی گردن سے لگا دیا تھا اور اسے چومنے لگا تھا آزادے چیخ رہی تھی۔

''یہ کمرہ ساؤنڈ پروف ہے۔'' کاردار نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''تم خوامخواہ محنت کر رہی ہو کوئی فائدہ نہیں۔'' کاردار نے کہا اور اسے پکڑ کر اپنی طرف موڑ لیا اور اپنے سیدھے ہاتھ سے اس کی شرٹ کھینچنے لگا آزادے کے گلے پر پڑا ہوا موتیوں کا ہار ٹوٹ گیا اور اس کے موتی فرش پر بکھر گئے آزادے تیزی سے تائی کون کی حاصل کی ہوئی ٹرک کاردار پر آزمانے لگی وہ اس پر تیزی سے مکے برسا رہی تھی جبکہ کاردار نے اس کے بالوں پر گرفت اور مضبوط کر دی تھی اور اسے نیچے جھکانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ایسا مت کرو پلیز، ایسا مت کرو۔'' آزادے چیخ رہی تھی لیکن کاردار نے بال پکڑ کر اسے بے بس کر دیا تھا پھر بھی وہ موقع ملتے ہی وار کر رہی تھی جس سے وہ بھی تکلیف سے کراہ رہا تھا پھر اس نے آزادے کو ایک دیوار کی طرف زور سے اچھال دیا تھا اور پھر چکرا کر فرش پر گری تھی لیکن اس کے بال اب بھی کاردار کی گرفت میں تھے۔

''چھوڑ دو۔'' وہ پھر چیخی لیکن کاردار نے اسے چھوڑنے کے بجائے بالوں کی مدد سے پکڑ کر پھر کھڑا کر لیا۔ پھر وہ اپنا چہرہ اس کے چہرے کے اتنا قریب لے آیا تھا کہ دونوں کی ناکیں ایک دوسرے کو چھو رہی تھیں کاردار کا چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں نشہ چھایا ہوا تھا۔

Reader Area.com
www.pakistanipoint.com

"چپ ہو جاؤ..... آواز بند کرو۔" اس نے آزادے کے چہرے پر زور سے تھپڑ مارتے ہوئے کہا اور آزادے کے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس ہونے لگا اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا دانت ٹوٹ گیا ہو اچانک ایک خیال آزادے کے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا تھا اس کے بیگ میں گن تھی وہی گن جو ایک فوجی نے اسے پاسنگ آؤٹ پریڈ پر دی تھی اسے لگا وہ خود کو بچا سکتی ہے اس خیال سے اس کے جسم میں جیسے توانائی لوٹ آئی یہ اپنے بچاؤ کا اس کے پاس آخری موقع تھا اس نے سوچا اگر اس کے سر کے بال کاردار اکھاڑ بھی دے تو اسے یہ تکلیف برداشت کرنا ہوگی۔ یہ جان بچانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے بال اس کی گرفت سے نکال لے جائے مکا ٹوٹ جائیں کیونکہ اسی صورت میں وہ بیگ سے گن نکال کر اس کو نشانہ بنا سکتی تھی اس نے چاروں طرف اپنے بیگ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں وہ دور ایک میز پر پڑا تھا کاردار نے اس کے بال اور بھی مضبوطی سے پکڑ لیے تھے وہ اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے زور لگا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اس میز کے قریب جانے کی کوشش بھی کر رہی تھی جس پر اس کا بیگ پڑا تھا۔

"مجھے چھوڑ دو....." وہ چیخی کیونکہ کاردار نے پھر اس کے بال مروڑے تھے اسے لگ رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی کی کھال چھیل رہی ہو وہ کافی حد تک بیگ کے قریب پہنچ گئی تھی کاردار کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی پھر اس نے اپنا ایک ہاتھ اس کی گردن کے گرد ڈال رہا تھا جو اس کے منہ کے بہت قریب تھا آزادے نے اس کی کلائی میں زور سے دانت گڑا دیئے تھے۔

"تو کتیا۔" کاردار زور سے چیخا اور آزادے اس کی گرفت سے نکل گئی اس کی گرفت سے نکلتے نکلتے آزادے نے اس کے پیٹ پر ایک زوردار لات ماری تھی اور تیزی سے میز کی طرف بڑھی تھی اور اپنا بیگ اٹھا لیا تھا پھر اس نے بیگ کھول کر اپنا ہاتھ اس میں ڈالا تھا اور جب وہ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں گن تھی جو لوڈ تھی اس نے گن کا رخ کاردار کی طرف کر دیا تھا۔

"میں گولی چلا دوں گی۔" آزادے نے دھمکی دی اس کے ہاتھ میں گن کانپ رہی تھی اور وہ اپنے کاندھے پر بیگ لٹکائے آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھتی جا رہی تھی اور کاردار بھی ایک ایک قدم اس کی طرف بڑھا تھا اس کے نزدیک آنے کی کوشش کر رہا تھا آزادے نے اس پر فائر کر دیا تھا۔

"میرے قریب مت آنا۔" آزادے نے سسکیوں کے درمیان کہا وہ دروازے تک پہنچ چکی تھی پھر اس نے دوسرے ہاتھ سے دروازہ کھول لیا تھا اور پھر تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی اوپر کی طرف بھاگی تھی اور کوشش کر رہی تھی کہ وہ اپنی اونچی ہیل کی وجہ سے گر نہ جائے اس کے بال بکھرے ہوئے تھے شرٹ پھٹ چکی تھی منہ سے خون بہہ رہا تھا پھر وہ اسی طرح بھاگتی ہوئی عمارت سے باہر آ گئی تھی اور اپنی طرف حیرت سے دیکھتے ڈرائیور، مالی اور گارڈ کو پیچھے چھوڑ کر وہ گیٹ کی طرف دوڑ رہی تھی اور گیٹ کیپر سے گیٹ کھولنے کے لیے کہہ رہی تھی اور دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ کاردار مر گیا ہو۔

وہ دوڑتی ہوئی ایک مصروف شاہراہ تک آ گئی تھی جہاں اس نے ایک پیلی اور سفید ٹیکسی کو روکنے کا اشارہ کیا تھا وہ اس سے پہلے کبھی کابل میں کسی ٹیکسی میں نہیں بیٹھی تھی اس نے اپنا پتہ ڈرائیور کو سمجھایا جو اپنے عقبی آئینے میں حیرت سے اس کے حلیے کو دیکھ رہا تھا۔ آزادے کا ہاتھ اس کے بیگ میں تھا جس میں گن تھی اور اسے اس نے یوں پکڑا ہوا تھا جیسے کوئی ڈوبتا ہوا شخص سمندر میں سہارے کے لیے کسی لکڑی کے ٹکڑے کو پکڑ لیتا ہے اب وہ گن خالی تھی باقی گولیاں اس کے بیگ کی تہہ میں پڑی تھیں اور وہ یہ جان کر کانپ رہی تھی کہ اس نے کاردار کو مار دیا ہے۔

اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر سوتی رہی تھی اس کا جسم بری طرح دکھ رہا تھا اسے لگ رہا تھا کہ وہ چل پھر بھی نہیں سکے گی وہ آہستہ آہستہ کھسکتی اپنے بیڈ کے کنارے تک آئی تھی اور اپنی ٹانگیں فرش پر لگائی تھیں اور قریب اس کی کرسی سے اپنا رات کو پہننے والا ڈھیلا سا پاجامہ اتار کر پہنا تھا لیکن اسے بہت مشکل پیش آ رہی تھی اس نے پھٹی ہوئی ٹی شرٹ بھی اتار دی تھی اس کے اونچی ایڑی کے جوتے ڈریسر کے قریب پڑے تھے اسے اپنی زبان پر خون کا ذائقہ محسوس ہو رہا تھا اس نے اپنی زبان مسوڑھوں پر پھیری تھی تاکہ اندازہ لگا سکے کہ کہیں کوئی دانت تو نہیں ٹوٹ گیا اس کے ہونٹوں پر سوجن تھی ڈریسر کے آئینے میں اس نے بیڈ پر

بیٹھے بیٹھے اپنا عکس دیکھا تھا اس کے چہرے کے بائیں حصے میں بہت ورم تھا اور اس کے ہاتھ کی انگلیوں کے کچھ ناخن بھی کئی جگہ سے ٹوٹے ہوئے تھے اس کی گردن بھی اتنی دکھ رہی تھی کہ وہ بہ مشکل اسے دائیں بائیں گھما سکتی تھی اس نے بیڈ کا کنارہ پکڑ کر کھڑے ہونے کی کوشش کی تھی اسے چکر آ گیا تھا اور وہ گرتے گرتے بچی تھی۔

''یا..... نی.....'' نقاہت سے اس کے منہ سے کمزور سی آواز نکلی تھی اسے یاد آیا تھا کہ گلاس باتھ روم میں تھا وہ آہستہ لڑکھڑاتی باتھ روم کی طرف بڑھی تھی جہاں گلاس سنک کے اوپر آئینے کے سامنے بنی شیلف میں رکھا تھا اس نے ڈرتے ڈرتے اپنا چہرہ قریب سے آئینے میں دیکھا تھا جہاں ایک بدشکل اجنبی عورت سرخ آنکھوں، زخمی چہرے اور بکھرے اور ٹوٹے ہوئے بالوں کے ساتھ اسے گھور رہی تھی اچانک کاردار کے حملے کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا تھا اس نے نل کھول کر اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے تھے اس کے ہونٹوں پر جما ہوا سیاہ خون موجود تھا جسے وہ دھونے کی کوشش کر رہی تھی دوسرے ہاتھ سے اس نے اپنا دکھتا ہوا سر سہلایا تھا اس کی کھوپڑی پر بھی سوجن محسوس ہو رہی تھی اور سر کے بال سورج کی تپش سے جلی ہوئی گھاس کی طرح لگ رہے تھے اس نے سیدھے کھڑے ہونے کی کوشش کی تھی لیکن وہ چکرا کر گر گئی تھی۔

اگلی بار جب اسے ہوش آیا تو وہ اپنے بیڈ پر لیٹی تھی اس کے قریب کرسی پر کامران بیٹھا تھا جو اس کے آنکھیں کھولتے ہی اس پر جھک گیا تھا۔

''تمہیں کیا ہوا ہے.....؟ آزادے..... بتاؤ..... میں آیا تو تم باتھ روم میں بے ہوش پڑی تھیں۔ تم تو انٹرویو دینے گئی تھیں؟'' اس نے بے چینی سے یکے بعد دیگرے کئی سوال کر دیئے تھے۔

''پپ..... پانی۔'' آزادے نے آہستہ سے کہا اور کامی نے جلدی سے میز سے گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا لیکن بعد میں غلطی کا احساس ہونے پر اس نے گلاس واپس میز پر رکھ دیا تھا اور سہارا دے کر آزادے کو اٹھایا تھا اور پھر دوسرے ہاتھ سے گلاس اٹھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا تھا اس کے چہرے پر غصے اور تفکر کے تاثرات تھے آزادے نے بہ مشکل آدھا گھونٹ پانی چسکیوں سے پیا تھا اور پھر لیٹ گئی تھی۔

''کیا ہوا ہے؟ مجھے بتاؤ آزادے کیا ہوا ہے.....؟''

کامران نے گلاس واپس میز پر رکھتے ہوئے کہا وہ آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ سہلا رہا تھا۔

''کامی، تم کہاں تھے؟'' آزادے نے پوچھا۔

''میں بہت دیر تک تمہارا انتظار کرتا رہا جب تم نہیں آئیں تو میں نے ITV جا کر پوچھا کہ تم انٹرویو دینے کہاں گئی ہو مجھے میٹ نے بتایا کہ کاردار نے تمہیں اپنی کوٹھی پر بلایا تھا میں نے وہاں کئی بار فون کیا لیکن کسی نے ریسیو نہیں کیا میں بہت پریشان ہو رہا تھا۔''

''کامی..... کاردار جھوٹا ہے..... دھوکے باز ہے.....'' آزادے نے سسکتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا ہے؟ بتاؤ۔''

''اس نے دھوکا دے کر بلایا تھا..... وہاں کوئی صحافی نہیں تھے..... اس نے جال بچھایا ہوا تھا۔''

''اوہ میرے خدا.....؟ پھر.....'' کامی نے تشویش سے پوچھا۔

''وہ اپنے گھر میں تنہا تھا وہاں گھر کی نچلی منزل میں (بیس منٹ) نائٹ کلب بنا ہے اس نے مجھے وہاں بلوایا تھا مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا ہمیں بلڈنگ کے دروازے پر ایک گارڈ ملا تھا اس نے دروازہ کھولا تھا اور پھر کاردار کا ڈرائیور ہی مجھے سیڑھیوں کے ذریعے نچلے حصے میں لے گیا تھا وہ سیڑھیوں سے ہی واپس چلا گیا تھا اور جب میں نیچے ہال میں داخل ہوئی تو وہاں ایک شراب خانہ بنا تھا جہاں کاردار بیٹھا تھا میری چھٹی حس نے خطرہ محسوس کیا اور میں نے اس سے پوچھا کہ صحافی کہاں ہیں جنہیں میرا انٹرویو کرنا ہے تو وہ ہنسنے لگا اور کہنے لگا کہ وہ آنے ہی والے ہیں تب تک میرے ساتھ ایک جام پی لو میں نے اسے منع کیا تو کہنے لگا کہ تم تو ماڈرن لڑکی ہو، کینیڈا میں پلی بڑھی ہو تمہارے لیے تو یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہوگی لیکن میں نے اس کی بات نہیں مانی وہ نشے میں تھا آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔''

''اوہ..... کاش میں وہاں ہوتا تو میں اسے مزہ چکا دیتا۔'' کامی نے غصے سے کہا۔

''لیکن میں نے اپنا بدلا لے لیا ہے..... میں نے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

اسے ماردیا ہے۔" آزادے نے بتایا۔

"تم نے اسے ماردیا.....؟ کیسے.....؟"

"میرے بیگ میں وہ گن تھی جو مجھے امریکی فوج کی تقریب میں گفٹ کی گئی تھی وہ لوڈ تھی جب میری سمجھ میں اپنے بچاؤ کا کوئی طریقہ نہ آیا تو میں نے وہ گن نکال کر اس پر فائر کردیا اور وہاں سے بھاگتی ہوئی نکل گئی پھر سڑک پر آ کر ایک ٹیکسی لی اور یہاں آ گئی رات خاصی گزر چکی تھی میں بیڈ پر گر کر بے ہوش ہوگئی تھی۔"

"اور اس حالت میں تمہیں صبح ہوگئی میں ابھی آیا تو تم باتھ روم میں گری ہوئی تھیں۔" کامی نے کہا پھر وہ اچانک چونکا تھا۔

"تم نے اپنا پہلا میوزیکل سیشن بھی تو کاردار کے ساتھ کیا تھا وہ تمہاری ٹیم کا حصہ تھا تم نے اس کے برتاؤ میں کوئی ایسی بات محسوس نہیں کی تھی جس سے اس کی شخصیت کے اس پہلو کا کچھ اندازہ ہوسکتا؟"

"نہیں اور مجھے حیرت ہے اس نے ہمیشہ بڑی دل جمعی سے کام کیا اس نے خاص طور سے خواتین کے برتاؤ کو پرکھنے کے عمل پر زیادہ کام کیا کہ خواتین کن باتوں سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں اس لیے ہمارے پروگرام کو اتنا پسند کیا جاتا ہے۔"

"لیکن اس کی تمہارے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے کی ہمت کیسے ہوئی؟"

"یہی تو میری بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہے..... لیکن اب میں زیادہ پریشان ہوں کامی..... میں نے اسے ماردیا ہے..... اور بہت جلد یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل جائے گی پھر میں نہیں بچوں گی۔" آزادے نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"تمہیں اس کے ڈرائیور اور گارڈ کے علاوہ کسی نے دیکھا تھا؟" کامی نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"میرا خیال ہے وہ میری شہرت سے جلتا تھا۔" آزادے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میرا پچھلا پروگرام جو عورت کے طلاق کے حقوق پر تھا اسے پسند نہیں آیا تھا اور اس نے پابندی لگادی تھی کہ آئندہ میں اس طرح کے موضوعات پر پروگرام نہیں کروں گی وہ شاید مجھے اپنے لیے خطرہ سمجھتا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اس پروگرام کے منتظمین میں شامل تھا اور میری شہرت اس سے زیادہ تھی وہ یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا چنانچہ اس نے میری عزت سے کھیلنا چاہا تاکہ میری شہرت کو میری بدنامی میں بدل دے۔"

"میرا خیال نہیں کہ یہ بات ہو ممکن ہے وہ نشے میں ہو اور مدہوشی میں ایسی حرکت کی ہو لیکن حرکت کسی بھی صورت معافی کے قابل نہیں ہے اگر وہ زندہ رہتا تو میں اسے اس کے انجام تک پہنچادیتا۔" کامی نے غصے میں کہا۔

"میں اپنا چہرہ دھونے باتھ روم میں گئی تھی۔" آزادے نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا لیکن اب اس کا چہرہ صاف تھا اس نے سوالیہ نظروں سے کامی کی طرف دیکھا۔

"میں جب تمہیں اٹھا کر لایا تو یہاں لٹانے کے بعد میں نے تمہارا چہرہ صاف کردیا تھا اس نے بہت رحمی سے تمہیں مارا ہے۔"

"ہاں، میرے سر کے بال تو اب تک دکھ رہے ہیں۔" آزادے نے کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ میں افغانستان میں خواتین کی بہتری کے لیے جو کام کررہی ہوں اس نے مجھے اس کی سزا دی ہے وہ عورتوں کی آزادی پر یقین نہیں رکھتا تھا۔"

"ممکن ہے ایسا ہی ہو۔" کامی نے کہا۔

"اس وقت کیا ٹائم ہوا ہے۔" آزادے نے چونکنے کے انداز میں پوچھا وہ سوچ رہی تھی کہ اسے جلد از جلد یہاں سے کہیں اور چلا جانا چاہیے تاکہ خود کو محفوظ کرسکے وہ صرف ITV ہی سے چھٹکارا حاصل کرنا نہیں چاہتی تھی بلکہ افغانستان سے بھی چلا جانا چاہتی تھی۔

"کیوں؟ کیا کروں گی؟" کامی نے اس کے بال سنوارتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

"میں چاہتی ہوں جتنی جلد ممکن ہو یہاں سے کہیں اور چلی جاؤں۔"

"لیکن تم ایسا نہیں کرسکتیں..... تم نے ITV کے ساتھ دوسرے سیزن کو پورا کرنے کا معاہدہ کیا ہوا ہے" کامی نے اسے یاد دلایا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

"ہاں، ضرور کیا ہوا ہے لیکن اب وہ مجھ پر پابندیاں لگا رہے ہیں۔" آزادے نے ناگواری سے کہا۔

"میری بات سنو تم پریشان مت ہو ابھی تم نے ناشتہ بھی نہیں کیا ہے ایک منٹ ٹھہرو۔" کامی نے کہا۔

اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا پھر چند لمحے بعد وہ واپس آیا تھا تو اس کے ہاتھ میں اورنج جوس کا ڈبہ تھا۔

"لو یہ پی لو، کچھ بہتر محسوس کرو گی۔" کامی نے کہا اور آزادے نے خاموشی سے جوس کا ڈبہ پکڑ لیا۔

"تمہارا چہرہ..... تمہارے ہاتھ..... یوں لگ رہا ہے جیسے بڑا ایکسیڈنٹ ہوا ہو اور جگہ جگہ نیل بھی پڑے ہیں اس حالت میں سفر؟" کامی بول رہا تھا اور آزادے جوس کی چسکیاں لیتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کامی، وعدہ کرو کسی کو اس حادثے کے بارے میں نہیں بتاؤ گے اگر کوئی بھی پوچھے تو ہم یہی کہیں گے کہ کار کے حادثے میں میں زخمی ہوئی ہوں۔" آزادے نے کہا اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ "میں وعدہ کرتا ہوں۔" کامی نے آہستہ سے کہا اور آزادے نے اس کے کاندھے پر سر ٹکا دیا پھر وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی تھی کامران اسے تسلیاں دے رہا تھا پھر اس نے اٹھ کر ٹی وی آن کر دیا تھا اور اسکرین پر بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔

"ITV کے ایک منتظم کاروار پر قاتلانہ حملہ اس حملے میں وہ بال بال بچ گئے ہیں لیکن شدید زخمی ہیں ان کے کاندھے میں گولی لگی ہے اور وہ مقامی اسپتال میں خاصی نگرانی میں ہیں۔"

"اوہ کامران اب کیا ہوگا؟" آزادے نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ "لیکن انہوں نے خبر میں قاتلانہ حملے کی وجہ اور مجرم کا نام نہیں بتایا ہے۔" آزادے کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ظاہر ہے اگر وہ قاتلانہ حملے کی صحیح وجہ بتائیں گے تو تمہارا نام بھی لینا پڑے گا اور یہ بات ITV چینل کے لیے اچھی نہیں ہوگی اور یہ بات بھی پوشیدہ نہیں رہے گی کہ کاردار نے تمہاری عزت پر حملہ کیا تھا تو تم نے جواب میں....."

"چپ ہو جاؤ کامی..... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" آزادے نے کامی کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ

naeyufaq.com

آنچل کی جانب سے ایک اور آنچل

ماہنامہ حجاب کراچی

محبت، نفرت کی آمیزش سے مزین ناقابل فراموش کہانیاں

عشق دی بازی

خاندانی رسم و رواج کس طرح لڑکیوں کو باغی کرتا ہے ریحانہ آفتاب کے نوک قلم نکلی ایک خوب صورت تحریر

عشق نگر کے مسافر

ایک حادثے نے اسے عشق نگر کا مسافر بنا دیا ندا حسین کی دلکش اور مدتوں یاد رہے جانے والی کہانی

آنگن کی چڑیا

قارئین کے تعارف پر مبنی سلسلہ

عالم میں انتخاب

ہر ماہ ایک شاعر کا انتخاب

اس کے علاوہ

بزم سخن، کچن کارنر، دوست کا پیغام آئے منتخب اشعار، غزلیں، اقتباسات اور دیگر قارئین کی دلچسپی کے مدنظر مستقل سلسلے

Info@naeyufaq.com

(021)35620771/2

0300-8264242

دیا اس کی آنکھوں میں خوف نظر آ رہا تھا۔

"اب میں بھی کہوں گا کہ تم کابل سے چلی جاؤ..... دبئی چلی جاؤ وہاں ایک ہوٹل میں قیام کرنا اور آرام کرنا بعد میں میں بھی تمہارے پاس آ جاؤں گا۔"

"نہیں کامی، میں اکیلی ہی جاؤں گی تم یہاں ٹھہرنا تمہیں گل خان اور اس کے بھائی کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ یتیم خانے کے مالک عزیزی ہمارے گھر کی چابیاں بجھوائیں گے تم بچوں کے ساتھ وہاں شفٹ کر جانا کیونکہ اب بچوں کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور میں انہیں کبھی بھی تنہا نہیں چھوڑوں گی۔"

"میں تمہارے لیے دبئی کی فلائٹ بک کروا دوں گا ویسے بھی تم اپنے زخموں کی وجہ سے ابھی پبلک میں نہیں جا سکتیں، تمہارے چہرے پر بہت سوجن بھی ہے۔"

"ٹھیک ہے، مجھے تم سے یہی امید تھی کہ تم میرا ساتھ دو گے۔" آزادے نے آہستہ سے کہا۔

"میں تمہارے لیے ناشتہ لاتا ہوں اور بچوں کی خیریت بھی پتا کرتا ہوں۔" کامران نے کہا اور پھر کمرے سے نکل گیا۔

آزادے ایک ہفتے تک دبئی کے عالیشان اپارٹمنٹ میں آرام کرتی رہی تھی وہ ٹی وی کے شوز، فلمیں، گانے، سارے ہی پروگرام دیکھتی لیکن اسے ایک پروگرام بھی یاد نہ رہتا وہ غسل کے دوران اپنے زخموں کا جائزہ لیتی جو آہستہ آہستہ منہدم ہو رہے تھے وہ سوچنے کی بہت کوشش کرتی کہ کاردار نے اس پر حملہ کیوں کیا لیکن اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی تھی اس کے اپنے سیل فون پر کاردار کی کئی کالیں بھی آئی تھیں لیکن اس نے کوئی کال ریسیو نہیں کی تھی لیکن وہ پریشان تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کاردار کے جرم کے بارے میں پولیس کو بتائے یا نہ بتائے اس میں اس کی بھی بدنامی تھی اور پھر کوئی افغان شاید ہی اس کی بات پر یقین کرے کیونکہ افغانستان کا کلچر یہی تھا کہ اگر کسی عورت کے ساتھ ظلم بھی ہوتا تھا تو قصوروار عورت ہی کو کہا جاتا تھا اس کے ساتھ بھی یہی ہو سکتا تھا افغانی بھی اس بات پر یقین نہیں کرتے کہ کاردار جیسا بہترین عہدے دار شہرت کا مالک اتنی اوچھی حرکت کر سکتا ہے سب یہی کہتے کہ وہ اس پر الزام لگا رہی ہے اور اس طرح افغانستان میں اس کی شہرت کا بہتر پن دور بھی ختم ہو سکتا تھا پھر کبھی اسے وہاں کام کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ وہ دبئی آ تو گئی تھی لیکن وہ کاردار کی وجہ سے افغانستان کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی اس طرح وہ جس مشن پر کام کر رہی تھی وہ بھی ادھورا رہ جاتا اور جن عورتوں اور بچوں کی وہ اچھے مستقبل کی امید بنی ہوئی تھی وہ ختم ہو جاتی لیکن وہ کاردار کا سامنا بھی کرنا نہیں چاہتی تھی اسے ڈر تھا کہ وہ پھر موقع ملتے ہی اس کی عزت پر حملہ کر سکتا ہے آزادے کو علم تھا کہ کچھ کمپنیوں نے اس کے پروگرام کے لیے اشتہارات بھی دیئے تھے اور سیزن 2 کے پروگرام بند ہونے کی وجہ کاردار کو ان کمپنیوں کو بتانا ہو گی ممکن ہے وہ کہہ دے کہ آزادے کی پرفارمنس بہتر نہیں تھی اس لیے اسے پروگرام سے نکال دیا گیا لیکن اس میں بھی اس کی ہی بدنامی تھی جب وہ اس بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان ہو گئی تو اس نے اپنی والدہ کو فون کرنے کا فیصلہ کیا جو کینیڈا (وینکور) میں موجود تھی۔

"کیا آپ ٹولو چینل کی انتظامیہ کو بتا سکتی ہیں کہ میں نے ان کے پروگرام "افغان اسٹار" میں میزبان پروگرام کی حیثیت سے کام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"تم مذاق کر رہی ہو؟" اس کی والدہ نسرین نے پوچھا۔ "بھلا تم سیزن 2 ختم ہونے سے پہلے ITV کا پروگرام کیوں چھوڑ رہی ہو؟ یہ کوئی عقلمندی نہیں ہے۔"

"میں ITV پر مزید کام نہیں کرنا چاہتی۔" آزادے نے ناگواری سے کہا۔

"لیکن آزادے، تمہیں تو ITV پسند تھا اور وہاں کام کرنے والوں سے تمہاری خاصی دوستی تھی تمہارا شو بھی ٹھیک جا رہا ہے یہ عقل میں آنے والی بات نہیں ہے کہ تم ٹولو ٹی وی کو کیوں جوائن کرنا چاہتی ہو ایک اچھے پروگرام کو چھوڑ کر؟"

"اگر آپ کچھ نہیں کریں گی تو میں خود ہی کچھ کرتی ہوں۔" آزادے نے غصے سے کہا اور غصے سے خون بنا کر دیا اب اسے ITV کے نقصان کی پروہ نہیں تھی اس۔ فوراً ہی Tolo TV کے "افغان اسٹار کے پروگرا ڈائریکٹر مسعود سنجار سے بات کی تھی جو خوشی سے حیران رہ گیا تھا۔

"مجھے تمہارے فیصلے کے بارے میں جان کر خو ہوئی ہے آزادے۔" سینمائی نے کہا۔

Nazar Azeem
www.pakistanipoint.com

''ہاں، مجھے ''افغان اسٹار'' کے ساتھ کام کرنے کی بہت آفرز آرہی تھیں چنانچہ میں نے Tolo TV کو جوائن کرنے کا فیصلہ کرلیا۔'' آزادے نے نارمل آواز میں کہا۔

''ابھی .....؟'' مسعود سینمائی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، کیوں؟'' آزادے نے پوچھا۔

''بھلا تم نے اتنی جلدی کیسے فیصلہ کرلیا؟ کیونکہ ابھی تو تم ITV کا دوسرا سیزن کررہی ہو؟''

''ہاہاہا..... دراصل اس پروگرام میں کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں جو مجھے پسند نہیں۔'' آزادے نے ہنستے ہوئے جواب دیا یہ کیا میرے لیے Tolo Tv پر کام کرنا اچھا رہے گا میں چاہتی ہوں کہ آزادے شو کو ITV سے ہٹا کر Tolo TV پر پیش کروں اور افغان اسٹار کی کو ہوسٹ بن جاؤں جیسا کہ آپ نے آفر کی ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ بہترین خبر ہے اور Tolo تمہارے شو کے لیے بہترین رہے گا تو جیسے ہی تمہارے پاس وقت ہو میرے ساتھ ایک میٹنگ رکھ لو۔''

''ٹھیک ہے۔'' آزادے نے جواب دیا پھر چند روز مزید دبئی میں قیام کرنے کے بعد وہ واپس کابل پہنچ گئی تھی اور Tolo Tv کی ٹیم کے ساتھ میٹنگ رکھ لی تھی اس کے لیے اس نے نسرین سے بھی مدد نہیں لی تھی جبکہ اس سے پہلے نسرین ہی اس کے لیے تمام میٹنگز کے لیے ارینجمنٹ کرتی تھی۔

اب آزادے کا قیام کابل گیسٹ ہاؤس میں نہیں بلکہ ''آزادے ولا'' میں تھا جو عزیزی نے اسے دیا تھا اور اس کی غیر موجودگی میں کامی نے بچوں کے ساتھ وہاں شفٹ کیا تھا اسے وہ ولا بہت پسند آیا تھا عزیزی نے ایک مہربانی اور کی تھی کہ اس ولا کے سارے کمروں کو بڑے سلیقے سے سجوا دیا تھا جن میں بچوں کے دو کمرے دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے ایک ان کی خوابگاہ اور دوسرا ان کا اسٹڈی روم تھا جہاں ان کے کھیل کا سامان بھی رکھا تھا۔

آزادے نے Tolo Tv پر پروگرام کرنے کا معاوضہ TV کے مقابلے میں زیادہ رکھا تھا اور اپنے پروگرام کا ایک خاکہ میٹنگ میں طے کرلیا تھا یہاں بھی اس کا پروگرام وطن اور اس کے عوام سے حب الوطنی کا تھا جس کے لیے اس نے راکٹوں کی زد میں رہ کر پروگرام کرنا قبول کیا تھا جہاں وہ تعلیم، ہنر، ہمت اور بہادری کا سبق سکھا رہی تھی عورتوں کی مدد کرنے کی کوشش کررہی تھی، بچوں، یتیموں اور غریب و مظلوم خاندانوں کی مدد کررہی تھی اب وقت کے ساتھ ساتھ ITV اور کاردار کو چھوڑ کر Tolo TV سے وابستہ ہوگئی تھی اسی طرح بھی وہ کاردار سے انتقام لے رہی تھی لیکن اس طرح اس کے وہ دوست بھی متاثر ہورہے تھے جو اس کے دوست تھے اور ITV میں اس کے ساتھ کام کرتے تھے پھر آزادے نے اپنی والدہ کو فون کرکے بتادیا تھا کہ اس نے Tolo Tv کے پروگرام مارننگ اسٹار کا کانٹریکٹ سائن کردیا ہے۔ نسرین اس کی بات سن کر حیران رہ گئی تھی۔

''آزادے جان، کیا تم اکیلی ہو؟ کیا تمہارے پاس بات کرنے کے لیے وقت ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

وہ اپنے گھر کینیڈا (وینکور) سے بات کررہی تھیں۔

''جی ہاں بالکل وقت ہے۔''

''مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟ تم نے ITV کیوں چھوڑ دیا تمہیں وہاں کام کرنا اچھا لگتا تھا لوگ بھی تمہارا شو پسند کرتی تھے پھر کیا ہوا؟''

''جی آپ ٹھیک کہتی ہیں؟''

''یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔'' نسرین نے کہا لیکن آزادے خاموش تھی۔

''کیا تم سن رہی ہو؟'' نسرین نے دوبارہ پوچھا۔

''ہاں۔''

''مجھے بتاؤ آزادے، کیا تمہیں کوئی پریشانی تھی، کچھ دھمکیاں مل رہی تھیں؟ یا اسٹیشن پر کوئی حملہ ہوگیا تھا؟ یا حکومت نے شو بند کردینے کی دھمکی دی تھی؟'' نسرین نے ایک ساتھ کئی شبے ظاہر کیے تھے۔ ''ایسی کوئی بات نہیں تھی۔'' آزادے نے جواب دیا۔

''تو پھر ایسا کیا ہوا کہ تم نے یہ فیصلہ کیا؟''

''آپ واقعی جاننا چاہتی ہیں؟''

''ہاں میری جان، میں بالکل جاننا چاہتی ہوں، تم جانتی ہو ہمارا مسئلہ دولت جمع کرنا نہیں ہے ہم یہاں کینیڈا میں پرسکون زندگی گزار رہے ہیں میرا اپنا بیوٹی پارلر ہے، تمہارے والد کی بہت اچھی جاب ہے لیکن تم وہاں اپنے

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

شوق سے گئی ہو اپنے ہم وطنوں کی مدد کرنے..... پھر کیا مسئلہ ہوا؟"

"یہ میری ہی غلطی تھی مجھ سے بڑی حماقت ہوگئی۔" آزادے نے کانپتی آواز میں کہا۔

"کیا مطلب؟ تم نے جو کچھ کہا وہ غلطی تھی؟" نسرین نے اپنی آواز کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"I TV کے ایک احمق نے میرے ساتھ دھوکا کیا..... آپ کا ردار کو تو جانتی ہی ہیں اس نے مجھے کال کر کے بتایا تھا کہ کچھ صحافی میرا انٹرویو کرنا چاہتے ہیں جس کا انتظام اس نے اپنے گھر پر کیا تھا اور مجھے پک کرنے کے لیے اپنی گاڑی بھیج دی تھی۔"

"ہاں، میں سن رہی ہوں۔" نسرین نے آزادے کے خاموش ہونے پر کہا۔

"لیکن وہاں کوئی صحافی نہیں تھا۔"

"اوہ....."

"اس نے جھوٹ بولا تھا، میرے لیے جال بچھایا تھا اور اس میں مجھے کھینچ لیا تھا وہ مجھ سے تہہ خانے جیسے کمرے میں ملا تھا مجھے اس پوشیدہ نائٹ کلب روم کا کوئی علم نہیں تھا وہاں شراب خانہ بھی بنا تھا اور ڈانس فلور بھی۔" آزادے نے کہا اس کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں جنہیں نسرین محسوس کر سکتی تھی۔

"آگے بولو..... پھر کیا ہوا؟"

"کاردار نے مجھ پر حملہ کر دیا۔"

"کیا؟"

"اس نے مجھ سے کہا کہ میری کیا قیمت ہے اور کہا کہ کیونکہ میری تربیت مغرب میں ہوئی ہے چنانچہ مجھے ایسی باتوں سے پریشان نہیں ہونا چاہیے اور ماڈرن ہونے کا ثبوت دینا چاہیے۔" آزادے نے کہا اس کے بعد اس نے کاردار کے تشدد کی ساری کہانی نسرین کو بتائی تھی جس کے بعد وہ کانپنے لگی تھی اور سسکیاں لے رہی تھی۔

"کاش وہ میری گولی سے مر گیا ہوتا۔" اس نے سسکتے ہوئے بتایا۔

"اوہ میرے خدا، اب ہم کیا کریں؟ ہم سے بڑی غلطی ہوگئی۔" نسرین نے کہا اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی

"کیا؟ کیا مطلب؟"

"مجھے اور تمہارے والد کو تمہیں افغانستان جانے کی اجازت نہیں دینا چاہتی تھی ہم سے غلطی ہوگئی جب میں چھوٹی تھی تو افغانستان کا ماحول کچھ اور تھا وہ ایک اچھی جگہ تھی محبتیں تھیں، انصاف تھا، عورتوں کی عزت کی جاتی تھی لیکن اب ایسا نہیں ہے، مجھے افسوس ہے یہ ہماری غلطی تھی۔"

"یہ آپ کی غلطی نہیں تھی۔" آزادے نے کہا۔

"نہیں آزادے جان، یہ ہماری غلطی تھی، مرد عورتوں کو اپنی جائیداد سمجھتے ہیں اور تم بھی ان کے لیے عام افغان عورتوں جیسی ہی ہو اور مرد سمجھتے ہیں کہ وہ جو چاہیں وہ عورتوں کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ تم چونکہ مغرب میں رہی ہو یہاں تعلیم حاصل کی ہے تو تمہارے ساتھ ان کا رویہ مختلف ہوگا اس کے علاوہ تم اپنے وطن کے لیے ایک اچھا کام بھی کر رہی ہو تمہارا دنیا میں نام ہے لیکن یہ میری غلطی تھی میں نے تمہیں خطروں میں اکیلا چھوڑ دیا۔" نسرین نے کہا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے آزادے نے فون بند کر دیا تھا وہ مردوں کو اور افغانستان کو برا کہہ رہی تھی جو آزادے کو پسند نہیں تھا اس کے خیال میں سب ایک جیسے نہیں تھے ان میں کچھ اچھے لوگ بھی تھے جو آزادے کی طرح اپنے ملک کو مصیبت سے نکالنا چاہتے تھے۔

اس روز جب آزادے گھر پہنچی تو دروازے پر گارڈز موجود تھے اور گھر میں ایک اجنبی ادھیڑ عمر موجود تھی جنہیں کامران کی درخواست پر عزیزی صاحب نے اپنی ذمہ داری پر وہاں بھیجا تھا وہ چاہتے تھے کہ آزادے دو بچوں کو گود لے کر ایک بھلائی کا کام کر رہی تھی اور وہ اس کی ہر ممکن مدد کرنا چاہتے تھے۔

"حیرت ہے کامی میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ عزیزی صاحب ہمارے لیے ان حالات میں فرشتہ ثابت ہونگے انہوں نے ہمارے لیے توقع سے بڑھ کر کیا ہے۔" آزادے نے گل خان کو پیار سے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔

"کیسے ہو گل خان؟" آزادے نے پیار سے گل خان کے بال درست کرتے ہوئے پوچھا اور وہ مسکرا دیا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

"میں ٹھیک ہوں اور بہت خوش ہوں۔"

"دل شاد کہاں ہے؟" آزادے نے پوچھا۔

"وہ سو رہا ہے۔"

"تم لوگوں نے پڑھنا شروع کیا؟" آزادے نے پوچھا کیونکہ وہ انہیں کتابیں دلوا چکی تھی۔

"جی، انکل کامی ہمیں پڑھاتے ہیں۔"

"ہوں..... خوب۔" آزادے نے کہا اور کامی کی طرف مڑی۔

"کامی، میری بات سنجانی سے ہوئی ہے وہ کہہ رہا تھا کہ میرے شو میں تم بھی میری مدد کرو گے۔"

"کیا واقعی؟" کامران نے کوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، تم مجھے اسسٹ کرو گے بالکل ایسے ہی جیسے ITV میں وکی کیا کرتا تھا لیکن ایک اچھے فنکار ہونے کے ناطے تم پروگرام میں بھی میرے ساتھ پرفارم کرو گے۔"

"ٹھیک ہے۔" کامی نے جواب دیا۔

رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد آزادے نے زرتاشہ کو اپنے کمرے میں بلایا تھا وہ دونوں بچوں کی ضروریات سے فارغ ہو کر اس کے پاس آ گئی تھی۔

"جی میڈم آپ نے بلایا تھا؟" زرتاشہ نے کہا۔

"ہاں بیٹھو۔" آزادے نے سامنے رکھے صوفے کی طرف اشارہ کیا تو زرتاشہ بیٹھ گئی۔

"تم عزیزی صاحب کو کیسے جانتی ہو؟"

"میں کیسے جانتی ہوں میڈم ویسے ہی جیسے ہر غریب اور دکھی انسان ان کو جانتا ہے میں کئی سال سے ان کے یتیم خانے میں ہوں وہاں چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہوں سر میرے کام میں بہت خوش ہیں چنانچہ انہوں نے آپ کی خدمت کرنے مجھے یہاں بھیج دیا ہے۔"

"تم یتیم خانے میں کیوں رہتی ہو؟ کیا تمہارے خاندان میں کوئی نہیں جو تمہاری سرپرستی کر سکتا؟"

آزادے نے پوچھا وہ جان گئی تھی کہ زرتاشہ کے پیچھے بھی ایسی ہی درد بھری داستان ہو گی جیسی کہ ہر کمزور جاہل اور غریب افغان موت کے نصیب میں لکھی تھی۔

"ایک راکٹ کے حملے میں میرا شوہر مارا گیا تھا ہماری ایک ہی بیٹی تھی میں اور وہ دنیا میں اکیلے رہ گئے یہاں اکیلی عورت یا لڑکی کو باہر نکلنے پر پابندی ہے، انتہا پسند گروپ کے لوگ اسے پسند نہیں کرتے اور کم عمر لڑکوں کو بھی زبردستی اٹھا کر لے جاتے ہیں اور اپنے گروہ میں شامل کر کے حکومت کی فوج سے لڑواتے ہیں شوہر کی موت کے بعد گھر کا خرچ چلانے والا کوئی نہیں رہا تھا میں دایا کا کام جانتی تھی چنانچہ جو لوگ مجھے جانتے تھے چوری چھپے ان کے گھروں میں کیس کرنے چلی جاتی تھی لیکن ایسا کام روز نہیں ملتا تھا میرے گھر میں اکثر فاقے ہوتے تھے جن سے تنگ آ کر میں نے محلے کی ایک چائے کی دکان میں بات کی اس کا مالک میرے شوہر کا دوست تھا میں نے اس سے درخواست کی کہ میری بچی کو اپنی دکان میں ملازم رکھ لے وہ برتن دھو دیا کرتے گی اور گاہکوں کو چائے بھی بنا کر دے دے گی وہ شروع میں تو نہیں مانا لیکن پھر بڑی مشکل سے میں نے اسے راضی کر لیا۔"

"پھر کیا ہوا؟" آزادے نے پوچھا۔

"اس نے مجھ سے کہا کہ اگر انتہا پسندوں نے دیکھ لیا کہ ایک دس سالہ بچی میری دکان میں ملازم ہے تو وہ بچی کو اور مجھے مار ڈالیں گے تم اس کے بہروپ لڑکے کا کردو تو میں اسے ملازم رکھ لوں گا۔"

"تو تم نے اسے لڑکا بنا دیا؟"

"ہاں، میں نے اسے لڑکوں والی شلوار قمیض پہنا دی اس کے بال کاٹ دیئے اور ٹوپی پہنا دی۔ لڑکوں والے جوتے لے کر دیئے اور وہ چائے کی دکان پر کام کرنے لگی وہ دکان جاتے ہوئے بہت ڈرتی تھی چھپ چھپ کر جاتی تھی۔" زرتاشہ خاموش ہوئی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"پھر.....؟ پھر کیا ہوا.....؟ تمہیں مناسب خرچ ملنے لگا؟"

"مناسب تو نہیں پر اسے دکا، والا بیس روپے روز دیتا تھا جن سے میں جیسے تیسے گزارا"

"اب تمہاری بیٹی کہاں"

"وہ ماری گئی۔"

"کیا؟ کیسے؟"

"وہ تو چائے کی دکان"

"ہاں لیکن

پسند گروپ کے ایک شخص کو اس پر شک ہو گیا اور وہ اسے پکڑ کر اپنے گروہ کے پاس لے گیا وہاں اسے دوسرے کم عمر لڑکوں کے ساتھ رکھ لیا گیا تھا اور پھر ایک روز اسے خودکش حملے میں استعمال کیا گیا اور وہ اپنی جان ہار گیا۔" زرتاشے اتنی بات کر کے رونے لگی تھی۔

"اوہ خدایا، میں یہی تو کہتی ہوں اگر ہم اپنے حق کے لیے نہیں لڑیں گے تو یوہی ظلم سہتے رہیں گے۔" آزادے نے کہا۔

"میں نے بھی آپ کے کچھ شو دیکھے ہیں لیکن آپ کی باتیں پریوں کے دیس جیسی ہیں، آپ اپنے شو میں مظلوم عورتوں پر شو ہو دے دکھاتی ہیں وہ اداکاری ہوتی ہیں لیکن ہم پہ ظلم جھیلتے ہیں ان کا درد محسوس کر سکتے ہیں لیکن ان کے خلاف کچھ کرنے کی جرات نہیں رکھتے کیونکہ معاشرے میں ہمارے لیے انصاف نہیں ہے۔"

"تم یہاں کیسے پہنچیں؟" آزادے نے سوال کیا۔

"یہاں.....؟"

"میرا مطلب ہے عزیزی کے یتیم خانے میں۔

"اسی چائے کی دکان والے نے مجھے وہاں کا پتہ دیا تھا کیونکہ میرا اکیلے گھر میں رہنا ممکن نہیں تھا اور کمائی کا بھی کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

"ہوں..... اور یوں تم یہاں آئیں۔" آزادے نے کہا۔ "میرے بچوں کی ذمہ داری اٹھالو گی؟"

"ہاں..... بالکل ..... میرا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں ہے میں اپنے بچوں کی طرح ان کی خدمت کروں گی ..... آپ کو شکایت کا کوئی موقع نہیں دوں گی۔" زرتاشے نے اعتماد سے کہا۔

"میں اکثر گھر سے باہر رہتی ہوں یہاں بچوں کے ساتھ کامی ہوتے ہیں وہ میرے منگیتر ہیں اس کے علاوہ گارڈ بھی ہیں لیکن پھر بھی تمہیں ہوشیار رہنے کی ضرورت ہوگی کیونکہ مجھے ناپسند کرنے والے بھی یہاں بہت ہیں میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے بچوں پر کوئی آنچ بھی آئے۔"

"آپ پریشان نہ ہوں میں اپنی جان سے زیادہ ان کی حفاظت کروں گی۔"

"ٹھیک ہے..... اب تم یہاں ہی رہو گی تمہارے لیے ایک کمرے کا انتظام کروا دیا ہے بچوں کے برابر والا کمرہ تمہارا ہے تاکہ تم ان کے نزدیک رہو۔"

"ٹھیک ہے میڈم۔" زرتاشے نے کہا اور وہاں سے اٹھ گئی پھر اس نے آزادے کو شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔

دو روز بعد آزادے کے Tolo Tv کے شوز کی ریکارڈنگ شروع ہو گئی تھی جن میں کامی بھی شریک تھا۔

"آج رات۔" اسٹوڈیو کے ریکارڈنگ ہال میں امید نظامی کی آواز گونجی جو "آزادے شو" کا میزبان تھا۔ "آپ سب ہماری خاص مہمان آزادے کو خوش آمدید کہیں۔"

اس نے ریکارڈنگ میں موجود مہمانوں سے کہا۔ آزادے اسٹیج پر آئی اور ہال تالیوں سے گونجنے لگا آزادے نے نقرئی لباس زیب تن کیا تھا ہاتھوں میں سلور کلر کی چوڑیاں بالوں میں سلور چمک چہرے پر مناسب میک اپ تھا اس نے بالوں کو پونی کی شکل دی ہوئی تھی اس نے جیسے ہی اسٹیج پر قدم رکھا ستارے کی شکل میں بنا اسٹیج گلابی رنگ کی روشنی سے چمک اٹھا اس کے فرش کے نیچے لائٹیں لگی تھیں جو فلور کو چمکا رہی تھیں آزادے کے ساتھ کامی تھا جس نے کالے رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا اور وہ بہت اسمارٹ نظر آ رہا تھا دونوں کی جوڑی خوب سج رہی تھی اس موقع کے لیے آزادے نے ایک نیا گانا تیار کیا تھا جو اس نے پیش کیا جسے سب نے بہت پسند کیا تھا۔

اس پروگرام کے آن ایئر ہونے کے ایک ہفتے بعد آزادے کو ہارپو پروڈکشن کے ایک پروڈیوسر کی کال موصول ہوئی تھی یہ ملٹی میڈیا کمپنی شہورا داکارہ Oprah winfry نے قائم کی تھی پروڈکشن کے پروڈیوسر نے پہلے کینیڈا میں آزادے کی والدہ سے بات کی تھی اور نسرین کو بتایا تھا کہ ایک خاص پروگرام میں اسے Oprah کے سامنے پیش کیا جائے گا یہ شو شکاگو سینٹر امریکہ میں ہونے والا تھا جہاں Daytime Tv پر بہت سے مشہور اداکار شریک ہو رہے تھے پروڈیوسر نے یہ بھی بتایا کہ ان کی نظریں آزادے پر نا صرف مسٹر اوباما کے سامنے پرفارمنس کی وجہ سے پڑی تھیں بلکہ مختلف امریکن ٹی وی چینلز پر اس کے انٹرویوز بھی اس کی وجہ بنے تھے پروڈیوسر نے یہ بھی کہا تھا کہ انہیں خوشی ہے کہ آزادے خود بھی Oprah سے متاثر ہے اور اس کے ہی انداز میں شو کرتی ہے اور اپنے شو کے

Meeat-Kzeem.pakistanipoint.com

ذریعے افغان عورتوں کو ایجوکیٹ کررہی ہے اور وہ اسے Surprise guset کے طور پر بلانا چاہتے ہیں۔

"ٹھیک ہے، میں آزادے سے بات کروں گی لیکن آپ بھی وعدہ کریں کہ اس بارے میں کسی سے بات نہیں کریں گے یہ ایک راز ہوگا۔" نسرین نے اس سے درخواست کی اور اسے آزادے کا فون نمبر دے دیا پھر اس نے رات ہونے کا انتظار کیا تھا اور رات کو آزادے کو افغانستان میں کال کی تھی جہاں اس وقت صبح تھی۔

"کیا ابھی تک Harpo Production کے کسی شخص نے تم سے بات کی ہے؟" نسرین نے آزادے سے پوچھا۔

"نہیں، میں نے ابھی اپنا فون آن کیا ہے میرے پاس کچھ Msg آئے ہوئے ہیں جنہیں میں نے ابھی چیک نہیں کیا ہے..... ویسے ہارپو پروڈکشن سے آپ کی مراد کیا ہے؟" آزادے نے پوچھا۔

"یہ Oprah کی ایک پروڈکشن کا نام ہے وہ ایک شو کررہے ہیں اور اس میں تمہاری شرکت Oprah کے لیے ایک سرپرائز ہوگی۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" آزادے نے بے یقینی سے ہنستے ہوئے کہا۔

"واقعی آزادے، تم Oprah کے لیے ایک سرپرائز ہوگی۔"

"آپ کا مطلب کیا ہے؟"

"وہ تمہیں اس شو میں پیش کرکے Oprah کو حیران کرنا چاہتے ہیں وہ اس شو میں افغانستان میں تمہاری کوششوں کی کہانی بھی سنائیں گے Oprah ابھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔"

اس کال کے بعد آزادے نے ITV کا اسی روز وزٹ کیا تھا وہاں اس کی کچھ چیزیں تھیں وہ لی تھیں اور اپنے کچھ ساتھیوں سے ملی تھی انہیں بتایا تھا کہ ابھی وہ ITV کے پروگرام ریکارڈ نہیں کرواسکے گی کیونکہ کینیڈا (ونیکور) میں اس کا کچھ گھریلو مسئلہ چل رہا ہے جس کے لیے اسے فوراً وہاں جانا ہے لیکن اس کی پرانی پروڈیوسر نیلوفر کچھ بھانپ گئی تھی۔

"تم ہمیں چھوڑ کر جارہی ہو نا؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔ "تم اب واپس نہیں آؤ گی۔" اس کے لہجے میں یقین تھا اور وہ آزادے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ آزادے نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا وہ اس سے جھوٹ بولنا نہیں چاہتی تھی اور جانتی تھی کہ نیلوفر نے بہت سے لوگوں کو ITV سے جاتے ہوئے دیکھا تھا جو افغانستان بھی چھوڑ گئے تھے انہوں نے استعفیٰ دیا تھا اور ان کے لیے ایک الوداعی دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا یہی اس ملک کا نصیب بن گیا تھا لوگ اچانک غائب ہوجاتے تھے جیسے وہ روحیں ہوں یا کسی حادثے میں مرجاتے تھے، چھپ جاتے تھے ہار ینا کے کسی اور حصے میں جابستے تھے۔

"اپنا خیال رکھنا آزادے..... خدا حافظ۔" نیلوفر نے دھیمے لہجے میں کہا جس کے بعد آزادے واپس Tolo Tv چلی گئی تھی۔

اس کے پروگرام جب Tolo Tv پر شروع ہوئے تو کچھ ہی عرصے بعد اسے احساس ہوگیا کہ وہاں بھی اسے اسی صورتحال کا سامنا تھا جو ITV پر تھا اب بھی کچھ لوگ اسے پسند اور کچھ ناپسند کرتے تھے اب بھی اسے دھمکیاں دی جاتی تھیں اب اس کے دل میں پہلے والا اطمینان نہیں تھا ایک خوف نے اسے گھیر لیا تھا اب وہ مخالف ذلت پر اعتماد نہیں کرتی تھی تنہائی میں کسی سے ملنے سے گھبراتی تھی اسے اپنے چاروں طرف خطرہ محسوس ہوتا تھا خودکش حملہ آوروں کا، اغوا کا جسے انتظامیہ نے اسٹیشن کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں کھڑا کرکے حفاظت کا احساس دینا چاہا تھا، لوہے کے کانٹوں والے تار لگائے گئے تھے، سیکورٹی گارڈز کی تعداد بڑھائی گئی تھی گاڑیوں کے شیشے سیاہ کردیئے گئے تھے اور آزادے کے آنے جانے کی اطلاع کو خفیہ رکھا جاتا تھا لیکن اب وہ کسی ساتھ کام کرنے والے پر بھی بھروسہ نہیں کرسکتی تھی اب حفاظت اور تحفظ کا احساس نہیں تھا اب وہ راتوں کو سونے کے بجائے جاگتی رہتی تھی کامی اسے بہت سمجھاتا تھا لیکن وہ مجبور تھی کامی اس کے کمرے کے برابر والے کمرے میں موجود ہوتا تھا پھر بھی وہ اس وقت تک نہیں ہوتی تھی جب تک اپنا کمرہ اندر سے لاک نہ کرلے اور اپنے سرہانے اپنی گن کو لوڈ کرکے نہ رکھ لے جبکہ وہ جانتی تھی کہ گھر کے اندر اور باہر سیکیورٹی گارڈز کا پہرہ ہوتا تھا۔

ایک روز پروگرام کے بعد ایک برقع پوش عورت

www.paksociety.com
www.readistanpoint.com

اس سے ملی۔

"اگر میرے پاس بھی غیر ملکی پاسپورٹ ہوتا تو میں بھی تمہارے جیسے کپڑے پہنتی لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی کیونکہ مجھے یہاں رہنا ہے اور اگر میں نے ایسا کیا تو مجھے مار ڈالا جائے گا میں کینیڈا واپس نہیں جا سکتی مجھے تو یہاں کی سڑکوں پر ہی نکلنا ہے۔"

اس واقعہ کے بعد آزادے نے ایک اور نیا گیت لکھا تھا "افغانستان وطنم، یا "میری قوم میرا گھر" اس میں حب الوطنی کے جذبے کو ابھارا گیا تھا اور یہ نغمہ دیکھتے ہی دیکھتے افغانستان کے طول و عرض میں مقبول ہو گیا تھا اور Tolo Tv سے ایک دن میں کئی بار نشر ہوتا تھا اس کی مقبولیت دیکھ کر آزادے کو خوشی کا احساس ہوا تھا لیکن جب وہ افغانستان کی سڑکوں پر چھوٹے بچوں کو بھیک مانگتے دیکھتی تھی جو ننگے پاؤں پھٹے پرانے کپڑے پہنے، مٹی میں اٹے ہوئے تھے تو وہ خود کو بے طاقت سمجھتی تھی وہ بے بس تھی اس دنیا کو اکیلے بدلنے کی کوشش کر رہی تھی وہ اکثر سوچتی تھی کہ اس نے یہ کیسے سوچ لیا تھا کہ وہ تن تنہا اس دنیا کو بدل دے گی وہ ان کی مدد کر سکے گی۔

Tolo Tv پر "افغان اسٹار" کا آخری پروگرام نشر ہونے کے بعد وہ واپس کینیڈا آ گئی تھی جبکہ کامی افغانستان میں ہیں اس کی رہائش گاہ پر بچوں کے ساتھ موجود تھا اس نے آزادے سے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا اور وہ اس پر قائم تھا اس کو کچھ عرصے آزادے کا انتظار کرنا تھا کیونکہ Tolo Tv پر اپنے اگلے پروگرام کی ریکارڈنگ کا شیڈول ملتے ہی آزادے کو واپس آنا تھا اسے کامی ہی نے سمجھا کہ کینیڈا بھیجا تھا تاکہ کچھ عرصے کے لیے خود کو پرسکون کر سکے اور اپنی بے چینی کیفیت پر قابو پا سکے۔

کینیڈا میں اسے ایک ماہ گزر گیا لیکن وہ خود کو پرسکون نہ کر سکی اس کی والدہ اور والد اسے سمجھاتے رہے لیکن وہ خود کو قصوروار سمجھتی رہی کہ حالات کی سختی سے گھبرا کر وہ افغانستان چھوڑ آئی تھی اور اپنا مشن ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

"لیکن آزادے جان، تم کر بھی کیا سکتی تھیں؟ تمہارے بس میں کچھ نہیں تھا انتہا پسند گروپ تمہارے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا وہ تمہاری وجہ سے Tolo Tv والوں بھی دھمکیاں دے رہے تھے اور تمہاری زندگی کو بھی خطرہ تھا۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں لیکن موت زندگی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے جب آپ مجھے افغانستان سے یہاں لائی تھیں تب میں پانچ سال کی تھی اس وقت بھی تو ہماری زندگی کو خطرہ تھا ساری ساری رات ہم بموں کے دھماکوں کی آوازیں سنتے رہتے تھے لیکن ہم نے انہی حالات میں سفر کیا جو بہت مشکل تھا پھر بھی ہم بچ گئے اور یہاں آنے میں کامیاب ہو گئے۔"

"اس لیے تو ہم تمہیں سمجھا رہے ہیں کہ اب خطرہ مول مت لو، تم بار بار موت سے نہیں بچ سکتیں۔" اس کے والد نے کہا جو قریب بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے۔

"لیکن میں کیا کروں میں زرتاشے کو نہیں بھلا سکتی جس کا شوہر خودکش دھماکے میں مارا گیا اور اکلوتی لڑکی کو بھی تنہا پسند گروپ نے ٹھکانے لگا دیا، میں گل خان اور دلشاد احمد خان کو کیسے بھول سکتی ہوں جن کی پوری فیملی بم بلاسٹ میں ختم ہو گئی اور کچھ ظالموں نے انہیں بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا، میں کامی کو کیسے بھولوں جو مجھ سے محبت کی خاطر اپنا وطن چھوڑ کر افغانستان میں ایک مشکل زندگی گزار رہا ہے اور میرے مقصد میں میرا ساتھ دے رہا ہے۔ میں ان پروجیکٹس کو بھی نہیں بھول سکتی جو میں نے افغانستان میں عام لوگوں کی مدد کے لیے شروع کیے ہوئے ہیں جیسے کہ یتیم بچوں کی بھلائی کے لیے رضا کارانہ کام کرنا، غریب بچوں کے لیے مفت اسکولوں کی تعمیر وغیرہ نہیں..... میں اب پیچھے نہیں ہٹ سکتی میں نے کامی سے وعدہ کیا ہے میں واپس جاؤں گی۔"

پھر تقریباً ایک ماہ ہی گزرا تھا کہ اسے ایک میل موصول ہوئی تھی جو Tolo Tv کے مالک سعد محسن نے کی تھی جس پر "Urgent" کا لفظ لکھا تھا اس نے میل کھولی۔

"تم کہاں ہو؟ کہا جا رہا ہے کہ تم مر چکی ہو۔"

آزادے نے میل پڑھ کر ایک گہرا سانس لیا یہ اس کے خلاف ایک اور غلط خبر پھیلائی گئی تھی وہ اس میل کا جواب لکھنے ہی والی تھی کہ اس کی والدہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

"آزادے، تمہارے والد نے ابھی قندھار سے کال کی ہے۔" اس کی والدہ نے کہا۔ "بشیر نے سٹیلائٹ فون سے کال کی ہے وہ تیار ہیں کہ انہیں کئی دوستوں کے فون آ رہے ہیں ہمارے رشتے دار بھی پوچھ رہے ہیں کہ کیا تم خیریت سے ہو، زندہ ہو؟" نسرین نے پریشان لہجے میں کہا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

"مجھے بھی ابھی سعد محسن کی میل ملی ہے جس میں لکھا ہے کہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ میں مرچکی ہوں، میں ابھی جواب دینے کا سوچ ہی رہی تھی۔" آزادے نے کہا۔

"لیکن بھلا کوئی ایسا کیوں کہے گا؟"

"افغانستان میں یونہی میرے خلاف افواہیں پھیلنے لگی ہیں پہلے یہ مشہور ہوگیا کہ میں کار کے ایک حادثے میں زخمی ہوگئی ہوں اور کومے میں چلی گئی ہوں اس سے پہلے یہ خبر پھیل گئی تھی کہ میں اغوا ہوگئی ہوں، یہ سب بکواس ہے۔"

"مگر لوگ ایسی باتوں پر یقین کرتے ہیں آزادے۔" نسرین نے کہا۔ "مجھے تو شک ہے کہ بغداد (عراق) میں بھی جو کامی کو اغوا کی گیا تھا اور تم خود اس کے پیچھے چلی گئی تھیں وہ بھی کسی ایسی ہی سازش کا حصہ تھا، ہمارے تو اس سے پہلے کوئی دشمن نہیں تھے۔"

"یہ مام، آپ پریشان نہ ہوا گر ایسا بھی ہے تو یہ ایک عام سی بات ہے جو بھی مشہور ہوتا ہے یا اسے کامیابی نصیب ہوتی ہے تو دوسرے اس سے حسد کرتے ہیں اور اس کے بارے میں بری خبریں پھیلاتے ہیں۔

"تو کیا تم پھر جاؤ گی؟"

"ہاں، میں اپنا مشن مکمل کروں گی۔" آزادے نے جواب دیا۔

دو ہفتے بعد اس نے بڑے بڑے دو سوٹ کیس اپنے کپڑوں سے بھرے تھے جنہیں وہ اب ہونے والے Tolo Tv کے شوز میں زیب تن کرنا چاہتی تھی اس کا دل پرسکون نہیں تھا لیکن اسے جانا بھی ضروری تھا۔

ونیکور سے افغانستان جانے والی فلائٹ معمول کے مطابق لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ سے ہوتی ہوئی دبئی (یونائیٹڈ عرب امارات) اور وہاں سے دوسرے جہاز میں کابل انٹرنیشنل ایئرپورٹ کا سفر ہوا تھا آزادے نے سفر کے دوران ہی اپنے موبائل کی سم تبدیل کرلی تھی اور وہی سم لگالی تھی جو وہ افغانستان میں استعمال کرتی تھی فوراً ہی اس کے موبائل میں بہت سے Msg آگئے تھے اس کے علاوہ کابل میں موجود کینیڈین ایمبسی سے بھی کالز آئی ہوئی تھیں جہاں اس کے والد ملازم تھے ایک پیغام میں اس سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ فوراً سفارش خانے سے رجوع کرے اس پیغام کے ساتھ سفارش خانے کا نمبر بھی لکھا تھا آزادے نے کابل ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد اس نمبر پر کال کی تھی وہ جہاز سے باہر ایئربیس پر ہی تھی تب اس نے بات کی تھی اس یقین کے ساتھ کہ اس کی گفتگو کوئی نہیں سن رہا تھا۔

"مجھے افسوس ہے آزادے یہ بات آپ سے چھپائی نہیں جاسکتی لیکن ہماری انٹیلی جنس نے بتایا ہے کہ آپ خطرے میں ہیں آپ کی زندگی کو خطرہ ہے، کیا آپ لندن میں ہیں؟"

دوسری طرف سے پوچھا گیا بات کرنے والا ایمبسی ہی کا کوئی ملازم تھا۔

"پلیز آپ کابل مت جائیں، آپ واپسی پلٹ جائیں اور ونیکور چلی جائیں۔" اس سے پھر کہا گیا وہ خاموش تھی صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کررہی تھی۔

"ارے نہیں، وہ سب افواہیں تھیں، ایسی باتیں تو میں اکثر سنتی رہتی ہوں۔" اس نے قدرے لاپرواہی سے کہا۔

"نہیں آزادے، ہم نے تحقیقات کی ہیں اور یہ حقیقت ہیں پلیز تم واپس گھر چلی جاؤ۔"

"لیکن میں ایسا نہیں کرسکتی، کابل میں میرا ایک گھر ہے، میری ایک فیملی ہے میری الگ ایک زندگی ہے اور میرے شوز شروع ہونے والے ہیں۔"

"لیکن تمہیں وارن کیا جاتا ہے کہ اگر تم کابل ضرور جانا چاہتی ہو اور یہ تمہارے لیے اتنا ہی اہم ہے تو جتنی جلدی ممکن ہو وہاں سے نکل بھی جانا۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں، میں احتیاط کروں گی، مجھے متنبہ کرنے کا شکریہ۔" آزادے نے کہا اور فون بند کردیا پھر جب وہ دوسرے مسافروں کے ساتھ ارایول گیٹ کی طرف جارہی تھی تاکہ اپنا سامان حاصل کرسکے تو اسے ایئرپورٹ کے ایک ملازم نے مخاطب کیا جو اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

"ہمارا خیال تھا کہ تم مرچکی ہو، ہم نے سنا تھا کہ تمہاری ناک، کان اور سر تمہارے تن سے جدا کردیا گیا تھا۔"

"تمہیں ایسی افواہوں پر کان نہیں دھرنے چاہئیں۔" آزادے نے مشورہ دیا اور اپنا سامان لے کر ایئرپورٹ سے نکل گئی۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

سلگتے چنار

عالی مان آفاقی

ایک ایسا علاقہ جو خود تو سلگتا ہی تھا مگر وہاں پیدا ہونے والے انسان بھی کسی آتش سے کم نہیں تھے۔ ہر روز کسی نا کسی گھر میں صف ماتم بچھتا تھا تو کسی نا کسی گھر سے آہوں، سسکیوں اور آہ زاریوں کی صدائیں بلند ہوتی تھیں

وادی کشمیر کا ایک نوحہ، ایک مرد حر کا احوال خاص

وادی میں روشنی معدوم ہوتی جارہی تھی۔ شام کی خنک ہوا نے حرارت کو ناپید کیا ہوا تھا۔ پیر پنجال کے سلسلہ ہائے کوہ میں سورج نے جا کی زندگی کو اپنی اکلوتی آنکھ سے دیکھتے دیکھتے دھیرے سے جانب مغرب اترنا شروع کر دیا تھا۔ بے انتہا خوب صورتی کے باوجود یہ علاقہ سہما سہما سا لگ رہا تھا۔ صبح ہو جانے پر بھی خوابیدہ سا تھا۔ جنگ بقا اور جدوجہد آزادی نے جہاں سچے دلوں میں جذبات کا طوفان بپا کیا تھا وہاں زبردستی قابض جنم جنم کے پاپی راجنوں کی وحشیانہ کارروائیوں سے فضا بری طرح مخدوش ہو چکی تھی۔

سلیمہ نے باہر گلی میں فوجی بوٹوں کی دھمک کو محسوس کیا۔ افطاری کی اذان کے درمیان ہی گلی سے آتا شور و غل اور چیخوں کی آواز سنائی دی تھی۔ سلیمہ کی آنکھیں کرب سے بند ہو گئیں۔

اس کے چہرے پر دنیا کی صعوبتوں کے اثرات تھے اور حالت کی بوسیدگی اس کی ذات پر وارد ہوئے ہولناک دکھ کی گواہی دیتی تھی۔ اس نے سینکڑوں جھروکوں والی دیوار سے باہر دیکھنے کی کوشش کی اور شمالی جانب جاتی راہ گزر کو سنسان پا کر پھر آہستہ سے تکیے پر سر رکھ دیا۔ کچھ دیر پہلے برپا چیخوں کا سلسلہ معدوم ہو چکا تھا۔

"آہ....." وہ سوچنے لگی۔ "آج پھر کچھ روزہ داروں کو شوق سے تنگ کیا گیا ہوگا۔ متروک ہو چکی بندوقوں اور ڈنڈوں سے بے چارے کب تک مقابلہ کر سکتے تھے۔ اٹھا کر لے جائے گئے ہوں گے۔ میرے بیٹے کی طرح....."

سورج کے بلند ہونے پر تمازت میں شدت آتی جارہی تھی۔

"میرا بیٹا..... سعید..... کب آئے گا؟ دیکھ عید پھر آرہی ہے۔" وہ روہانسی ہوئی۔

وہ دن کہاں بھلایا جا سکنے والا تھا۔ جب عید اس کے گھر میں سعید بن کر نہیں آئی تھی بلکہ خود اس کے سعید کو ہی اس سے چھین لے گئی تھی۔ عید کی نماز ادا کرنے کے لیے نکلنے والا سعید غاصب دشمنوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ سلیمہ نے شام تک اس کا انتظار کیا تھا۔ گزرتے وقت کی ہر گھڑی اس کے دل میں دھڑکتی رہی تھی۔ دن کے نڈھال ہو کر رات اوڑھتے ہی اس کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ وادی میں دیوانی ہوئی پھری۔ مگر تلاش میں سرگرداں اس کا اٹھا ہر قدم رائیگاں رہا۔ نڈھال سی گھر واپس آئی تو اس کے کمرے کی چھت اور کونوں کھدروں میں رہائش پذیر چڑیوں نے بھی اپنے گھر باندھ لیے تھے۔ وادی میں چھائی ہیبت ناک موت کی فضا نے ان بے زبانوں کو ہجرت پر مجبور کر دیا تھا۔ تب سے اب تک سلیمہ چارپائی سے بہت کم اٹھ پاتی تھی۔ گھر بالکل ویران ہو گیا تھا۔ خاموشی کا گڑھ بنے اس گھر میں آواز اگر کبھی آتی بھی تھی تو باہر سے مظلوموں کی چیخوں کی یا ظالموں کے قہقہوں کی ہوتی۔

کسی قسم کے قانون اور ریت کے وجود سے محروم اس خطے میں عید کے چاند نے جھلک دکھائی مگر مسحور کن وادی کو محبوس پا کر آسمان کی دھندلی گردشوں میں چھپنے کی کوشش کرنے لگا۔ باہر سے آتے وحشیانہ للکاروں کی بازگشت میں دبی عید مبارک کی سہمی سی آوازیں بھی کہیں سے سنائی نہیں دی تھیں۔ یہ چاند رات تھی۔ ظلم کا بازار اور بھی گرم ہو گیا تھا۔ غاصب جدید ہتھیاروں سے ان نہتوں پر ظلم کی تاریخ رقم کرنے میں لگا تھا جن کے ہاتھوں میں صرف ڈنڈے تھے اور متروک ہو چکی بندوقیں تھیں۔

"حضرات! عید کا چاند نظر آ گیا ہے۔ نماز عید صبح آٹھ بجے ادا ہوگی۔" مسجد کے اسپیکر سے اعلان ہوا اور بوڑھی سلیمہ کی آنکھیں بہہ اٹھیں۔

◆◆◆◆

سعید کے لیے اب یہ جگہ نئی نہیں رہی تھی۔ مسلسل ایک سال سے وہ راجستھان کی ان پتھریلی چٹانوں کے درمیان بنے عقوبت خانے میں دشمن کے مظالم سہتا آرہا تھا۔ کھردری

Moqar Azeem
www.pakistanipoint.com

اور جھلسی ہوئی پہاڑی پر پرانے قلعے کا یہ کھنڈر اور آس پاس بکھرا ہولناک خرابہ اپنے بھیانک جبڑے پھیلائے ہوئے تھا۔ عقوبت خانے کے پنجرہ نما زندان خانے میں سعید کے علاوہ بھی دس کے قریب کشمیری مجاہد قید تھے۔ ان سب کی غم زدہ خاموشی سے عقوبت خانہ دن کے دوسرے پہر میں ہی شب کی سی تاریکی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ پیر پنجال کے کوہستانی سلسلے کی پہی ویلی (کشمیر) کے جلتی کنجوں میں اپنی بقا اور آزادی کی جنگ لڑتے غلاموں کو لا کر پابجولاں یہاں پھینک دیا جاتا اور وہ بھوکے پیاسے ان خرابوں میں تڑپتے پھڑکتے اور مر بھی جاتے تھے۔ مرنے والوں کی لاشوں کو ہاتھ بھی لگانے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کی لاشیں اٹھا کر کھلے آسمان تلے صحرا میں پھینک دی جاتیں۔

صبح کے دس بج رہے تھے۔ اجالا اتنا مدھم تھا کہ اگر یہاں کا ماحول مخدوش فضا سے لدا نہ ہوتا تو اسے خواب ناک کہا جا سکتا تھا۔ عقوبت خانے کا گرد سے اٹا آبنوسی دروازہ کھلا اور حسمگین آنکھوں والا ایک بندوق بدست اندر داخل ہوا۔ اپنے سرمہ سا دیدے گھما کر چاروں اور چھائی سراسیمگی کو محسوس کیا اور گویا ہوا۔

"آج تم مسلوں کی عید ہے۔ سب عید کی خوشیاں منائیں گے مگر آتنک وادی نہیں۔ تم خوشی اس وقت مناؤ گے جب ہمیں خوشی حاصل کرنے دو گے۔ جب کشمیر ہمارا ہوگا۔ جب عید ہماری ہوگی۔" وہ خاموش ہوا۔

قیدی نڈھال سے دکھائی پڑتے تھے۔ سعید ایک طرف کونے میں سر ڈالے بیٹھا تھا۔ وہ سعید کی طرف بڑھا اور اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔

"آخر تم لوگ چیز کیا ہو؟ کسی قسم کا کوئی ڈر تمہیں محسوس ہوتا ہے یا نہیں۔ تم آتنک وادی ہو صرف آتنک وادی۔ ہونہہ! تمہارا تو بچہ بچہ اپنی ماں کی کوکھ سے آتنک وادی بن کر نکلتا ہے۔ پتا نہیں کون سی آگ بھری ہے تم میں کہ اتنے اتیاچار کے بعد بھی تم باز نہیں آتے۔ اب کی بار اچھی طرح باز آؤ گے۔ کیونکہ آج ہی سری نگر میں مسلمانوں کے لیے عید کا تحفہ بھیج دیا جائے گا، ہماری طرف سے۔" اس نے بات ختم کی اور قید میں موجود مجاہدین اس کے ساتھ ہی چلتی بندوق کے دہانے پر آ گئے۔ تڑاتڑ گولیاں برسیں اور تمام قیدی شہادت کا جام لبوں سے لگانے لگے۔

"اسے بھیج دو۔" گولیوں کی آواز سن کر اندر آ جانے والے کارندوں کو سعید کی لاش کی طرف اشارہ کر کے اس نے حکم دیا۔ "باقیوں کو صحرا میں پھینک دو۔" نہایت آسانی سے کہہ کر وہ دروازے سے نکلتا چلا گیا۔

◆◆◆◆

سعید کی لاش کیا پہنچی پوری وادی جیسے خون میں نہا گئی۔ گھروں سے چیخیں اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ عید کے دن خوشیوں کے تہوار کے موقع پر چھاتیاں پیٹ کر بھارتی مظالم کی گواہی دی جانے لگی۔ خون میں ڈوبی لاش پر بے حد و حساب زخم تھے جنہیں دیوانے انداز میں گنتی سلیمہ پاگل پن میں قہقہے لگاتی رہی۔ کبھی آسمان کی طرف تکنے لگتی۔

سعید مجاہدین میں ایک اہمیت کا حامل شخص تھا۔ اس نے کئی بار بھارتی چوکیوں کو تہہ نار کیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے ایک سال قبل آج ہی کے دن نماز عید کے دوران ہندو فوجیوں کے ہاتھ لگ گیا۔

آج اس کے جنازے میں لوگوں کا ایک سیلاب سا امڈ آیا جو نجانے کہاں کہاں سے آئے تھے۔ تدفین کے لیے ساتھ جانے والے لوگ واپسی پر سڑکوں پر نکل آئے۔ کشمیری عورتیں اور بچے ساتھ شامل ہو گئے۔ قوت ایمانی سے اٹھتی حق کی آوازوں اور نعروں کی گونج میں بھارتی آرمی نے جدید اسلحے کے دہانے کھول دیے۔ بے شمار گولیوں نے ان گنت سینے چاٹے۔ آہوں اور سسکیوں کی آوازیں تھیں اور کنواریوں کے ہاتھوں پہ لگی عید کی مہندی کا رنگ گہرا سرخ ہو گیا تھا۔

◆◆◆◆

بھارتی پورے گھر میں دندناتے پھرے۔ آتنک وادی کے گھر سے اس کی کارروائیوں کے سورسز کی تلاش کے دوران بوڑھی سلیمہ جان سے گئی تھی۔ غاصب کی بندوق کا پورا برسٹ اس کے سینے میں منتقل ہو گیا تھا۔ اس کے خاموش چہرے پر لب مسکرا رہے تھے۔ آنکھیں جگمگا رہی تھی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہوں۔

عید مبارک..... جنت میں رفاقتِ سعید مبارک۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

موذی کی آہٹ

شبانہ اسلم

سن بیس بیس آفت زدہ سال بن گیا ہے اس سال میں ایک ایسا موذی مرض ہمارے درمیان میں ہے جو اب شاید زندگی بھر ہماری زندگی کا حصہ بن جائے گا، اس سے جان چھڑانا ناممکن ہوجائے گا۔
زیر نظر کہانی بھی اسی وائراس سے متاثرہ ایک گھرانے کی ہے جس نے احتیاط کو مد نظر رکھ کر اپنا گھرانہ محفوظ کرلیا تھا۔

ایک ایسے گھرانہ کا احوال جس نے موجودہ وبائی مرض کرونا پر احسن انداز میں قابو پایا تھا

نیو جرسی گارفیلڈ ایریا۔

وہ تینوں نفوس بے تاثر چہرہ لیے کھڑکی سے باہر جھانک رہے تھے تینوں کے چہروں پر ویرانی، وحشت اور مردنی چھائی ہوئی تھی۔ باہر مکمل سناٹے اور تاریکی کا راج تھا۔ کسی ذی روح کا نام ونشان نہ تھا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان تینوں کے علاوہ کوئی بقید حیات نہ ہو۔ اتنی ویرانی پہلے تو کبھی دیکھنے کو نہ ملی تھی۔

''مام! میں باہر جانا چاہتی ہوں۔'' ماریا نے اندھیرے میں گھورتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''نہیں، تم کہیں نہیں جاؤ گی۔'' سارا نے سختی سے جواب دیا۔

''مام! مجھے بھوک لگی ہے۔ مجھے جانے دیں۔'' ماریا مچلی۔

''ہم دونوں بھی بھوکے ہیں مگر تم حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔'' سارا نے ایک نظر اس پر اور دوسری جوزف پر ڈال کر کہا۔

''دو دن سے ہم نے کچھ نہیں کھایا مام! کیا ہم تینوں موت کے خوف سے یونہی گھروں میں دبک کر بیٹھے رہیں گے اور پھر فاقے کا شکار ہوکر بھی تو مر ہی جائیں گے۔'' وہ اپنی ماں کے قریب آکر التجائیہ انداز میں بولی۔

''ماریا! تم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو؟ اس وقت ہم سب بہت سی مشکلات کا شکار ہیں۔ اس وائرس نے آناً فاناً تباہی مچادی ہے موت نے اپنا شکنجہ ہم سب پر کس دیا ہے۔ ہم بس بیٹھ کر کسی معجزے کا ہی انتظار کرسکتے ہیں۔'' سارا اسے بے بسی سے دیکھنے لگی۔

''مام! آپ کسی معجزے کا انتظار کریں لیکن میں نہیں کرسکتی۔'' سترہ سالہ ماریا کے لہجے سے خودسری جھلک رہی تھی۔

''دیکھو میں نے کچھ آٹے سے لوف بنا کر رکھی ہے۔ تم اور جوزف وہ کھالو۔ تب تک شاید کوئی امداد بھی آجائے۔'' سارا نے انہیں امید کا سرا تھمانا چاہا۔

''مام! ہمارا یہ چھوٹا سا کاٹیج شہر سے کافی دور ہے۔ یہاں تک اسپیشلی کوئی آتا بھی ہے یا نہیں؟ مجھے نہیں لگتا مجھے اپنی مدد آپ کے تحت ہی خوراک کا بندوبست کرنا ہوگا۔'' ماریا ہٹ دھرمی سے بولی۔

''جوزف! تم یہ کھالو اسے رہنے دو۔'' سارا نے سات سالہ جوزف کے آگے پلیٹ رکھتے ہوئے اس کی بات کو نظر انداز کیا۔

''مام! میں صرف سترہ سال کی ہوں اور میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔

''مرنا تو ہم میں سے بھی کوئی نہیں چاہتا لیکن ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟ باہر مرنے کے چانسز زیادہ ہیں ایڈیٹ، تمہیں اتنی سی بات سمجھ کیوں نہیں آرہی ہے؟'' سارا نے برہمی سے کہا۔

www.pakistanipoint.com

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ماریا خاموش ہوگئی جبکہ جوزف بغیر کسی ردعمل کے میکانکی انداز میں پلیٹ سے بریڈ پکڑ کر کھانے لگا۔

''تم نہیں کھاؤ گی؟'' سارا نے بچا ہوا ٹکڑا اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

''نہیں۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔

''اسے آپ ہی کھاؤ ایسی باس مارتا کھانا کھانے سے بہتر ہے کہ میں بھوکی رہوں۔'' وہ تنفر سے کہتی ہوئی بستر میں منہ پھیر کر لیٹ گئی۔

''ہاں میں تو کھاؤں گی ہی، اس لیے نہیں کہ مجھے بھوک ہے بلکہ اس لیے کہ مجھے جینا ہے تم دونوں کے لیے چھ سال پہلے جب تمہارا باپ مرا تھا نا تو تم لوگوں کو میں نے تن تنہا پالا تھا اور اب تک سنبھال رہی ہوں میرا اثاثہ ہو تم دونوں۔'' وہ اتنا کہہ کر بلند آواز سے رونے لگی۔ جوزف سہما سا پاس چلا آیا اور اپنی ماں کے آنسو پونچھنے لگا۔

رات تینوں پر بھاری تھی مگر وہ لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ صبح کا سورج ان کے لیے ایک نیا امتحان لانے والا ہے۔

❁❁❁❁

سورج کی پہلی کرن اس کے چہرے پر پڑی تو وہ کسمسا کر اٹھی اور اپنے بستر کے دائیں جانب دیکھا تو دھک سے رہ گئی۔

''جوزف..... جوزف!'' اس نے بے خبر سوئے ہوئے جوزف کو بری طرح سے جھنجھوڑ ڈالا۔

''ماریا کہاں ہے جوزف؟'' وہ اسے مسلسل جھنجھوڑ رہی تھی۔

''میں نہیں جانتا مام۔'' اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

سارا سرعت سے اٹھی اور گھر کے اکلوتے کمرے سے ملحقہ چھوٹے سے اسٹور روم میں اور پھر غسل خانے میں جھانکا۔ ماریا کہیں نہیں تھی۔ وہ چکرا گئی اس نے بیرونی دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور وہ آرام سے کھلتا چلا گیا۔

ماریا..... وہ اس قدر زور سے چلائی کہ ویرانے میں اس کی دورناک آواز سکوت کے پردے کو چیرتی ہوئی دور تک نکل گئی۔

❁❁❁❁

وہ درختوں کے درمیان سے نکل کر چھپتی چھپاتی ہوئی ذیلی سڑک پر آ نکلی۔ دور دور تک کسی انسان کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس نے مفلر کو منہ پر اچھی طرح سے لپیٹ رکھا تھا۔ ایک ہاتھ سے مفلر کو پکڑتی اور دوسرے ہاتھ سے مختلف چیزوں کو ٹٹولتی ہوئی وہ آگے بڑھتی جا رہی تھی ہوا کے تیز جھونکے وقتاً فوقتاً اس سے ٹکرا جاتے تھے وہ تیزی سے نیچے کی طرف جا رہی تھی تاکہ کہیں سے تازہ خوراک حاصل کر سکے۔ اسے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اس نے مڑ کر دیکھا وہ بلی تھی جو چھلانگیں مارتی ہوئی بنا آواز کیے وہاں سے چلی گئی۔ اس کی جان میں جان آئی۔ اس نے پھر سے رخ سامنے کیا تو ایک نیوز پیپر ہوا سے اڑ کر اس کے منہ پر چپک گیا اس نے پیپر کو پکڑا اور اس پر نظریں دوڑانے لگی۔

اطلاع عام۔

''تمام لوگوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ شہر میں لاک ڈاؤن کر دیا گیا ہے کوئی بھی شخص گھر سے باہر نہیں نکلے گا جو باہر پایا گیا اور وائرس کی زد میں آیا اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے گا۔ وزارت حکومت امریکہ۔ کرونا وائرس کی علامات (۱) ناک بہنا (۲) گلے میں درد (۳) کھانسی (۴) بخار (۵) نمونیا (۶) سانس لینے میں دشواری۔

ماریا نے پیپر کو پڑھ کر چڑ مڑ کر کے اپنی سائیڈ پاکٹ میں ٹھونس لیا۔

''اونہہ! زندگی بچانے کے لیے زندگی کو ہی ختم کر دیں گے۔'' وہ تنفر سے ہنسی۔

❁❁❁❁

''جوزف! کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ کہاں تک گئی ہوگی؟'' سارا خوف سے پیلے پڑتے چہرے کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''یس مام! وہ اسکول کے راستے میں ایک بازار آتا ہے نا وہاں ایک بڑا سا اسٹور بھی ہے وہ وہاں ہی گئی ہوگی۔'' جوزف اپنے کھلونوں سے کھیلتا ہوا بولا۔

تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟'' سارا نے چونک کر دیکھا۔

''کیونکہ جب اسکول سے واپسی پر ماریا کا وہاں سے گذر ہوتا تھا تو وہ ہمیشہ یہی کہتی تھی کہ جب بھی اس کے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

پاس بہت سے پیسے آئے وہ اس اسٹور سے خریداری کرے گی۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''اوہ میرے خدا! ماریا یہ تم نے کیا کر دیا، کیا اب میں تمہاری واپسی کی امید کر سکتی ہوں؟'' وہ جھر جھر بہتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان خود سے ہم کلام ہوئی۔

✽✽✽✽

وہ بہت محتاط طریقے سے ادھر سے ادھر دیکھتی ہوئی جا رہی تھی ابھی تک اسے کوئی ایک بھی وجود انسانی دکھائی نہیں دے رہا تھا نہ ہی آرمی کے لوگ۔

''مجھے لگتا ہے میں با آسانی اس اسٹور سے کھانا نکال کر لا سکوں گی۔'' اس کے چہرے پہ مسکراہٹ آئی۔ ''جب میں بہت سا سامان لے کر گھر جاؤں گی تو مام بھی اپنی ناراضگی بھول جائیں گی۔ یہ سوچتے ہی اس کے قدموں میں تیزی آ گئی پندرہ سے بیس کلومیٹر کی دوری پر ایک گول چکر گھوم کر وہ اسٹور آتا تھا اس سے پچاس گز دوران کا اسکول تھا۔

وہ چند قدم ہی چلی ہوگی کہ اسے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ ماریا نے اس سمت دیکھا جدھر سے آواز آ رہی تھی۔ وہ سڑک کی دوسری طرف والی جھاڑیاں تھیں آواز وہیں سے ہی آ رہی تھی۔ اسے تجسس ہوا کہ وہاں کون ہو سکتا ہے۔ کوئی عورت یا شائد پھر کوئی مرد، چونکہ اب تک تو راستے میں کوئی بھی نظر نہیں آیا تھا اس نے آگے بڑھ کر دیکھا اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی۔

✽✽✽✽

''بارہ بج رہے ہیں اور اس لڑکی کا کچھ پتا نہیں ہے کاش میرے اختیار میں ہوتا تو میں اسے ڈھونڈنے نکل جاتی لیکن جوزف تمہیں کس کے سہارے چھوڑ کر جاؤں بس اسی سوچ نے میرے قدموں کو روک رکھا ہے وہ مضمحل سی دیکھائی دے رہی تھی۔

''آ جائے گی مام زیادہ دور نہیں گئی ہوگی۔'' جوزف نے معصومیت سے کہا۔

''سوال یہ نہیں ہے کہ وہ نہیں آئے گی وہ آ تو جائے گی مگر کیا وہ زندہ واپس آئے گی یا پھر وائرس کو اپنے ساتھ لائے گی؟'' سارا نے کھڑکی سے باہر نظریں دوڑاتے ہوئے رنج سے سوچا۔

✽✽✽✽

ماریا نے آگے ہو کر دیکھا تو اسے زمین پر ایک آڑھا ترچھا پڑا ہوا شخص ملا جس کی عمر تقریباً چھبیس ستائیس سال ہوگی وہ پیٹ پر ہاتھ رکھے بلبلا رہا تھا۔

''اوہ میرے خدا! یہ کس قسم کی وبا ہے؟ لوگ تڑپ رہے ہیں سسک رہے ہیں اور لمحوں میں موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔''

''میری مدد کرو کوئی۔'' اذیت بھری آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ ماریا اس کی حالت دیکھ کر دہل گئی۔

''تمہاری اب کوئی مدد نہیں کر سکتا ہے۔'' وہ منہ میں ہی بڑبڑائی اور خوف سے جھرجھری لیتی ہوئی فوراً الٹے قدموں دوڑی۔

مام اور جوزف میرا انتظار کر رہے ہوں گے مجھے جلد از جلد گھر پہنچنا ہوگا۔ اس کے ذہن میں بس یہی سوچ گردش کر رہی تھی۔

✽✽✽✽

''مام میں گھر پر پڑے پڑے تھک گیا ہوں مجھے باہر جا کر کھیلنا ہے۔'' وہ اپنی سوچوں میں مستغرق تھی کہ جوزف اس کے پاس چلا آیا۔

''جوزف میری جان! کیا تم نہیں جانتے کہ باہر کتنا خطرہ ہے لاک ڈاؤن کر رکھا ہے۔ ماریا نے بھی سنگین حماقت کا مظاہرہ کیا اور گھر سے نکل گئی ہے۔ نہیں معلوم وہ ہمیں دوبارہ ملتی بھی ہے یا نہیں، اور اب میں تمہیں بھی گنوا دوں، نہیں..... ہرگز نہیں۔'' وہ اسے سینے سے لگا کر بلک پڑی۔

''مام! ایسا کب تک چلے گا۔'' جوزف نے چہرہ اونچا کر کے ماں سے سوال کیا جس کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

اچانک فضا الارمنگ سائرن سے گونجنے لگی۔

''کرونا وائرس نے اس وقت پورے امریکہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے آپ سب کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ اپنے آپ کو گھروں میں مقید رکھیں ضرورت مند افراد کو ان کی ضروریات کا سامان گھروں میں فراہم کیا جا رہا ہے۔ اس وقت ہر شہر ہر صوبے کی حالت کشیدہ ہے جو شخص بھی باہر نظر آیا اسے گولی مار دی جائے گی۔ یہ حکومتی احکامات ہیں جن پر سختی سے عملدرآمد کیا جائے نہیں تو نتائج کے خود ذمہ دار

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

ہوں گے۔ جو اس وائرس سے بچ گئے ہیں وہ اپنے آپ کو اکیلا کرلیں۔"

"میری بچی! اوہ میرے خدا میری بچی کی حفاظت فرما۔" اعلان سن کر سارا کو سانپ سونگھ گیا۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی سارا اور جوزف نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"شائد ماریا واپس آگئی ہو۔" سارا جوزف کو بیٹھے رہنے کا اشارہ کرتی ہوئی دروازے کی جانب بڑھی۔

"کون؟" اس نے لرزتی ہوئی آواز سے پوچھا۔

"آرمی، دروازہ کھولیے۔" جواب آیا۔

اس نے بلا تامل دروازہ کھول دیا۔ تین آرمی آفیسرز سامنے کھڑے تھے۔ جن میں سے دو نے بڑے بڑے تھیلے پکڑ رکھے تھے۔

"کتنے نفوس ہیں اس گھر میں؟" ان میں سے ایک بولا۔

تین۔" سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

"تیسرا دکھائی نہیں دے رہا۔" آنے والے نے جوزف کو اکیلے بیٹھے دیکھ کر کہا۔

"وہ سو رہی ہے۔" سارا نے زبردستی کی مسکراہٹ سجا کر جھوٹ کا سہارا لیا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ لو راشن ہے دو ماہ کا اور یہ ماسک بھی ہیں۔ اور سنو تم یا تمہارے بچے گھر سے باہر ہرگز نہیں نکلنا یہ میرا نمبر ہے راشن ختم ہو جائے تو کال کر دینا۔" اسی آفیسر نے پچھلے آفیسرز کو اشارہ کرتے ہوئے سارا سے مخاطب ہو کر کہا۔

ان دونوں آفیسرز نے آگے بڑھ کر سامان لے کر اندر جانا چاہا۔

"یہیں رکھ دیں میں اٹھا لونگی۔" سارا نے انہیں اندر داخل ہونے سے روکا۔

"اوکے۔" انہوں نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا اور سامان وہیں پر نیچے رکھ دیا۔

"بہت شکریہ۔" وہ ممنون لہجے میں بولی۔

تب تک دروازے پر جم کر کھڑی رہی جب تک کہ وہ نظر سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ اسے ڈر تھا تو صرف اس بات کا کہ وہ فوجی ماریا کی غیر موجودگی کی بابت دریافت نہ کرنے لگ جائیں۔

"جوزف ادھر آؤ اور آ کر میری مدد کرو۔" سارا نے ان کے جانے کے بعد ایک طمانیت بھری سانس لی۔ ایک چیز کے ملنے کی خوشی دوسری چیز کی جدائی کے غم سے منسلک تھی۔

❁❁❁❁

ماریا تیز تیز قدموں سے سڑک کی جانب بڑھ رہی تھی ساتھ ہی ساتھ وہ اطراف میں نگاہیں بھی دوڑا رہی تھی کہ کہیں سے کوئی سنسناتی ہوئی گولی اس کو اپنا ہدف نہ بنا لے۔ جب سے اس نے اس شخص کو بے یارو مددگار تڑپتے ہوئے دیکھا تھا تب سے اس کے خوف میں بتدریج اضافہ ہو گیا تھا۔ اب وہ سڑک کے کنارے آن پہنچی تھی۔

اس نے چوکنے انداز میں پہلے دائیں جانب اور پھر بائیں جانب دیکھا اور دوڑ کر سڑک کے دوسری جانب آگئی اب بس تھوڑا سا ہی اور فاصلہ طے کرنا تھا اور اس کی منزل سامنے تھی۔

ہوا رک چکی تھی اور ماحول میں عجیب سا سکوت تھا بس چند پرندوں کے پروں کے پھڑ پھڑانے کی آواز وقتاً فوقتاً سنائی دیتی تھی۔ انسان کی موت تو بعد کی بات تھی زندگی کے ہنگاموں کی موت پہلے ہی ہو چکی تھی۔ ماریا کو شدتِ پیاس کا احساس جاگا۔ اس نے مفلر ہٹایا اور گہرا سانس بھرا۔ ساتھ ہی خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں تر کیا۔ اس نے مفلر کو پھر سے اچھی طرح سے لپیٹا اور اسٹور کی سمت قدم بڑھا دیے۔ اب وہ قدرے سست روی سے چل رہی تھی اس نے اسٹور کے قریب پہنچ کر اس کے مین دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے کھولنے کی سعی میں لگ گئی مگر وہ مقفل ہینڈل کھل کے ہی نہیں دیا۔

اس نے بڑے بڑے شیشوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی اور مختلف انواع و اقسام کی چیزوں کو دیکھ کر اس کی رال ٹپکنے لگی۔

"مجھے ہر حال میں انہیں نکالنا ہے۔" وہ شیشے پر ندیدوں کی طرح ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

اس نے پتھر تلاش کرنے کے لیے نگاہ دوڑائی تاکہ شیشہ توڑ کر مطلوبہ سامان نکال سکے۔ اس میں رسک تو تھا کیونکہ اگر وہ شیشہ توڑتی تو الارم بج اٹھتا اور وہ پکڑی بھی جا سکتی تھی۔ مگر وہ سر پر کفن باندھ کر جب یہاں تک چلی آئی تھی تو آگے بھی سہی۔ وہ چند قدم آگے بڑھی اچانک سے

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

اسے دکان کے پچھلی طرف ایک پتھر نظر آیا اس کی نیلی آنکھوں میں چمک عود کر آئی۔ وہ تیزی سے پتھر کے قریب پہنچی۔ خوشی سے بڑھ کر حیرت کا شدید جھٹکا اسے لگا جب اس نے دیکھا کہ کوئی اور اسی پتھر سے اسٹور کے پچھلی طرف کے شیشے کو توڑ کر رستہ بنا چکا تھا اور شاید اپنا مطلوبہ سامان لے کر فرار بھی ہو چکا تھا۔ اسے خوشگوار مگر کمینی سی حیرت نے گھیر لیا۔

''واہ! ماریا اس سے بہترین موقع تجھے میسر نہیں آسکتا لوٹ لے۔'' وہ سرعت سے شیشے کے قریب لپکی اور پھر ایک جست لگا کر پار ہوگئی۔

وہ پررونق اسٹور جہاں عام دنوں میں آدم زاد کا رش لگا رہتا تھا آج سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ایک شیلف کے پاس چیزیں نیچے گری ہوئی تھیں جیسے کوئی عجلت میں سامان لیتے ہوئے غیر ضروری سامان نیچے گرا گیا ہو۔ اسٹور کے دیگر شیلف کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ ماریا نے کاؤنٹر کے پاس سے جا کر ایک بڑا سا شاپر لیا اور اس میں اپنے مطلب کی چیزیں بھرنے لگی۔ اس نے دو تھیلے بھر لیے اور ان کا وزن چیک کرنے لگی۔

''اچھا ہوتا جوزف کو بھی ساتھ لے آتی۔'' اس نے سوچا۔ ''لیکن خیر کسی نہ کسی طرح اسے لے کر گھر پہنچنا ہوگا۔''

بڑبڑاتے ہوئے اس نے شاپر اٹھائے اور کاؤنٹر کے پاس کچھ دیر رکی اور وہاں سے چاکلیٹ سے بھرے جار میں سے مٹھی بھر کر چاکلیٹ نکالیں اور پینٹ کی جیب میں ٹھونس لیں۔

''جوزف خوش ہو جائے گا۔'' اس کے چہرے پر دل فریب مسکراہٹ آئی۔

''کیپ دا چینج۔'' وہ ایک سکہ نکال کر اسے کاؤنٹر پر پٹخ کر شرارت بھری مسکراہٹ سے بولی۔

❁❁❁❁

''جوزف میرے بچے یہ لو نوڈلز کھالو۔'' وہ باؤل میں گرما گرم نوڈلز ڈال کر جوزف کو پکڑاتے ہوئے بولی۔

''واہ مام بہت مزیدار۔'' جوزف نے کانٹا پکڑ کر نوڈلز میں گھمانا شروع کر دیا۔

''مام کیا تم نہیں کھاؤ گی؟'' جوزف نے سارا کو خالی ہاتھ بیٹھے دیکھ کر کہا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے جوزی تم کھاؤ بیٹا جب تک میری ماریا نہیں لوٹ آتی تب تک میرے حلق سے ایک نوالہ بھی نہیں اترے گا۔'' سارا بجھے سے لہجے میں بولی۔

''مام! ماریا از بریو گرل وہ ضرور جلدی لوٹ آئے گی۔''

''آئی ہوپ۔'' وہ آہ بھر کر بولی۔

''پتا ہے جوزف بچپن میں ماریا بہت ڈرپوک ہوتی تھی اکیلے گھر سے کبھی باہر نہیں نکلتی تھی۔ تمہارے پاپا اسے باہر گھمانے لے جایا کرتے تھے۔ ایک بار تمہارے پاپا اسے سائیکل سکھا رہے تھے سائیکل سکھاتے ہوئے اچانک سے تمہارے پاپا کو شرارت سوجھی اور وہ چھپ گئے۔'' سارا بیتے دنوں کی یادوں میں کھو کر بولی۔

''اچھا پھر کیا ہوا؟'' جوزف اشتیاق سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''پھر کیا؟ جب ماریا نے دیکھا کہ پاپا نہیں ہیں تو وہ اتنی خوفزدہ ہوئی کہ ڈر کے مارے سائیکل سے گر گئی اور بیہوش ہوگئی۔''

''اوہ.....'' جوزف کے منہ سے اتنا ہی نکلا۔

''اس کے بعد پیٹر اور میں نے ایک دوسرے سے وعدہ کیا کہ ماریا کو کبھی بھی اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔''

''میں تو اپنے وعدے پر قائم رہی مگر تمہارے پاپا نا صرف ماریا بلکہ ہم دونوں کو بھی اکیلا چھوڑ گئے۔'' سارا سسکی۔ ''اوہ میرے خدا پیٹر کو تو نے مجھ سے چھین لیا اب میری ماریا کو مجھ سے مت چھیننا۔'' وہ آنکھیں بند کیے دعا میں مشغول ہوگئی۔

''ماریا کو کچھ نہیں ہوگا مام ڈونٹ وری۔'' جوزف نوڈلز وہیں چھوڑ کر ماں کے ساتھ لگ کر اس کی پیٹھ تھپتھپانے لگا۔

❁❁❁❁

ماریا کے لیے دونوں شاپرز کا بوجھ سنبھالنا کافی مشکل لگ رہا تھا وہ دھان پان سی تھی اور شاپرز قدرے بھاری۔ بہرحال اس نے ہمت جمع رکھی اور واپسی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ ایک بار پھر اس کا گزر اسی رستے سے ہونا تھا جہاں اس نے بے یارومددگار پڑے شخص کو دیکھا تھا وہ آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی اسے شدید بھوک کا بھی سامنا تھا۔ ماریا نے اسٹور سے دور آتے ہی شاپرز میں جھانک کر مطلوبہ چیز نکالی اور ریپر پھاڑ کر عجلت میں کھانے لگی۔ اس کے پیٹ کو تقویت ملی جسم میں نئے سرے سے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

جان سی آ گئی۔اس نے بوتل نکالی اور حلق میں ایک ہی سانس میں غٹاغٹ پانی چڑھایا۔اب وہ واپسی کے لیے پوری طرح تیار تھی وہ اسی سڑک کے قریب پہنچی جہاں سے گول گھوم کر اوپر چڑھنا تھا۔مگر یک بارگی جیسے اس کے قدم جم سے گئے۔وہ خوف کے مارے نیچے بیٹھ گئی۔وہاں چند پولیس والے کھڑے تھے اور وہ درد سے کراہتا ہوا شخص جس کے تڑپنے کی شدت میں اضافہ ہو چکا تھا بری طرح سے سانس لینے کی آوازیں نکال رہا تھا۔

''کیا کیا جائے کیا یہ بچ جائے گا۔'' ایک پولیس والا دوسرے سے مخاطب ہوا۔

''اسے ہسپتال لے چلتے ہیں ایمبولینس منگوا کر۔'' دوسرا بولا۔

وہ سب ماسک پہنے ہوئے تھے اور اس شخص سے قدرے دور کھڑے ہو کر گفت وشنید میں لگے تھے۔

''مجھے نہیں لگتا ہے یہ بچے گا۔اس کی بیماری جسم میں پھیل چکی ہے اسے مار دو۔'' ان میں سے ایک سفاکی سے بولا۔

''یہی بہتر ہوگا۔'' سبھی نے تائید میں سر ہلایا۔

''اوہ میرے خدا.....!'' ماریا جو یہ دیکھنے کے لیے رکی تھی کہ وہ لوگ کیسے اس شخص کو مدد دیتے ہیں ان کی باتیں سن کر ششدر رہ گئی۔

''گولی مارو اسے نہیں تو یہ وائرس پھیل جائے گا۔'' ایک پھر بولا۔

''یس سر!'' اس آواز کے آتے ہی گولی چلنے اور پھر ایک بھیانک چیخ کی آواز نے ماریا کو تھرا کر رکھ دیا۔اس کے ہاتھ سے شاپرز چھوٹ گئے تھے اور وہ آنکھیں بند کیے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھر تھرا رہی تھی۔

گولی کی آواز سے اس کے منہ سے دبی دبی چیخ برآمد ہوئی۔

''ہے..... مجھے لگتا ہے وہاں پر کوئی ہے۔ایک پولیس والا مڑ کر اس سمت دیکھنے لگا جہاں ماریا تھی ماریا بالکل سیدھی لیٹ گئی اب وہ خادار جھاڑیوں کے درمیان چھپ سی گئی تھی۔

''میرا نہیں خیال کہ وہاں کوئی ہے۔'' چند ثانیے انہوں نے کسی آواز کو سننے کے لیے خاموشی اختیار کی اور پھر ایک نفی میں سر ہلا کر بولا۔

''چلو لاشیں ٹھکانے لگانے والے عملے کو کال کرو اور فوراً چلو یہاں سے۔'' ایک نے احکامات جاری کیے اور چل کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔باقی افراد بھی پولیس وین میں بیٹھے اور گاڑی زن سے بھگا لے گئے۔

ماریا کتنی دیر ساکت پڑی آسمان کو دیکھتی رہی اسے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ بچ گئی اور اس کی بدقسمتی پر جو پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔وہ تیزی سے اٹھی شاپرز کو مضبوطی سے تھاما اور گھر کی جانب قدم بڑھا دیے جو قریب ہو کر بھی بہت دور لگ رہا تھا۔

❁❁❁❁

سارا نے اسٹور کی فالتو چیزیں نکالیں اور پردہ آگے کر کے ٹریش بن کی نظر کرتی ہوئی باہر نکلی۔اب وہ سنک کے آگے پر خیال نظرے گاڑے ہاتھ دھو رہی تھی اس نے منہ پر پانی کے ڈھیروں ڈھیر چھپکے مارے اور ٹاول سے پونچھتی ہوئی آ کر بستر پر لیٹ گئی۔وہ کافی نڈھال دیکھائی دے رہی تھی۔خیالات کے اژدہام نے اسے آکٹوپس کی طرح سے جکڑ رکھا تھا۔

''کم بیک ماریا اس سے پہلے کے بہت دیر ہو جائے۔'' وہ بڑبڑائی اور جوزف کی طرف دیکھا جو بے خبر سو رہا تھا۔

❁❁❁❁

ماریا کو دور سے گاڑی آتی دکھائی دے رہی تھی۔وہ یقیناً پولیس کار ہی تھی۔خوف کی ایک شدید لہر اس کے پورے جسم میں دوڑی۔اس نے تقریباً بھاگتے ہوئے انداز میں سڑک پار کی اور پیچھے مڑے بغیر آگے ہی آگے دوڑتی رہی۔اس سے تھیلے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا لیکن اب وہ منزل کے اتنا قریب آ کر کسی خطرے میں نہیں پڑنا چاہتی تھی لہٰذا اپنی پوری قوت صرف کر کے وہ آگے بڑھتی رہی یہاں تک کہ گھر کے دروازے کے سامنے پہنچ کر اس پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

''مام دروازہ کھولیے۔'' اس کے ہاتھ سے دونوں تھیلے چھوٹ کر گرے اور پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے دروازے پر مکے برسانا شروع کر دیے۔

''مام ماریا آ گئی۔'' جوزف خوشی سے چلایا۔

سارا کے کھانا بناتے ہوئے ہاتھ رکے۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''میں کھولوں؟''

''رکو جوزف!'' سارا نے جوزف کے کہنے پر اسے روکا اور ہاتھ پونچھتی ہوئی دروازے کی طرف آ گئی

''مام..... جوزف.....'' ماریا کبھی دروازہ بجاتی اور کبھی پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوئی مسلسل چلا رہی تھی۔ ''مام دروازہ کھولو! باہر پولیس کی گاڑی گشت کر رہی ہے۔'' ماریا ایک بار پھر سے دروازہ پیٹنے لگی۔

''ماریا..... ماریا میری بات سنو۔'' سارا پرسکون سی بولی۔

''اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تم اکیلی آئی ہو؟''

''مام میں اکیلی ہی ہوں۔'' وہ زچ ہو کر بولی۔

''کیا تم وائرس کو ساتھ نہیں لائی ہو؟'' سارا اسی لہجے میں پھر بولی۔

''میں نہیں جانتی..... مام پلیز..... مجھے اندر آنے دیں۔'' ماریا التجائی لہجے میں کہا۔

''کیسے آنے دوں کیا تمہیں نہیں پتا کہ اگر تمہیں یہ وائرس لگ چکا ہے تو اس کی زد میں ہم دونوں بھی آ سکتے ہیں۔''

''مام ایسا کچھ نہیں ہوگا مجھے وائرس نہیں لگا بھروسہ کریں۔'' ماریا بے یقینی سے دروازے کو دیکھ رہی تھی جس کے پار اس کی ماں سفا کی کا عظیم الشان مظاہرہ کر رہی تھی۔

''مام وہ لوگ کسی بھی وقت ادھر آ سکتے ہیں انہوں نے صبح ہی ایک بے بس ولا چار شخص کو گولی کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ یقیناً مجھے بھی اڑا دیں گے۔'' وہ رقت بھرے لہجے میں بولی۔

سارا کشمکش و پیچ میں مبتلا تھی کہ کیا کرے زندگی اس سے عجیب امتحان لے رہی تھی وہ اپنی ممتا کے ہاتھوں دونوں طرف سے مجبور تھی۔

فیصلہ لینا اتنا آسان نہ تھا ایک طرف گھر کے اندر وہ دونوں تھے جنہیں باہر کھڑی ماریا سے خطرہ تھا دوسری طرف ماریا تھی جسے صرف باہر سے ہی خطرہ تھا۔

''مام پلیز ماریا کو اندر بلا لو مام.....'' جوزف ماں کے پاؤں پر گر گیا اور بلک بلک کر دہائیاں دینے لگا۔

دور کہیں گولی چلنے کی آواز پر ایک درخت پر کتنی دیر سے خاموش بیٹھے پرندوں نے شور مچا کر احتجاج کیا۔ ادھر تینوں ہی اپنی جگہ سے اچھل پڑے۔

''مام.....'' خوفزدہ سی آواز آئی۔

سارا نے کھٹ سے دروازہ کھولا اور بازو سے پکڑ کر ماریا کو اندر گھسیٹ لیا۔

''تھینک یو مام لو یو۔'' ماریا ماں کے گلے لگنے کو آگے بڑھی مگر سارا نے ہاتھ سے اسے روک دیا

''جاؤ جا کر نہاؤ! ہاتھ منہ دھو کر آؤ جلدی سے۔ یہ کپڑے پھینک دینا۔'' سارا نے نظریں سنجیدگی سے ماریا کے وجود پر دوڑاتے ہوئے کہا۔

''اوکے مام۔'' ماریا خوشی سے تھرتھرا رہی تھی۔ وہ واش روم میں چلی گئی۔ سارا نے اس کے کپڑے نکال کر رکھے۔

جب وہ نہا کر باہر آئی تو سارا کو اپنے آگے کھڑے ہوئے پایا۔ سارا نے ہاتھ سے اسٹور کی طرف اشارہ کیا۔ ماریا نے ناسمجھی سے دیکھا۔

''تم اب سے آئیسولیٹ رہو گی میرے اور جوزف کے قریب آنے کی کوشش بھی مت کرنا۔''

''مام.....'' ماریا کا چہرہ بجھ سا گیا۔ اس نے دزدیدہ نگاہ سے دیکھا۔

''حالات پہلے جیسے نہیں رہے ماریا! اگر تم میری بات مان لیتی تو آج ہمیں اس صورتحال سے نہ گزرنا پڑتا بہر حال اب ہمیں احتیاط تو کرنی ہوگی۔''

ماریا وقت کی نزاکت کو سمجھ گئی اور بلا چوں چراں اسٹور میں چلی گئی۔

''ہمیں سب سے پہلا کام یہ کرنا ہوگا کہ ماریا کے جسم میں وائرس کی موجودگی کا پتا چلانا ہوگا۔ اب سوال اٹھتا ہے کہ کیسے، تو ہم اسے چار دن تک اندر رکھیں گے اور اس کے جسم میں ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیں گے اگر کوئی ایک علامت بھی نظر آئی تو پھر ماریا کو بلڈ ٹیسٹ کے لیے ہسپتال لے جانا ہوگا۔'' سارا بآواز بلند بول رہی تھی تاکہ ماریا بھی سن سکے۔

ماریا جو اسٹور کی حالت کا بغور جائزہ لے رہی تھی سارا کو بغور سننے لگی۔

''مام مجھے کچھ نہیں ہوا ہے میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' ماریا خفگی سے چلا کر بولی اور بستر میں گھس کر آنکھیں موند لیں۔

''اگر یہ نہیں جاؤ گی آئی ول کال دا پولیس۔'' سارا سپاٹ لہجے میں بولی۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ماریا اپنی جگہ دبک گئی۔

''ماریا اٹھو بیٹی ناشتہ کرلو لیکن پہلے ہاتھ منہ دھو کر آؤ اور پلیز پلیز اس روم سے باہر مت نکلنا۔'' سارا کی آواز پر ماریا نے دیوار گیر گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ آٹھ بج رہے تھے۔

''اوہ مام اتنی صبح جگا دیا کچھ دیر تو اور سونے دیتیں۔'' ماریا نے ایک بھرپور انگڑائی لی اور اٹھ کر آنکھیں ملیں۔

''سو جانا اور تمہیں کرنا کیا ہے مجھے تو ابھی بہت سے کام دیکھنے ہیں۔'' سارا سنجیدہ سی بولی۔

''اور سنو ماسک بھی یاد سے پہنے رکھنا۔'' سارا نے ایک بار پھر تاکید کی۔

''اُف ہو مام.....'' وہ چڑ سی گئی۔

''اچھا ماسک سے یاد آیا ذرا اپنا ماسک تو اتار کر ایک بار اپنا پیارا سا چہرہ ہی دکھا دیں۔ یقین کریں جب سے آئی ہوں آپ کو ماسک میں دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ کوئی ہسپتال ہو اور آپ کوئی ماہر سرجن۔'' ماریا شرارت سے بولی۔

''یہ لو دیکھ لو۔'' سارا نے غصے سے ماسک اتارا ''تمہیں تو مذاق ہی سوجھے گا نا میرے دل کی کیفیت کا تو قطعاً اندازہ نہیں کرسکتی ہو۔ خدا کی بھیجی ہوئی ایک آفت کافی نہیں تھی جو مجھ بدنصیب کو تم نے ایک نئی آزمائش میں ڈال دیا ہے اگر خدانخواستہ تمہیں کچھ ہوگیا تو۔'' وہ آزردگی سے بولی تھی اور بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''آئی ایم سوری مام۔ پلیز مجھے معاف کردیں۔'' ماریا نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ملائیں اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر رقت آمیز لہجے میں بولی۔

ماں کو دکھی دیکھ کر اس کا دل بھی تڑپ گیا تھا۔

''مام میں وعدہ کرتی ہوں کہ آج کے بعد آپ کی حکم عدولی نہیں کروں گی۔ آپ جو کہیں گی میں وہی کروں گی یہ ماریا کا آپ سے وعدہ ہے۔'' وہ پرعزم لہجے میں بولی۔

''میں تم سے اسی بات کی توقع رکھتی ہوں۔'' سارا مڑی اور یک لخت رک کہا

''پھر آپ ناراض تو نہیں ہوں گی ناں؟'' ماریا نے ماں کی پشت سے آواز لگائی۔

''نہیں۔'' سارا ماسک چڑھا کر بولی۔

''واہ.....'' وہ خوشی سے چلائی۔

❁❁❁❁

سارا کو جس بات کا خدشہ تھا وہ یقین میں بدلنے کو تھا۔ پانچ دن سے اس کی سختی کے کاربند اصولوں پر عمل کرتی ہوئی ماریا کو اپنی طبیعت میں گرانی سی محسوس ہوئی پہلے تو اسے چھینکیں آئیں اور ناک بہنے لگی لیکن ماریا نے اسے سنجیدہ خیال نہ کیا۔

''کیا بات ہے ماریا کیا تم مسلسل چھینک رہی ہو؟'' سارا نے تفکر سے کہا۔

''نو مام بس ایسے ہی۔'' ماریا نے اسے مطمئن کرنا چاہا۔

''مجھے لگتا ہے جس بات سے ہم ڈر رہے تھے وہ ہوگئی ہے۔ جوزف فون پکڑاؤ۔'' سارا نے جوزف کو اشارہ کیا۔

''نو مام پلیز۔'' ماریا کو انجانا سا خوف محسوس ہوا۔

ماریا اٹھنے لگی مگر جسم میں شدید اینٹھن کا احساس ہوا۔

''تو کیا میں بھی اس وبا کی زد میں آگئی؟'' وہ چکراتے ہوئے سر کے ساتھ ماں کو پردے کی اوٹ سے فون پر بات کرتے ہوئے دیکھنے لگی۔

سائرن بجاتی ہوئی گاڑی ان کے گھر کے سامنے آکر رکی خاموش فضا میں لمحے بھر کو ہلچل سی مچ گ ؟ ی۔

''مجھے ایک سچ بتانا ہے پانچ دن پہلے میری بیٹی پورا دن باہر رہی تھی لیکن میں نے اس بات کو چھپایا مگر میں نے اسے آئیسولیشن میں رکھا تھا مگر اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں نے ٹھیک نہیں کیا۔ مجھے پہلے ہی اس بارے میں آپ لوگوں کو بتا دینا چاہیے تھا۔ تاہم مزید برآں میرے ضمیر نے یہ بات گوارا نہیں کی کہ اس بات کو مخفی رکھ کر کوئی بڑا نقصان اٹھاؤں۔'' سارا رسانیت سے بول رہی تھی۔

''مگر میں مانتی ہوں کہ یہ میری غلطی تھی۔ اب میں اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اسے ہسپتال لے جائیں۔'' سارا نے پولیس آفیسر کو ساری صورتحال سے آگاہ کیا۔

''مجھے خوشی ہے کہ آپ نے ایک ذمے دار شہری ہونے کا ثبوت دیا ہے ایک ماں کے لیے یہ اتنا آسان نہیں تھا۔'' آفیسر شگفتہ مزاجی سے بولا۔

''ہم اسے ابھی ہسپتال لے کر جائیں گے اور ہم امید کرتے ہیں کہ اس بچی کا ٹیسٹ نیگیٹو آئے۔''

❁❁❁❁

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

''آپ کی بچی ٹیسٹ کی رپورٹ آنے تک قرنطینہ میں رہے گی۔ اس لیے مس سارا آپ کو تحمل اور برداشت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔'' آفیسر نے سارا کو فون پر تفصیلات بتاتے ہوئے کہا

''کیا میں ہسپتال میں اپنی بچی کے پاس نہیں رہ سکتی ہوں؟'' سارا نے پریشان ہوکر سوال کیا۔

''مس سارا فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتا، رپورٹ آنے تک آپ صبر کرنا ہوگا پھر میں آپ کو کال کرکے دوبارہ صورتحال سے آگاہ کرتا ہوں۔''

''جی ٹھیک آفیسر۔'' وہ بے جان سے لہجے میں بولی۔

''مام ماریا بچ جائے گی نا؟'' جوزف نے سارا کو سم کھڑی سارا کا بازو ہلا کر پوچھا

''ماریا کو کچھ نہیں ہوگا جوزی مجھے یقین ہے۔'' سارا نے دور جاکر نظروں سے اوجھل ہوتی ہوئی ایمبولینس پر آخری نگاہ ڈال کر کہا اور جوزف کو لے کر اندر چل دی۔

❁❁❁❁

''فیڈرک دیکھ لیا نا تو نے اپنی ضد کا انجام؟ تجھے وائرس لگا تھا تو اس میں ہمارا کیا قصور تھا کیوں تو نے اپنے ساتھ مجھے بھی اذیت میں مبتلا کردیا۔'' رابرٹ تکلیف دہ انداز میں سانس لیتے ہوئے غائبانہ طور پر فیڈرک سے مخاطب تھا۔

''رات بھر آوارہ گردی اور سستی شراب پی کر گھر آجاتا ہے اب باہر مت جانا نہیں تو، تو بھی اس وبا کی زد میں آجائے گا۔'' رابرٹ نے فیڈرک کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''اوہ پلیز تم میرے ڈیڈ بننے کی کوشش نہ کرو۔ لاولد ہوں آزاد رہنے دو مجھے۔'' فیڈرک نشے میں لڑکھڑاتا ہوا کپڑے اتار کر پھینکنے لگا اور بستر پر ڈھیر ہوگیا۔

''مجھے تجھ سے پوری ہمدردی ہے۔'' رابرٹ نے ترحم بھری نگاہ ڈالی اور بتی بجھا کر آنکھیں موند لیں۔

''جب سے ہوش سنبھالا ہے خود کو آوارہ کتے کی طرح ادھر اُدھر پھرتے ہوئے دیکھا پھر فیڈرک ملا جو خود بھی جلا تھا وہ رابرٹ پر ترس کھاتے ہوئے اسے اپنے چھوٹے اپارٹمنٹ میں لے آیا۔ وہ ہاٹ ڈوگ برگر کارنر پر کام کرتا تھا جبکہ فیڈرک ایک بار میں کام میں لگ گیا۔ حالات کی پراگندگی پر فیڈرک اکثر بلبلا اٹھتا تھا۔

آج جب پوری دنیا میں کرونا وائرس کی عفریت نے اپنے پنجے گاڑنا شروع کیے تھے تو سب سے زیادہ متاثر وہ دونوں ہی ہوئے تھے اس صورتحال سے اونچے طبقے کو تو اتنی پریشانی نہ تھی جتنا نچلے طبقے کے لوگ پس جایا کرتے ہیں۔

اگلی صبح رابرٹ کی آنکھ کھلی تو اس نے رابرٹ کو کچھ ڈھونڈتے ہوئے پایا۔

''کیا ہوا؟ کیا تلاش کررہے ہو؟'' رابرٹ حیرانی سیا سے کمرے کو الٹتے پلٹتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''اوہ تم اٹھ گئے۔ وہ تمہاری پھٹی چرسی گاڑی کہاں ہے؟''

''وہ تو رونی کی گیراج میں کھڑی ہے مگر تم اسے کمرے میں کیوں ڈھونڈ رہے ہو۔'' رابرٹ کو از حد حیرت ہوئی۔

''ارے بے وقوف اس کی چابی تلاش کررہا ہوں چابی کہاں ہے؟'' رابرٹ نے شرمندہ ہوئے بغیر پوچھا۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن کیوں؟'' رابرٹ نے پھر سے سوال داغا۔

''دیکھ تجھے بھوکے مرنے کا شوق ہے تو بے شک مرجا مگر مجھے ابھی اور جینا ہے اور کیتھی سے شادی بھی رچانی ہے۔'' فیڈرک نے چیزوں کو تلپٹ کرنا موقوف کیا اور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''فیڈرک میرے دوست میری بات سن تو ابھی باہر مت جا حالات سازگار نہیں ہیں۔ اگر تجھے کچھ ہوگیا تو؟'' رابرٹ نے رقیق لہجے میں کہا۔

''مجھے کچھ ہونا ہوتا تو بہت پہلے ہی ہوجاتا اونہہ۔'' وہ بکھری ہوئی چیزوں کو ٹھوکر مارتا ہوا باہر نکل گیا۔

''مجھے تم پر صرف ترس آتا ہے۔'' وہ اسے جاتے ہوئے دیکھ کر بے چارگی سے بولا۔

فیڈرک نے ہوشیاری سے گاڑی چلاتے ہوئے اسے سنسان سڑک کی جانب موڑ دیا۔ اب اس کی رفتار ستر سے اوپر تجاوز کرنے لگی تھی۔ اسے اچھی طرح سے پتا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ وہ ایک کہنی کو بائیں دروازے کی کھلی کھڑکی پر رکھ کر ایک ہاتھ سے گاڑی چلا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس نے انگلش گانے پر سر دھننا شروع کردیا۔

وہ کافی دور تک نکل آیا تھا اس نے سنسان راستے پر نگاہ دوڑائی اور پھر اسپیڈ کو چالیس پر لے آیا لیکن یہ دیکھ کر اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا کہ فیول ختم ہونے کے نزدیک تھا اور

www.pakistanipoint.com

اسے خبر بھی نہ ہوسکی اس نے غصے سے اسٹیئرنگ پر ایک زور کا ہاتھ مارا اور مغلظات بکنے لگا۔

فیول کے ختم ہونے سے پہلے ہی اس نے اس زور سے بریک لگائے تھے کہ چرچراہٹ کی آواز سناٹے میں دور تک گونجتی چلی گئی۔ اس نے اپنے مختل اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کی اور پھر گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ کچھ دیر وہاں کھڑے رہنے اور ارد گرد کا جائزہ لینے کے بعد اس نے پیدل چلنے کا فیصلہ کیا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ دو کلومیٹر تک چلا ہوگا کہ اسے کارپر سپر اسٹور نظر آیا۔ مسرت سے باچھیں کھلاتا ہوا وہ دوڑتا ہوا وہاں تک پہنچا۔ اسٹور میں کوئی نہیں تھا شیشے سے بنی تمام کھڑکیاں اور دروازے مقفل تھے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا کچھ فاصلے پر پڑے پتھر کو اٹھا لایا اور اس زور سے مارا کہ چھن کی آواز سے شیشہ چکنا چور ہوگیا۔

اس نے اسٹور میں گھستے ہی اتھل پتھل مچادی۔ وہ اپنی مطلوبہ چیزیں سمیٹنے لگا اور پیٹرول سیکشن سے پیٹرول کا قدرے بھاری کین اٹھا لایا۔

اس نے بیئر کی بوتل کھولی اور غٹاغٹ غٹاپ کرکے پینے لگا۔ اب اسے اپنے اندر کچھ انرجی سی محسوس ہو رہی تھی اس نے شیشے کے کاؤنٹر سے اچک کر اندر ہاتھ مارا اور مفلر نکال کر بڑے بڑے نوالے کھانے لگا۔

''لاک ڈاؤن میں تو یہ پڑے ویسے بھی سڑ ہی جانے تھے۔'' وہ اپنی انگلیاں چاٹتے ہوئے ہنسا۔

''چل فیڈرک! نکل اس سے پہلے کہ کوئی پارٹی گھومتی گھماتی ادھر آ نکلے اور تیرا یہ ذہین بھیجہ بھک سے اڑا دے۔'' اس نے دو انگلیوں سے پستول بنا کر اپنی کنپٹی پہ رکھتے ہوئے مصنوعی خوف سے کہا اور باہر نکل آیا۔

❁❁❁❁

وہ کھلکھلاتی ہوئی جوزف کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی اور اسے پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی مگر جوزف اس کے ہاتھ ہی نہیں آرہا تھا۔ ان کی ماں ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھی اچانک ایک پتھر سے اسے ٹھوکر لگی اور وہ اوندھے منہ جا گری

''ماریا..... ماریا.....'' مام اور جوزف یک بیک چلائے۔

ماریا نے آنکھیں کھولیں مگر یہ کیا یہ تو منظر ہی کچھ اور تھا وہ اپنے گھر میں نہیں سفید بے داغ بستر پہ کسی حساس وارڈ پر پڑی تھی۔

''مام!'' وہ بے بسی سے پکاری۔

''کیسی ہو ماریا؟'' مکمل حفاظتی لباس میں ماسک پہنے ہاتھوں میں دستانے چڑھائے دو لوگ اس کے پاس کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک بولا۔

''مج..... مجھے گھر جانا ہے، مام کے پاس۔'' وہ سراسیمہ سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

''چلی جانا پہلے ٹھیک تو ہولو۔'' ایک نے جواب دیا۔

''مجھے کیا ہوا ہے میں ٹھیک تو ہوں۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی کہ اسے چھینکیں آنا شروع ہوگئی۔

''ہاں تم ٹھیک ہو فکر نہ کرو جلد گھر چلی جاؤ گی۔'' دوسرا شخص بولا۔

''مگر کب؟ میں تنگ آگئی ہوں یہاں پڑے پڑے زندہ لاش تصور کر رہی ہوں خود کو۔'' وہ ٹشو سے منہ ناک صاف کرتی ہوئی بدقت بولی۔

''بہت جلد تم واپس جاؤ گی تب تک تم اس سے باتیں کرو وہ بھی تمہاری طرح اکیلا پڑا سڑ رہا ہے اور بور ہو رہا ہے۔''

ماریا نے اس طرف نگاہ کی جہاں ایک بائیس تیئیس سالہ جوان حسرت ویاس کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' ماریا نے بلا جھجک سوال داغا۔

''البرٹ۔'' نوجوان کافی مغموم دکھائی دیا۔

''اوہ اچھا۔'' اس نے سر واپس تکیے پر رکھا اور خاموشی سے چھت کو گھورنے لگی۔ یہ بھی بیچارا میری طرح سے بے بس ولاچار ہوگیا۔

❁❁❁❁

''مام ماریا واپس آئے گی ناں؟'' جوزف اس کا ہاتھ تھامے منتظر جواب کھڑا تھا۔

''ہاں بیٹا وہ ضرور آئے گی میں نے گاڈ سے بہت دعا کی ہے مجھے ماریا کی اور ماریا اور تمہیں میری ضرورت ہے۔'' وہ اسے گلے لگا کر بولی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''کاش ماما سب کچھ پہلے ہی کی طرح ہوجائے ماریا واپس آجائے ہمارے اسکول کھل جائیں، میں باہر کی تازہ ہوا لے سکوں۔'' وہ سسکتی ہوئی ماں کے ساتھ لگ کر

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

اداسی سے بولا۔

دور کہیں سے پولیس کی گاڑی کے سائرن کی آواز سنائی دینے لگی۔

✱✱✱✱

''البرٹ یوں مغموم رہنے سے کیا ہوگا مجھے دیکھو میں محض اپنی غفلت و کوتاہی کی وجہ سے یہاں پڑی ہوں۔'' ماریا نے اپنی طبیعت میں بے چینی سی محسوس کرتے ہوئے بے جان پڑے البرٹ کو دیکھ کر مخاطب کیا۔

دو ہفتے ہونے کو تھے قرنطینہ میں پڑے ہوئے مریضوں کی مکمل نگہداشت کی جارہی تھی۔ ماریا اور البرٹ کے درمیان پہلے دن کی حائل اجنبیت دیوار اب ڈھے چکی تھی۔

''مگر ماریا اس میں میرا کیا قصور تھا؟ ساری غلطی فیڈرک کی تو تھی۔ نا وہ بداحتیاطی کرتا اور نہ ہی یہ وائرس مجھ تک منتقل ہوتا۔'' وہ آزردہ سا ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔

''اب ان باتوں سے کیا فائدہ غلطی چاہے جس کی بھی تھی۔'' ماریا سرد آہ بھر کر بولی۔

''میں نے اسے فٹ پاتھ سے اٹھا کر اپنے گھر رکھا اسے نوکری دلائی اسے اپنے بھائیوں کی طرح سمجھا مگر بدلے میں مجھے اس سے وائرس ملا۔'' وہ شائد فیڈرک کی غلطی معاف کرنے کو تیار نہیں تھا

اس نے لرزتے ہاتھوں سے بٹوہ نکالا اپنی اور فیڈرک کی ہنستی مسکراتی ہوئی تصویر کو ایک نظر دیکھا اور اچھال کر پھینک دیا جو ہوا کے دوش پر لہراتی ماریا کے بستر پر آ کر گر گئی۔

ماریا نے ایک نظر تصویر کو دیکھا اور چونک گئی۔

''یہ ہے تمہارا دوست فیڈرک؟'' اس نے فیڈرک کے اوپر انگلی رکھ کر بے چینی سے پوچھا۔

''ہاں یہی ہے وہ جانے اب کہاں دفع ہو گیا ہے۔''

''یہ مر چکا ہے۔'' ماریا نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''واٹ! کیا کہہ رہی ہو تم؟'' البرٹ کو دھچکا لگا۔

''تمہیں کیسے پتا؟'' اس نے تحیر سے اسے دیکھا۔

''جب میں اسٹور جانے کے لیے گھر سے نکلی تھی تو راستے میں اسے دیکھا تھا اس کی حالت مخدوش تھی تڑپ رہا تھا چلا رہا تھا مدد مدد پکار رہا تھا۔ اور پھر اسے گولی مار دی گئی۔ ماریا نے بلند سی سرگوشی میں کہا۔

''واقعی؟ آہ میرے دوست تیری لاپرواہی نے مجھے تو پھنسا ہی دیا ساتھ میں تجھے بھی موت کے دہانے پر دھکیل دیا۔'' البرٹ سسکیاں بھرنے لگا۔

''ہمت کرو تمہیں اب خود کو دیکھنا ہے اس وائرس سے لڑنا ہے۔'' ماریا پھیکی سی مسکراہٹ سے بولی اور پھر اپنی نگاہوں کا ارتکاز چھت کی جانب کر لیا۔

''اور یقیناً مجھے بھی.....'' اس نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔

✱✱✱✱

سورج کی چمکدار کرنیں اس کے گھر کے باہر بنی کیاری میں پڑ رہی تھیں ماریا اور جوزف نے اودھم مچا رکھا تھا وہ جوزف کے پیچھے پیچھے دوڑتی اور اسے پکڑنے کی کوشش کرتی مگر وہ اتنا پھرتیلا تھا کہ چکنی مچھلی کی طرح اس کے ہاتھ سے پھسل جاتا۔ سارا کیاری میں سبزیاں لگا رہی تھی۔ وہ گاہے بگاہے ان پر بھی نگاہ ڈالتی اور مسکرا دیتی تھی۔

''جوزف اب تم نہیں بچو گے۔'' ماریا نے نیچے جھک کر ہاتھوں پر خشک مٹی ملی اور پھر سے ایک نئے جوش و جذبے سے جوزف کو ہاتھ لگانے کو لپکی۔

''ہاہاہا ماریا تم مجھے نہیں پکڑ سکتی کبھی بھی نہیں بہتر ہے کہ ہار مان لو۔'' جوزف اسے منہ چڑاتے ہوئے بولا۔

''اچھا۔ یہ بات ہے تو یہ لو۔'' اس نے جست لگائی اور جوزف سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر اچانک سے بہت سا دلدلی کیچڑ پڑا ملا جس میں وہ اوندھے منہ دھپ سے جا گری۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ اسے فوری طور پر سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا۔

جوزف کی ہنسی کو بریک لگی اور وہ ماریا کی جانب دوڑا۔ سارا بھی سب چھوڑ چھاڑ جوزف کے پیچھے گئی۔

ماریا کو لگا کہ وہ معمولی کیچڑ نہیں تھا وہ اب خود کو اس میں دھنستا ہوا محسوس کرنے لگی تھی۔

''جوزف.....!'' اس نے منہ سے کیچڑ کی دبیز تہہ اتاری اور ہاتھ مارتے ہوئے چلانا شروع کر دیا۔

''ماریا میں آ رہا ہوں۔'' جوزف چلایا۔

جوزف نے اس سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

مگر پیچھے سے سارا نے آ کر دبوچ لیا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

''نہیں جوزف ہم اس کی مدد نہیں کر سکتے ہیں اس کیچڑ میں یہ اپنی وجہ سے دھنسی ہے۔ اگر ہم نے اسے بچانے کی کوشش کی تو ہم بھی اس کے ساتھ دھنس جائیں گے اور کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکے گا۔'' سارا نے ماریا کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''مام.....'' ماریا نے سارا کی طرف بے یقینی سے دیکھا اور پھر جوزف کو جو اپنے آپ کو ماں کے شکنجے سے خود کو چھڑانے اور ماریا کی مدد کرنے کے درپے تھا۔

اس کا وجود تیزی سے زیر زمین جا رہا تھا۔ ماریا نے ایک آخری بار اپنی ماں کو پکارا۔ کہ شائد اسے ماریا پر ترس آجائے۔ مگر سارا جوزف کو مضبوطی سے پکڑے جمی کھڑی رہی۔ ماریا کی آنکھ سے آنسو رواں ہوئے اور وہ اندر ہی اندر دھنستی گئی کہ آخر میں اس کا ہاتھ جو کسی مضبوط سہارے کا متمنی تھا وہ بھی دھنستے دھنستے اندر چلا گیا۔ اس کا دم گھٹنے لگا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا اور پھر سانس؟ وہ مر گئی۔

وہ چیخ مار کر اٹھی اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ ہسپتال کے اسی وارڈ میں ہے اس کی چیخ کی آواز سن کر البرٹ تو ہڑبڑا کر اٹھا مگر باقی ادھ بے جان جسموں نے محض خفیف سی حرکت کی، جو باعث آزار مصنوعی سہاروں کی بدولت نیند کی گمنام وادی میں سکون کے چند لمحے مستعار لیے محو خواب تھے۔

ایک وارڈ بوائے اور دو نرسیں جو باہر بیٹھے گپیں لگا رہے تھے اس اچانک افتاد پر دوڑے آئے۔

ماریا نے متوحش نگاہوں سے سب کی طرف دیکھا۔ اور گہرے گہرے سانس لینے کی کوشش کرنے لگی مگر ناکام رہی۔

''اوہ نو مجھے لگتا ہے اس کی بیماری بڑھ گئی ہے۔'' ایک نرس ساری صورتحال بھانپ گئی۔

ماریا کے سینے کا زیر و بم تیزی سے اوپر نیچے ہو رہا تھا اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی فقط سانس لینے پر زور تھا۔

''اوہ بے چاری۔'' البرٹ بے بسی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''مارگریٹ کھڑی کیوں ہو جاؤ ڈاکٹر اسٹیفن کو بلاؤ۔''

ماریا نے تکلیف کی شدت سے بستر پر سر پٹخنا شروع کر دیا اور تکلیف دہ سانسیں بھرنے لگی۔

❁❁❁❁

''اتنی اونچی آواز جوزف تم یہ ٹی وی آف کیوں نہیں کر دیتے۔ اس شور سے آج مجھے جانے کیوں وحشت ہو رہی ہے۔'' سارا نے کھانا بناتے ہوئے اسے ٹی وی بند کرنے کو کہا۔

''پتا نہیں میرا دل کیوں بے چین ہو رہا ہے ماریا کی بھی کوئی خیر خبر نہیں اگر ممکن ہوتا تو ہسپتال چلی جاتی۔'' اس نے تیزی سے چمچ ہلاتے ہوئے سوچا۔

اتنے میں باہر کا دروازہ بجنے لگا۔ وہ اپنے دھیان سے بے طرح چونکی۔

''جوزف دیکھو دروازے پر کون ہے؟'' اس نے چولہے کی آنچ دھیمی کی اور نیپکن سے ہاتھ صاف کرنے لگی۔

جوزف نے ٹی وی بند کر کے ریموٹ پھینکا اور دروازے پر پہنچ گیا۔ سارا ابھی تب تک نزدیک آ چکی تھی دل میں سرسراتے انجانے خدشوں کے ناگ نے پھن اٹھایا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی جو آشنا صورت نظر آئی وہ کسی اور کی نہیں آفیسر میڈی کی تھی۔

''مس سارا ہمیں آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے، کیا آپ ہم سے بات کرنے کے لیے تیار ہیں؟'' ماسک کے نیچے سے نہ تو آفیسر کے تاثرات پتا چل رہے تھے اور نہ ہی ماسک کے بغیر کھڑی سارا کے۔

''بیٹھیے۔'' اچانک سارا حرکت میں آئی اور میڈی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''شکریہ۔'' وہ ماسک کو نیچے کرتے ہوئے لکڑی کی ایک پرانی اور خستہ حال کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیا جوزف کو کہیں اور نہیں بھیج سکتے؟'' بات سنجیدہ نوعیت کی ہے جوزف کے کانوں میں نہیں پڑنی چاہیے۔'' آفیسر نے سرگوشیانہ لہجہ اپنایا۔

''جوزف اندر اسٹور میں چل کر کپڑے سمیٹو اور بیگ لے کر بیٹھو۔'' جوزف نے بلاں چوں چراں وہاں سے اٹھ جانے میں ہی غنیمت سمجھی۔

''جی آفیسر کیا بات کرنا چاہتے ہیں آپ؟'' سارا اسے اندر جاتا دیکھ کر میڈی کی طرف متوجہ ہوئی۔

''مس سارا ہمیں بہت افسوس کے ساتھ آپ کو بتانا

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

پڑ رہا ہے کہ آپ کی بیٹی کی حالت مزید خراب ہوگئی ہے۔ اس کے پھیپھڑے متاثر ہیں جس کی وجہ سے اسے سانس لینے میں دقت ہو رہی ہے۔'' آفیسر نے تفصیلات بتائی جسے سن کر سارا کی تو جیسے سانسیں رک گئیں۔

ماں کی سانسوں کی روانی تو اولاد کی سانسوں کی نازک ڈور سے بندھی ہوتی ہے۔ اور اب یہ ڈور ٹوٹ جانے کو تھی۔

''نہیں آفیسر ایسا نہیں ہوسکتا۔'' وہ بے یقینی سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''ان کے فادر کے گزر جانے کے بعد میں نے ہی ان دونوں کو ماں اور باپ بن کر پالا۔ اس کا باپ تو مجھے دغا دے گیا لیکن ماریا کیسے ایسے کرسکتی ہے؟'' وہ اتنا کہتی ہوئی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر التجا کرنے لگی۔

''پلیز کچھ کرو میری ماریا کو بچالو۔'' وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

''دیکھئے فی الحال تو کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہے شاید ماریا کو بچالیا جائے یا شاید ماریا.....'' آفیسر جملہ درمیان میں ہی ادھورا چھوڑ کر سارا کو دیکھنے لگا

جوزف ماں کے رونے کی آواز سن کر باہر نکل آیا۔

''کیا ہوا مام ماریا ٹھیک تو ہے نا۔'' جوزف نے ماں کی طرف بڑھتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔

''نہیں ہے وہ ٹھیک۔'' ماریا نے آنسوؤں سے تر چہرہ اوپر کرکے جوزف کی طرف دزدیدہ نگاہ کی۔

''نو مام ہم ماریا کے بنا کیسے جئیں گے۔'' جوزف دل گرفتہ سا ماں کے پاس گرنے کے انداز میں بیٹھا اور پھر دونوں ماں بیٹا ایک دوسرے کے گلے لگ کر رونے لگے۔

''میں چلتا ہوں مس سارا گاڈ سے دعا کیجیے۔ سنا ہے دعاؤں سے تقدیر بدل جاتی ہے۔'' آفیسر اپنی کیپ کو اتار کر دوبارہ سر پر جماتے ہوئے بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ سارا نے جوزف کو خود سے الگ کیا۔

''ایک دعا..... دن رات کا شمار کیے بغیر جانے کتنی دعائیں مانگ لیں۔'' سارا خالی نظروں سے آفیسر کو جاتا دیکھنے لگی۔

❁❁❁❁

''ممی..... مم..... ممی! جوزف.....'' وہ تیز اور گہرے سانسوں کے مدوجزر کے درمیان بھی دونوں کا نام لینا نہیں بھولتی تھی۔

البرٹ ری کور ہوکر جاچکا تھا۔ مگر جانے سے پہلے اس نے ماریا کو امید دلائی تھی۔

ماریا تم دیکھنا تم بھی ایک دن صحت یاب ہوکر باہر آؤ گی۔ البرٹ نے مسکراتے ہوئے وکٹری کا نشان بنایا اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

❁❁❁❁

زندگی کی ہولناکیوں میں سے ایک ہولناکی یہ بھی ہے کہ موت کو اتنا قریب ہوتا دیکھنا۔ اور پل پل ڈوبتی ابھرتی سانسوں کے درمیان فقط ابھرتی سانسوں کے تسلسل کی خواہش کرنا۔ وقت بہت کم لوگوں کو مہلت دیا کرتا ہے اور ماریا ابھی اور مہلت چاہتی تھی۔

''مجھے جینا ہے۔ میں جینا چاہتی ہوں۔ مجھے اپنی ماں اور بھائی کے لیے جینا ہے اس مرض سے لڑنا ہوگا اور میں لڑوں گی۔'' ماریا نے ایک نئے عزم سے ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر سر ہلا دیا۔

❁❁❁❁

''ماریا..... جوزف جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر آؤ تم لوگوں کے لیے مفن بنائے ہیں۔'' سارا کی زندگی سے بھرپور آواز گونجی۔

''جی مام ابھی آئے۔'' وہ دونوں بکس کو شیلف میں رکھ کر ہاتھ واش روم کی طرف بڑھے۔

ماریا کا ٹیسٹ پازیٹو آیا تھا لیکن اس کو بروقت ٹریٹمنٹ دے کر بچالیا گیا تھا۔ ایک ذرا سی احتیاط اور ہنستی مسکراتی زندگی ان کی منتظر تھی۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

زہریلی

مونا شہزاد

ہمارا معاشرہ اپنی بے حسی کے عروج پر ہے۔ بعض اوقات دیدہ و دانستہ کچھ ایسے کام کر جاتے ہیں جس سے حساس انسانوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا ہوجاتا ہے، اکثر لوگ تاریکی کی گہرائیوں میں کچھ اس طرح چلے جاتے ہیں کی انہیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ مگر جب پلٹ کر دیکھتے ہیں تو انہیں بہت دیر ہوچکی ہوتی ہے۔

ایک ایسی عورت کا قصہ جو تاریکی کا حصہ بن گئی تھی

سیما رضوی اپنے اکلوتے بیٹے کے گھر میں داخل ہوئی تو چکرا کر رہ گئی۔ وہاں پر گھمسان کا رن چل رہا تھا۔ دونوں میاں بیوی آج ایک دوسرے کے جانی دشمن بنے ہوئے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے خاور علیزے کو طلاق دے کر ہی دم لے گا۔ سیما رضوی بہت دنوں کے بعد بغیر اطلاع دیئے اپنے بیٹے بہو کو سرپرائز دینے کی نیت سے ان کے گھر ملنے چلی آئی تھیں، مگر وہاں تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ دو ہنسوں کا جوڑا آج ایک دوسرے کے خون کا پیاسا لگ رہا تھا۔

''ناہنجار عورت! میں تجھے طلاق دے دوں؟'' انھوں نے دیکھا ان کا ہونہار بیٹا منہ سے جھاگ اڑاتا بیوی سے کہہ رہا تھا۔

''تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ دے دو مجھے طلاق۔ فوراً ابھی کہ ابھی..... مجھے طلاق چاہیئے۔'' علیزے بھی غصے میں بھری بیٹھی تھی۔ پھر کر بولی۔

سیما رضوی کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ان کے جس بیٹے بہو کی محبت کی مثالیں لوگ دیتے تھے وہ آج کس بات پر اتنے

Anwar Azeem
www.pakistanipoint.com

برہم تھے؟

''مجھے تو آنٹی صاحبہ نے تمہاری حقیقت بتائی ہے۔ تم آفس کے بہانے غیر عورتوں کے ساتھ گل چھڑے اڑاتے ہو۔ بے غیرت شخص۔'' علیزے چیخ کر بولی۔

''مجھے خالہ صاحبہ نے ہی بتایا ہے کہ تم میرے کردار پر شک کرتی ہو، میری جاسوسی کرتی ہو۔ میں تمہیں.....'' خاور بپھر کر بولا۔

''خدا کی پناہ! تم لوگ صاحبہ کی باتوں میں آگئے ہو، وہ میری بہن ضرور ہے مگر ایسے ہی زہریلی مشہور نہیں ہے، میں اس بھول میں اس کا پردہ رکھ گئی کہ وہ اپنے سگے بھانجے کو تو بخش دے گی۔ مگر نہیں اس کی شر سے اب شاید اس کی اولاد بھی محفوظ نہیں ہے۔ اس کے ذہن میں یہی زہر ہے کہ اس کی شادی انصر بھائی سے کروانے کے ذمہ دار ہم سب ہیں۔'' سیمار ضوی نے اس کے منہ پر کس کر ہاتھ رکھا اور چیخ کر بولیں۔

خاور اور علیزے اپنا جھگڑا بھول حق دق سے رہ گئے۔ سیمار ضوی تھکے تھکے انداز میں صوفے پر گر گئی۔

❖❖❖❖

صاحبہ کو دیکھ کر کوئی بھی اس کی سادگی اور نیک دلی پر شک نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے خوبصورت ہونٹوں پر وقت ایک میٹھی سی مسکان کھیلتی رہتی تھی، اوپر سے اس کا بے مثال سوگوار حسن۔ اس کے ہاتھوں میں ہر وقت تسبیح رہتی تھی، ہونٹوں پر ذکر، سر پر سیاہ چادر۔ بیوگی کے باعث وہ اکثر سفید کپڑے یا ہلکے رنگوں کے کپڑے ہی پہنتی تھی۔ وہ رشتے داروں، دوست احباب کے غم ہو یا خوشی وہ ہر ایک موقعے میں شریک نظر آتی تھی۔ کسی گھر میں بیماری ہو، شادی کی تقریب ہو، موت ہوئی ہو، میاں بیوی کا جھگڑا ہو وہ ہر جگہ موجود ہوتی تھی۔ اسے لوگوں کو اپنا بنانے کا فن آتا تھا وہ ہر کسی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی غم گساری کرتی تھی۔ وہ بوڑھی عورتوں کی بھی دوست تھی، وہ اس سے بلا جھجک اپنی بہوؤں کی شکایات کرتیں۔ وہ بہوؤں کی بھی دوست تھی، اکثر بہوئیں اپنے دل کے پھپھولے اس کے سامنے پھوڑتیں۔

وہ کم عمر لڑکیوں بالیوں سے بھی کھٹی میٹھی باتیں کرتی تھی۔ وہ کل جگ کی سہیلی تھی۔ وہ نہ صرف عورتوں کے حلقے میں مقبول عام تھی بلکہ اسے خاندان بھر، محلے بھر کے مرد بھی بہت پسند کرتے تھے اور دل سے اس کی عزت کرتے تھے۔

ہر ایک اپنی عمر کے حساب سے اسے احترام سے آپا، باجی، آنٹی یا بی بی کہہ کر بلاتا تھا۔ وہ جس کے پاس کھڑی ہوتی اس سے راز کی باتیں اگلوا لیتی۔ عورتیں خاص طور پر جذبات کی رو میں بہک کر اسے اپنی ساری شکایات اور محرومیاں بتا دیتی تھیں۔ بس پھر ہمدرد صاحبہ اپنی میٹھی مسکراہٹ کی آڑ میں ایسا کھیل کھیل جاتی تھی کہ کوئی ناقابل تلافی نقصان ہو چکا ہوتا تھا۔

رفتہ رفتہ کچھ لوگوں پر اس کی حقیقت کھل گئی مگر اس کی برائی کر کے اپنے آپ کو متنازعہ بنانے کے بجائے سمجھدار لوگوں نے اس سے فاصلہ اختیار کرنا شروع کر دیا تھا مگر وہ کسی کو تنہا نہیں چھوڑتی تھی، کبھی فون کر کے کبھی گھر جا کر سارے گھریلو مسائل اور تنازعوں کی معلومات حاصل کرنے کی بھرپور کوششیں کرتی رہتی تھی۔ اس کے میٹھے زہر سے ڈسے ہوئے لوگ اسے پیٹھ پیچھے زہریلی کے نام سے یاد کرتے تھے۔

❖❖❖❖

آج بھی خاور کے گھر سے لگائی بجھائی کر کے واپس آ کر وہ بہت شاد تھی۔ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو

غزل

انجان بن رہا تھا مگر جانتا بھی تھا
دل کو محبتیں بھی اس سے گلہ بھی تھا
اب کچھ یاد نہیں رہا بچھڑے تھے کس جگہ
کچھ دور ساتھ ساتھ وہ میرے چلا بھی تھا
پچھلے برس ملا تھا بڑے اہتمام سے
آنکھوں میں رت جگے بھی رنگ حیا بھی تھا
برہم سا ہو بھی جاتا تھا وہ میرے ذکر پر
لیکن اکیلے پن میں مجھے سوچتا بھی تھا
یہ اور بات ہے کہ راس آئیں نہ رونقیں
اک شہر آرزوؤں کا دل میں بسا بھی تھا
اب اختلاف کرتا ہے میرے خیال سے
پچھلے برس تو ساتھ میرے آئینہ بھی تھا

رابعہ افضل.....قصور

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

کر انگڑائی لی اور مسکرائی۔ اچانک اس نے دیکھا اس کا عکس مسکرا نہیں رہا تھا۔ وہ اسے ملامتی نظروں سے گھور رہا تھا۔

''میرے ساتھ کون سا کسی نے اچھا کیا تھا جو میں کسی کی خیر چاہوں۔ میں تو ناگن بن کر سب کو ڈس لینا چاہتی ہوں۔'' اس نے شرمندگی سے نظریں چرائیں اور بولی۔

اس کا عکس رنجیدہ سا آئینے میں کھڑا رہ گیا وہ سر جھٹکتی ہوئی بستر پر آ گری۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کی فلم چل پڑی۔

اسے یاد آیا کہ موسم بہار کی وہ ایک سہانی شام تھی۔ ہوا پھولوں کی خوشبو سے بوجھل تھی۔ وہ بھی پھولوں کی ڈال بنی مہک رہی تھی۔ سکھیاں اس کے کانوں میں کھٹی میٹھی سرگوشیاں کر رہی تھیں، اس کے جسم میں ایک عجب سی سنسنی سی پھیل رہی تھی۔ وہ شرم سے سرخ ہوتے ہوئے مسکائے جا رہی تھی۔ بہت منتوں مرادوں اور طویل انتظار کے بعد یہ خوشیوں بھرا دن اس کی زندگی میں آیا تھا۔ اس دلہن کا روپ اختیار کرنے کے لئے اس نے ہر وظیفہ، ہر دعا کی تھی۔ اس نے لجا کر سوچا۔

''اب میں بھی کسی کی آنکھوں میں رہوں گی۔ میرا بھی کوئی سانوریا ہوگا جو مجھے ٹوٹ کر پیار کرے گا۔'' اس کے چشم تصور میں ایک چھ فٹ لمبا چوڑا، وجیہہ و شکیل شخص آ گیا۔

''جب چھوٹا بھائی اتنا وجیہہ و شکیل ہے تو اس کے بڑے بھائی صاحب کتنے وجیہہ ہوں گے؟'' اس نے سوچا۔

اتنے میں شور اٹھا کہ بارات آ گئی ہے۔ سب لڑکیاں بالیاں بالکونی میں بارات دیکھنے کے بہانے بھاگ گئیں۔ وہ کمرے میں تنہا رہ گئی۔ آج تو اس کی دھڑکنیں بھی محبت کی لے پر مستانی ہوئی جا رہی تھیں۔ اسے بغیر دیکھے ہی اپنے ہونے والے شریک حیات سے محبت محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کے بے چینی کے سمندر کو کنارہ ملنے والا تھا۔ ایک گبرو جوان اسے اپنی رانی بنانے والا تھا۔ صاحبہ نے تنہائی کو غنیمت سمجھتے ہوئے، شرماتے ہوئے شیشے پر نظر ڈالی۔ وہ اپنا عکس دیکھ کر ایک لمحے کے لئے مبہوت رہ گئی۔ دلہن بن کر وہ واقعی کوئی حور لگ رہی تھی جو جنت سے بھٹکتی ہوئی زمین پر آ گئی تھی۔

سہاگن بننے کی نوید کیسے روپ رنگ کو نکھار دیتی ہے وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ وہ آج بہت حسین لگ رہی تھی۔

اسے اپنا آپ بہت انمول اور نایاب سا محسوس ہوا۔ اس کا تعلق ایک اوسط درجے کے شریف گھرانے سے تھا۔ اس کا نمبر بہن بھائیوں میں چوتھا تھا۔ اس کے بڑے بہن بھائی خاندان میں ہی بیاہے گئے تھے۔ مگر صاحبہ کے جوڑ کا رشتہ اب خاندان میں نہیں تھا۔ اس نے ایف اے کہ امتحانات کے فوراً بعد ہی اپنے آپ کو سلائی کڑھائی، فلاور میکنگ اور دیگر دستکاری کے کورسز میں مصروف کر لیا تھا۔

وہ بہت کم گو اور سلیقہ شعار تھی۔ اس کی ماں جی کو امید تھی کہ بہت جلد صاحبہ بیاہ کر اپنے گھر سدھار جائے گی۔ مگر ان کی امیدیں برآور نہ ہو سکیں۔ ہزار کوشش کے باوجود صاحبہ کا رشتہ کہیں طے نہیں ہو پایا۔ لوگ رشتہ دیکھنے آتے، اس کی خوبصورتی اور سلیقہ مندی کی تعریفیں کرتے اور پھر ان کے گھر کی عسرت اور غربت دیکھ کر منہ موڑ کر چلے جاتے۔ سال پر سال گزرتے گئے۔ ایک روز ماں جی اس کے لمبے سیاہ بالوں کو تیل لگا رہی تھیں کہ انھیں اس کی سیاہ طویل زلفوں کے بیچ میں چاندی کے تار بھی چمکتے نظر آئے۔ وہ ہول اٹھیں۔ انھوں نے سختی سے وہ تار اس کے سر سے کھینچ ڈالے، دو چار دھمو کے اس کی کمر پر جڑے اور جلدی جلدی اس کی چوٹی کس کر بنا ڈالی۔

''نامراد! چھبیس سال کی ہونے والی ہے اور ابھی تک شادی بیاہ کی کوئی سبیل نہیں بن پا رہی۔ کتنی بار کہا ہے کہ محنت وظیفے پڑھا کر۔ پیر صاحب کے مزار پر میرے ساتھ چلا کر۔ مگر مجال ہے جو اس کو کوئی فکر ہو۔ اماں باوا کا ہی خون پئے گی اور ہمیں قبر تک پہنچائے گی۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے بول رہی تھیں۔

آج میں نصیبن بوا سے کہتی ہوں کہ تیلی، نائی، ماشکی جس مرضی کا رشتہ تیرے لیے اب لے آئے۔ میں نے تجھے بیاہ کر دم لینا ہے۔'' پھر انھوں نے اپنے سر پر شٹل کاک برقعہ ڈالا اور بڑبڑاتی ہوئی گھر سے نکل گئیں۔

صاحبہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ سمجھ نہ پائی کہ ماں جی کو اس کے سر میں چاندی کے تار دیکھ کر اتنا غصہ اس پر کیوں آیا تھا..... اس کا کیا قصور تھا؟ رشتہ مسترد ہونے پر اس پر کیا گزرتی تھی اس کی پروا کسی کو نہیں تھی۔ وہ آزردہ سی ہو کر بالکونی میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا دل بہت غمگین تھا۔ اس کا من کیا کہ وہ چیخ چیخ کر راہ گیروں سے کہے۔

www.pakistanipoint.com

''دیکھو غور سے مجھے مجھ میں کس چیز کی کمی ہے، میں تم لوگوں کے گھر کی عورتوں سے زیادہ حسین اور سلیقہ شعار ہوں۔ مگر میرے والدین مجھے جہیز نہیں دے سکتے۔ میرے بابل کے عسرت زدہ آنگن کو دیکھ کر تمہاری ماؤں، بہنوں کی نظریں بدل جاتی ہیں۔ خدارا! اپنے گھر کی عورتوں کی آنکھوں پر بھروسہ مت کرو۔ میرے روپ کا چندن عمر کے ہندسوں سے کٹ کٹ کر ماند پڑتا جا رہا ہے۔ میرے حصے میں صرف مسترد کیے جانے کا دکھ ہے۔ میں ایک جیتی جاگتی لڑکی نہیں ہوں بلکہ بازار کے کارنس پر سجی ایک گڑیا ہوں۔ جس کے کوئی احساسات اور جذبات نہیں ہوتے۔ جسے ہر خریدار مسترد کر دیتا ہے مگر وہ بے حس کارنس پر سجی پڑی رہتی ہے۔'' اچانک اس کی سوچوں کا تار اباجی کے کھنکھارنے کی آواز سے ٹوٹ گیا۔

اس نے سر پر دوپٹہ صحیح کیا اور بالکونی سے پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے دیکھا اباجی کی آنکھوں میں بھی شکوک و شبہات کی دنیا آباد تھی۔ وہ اسے شک بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بالکونی میں آ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے بالکونی سے نیچے جھانکا نیچے بازار کی چہل پہل جاری و ساری تھی، مگر انھیں کوئی بھی نوجوان اوپر بالکونی کی طرف متوجہ نظر نہیں آیا۔ انھوں نے سکھ کا سانس لیا اور صاحبہ کو نظر بھر کر دیکھا۔ ان کے ذہن میں اچانک ہی ایک فسادی سوچ نے سر اٹھایا، شیطان ان کی سوچ کا روپ بدل کر بولا۔

''کنواری بیٹی ایک بھاری سل کی مانند ہوتی ہے۔ جو وقت بے وقت والدین کا سانس گھوٹتی رہتی ہے۔ کہیں یہ سل عمر بھر کے لئے میرے سینے پر دھری کی دھری نہ رہ جائے۔ میں کس طرح لوگوں کی زبانیں بند کروں گا، میں یہ بوجھ ساری عمر نہیں ڈھو سکتا۔؟'' انھوں نے بے اختیار ہی اونچی آواز میں کہا۔

صاحبہ نے کمرے میں جاتے جاتے مڑ کر دیکھا، اس کے ابا کے چہرے کے تاثرات اور الفاظ نے جیسے اس کے نازک دل پر ایک چرکا اور لگا دیا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے لمبی ناگن جیسی چوٹی اس کے کولہوں پر جھولتی شاید یہی تکرار کر رہی تھی۔

''عورت ہونا بھی کس قدر بڑی آزمائش ہے۔''

❖❖❖❖

آنے والے دنوں میں شریفن بوا نے رشتوں کی بھرمار کر دی۔ اندھے، لنگڑے، عمر رسیدہ غرض ہر قسم کے الٹے سیدھے رشتوں نے جیسے ان کی چوکھٹ دیکھ لی تھی۔ صاحبہ خوف سے زرد پڑتی جا رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ردی کا کوئی مال تھی جسے اماں ابا کسی بھی گئے گزرے کے ہاتھ تھما دیں گے۔ ایسے میں انصر کا رشتہ اس کے بھائی بہنیں لے کر آئے۔ وہ سب کھاتے پیتے آسودہ حال، خوش شکل لوگ تھے۔ وہ دو گاڑیوں میں بیٹھ کر آئے تھے۔ انھوں نے صاحبہ کو دیکھتے ہی ہاں کر دی۔ اماں ابا تو جیسے خوشی سے دیوانے سے ہو گئے تھے۔ وہ ان کے سامنے بچھے جا رہے تھے۔

انصر کے بہن بھائیوں نے بتایا کہ انصر ان کے بڑے بھائی تھے۔ ان کے والدین کی وفات کے بعد انھوں نے نہ صرف کاروبار سنبھالا تھا بلکہ اپنے بہن بھائیوں کو بھی سنبھالا تھا۔ اس لئے ان کی شادی وقت پر نہ ہو سکی تھی۔ انصر کی بہن نے اپنے ہاتھ سے ڈائمنڈ کی انگوٹھی اتار کر صاحبہ کو پہنا ڈالی۔ صاحبہ اپنے نصیب پر نازاں ہو گئی۔ اس کے رب سے تمام گلے شکوے مٹ گئے تھے۔ اسی روز انھوں نے مہینے بعد کی شادی کی تاریخ بھی دے دی۔ اماں ابا نے تو فوراً حامی بھر لی۔ مہینہ بھر گزرتے پتا ہی نہیں چلا۔ اس کے سسرال سے بہت شاندار بری اور بھاری طلائی زیورات آئے تھے۔ مگر اس سارے عرصے میں نہ ہی انصر نے اپنے ہونے والے سسرال کوئی چکر لگایا اور نہ ہی اس کی کوئی تصویر اسے بھیجی گئی۔ وہ بھی شرم کے مارے کسی کو کچھ نہیں کہہ سکی۔ اس نے ایک دو دفعہ بڑی بہنوں سے انصر کے متعلق پوچھنا چاہا مگر انھوں نے اس کی بات ہنسی مذاق میں اڑا دی۔

آج وہ دلہن بنی پیا سنگ چلنے کو تیار تھی۔ نکاح کے بعد مبارک سلامت کا شور بلند ہوا۔ کچھ رسومات کے بعد رخصتی بھی ہو گئی۔ صاحبہ رخصت ہو کر ایک دو کنال کی خوبصورت کوٹھی میں آ گئی۔ حجلہ عروسی کی خوبصورتی اور سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ آخر کار اس کی نندیں اور دیور کمرے سے رخصت ہو گئے۔ وہ آنکھیں بند کر کے بیٹھی تھی کہ بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس کا دل مدھر لے پر دھڑک رہا تھا۔ آنے والا اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

''آنکھیں تو کھولو بنو۔'' اس نے اس کا گھونگھٹ اٹھایا، اس کے ہاتھوں میں کنگن پہناتے ہوئے بھدی آواز اور اجڈ لہجے میں بولا۔

''موصوف مذاق کر رہے ہیں۔ آواز بھدی بنا کر بول رہے ہیں۔'' صاحبہ نے شرماتے ہوئے سوچا۔

اس نے مسکراتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور وہ ششدر سی رہ گئی۔ اس کے سامنے ایک سیاہ رنگت کا ادھیڑ عمر بے ڈھنگا موٹا سا شخص بیٹھا تھا۔ وہ شخص بدصورتی میں اپنی مثال آپ تھا۔ صاحبہ نے بے اختیار ہی اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑوایا اور جست لگا کر مسہری سے نیچے اتر گئی۔

''تم کون ہو، یہاں میرے کمرے میں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے کپکپاتے ہونٹوں سے اونچی آواز میں پوچھا۔

''کیا پاگل ہو گئی ہو۔ میں انصر ہوں۔ تمہارا شوہر۔''

اس بے ڈھنگے، بدصورت شخص کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ وہ ہکلا کر بولا۔

''نہیں تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم انصر نہیں ہو سکتے۔ انصر اتنے بدصورت نہیں ہو سکتے۔'' صاحبہ کے سپنوں کا محل دھڑام سے زمین بوس ہو گیا۔ وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

احساس ذلت سے اس شخص کا چہرہ مزید سیاہ پڑ گیا۔ اس نے اٹھ کر ایک چانٹا اسے رسید کیا اور اسے مسہری پر کھینچ لیا۔ صاحبہ مچلتی تڑپتی رہ گئی۔ فاتح افواج مفتوحہ علاقے کو تخت و تاراج کرتی گزرتی چلیں گئی۔

صاحبہ صبح سویرے ٹوٹی پھوٹی گھسٹتی ہوئی باتھ روم میں گئی۔ اس کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا تو ڈر گئی۔ اس کے چہرے پر نیل کے نشانات تھے۔ اس کی سہاگ رات اس کا خوفناک خواب ثابت ہوئی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس وحشی درندے کے ساتھ ایک پل مزید نہیں گزارے گی۔ اس نے عزم مصمم کیا۔ وہ غسل کر کے تیار ہو کر باہر آئی تو اسے اس کی نند نے اطلاع دی کہ اس کی ماں اور بہنیں مکلاوہ لینے آئی تھیں۔

صاحبہ نے ضبط سے سر ہلایا اور سر جھکائے اس کے ساتھ ڈائننگ ہال کی جانب چل پڑی۔ اس کی ماں جی اور بہنیں بہت تپاک سے اسے ملیں مگر صاحبہ مٹی کا مادھو بنی رہی۔ اسے ناشتے کے بعد جیسے ہی ماں بہنوں کے ساتھ تنہائی ملی وہ پھٹ پڑی۔ اس نے روتے ہوئے بڑی بہنوں کو کہا۔

''تم لوگ خود کو میری بہنیں کہتی ہو، تم لوگوں نے تو مجھے وہ سزا دی ہے جو کسی دشمن کو بھی نہیں دی جاتی؟'' اس نے روتے ہوئے وہ دانتوں کے کاٹنے کے نشانات اور اپنے جسم کے نیل دکھائے۔

اس کو توقع تھی کہ ماں جی اور بہنوں کا دل پسیج جائے گا، وہ انصر اور اس کے گھر والوں سے کوئی پوچھ گچھ کریں گی مگر اس کی توقع کے خلاف ماں جی ٹھہرے ٹھہرے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں بولیں۔

''انصر تیرے سر کا سائیں ہے۔ تجھے اس کو ہر قیمت پر خوش رکھنا ہے۔ ہم سے کسی مدد کی توقع مت رکھنا۔'' یہ کہہ کر انھوں نے شٹل کاک برقع اٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔

''مرد کو منہ در منہ جواب دیتی، زور آور عورت اچھی نہیں لگتی۔ تو ذرا میٹھی ہو جا، مسکرایا کر وہ خود بخود نرم ہو جائے گا۔ تجھ سے محبت کرنے لگے گا۔'' بڑی آپا سیما نے چادر اوڑھتے ہوئے کہا۔

❖❖❖❖

آنے والے دن صاحبہ کے لئے بہت تکلیف دہ تھے۔ انصر ایک تشدد پسند اور انتہائی شکی مزاج شخص تھا۔ وہ اسے بدترین جنسی اذیت دیتا، وہ تڑپ جاتی مگر وہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیتا۔ صاحبہ کی زندگی ایک امتحان بن کر رہ گئی تھی۔ اسے انصر کے ساتھ تنہائی کا تصور ہی خوفزدہ کرتا تھا۔ اسے اپنے میکے رشتوں کی سفاکی اور خود غرضی یاد آتی تو وہ حیران ہو جاتی۔ اس کے ولیمے کے بعد سے اس کے میکے سے کسی نے اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ صاحبہ کا بھی جیسے دل مر سا گیا تھا اس نے اپنی اماں اور بہن بھائیوں سے فون پر رابطہ کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

شادی کے کچھ دنوں کے بعد انصر نے مجبوراً دوبارہ فیکٹری جانا شروع کر دیا تھا۔ صاحبہ نے بھی سکون کا سانس لیا، اس جلاد کی عدم موجودگی اس کے لئے ایک نعمت تھی۔ مگر انصر بہانے بہانے سے کئی دفعہ بتائے بغیر گھر اچانک آ جاتا تھا۔ صاحبہ کو اندازہ ہوا کہ انصر اس کے کردار پر شک کرتا تھا۔ صاحبہ کے معصوم دل میں انصر کی نفرت کا پودا دن بدن تناور درخت بنتا جا رہا تھا ایسے میں صاحبہ کو احساس ہوا کہ وہ ماں بننے والی تھی۔ صاحبہ اس خوشخبری

www.pakistanipoint.com

سے خوش ہو جانے کے بجائے آزردہ ہو گئی تھی اس کا دل کیا کہ وہ اس حیوان کی اولاد کا بھی گلا گھونٹ دے۔ مگر وہ اس گناہ کا سوچ کر ہی کانپ اٹھی۔ اس کو انصر کے ظلم و ستم سے بچنے کا یہی حل نظر آیا کہ وہ اس خبر کو اس کے گوش گزار کر دے۔

اولاد کی خوشخبری کا سن کر انصر کا رویہ اس سے قدرے بہتر ضرور ہوا مگر ابھی بھی وہ اسے جھنجھوڑ ڈالتا تھا۔ صاحبہ نے محسوس کیا کہ اس کی نندیں، دیور اس کے میاں کی حرکات اور وہی طبیعت سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس کے دیور اور نند وئی اس سے بہت محدود سی گفتگو کرتے تھے۔ اس کی نندیں کیونکہ بھائی سے پیسہ مختلف بہانوں سے اینٹھتی رہتی تھیں اس وجہ سے وہ اس کی تعریفوں کی مالا ہی جپتی رہتی تھیں۔ ایک دن اس کی بڑی نند جنھیں سب منی آپا کہتے تھے اس کی خوش نصیبی کے قصیدے پڑھنے میں مصروف تھیں۔ صاحبہ پہلے تو خاموشی سے سنتی رہی مگر پھر نجانے اسے کیا ہوا؟

''اللہ کرے منی آپا! آپ کی پانچوں بیٹیوں کو انصر جیسا شوہر نصیب ہو۔'' وہ بے اختیار ہی بول اٹھی۔

اس کے یہ الفاظ نکلنے کی دیر تھی کہ منی آپا کی زبان کو بریک لگ گیا۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنے گھر روانہ ہو گئیں۔ صاحبہ کے ہونٹوں پر ایک خوبصورت مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی اس دن شاید صاحبہ مر گئی تھی اور زہریلی کا باقاعدہ جنم ہوا تھا۔

❖❖❖❖

بڑے بھائی صاحب کی بیٹی کے نکاح کی تقریب تھی۔ پنڈال مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ اچانک صاحبہ ایک وجیہہ شخص کے ساتھ پنڈال میں داخل ہوئی۔ آج صاحبہ کا روپ لشکارے مار رہا تھا۔ صاحبہ نے اس شخص کی بانہوں میں بانہیں ڈالی ہوئی تھیں۔ تمام لوگ متعجب تھے، صاحبہ بیوہ تھی، جوان بیٹوں کی ماں تھی، اس کے اپنے بیٹے بھی شادی شدہ تھے۔ وہ جلد ہی دادی بننے والی تھی۔ ہر آنکھ سوالی تھی۔ صاحبہ نے سٹیج پر آ کر دلہا دلہن کو سلامی دی۔

''آپ سب کی آنکھوں میں ایک سوال ہے۔ چلیں میں خود ہی تعارف کروا دیتی ہوں۔ یہ رضا زیدی صاحب ہیں ہماری فیکٹری کے ڈائریکٹر میں نے ان سے نکاح ثانی کر لیا ہے۔'' وہ مولوی صاحب سے مائیک لے کر بولی۔

صاحبہ نے ایک ادا سے اس شخص کا ہاتھ تھاما اور لہراتی ہوئی، مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ پورے پنڈال میں جیسے آگ لگ گئی تھی۔ ہر طرف زہریلی، زہریلی کی پکار مچ گئی تھی۔ بڑے بھائی صاحب تو سینہ ملتے ہوئے تیورا کر گر گئے تھے۔

''زہریلی اس خوشی کے موقعہ پر بھی زہر اگلنے سے باز نہیں آئی۔ ہماری خوشیوں کو ڈس گئی۔'' سیما رضوی جل کر بولیں۔

''خدارا بس کر دیجیے۔ وہ زہریلی نہیں ہے۔ آپ لوگ اور یہ معاشرہ زہریلا ہے۔ یہ رشتے زہریلے ہیں جو ایک انسان سے اپنے ہونے کا خراج لیتے رہتے ہیں۔ خالہ صاحبہ نے کچھ غلط نہیں کیا۔ انھوں نے ایک ناپسندیدہ تعلق کو صرف ہماری نانی اور نانا ابا کی نام نہاد عزت اور ضد کی خاطر نبھایا حالانکہ اسلام انھیں خلع کا حق دیتا تھا۔ مگر اپنے میکے کی عزت کی خاطر وہ ایک شخص کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتی رہی۔ ایک مرد کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنی ہی بیوی کو ایسے نوچے کھسوٹے جیسے وہ لوٹ کا مال ہو۔ اپنی ہی بیوی کی کردار کشی کرتا رہے۔ اسے بیسوا قرار دیتا رہے۔ مگر انصر خالو یہ سب اپنی زندگی میں علی الاعلان کرتے رہے۔ بڑے ماموں سے لے کر چھوٹے ماموں تک کوئی خالہ صاحبہ کی حمایت میں ایک لفظ نہیں بولا۔ خدارا اب انھیں بخش دیجیے۔ خالو انصر کی وفات کے بعد وہ آزاد ہیں، عاقل و بالغ ہیں اور اسلام انھیں دوسرے نکاح کی اجازت دیتا ہے۔ اس لئے اب اس زہریلی کی اصطلاح کا استعمال بند کر دیجیے۔ کوئی بھی شخص زہریلا نہیں ہوتا ہمارے معاشرتی رویوں کی بے حسی اسے زہریلا بنا دیتی ہے۔''

پورے پنڈال پر سکوت کا عالم طاری تھا۔ ہر شخص خود احتسابی کے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر شرمندہ تھا۔ شاید پورا پنڈال ہی انسانوں سے نہیں بلکہ سانپوں سے بھرا ہوا تھا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

(قسط نمبر 5)

وجود حیات

عرفان رامے

ایک ایسے انسان کی کہانی جو اپنے ہی وجود کی کرچیاں سمیٹتے ہوئے وہ بہت دور نکل آیا تھا

وجود میں حیات تلاشنا آسان نہیں بسا اوقات وجود ہوتا ہے لیکن حیات نہیں اور کبھی حیات وجود تلاشتے تھک ہار کر جان ہی دے دیتی ہے مگر معلوم نہیں اس سلسلے میں کس موڑ پر وہ اپنے وجود سے الگ ہوئی حیات کو ڈھونڈ بھی پاتا ہے یا نہیں۔

زندگی انجان راستوں کا سفر ہے۔ اس میں کون، کب، کہاں اور کیسے مل جائے کوئی نہیں جانتا۔ لمحے جب کھو جائیں تو پچھتاوے باقی رہ جاتے ہیں۔ محبتوں کے پڑاؤ میں وفاؤں کے سائباں نہ ہوں تو راستہ کٹھن ہو جاتا ہے۔

رشتوں کے درمیان شیشے کی دیوار کی کہانی محبتوں، عداوتوں اور سازشوں میں گندھی سحر انگیز سلسلے وار کہانی

رباب کا جسم بالکل ساکت تھا۔ یقیناً اُسے دیوتا کو خوش کرنے کے لیے بھینٹ چڑھا دیا گیا تھا۔ جب کہ قریب کھڑے تیمور برنی کا وجود غم و غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس کے سینے میں بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ لحہ بہ لحہ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ رباب کو یہاں لانے والے شوکال کی لاش وہ پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ یہ ایک معمہ تھا کہ اگر شوکال مر چکا ہے تو رباب کو کس نے مارا، کیا شوکال کے علاوہ بھی کوئی اس مندر میں موجود ہے جو اس سے زیادہ طاقتور ہے؟

''دیکھو تیمور! اِس کی سانس چل رہی ہے..... یہ مری نہیں زندہ ہے۔'' تیمور برنی ابھی سوچوں میں گم تھا کہ فاخر کی سرگوشی نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

فاخر کی بات سن کر تیمور کئی ثانیے رباب کو گھورتا رہا۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے مایوسی کی اتھاہ تاریکی میں اُمید کی کرن روشن ہو گی ہو۔ اس کا دل خوشی کے جذبات سے معمور ہو گیا تھا۔ اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا اور رباب زندہ تھی۔ سفید چادر کے نیچے اس کے سینے میں سانس کا اُتار چڑھاؤ صاف محسوس ہو رہا تھا۔

تیمور برنی کو اس بات کی ہرگز توقع نہیں تھی کہ رباب ابھی تک زندہ ہو گی۔ یہ ایک معجزہ تھا جسے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ قربان گاہ میں اس کی موجودگی اس خطرے کا پیش خیمہ بھی ہو سکتی تھی کہ اُسے قتل کرنے کا فیصلہ کیا جا چکا ہے اور کوئی شیطان صفت پروہت کسی مبارک ساعت کا منتظر ہے۔ تیمور برنی جلدی سے آگے بڑھا اور رباب کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا، وہ بہت دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔ شاید اُسے کسی نیند آور دوا کے زیر اثر رکھا گیا تھا۔

''ہمیں رباب کو لے کر یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ اگر کسی کو یہاں ہماری موجودگی کا علم ہو گیا تو جانے کب مصیبت آن پڑے۔'' فاخر نے مشورہ دیا۔

تیمور برنی نے بھی اس سے اتفاق کیا۔ وہ بے ہوش رباب کو اپنی بانہوں میں اُٹھانے ہی والا تھا کہ برآمدے میں کسی کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ شاید کوئی اسی کی طرف ہی آ رہا تھا۔ آہٹ پاتے ہی تیمور برنی رباب کو وہیں چھوڑا اور دونوں بجلی کی تیزی سے دیوقامت مجسمے کے عقب میں جا چھپے۔

تیمور برنی کی گرفت ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کے دستے پر اور فاخر کی پکڑ نیزے پر مضبوط ہو چکی تھی۔

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

SHINYO SAWAK

کسی بھی خطرے سے نمٹنے کے لیے تیار تھے۔ قدموں کی آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آتی چلی جارہی تھی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور مضبوط جسم کا ایک ادھیڑ عمر آدمی اندر داخل ہوا۔ اُس نے پروہت کا مخصوص لباس پہن رکھا تھا۔

پروہت کے قدموں کی لڑکھڑاہٹ اور آنکھوں کی خماری بتا رہی تھی کہ وہ نشے میں ہے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے سرسری انداز میں چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر لڑکھڑاتا ہوا رباب کے قریب آ کھڑا ہوا۔ نشے کی حالت میں بھی پروہت کی شخصیت بہت پرشکوہ اور سحر انگیز دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے گلے میں قیمتی جواہرات کی مالا اور انگلیوں میں قیمتی پتھروں سے جڑی انگوٹھیاں تھیں۔ اس مندر میں پروہت واقعی کسی دیوتا کی مانند مافوق الفطرت ہستی محسوس ہو رہا تھا۔

چند لمحے بغور رباب کا چہرہ دیکھنے کے بعد پروہت نے جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی اور سیال محلول کے چند قطرے اس کے منہ میں ٹپکا دیے۔ اب وہ اس کے سرہانے بیٹھ گیا تھا۔ اس عمل کو کچھ ہی دیر گزری تھی کہ رباب نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں اور خوف زدہ نظروں سے چھت کو گھورنے لگی۔ پھر جیسے ہی اس کی نظر سرہانے بیٹھے پروہت کے چہرے پر پڑی وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی اور ہذیانی آواز میں چلائی۔

''نہیں..... نہیں میرے ساتھ اتنا برا سلوک مت کرو..... مجھے مت مارو۔ خدارا مجھے آزاد کردو۔''

اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہو کر پروہت نے شیطانی قہقہہ لگایا۔ اس وقت تیمور برنی اور فاخر کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ انگریزی زبان میں اس سے مخاطب ہوا۔

''تم بہت خوب صورت ہو، نادان حسینہ یہ کیسے سوچ لیا کہ تمہیں قربان کر دیا جائے گا۔ میں اتنا بے حس اور بدذوق ہرگز نہیں کہ تم جیسی کانچ کی گڑیا کو اس بے جان بت کے قدموں میں قتل کر دوں..... حقیقت یہ ہے کہ اس سے قبل بھی کبھی بھینٹ کے لیے لائی جانے والی کسی حسینہ کو قتل نہیں کیا گیا۔ اب شوکال مر چکا ہے۔ وہ بالکل احمق تھا۔ اُسے جو فرائض سونپے گئے وہ انھیں بھول گیا تھا۔ تبھی تو مجھے اسی ویران جزیرے پر آ کر اُسے ٹھکانے لگانا پڑا۔ اب اس مندر اور جزیرے کا بادشاہ میں ہوں۔ مجھ پر اعتماد کرو، تمہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہ تم سے جگرال کا وعدہ ہے۔''

پروہت جس کا نام جگرال تھا سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''اگر یہاں دیوتا کو بھینٹ نہیں چڑھائی جاتی تو مجھے یہاں لانے کا کیا مقصد ہے؟'' رباب نے پوچھا۔

''تمہیں یہاں لانے کا مقصد اپنی تنہائی کو دُور کر کے اس ویران مندر کی وحشت کو کم کرنا ہے۔ تم سے پہلے لائی جانے والی لڑکیوں کی ذمہ داری بھی یہی تھی۔ شوکال کا دل جب کسی لڑکی سے بھر جاتا تھا تو وہ بہانے سے قبیلے والوں سے نئی لڑکی مانگ لیتا تھا جب کہ پہلی لڑکی کو زہر دے کر مار دیا جاتا تھا۔ اب تم میرے ساتھ رہو گی۔ میں تمہیں محبت اور عزت ہی نہیں یہ حق بھی دوں گا کہ تم میرے دل پر حکمرانی کر سکو..... بہت جلد تمہیں اس ویرانے میں دنیا کی ہر آسائش میسر ہو جائے گی۔ تمام راحتیں تمہارے قدموں میں ہوں گی۔ میں تمہیں اپنی ملکہ بنا کر رکھوں گا..... بہت جلد تمہاری زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہونے والا ہے۔'' جگرال نے تفصیل بتائی۔

''نہیں، ہرگز نہیں، میں اس ویران مندر میں زندگی نہیں گزار سکتی۔ مجھ پر رحم کرو۔ مجھے اپنی دنیا میں واپس جانے دو۔'' رباب نے انکار کر دیا۔

''پاگل مت بنو! اصولوں، پابندیوں اور معاشرتی ناہمواریوں میں جکڑی دنیا میں کیا رکھا ہے۔ وہاں اُونچ نیچ ہے، فرقہ بندی ہے اور انسان انسان کو حقیر سمجھتا ہے۔ میں اس مندر کی وحشت خیزی اور ویرانی کو دور کر دوں گا۔ یہاں ہر قسم کی آسائشات میسر ہوں گی۔ یہ ویران مندر رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا اُٹھے گا۔ صحن سے خاردار جھاڑیوں کا خاتمہ کر کے خوب صورت باغ لگایا جائے گا۔''

''آخر تم ہو کون..... مجھے یقین ہے کہ تم کوئی پروہت نہیں؟'' رباب حیرت سے جگرال کی باتیں سن رہی تھی۔ کچھ دیر اُسے غور سے دیکھتی رہی اور بولی۔

''میں کون ہوں..... کیا ہوں؟ تمہارے لیے یہ سب جاننا ضروری نہیں۔ بس اتنا سمجھ لو کہ میں تمہیں اپنے دل کی ملکہ بنا کر رکھنا چاہتا ہوں اور تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔''

''لیکن میں تم سے محبت نہیں کرتی۔ کوئی کسی دوسرے کو مجبور نہیں کر سکتا ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔'' رباب

نے سخت لہجے میں کہا۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو۔ تم اس مندر میں قید ہو کر نہیں رہو گی۔ باقی دنیا سے ہمارا رابطہ قائم رہے گا۔ جزیرے کے شمالی ساحل پر میرا جہاز لنگر انداز ہے۔ وہاں دو لانچیں بھی موجود ہیں..... ہم سیر و تفریح کے لیے یورپ جائیں گے اور پھر دنیا بھر کی سیاحت کریں گے۔'' جگرال نے کہا۔

''کیا تمہارا تعلق بیرونی دنیا سے بھی ہے؟'' رباب نے حیرت سے پوچھا۔

''ان باتوں کو کریدنے کے بجائے تمہیں صرف ہاں کہہ دینی چاہیے۔ تاکہ ایک نئی زندگی کا آغاز کیا جا سکے۔'' جب تم میری زندگی میں آجاؤ گی تو تمہیں بہت کچھ معلوم ہو جائے گا اور تم اپنی خوش نصیبی پر فخر کرو گی۔''

''مجھے تمہاری کوئی بھی پیش کش قبول نہیں۔'' رباب نے ٹکا سا جواب دے دیا۔

''یہ بات ذہن میں رکھو کہ انکار کرنا تمہارے لیے ممکن نہیں۔'' جگرال کے چہرے پر ناگواری کا تاثر ابھرا۔

''میں ہاں کرنے کے بجائے مرجانا بہتر سمجھوں گی۔'' رباب نے ٹکا سا جواب دیا۔

''تمہیں میرا حکم ماننا پڑے گا۔'' اس کی آنکھیں غصے سے لال ہونے لگیں۔

''ورنہ.....؟'' رباب نے بھی بے خوفی سے اس کی جانب دیکھا۔

''ورنہ میں زبردستی تمہیں حاصل کرلوں گا۔ میں نے زندگی میں جس چیز کی خواہش کی، اُسے حاصل کر کے دم لیا۔ تمہارا حصول میرے لیے مشکل نہیں۔ تم تو پہلے ہی میرے رحم و کرم پر ہو۔'' جگرال نے غصے سے رباب کی چادر کھینچ کر دور اُچھال دی اور اُسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔

تیمور برنی اور فاخر بُت کی اُوٹ سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ معاملہ اب ان کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ انھیں اندازہ نہیں تھا کہ جگرال اپنی حد پار کرنے کی کوشش کرے گا۔ چناں چہ اگلے ہی لمحے تیمور برنی نے باہر نکل کر ریوالور سیدھا کیا اور جگرال کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ مندر میں فائر کی آواز توپ کے گولے کی سی تھی۔ گولی جگرال کے بائیں کندھے کو چھو کر گزر گئی تھی۔ جیسے ہی اس کا دھیان بٹا رباب اس کی گرفت سے آزاد ہو کر دور جا کھڑی ہوئی۔ تیمور اور فاخر کو دیکھ کر اُس کی جان میں جان آ گئی تھی۔

جگرال کے زخم سے گرم گرم خون اُبل رہا تھا۔ لیکن وہ زخمی حالت میں بھی چٹان کی طرح جم کر کھڑا اُن دونوں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نہ پریشانی کے آثار تھے اور نہ ہی خوف کے۔ تیمور برنی اور فاخر اُسے یوں پرسکون دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ جگرال کی آنکھوں میں کچھ ایسا سحر تھا جس نے ان دونوں کو اپنی جگہ پر ساکت کر دیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ تیمور برنی باوجود کوشش کے دوسرا فائر نہ کر سکا تھا۔ وہ یوں ساکت کھڑا تھا جیسے جگرال نے اُسے حکم کا غلام بنا کر تمام طاقت سلب کر لی ہو۔ کچھ ایسی ہی حالت فاخر کی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے حیران کن لمحات سے گزر رہے تھے۔

تیمور برنی اور فاخر میں سے کوئی بھی لڑائی میں ماہر نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ہر قسم کی صورت حال سے نبٹنے کے لیے تیار تھے۔ انھیں خاموش دیکھ کر جگرال زخمی سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا آگے بڑھا اور اپنی کلائی پوری قوت سے تیمور کے ریوالور والے ہاتھ پر دے ماری۔ ضرب لگتے ہی ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر دیوار کے پاس جا گرا۔ اس نے تیمور برنی کو اتنی مہلت بھی نہیں دی تھی کہ وہ سنبھل سکتا اور پھر اپنا ہاتھ گھما کر اس کی کنپٹی پر دے مارا۔

ضرب اتنی شدید تھی کہ تیمور برنی کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ وہ چاروں شانے چت فرش پر گر پڑا تھا۔

تیمور کو گرتا دیکھ کر فاخر کو جیسے ہوش سا آ گیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا نیزہ ہوا میں بلند کر کے جگرال پر حملہ کر دیا۔

اس سے پہلے کہ نیزہ جگرال کے جسم کو چھوتا، اُس نے پھرتی سے اپنی جگہ بدل لی اور کسی جنگجو کی طرح جھٹکے سے نیزہ چھین لیا۔

یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ فاخر اپنا ہتھیار کھو دینے پر ہکا بکا رہ گیا۔ پھر یہ حیرانی اس پل بدحواسی اور خوف میں بدل گئی جب جگرال نے نیزے کو ہوا میں گھما کر جوابی وار کر دیا، اگلے ہی لمحے نیزہ فاخر کے سینے کو چیرتا ہوا پار ہو گیا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر تھر تھر کانپتی رباب نے آنکھوں پر ہاتھ

www.paksociety.com

رکھ لیے۔ ایک دہلا دینے والی چیخ مارنے کے بعد جب اُس نے آہستہ آہستہ آنکھوں سے ہاتھ ہٹائے تو سامنے فرش پر تڑپتا ہوا فاخر آخری ہچکی لے رہا تھا۔

-☆-☆-☆-

انجن تھکے ہارے گھوڑے کی مانند بوگیوں کی ایک لمبی قطار کو کھینچتا ہوا نظروں سے اُوجھل ہو چکا تھا۔ فیض پور کے اس چھوٹے سے اسٹیشن پر زندگی عموماً اسی وقت انگڑائی لیتی تھی جب کوئی ٹرین کراس کی صورت میں یہاں رُکنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ ورنہ عام حالات میں تو یہاں ویرانی چھائی رہتی تھی اور گاڑیاں بنائر کے تیزی سے گزر جایا کرتی تھیں۔

فیض پور اسٹیشن سے چند فرلانگ کے فاصلے پر مختصر آبادی والا ایک گاؤں تھا۔ یہاں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ بہت سے ہندو خاندان بھی آباد تھے۔ گاؤں کے باہر ایک مندر اور شمشان گھاٹ بھی تھا۔ لیکن مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کسی قسم کا لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو اپنے عقائد کے مطابق مذہبی آزادی سے زندگی گزار رہے تھے۔

آج آدھی رات کو رُکنے والی ٹرین کی وجہ بھی کراس ہی تھا۔ گاڑی روانہ ہونے کے بعد اسٹیشن پر گھپ اندھیرا پھیل گیا تو سگنل مین موہن نے منہ کھول کر جمائی لی اور ٹارچ اُٹھا کر اپنے کیبن سے باہر نکل آیا۔ وہ رات کو آخری ٹرین گزر جانے کے بعد اکثر گھر چلا جایا کرتا تھا۔ کیوں کہ یہاں اس سے پوچھ گچھ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

آج سردی بھی کچھ زیادہ تھی اور ماحول کو دُھند کی چادر نے پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ چناں چہ موہن نے اپنی پرانی سی چادر کو اچھی طرح جسم کے گرد لپیٹا اور ٹارچ ہاتھ میں تھام کر گاؤں کی جانب چل پڑا۔ وہ پلیٹ فارم سے اُتر کر پٹڑی کے دوسری جانب پہنچ چکا تھا۔ ابھی اس نے مختصر فاصلہ طے کیا تھا کہ یوں محسوس ہوا جیسے ابھی ابھی کوئی سفید سی چیز اس کی ٹارچ کی روشنی کے سامنے سے گزری ہو۔

''یہ کیا تھا..... شمشان گھاٹ بھی قریب ہے۔ کہیں کوئی آتما تو نہیں؟'' موہن کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔

سفید چادر میں لپٹا کوئی وجود روشنی کے سامنے سے گزر کر دھند میں غائب ہو گیا تھا۔ موہن نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ کی روشنی تیز کر کے اُس جانب گھمائی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ کوئی نوعمر لڑکی تھی جو ہر قسم کے خطرے سے بے نیاز دھیمی رفتار سے آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ موہن چند لمحے وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا اور پھر ہمت کر کے آواز دی۔

''اے چھوکری..... کون ہو تو؟''

مگر لڑکی جو کہ ارینا تھی بالکل خاموش رہی اور کسی بات کا جواب نہ دیا۔

وہ موہن کی موجودگی سے بے نیاز آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کا رُخ کچے رستے سے ہٹ کر ویرانے میں شمشان گھاٹ کی طرف تھا۔ یہ شمشان گھاٹ قیام پاکستان سے پہلے کا تھا۔ قریبی دیہاتوں میں رہنے والے اکا دکا ہندو اپنے مردوں کا کریا کرم کرنے کے لیے اسی شمشان گھاٹ کا رُخ کرتے تھے۔

موہن ہمت کر کے ارینا کا تعاقب کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ شمشان گھاٹ کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے گزر کر اندر داخل ہو گئی۔ موہن کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اُسے آواز دی۔

''ٹھہر جا لڑکی، میں تجھ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

مگر ارینا نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید اس نے سنا ہی نہیں تھا یا پھر جواب دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

''آتما..... یقیناً یہ کوئی بھٹکی ہوئی آتما ہے۔''

موہن کا جسم خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ مگر وہ ایک جی دار آدمی تھا۔ اس کی فطرت میں تجسس کا وہ مادہ بھی موجود تھا جو انسان کو کسی غیر معمولی واقعہ کا کھوج لگانے کے لیے اُکساتا ہے۔ لہٰذا وہ دل میں خوف پیدا ہونے کے باوجود اس کے پیچھے چلتا رہا۔

ارینا کسی روبوٹ کی مانند شمشان گھاٹ میں داخل ہوئی اور اُسے پار کر کے دوسرے دروازے سے باہر نکل گئی۔ وہ دائیں بائیں دیکھنے کے بجائے اس سیدھے راستے پر آگے بڑھتی جا رہی تھی جو کافی دور جا کر مسلمانوں کے قبرستان پر ختم ہوتا تھا۔

دُھند اور سردی کے باوجود ارینا پُرسکون انداز میں اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھی جیسے وہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہو۔ سارا راستہ طے کرنے کے بعد وہ

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

قبرستان میں داخل ہو گئی۔ کھلے میدان میں پھیلا ہوا قبرستان رات کی تاریکی میں نہایت پراسرار دکھائی دے رہا تھا۔ اب موہن یہ سوچ رہا تھا اس لڑکی کے چکر میں وہ کسی بڑی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ لڑکی کہیں خون آشام تو نہیں جو یوں سکون سے کسی شکار کی تلاش میں آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

قبرستان کے ٹیڑھے میڑھے راستے اور مٹی کی بے ترتیب ڈھیریاں موہن کے دل میں دہشت پیدا کر رہی تھیں۔ قبرستان میں کوئی بھی چیز واضح دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ یہاں تک کہ چاند بھی شدید دھند کے باعث ایک مدھم سا بلب بن کر رہ گیا تھا۔ ہر طرف تاریکی کا راج تھا جس سے موہن کی وحشت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

قبرستان کی حدود کے اندر ہی کونے میں برگد کا ایک بہت پرانا درخت تھا۔ اس کی پھیلی ہوئی شاخوں نے ایک بڑی چھتری کی سی شکل اختیار کر لی تھی۔

ارینا آگے بڑھتی رہی اور درخت کے پاس پہنچ کر رُک گئی۔ اب وہ زمین پر بیٹھ کر غور سے درخت کو گھورنے لگی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا برگد کے بوڑھے پیڑ سے اس کا کوئی گہرا تعلق ہو۔ کچھ دیر گم صم بیٹھے رہنے کے بعد اس کے ہونٹوں پر معصوم سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

اُسے مسکراتا دیکھ کر موہن دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھا اور، ارینا کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ کسی اجنبی کا لمس محسوس کرتے ہی ارینا نے پلٹ کر دیکھا اور بے اختیار بولی۔

"دیکھو! وہ کتنا خوب صورت ہے....." یہ کہتے ہی ارینا کا چہرہ یکدم سفید پڑ گیا اور وہ چکرا کر زمین پر گرتے ہی بے ہوش ہو گئی۔

موہن زمین پر بے ہوش پڑی لڑکی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے گاؤں کی نہیں تھی۔ حال حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ کسی مسلمان گھرانے سے ہے۔

موہن سوچ رہا تھا کہ وہ کون ہے اور اس قدر شدید سردی میں آدھی رات کے وقت اس درخت کے پاس کیوں آئی ہے، اور یہ بات اُس نے کس کے بارے کہی کہ دیکھو وہ کتنا خوب صورت ہے؟

-☆-☆-☆-

تیمور برنی کی آنکھ کھلی تو اسے اپنے پورے وجود میں درد کی ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوئیں۔ چند لمحے خالی نظروں سے چھت کو گھورتے رہنے کے بعد اس نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی تو مایا کے باپ اور ایک محافظ کو اپنے بستر کے قریب بیٹھے پایا۔

تیمور برنی کو ہوش میں دیکھ کر وہ دونوں اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کے سرہانے آ کھڑے ہوئے۔ تیمور برنی جو کہ پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد سردار کو پہچان چکا تھا دھیمے لہجے میں بولا۔

"میں کہاں ہوں سردار..... یہ کون سی جگہ ہے۔" اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"دیوتا نے تم پر رحم کر دیا ہے دوست..... تم زندہ سلامت اور محفوظ ہاتھوں میں ہو۔" سردار نے نرم لہجے میں اسے تسلی دی۔

"اور میرے ساتھی....." تیمور برنی کے ذہن میں رباب اور فاخر کا خیال بجلی بن کر کوندا تھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ ہم تمہارے دوست فاخر کو نہیں بچا سکے۔"

"کیا مطلب....." تیمور کو اپنی آنکھوں کے سامنے ایک مرتبہ پھر اندھیرا چھاتا محسوس ہوا۔

"زہر میں بجھا نیزہ اس کے سینے کے آر پار ہو گیا تھا۔ فاخر بہت اچھا انسان تھا۔ مجھے اس کی دوستی پر فخر رہے گا۔"

"اور رباب..... وہ کہاں ہے؟" تیمور برنی نے اُمید بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

"تم شاید اس لڑکی کے بارے میں پوچھ رہے ہو جسے شوکال دیوتا کے چرنوں میں قربان کرنے کے لیے مندر میں لے گیا تھا؟"

"ہاں ہاں وہی....."

"نیا پروہت جزیرے سے فرار ہوتے وقت اس لڑکی کو اپنے ساتھ یونان لے گیا ہے۔"

"کیا.....؟" تیمور برنی اس انکشاف سن کر تقریباً چیخ اُٹھا تھا۔

"یہ درست ہے..... لیکن دیوتا کی مہربانی سے ہم تمہیں بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ گھبراؤ نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس لڑکی کو ضرور ڈھونڈ لو گے۔ ویسے بھی تم

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

لوگ یونان جانے والے تھے۔ دیوتا تمہاری مشکل ضرور آسان کریں گے۔'' سردار نے اُسے تسلی دی۔

''اس وقت میں کہاں ہوں؟'' تیمور نے اُٹھ کر اردگرد نظر دوڑائی۔

''تم مندر کے ایک کمرے میں ہو۔ جب ہم لوگ مندر میں داخل ہوئے تو تم مرکزی عبادت گاہ میں بے ہوش پڑے تھے۔ اس کے بعد تم مسلسل تین روز تک بے ہوش رہے ہو۔'' سردار نے تفصیل بتائی۔

''لیکن تم لوگ مندر کے اندر کیسے پہنچے۔ حالانکہ پروہت تو کسی کو یہاں آنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔''

''یہ ایک الگ کہانی ہے۔ جس وقت تم اور فاخر ہماری قید سے فرار ہو کر کھلے سمندر میں جا پہنچے تو ہمیں یقین تھا کہ تم دونوں جزیرے پر واپس ضرور آؤ گے۔ چناں چہ ہم نے جزیرے کے چاروں طرف ساحل کی نگرانی شروع کر دی۔ یہ نگرانی خفیہ طریقے سے کی جا رہی تھی تاکہ پروہت کو تمہارے فرار کی خبر نہ ہو سکے کیوں کہ وہ تمہیں آگ میں جلانے کا حکم دے چکا تھا۔ ایک رات میرے جوانوں نے اطلاع دی کہ جزیرے کے مغربی ساحل پر ایک چھوٹا بحری جہاز اور چند کشتیاں دیکھی گئی ہے۔ جن میں سے بیرونی دنیا کے لوگ پراسرار طریقے سے نکل کر مندر کے خفیہ دروازے کی جانب جاتے دیکھے گئے ہیں..... اس کے بعد ہم مزید چوکس ہو کر نگرانی کرنے لگے۔ جس کے نتیجے میں جلد ہی یہ حقیقت سامنے آ گئی کہ آمد و رفت کا یہ سلسلہ اکثر رات کے اندھیرے میں جاری رہتا ہے۔ یہ سن کر مجھے بہت حیرانی ہوئی اور میں نے ان اجنبی لوگوں کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ جو خفیہ طریقے سے سامان مندر میں منتقل کر رہے تھے۔ اسی رات میرے ساتھیوں نے دو آدمیوں کو گرفتار کر لیا جن سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ مندر کا اصل پروہت شوکال اپنے باپ سمیت قتل ہو چکا ہے اور اس کی جگہ شیطانی طاقت رکھنے والا ایک شخص جگرال مندر پر قابض ہو چکا ہے جس کا تعلق یونان سے ہے۔ یہ راز کھلتے ہی ہم نے پر مندر میں داخل ہو کر اس نقلی پروہت کو ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر لیا مگر وہ زخمی حالت میں اس لڑکی کو ڈھال بنا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا جسے دیوتا کے چرنوں میں بھینٹ چڑھانے کے لیے پیش کیا گیا تھا، لیکن ہم بہت شکر گزار ہیں کہ تمہارے آنے سے ہمیں دیوتاؤں کے قہر سے نجات حاصل ہوئی۔ ورنہ ہم اپنے قبیلے کی لڑکیاں بھینٹ چڑھانے پر مجبور تھے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہمیں یہ رہائی صرف اور صرف تمہاری وجہ سے نصیب ہوئی ہے۔''

''میری وجہ سے کیوں؟'' تیمور برنی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہمارے مہان جوتشی کا کہنا ہے کہ تم ہی وہ خوش نصیب شخص ہو جس کے آنے سے اس جزیرے کے لوگوں کو رہائی نصیب ہوئی۔''

''تم لوگ یہ بات وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں تمہارے لیے خوش قسمت ثابت ہوا ہوں۔ حالانکہ میری وجہ سے تمہاری بیٹی مایا کا قتل ہو گیا۔ جس کا افسوس مجھے آخری سانس تک رہے گا۔'' تیمور برنی نے دبے الفاظ میں سردار سے مایا کے قتل پر افسوس کا اظہار کیا۔

''مہان جوتشی کی بازیابی سے قبل میں واقعی تمہیں اپنی بیٹی کے قتل کا ذمہ دار قرار دے رہا تھا۔ مگر حقیقت کھلنے پر مجھے خوشی ہوئی کہ مایا کی بھینٹ اس جزیرے پر دی جانے والی آخری قربانی ثابت ہوئی ہے۔ آیندہ کبھی کسی لڑکی کو دیوتا کے سامنے بھینٹ نہیں چڑھایا جائے گا۔''

''یہ کب بتایا تمہارے مہان جوتشی نے؟'' تیمور برنی نے اس کی بات میں دلچسپی لیتے ہوئے مسکرا کر پوچھا تو وہ سنجیدگی سے بولا۔

''دو روز قبل..... دراصل مہان جوتشی کو بھی شوکال نے مندر کے تہہ خانے میں قید کر رکھا تھا کیوں کہ جوتشی نے اپنا زائچہ بنا کر کافی عرصہ قبل اسے یہ بتا دیا تھا کہ چند سال بعد جزیرے پر ایک ایسا شخص وارد ہو گا جس کے آتے ہی تمہاری حکومت ختم ہو جائے گی۔ اب جوتشی کا کہنا ہے کہ وہ شخص تم ہو۔''

''کیا میں اس جوتشی سے مل سکتا ہوں؟''

''ہاں ضرور لیکن آج نہیں، کل..... آج وہ اپنے کسی اہم زائچے کی تیاری میں مصروف ہے۔''

سردار نے جواب دیا اور تیمور برنی نے گہری سانس لیتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

دوپہر تک آرام کرنے کے بعد تیمور برنی نے سردار کا بھجوایا ہوا کھانا کھایا اور پھر کمرے سے نکل کر باہر آ گیا۔

www.paksociety.com

آج مندر میں خوب گہما گہمی تھی۔ جزیرے کے لوگ ٹولیوں کی شکل میں بیٹھے پروہت کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ تیمور برنی کو اپنے درمیان پا کر انھوں نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ وہ سب مہان جوتشی کی پیش گوئی کا حوالہ دیتے ہوئے تیمور برنی کو اپنے لیے نجات دہندہ قرار دے رہے تھے۔

اس روز تیمور برنی پر یہ راز بھی افشاں ہو گیا مندر پر قابض پروہت شوکال سے پہلے یہ مرتبہ اس کے باپ اور دادا کو حاصل تھا۔

تیمور برنی کو یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ مندر صدیوں پرانا ہے۔ اسے تعمیر کرنے والے لوگ کسی دور دراز مشرقی خطے سے فرار ہو کر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یہاں آیا تھا۔ وہ اس جزیرے پر حادثاتی طور پر پہنچے تھے۔ لیکن یہاں آنے کے بعد انھوں نے مندر تعمیر کر لیا۔ پھر اس کے پجاریوں نے جزیرے کے سادہ لوح قبائلیوں کو اپنے شعبدوں کے ذریعے مرعوب کر کے ذہنی اور جسمانی طور پر اپنا غلام بنا لیا۔ یہ سلسلہ مدتوں جاری رہا۔ شوکال کا دادا ایک پجاری کی حیثیت سے اس مندر میں وارد ہوا تھا۔ آتے ہی اس نے اپنی جڑیں مضبوط کر لیں اور مندر میں رہنے والے مخالفین کو قتل کروانا شروع کر دیا۔

جب اُس نے اپنے چند قابل اعتماد ساتھیوں کے علاوہ سب کو قتل کرا دیا تو قبیلے کے عام لوگوں کے مندر میں آنے پر پابندی عائد کر دی۔ صرف قبیلے کا سردار یا پروہت کا ایک خاص آدمی مندر میں آ سکتا تھا لیکن وہ بھی اجازت حاصل کرنے کے بعد۔ اس نے جزیرے کے باسیوں کو حکم دیا کہ اسے ہر سال دیوتا کو بھینٹ چڑھانے کے لیے ایک لڑکی پیش کی جائے۔ جزیرے کے لوگ جو کہ شوکال کے دادا کو دیوتا کا بیٹا مان بیٹھے تھے۔ اس کے حکم کی تعمیل سے انکار نہ کر سکے اور قبیلے کی سب سے خوب صورت لڑکی کو قربانی کے لیے پروہت کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔

یوں اس خونی روایت کا آغاز ہو گیا اور ہر سال ایک لڑکی پروہت کے حوالے کی جانے لگی۔ حقیقت یہ تھی کہ پروہت ان لڑکیوں کو فوری قتل کرنے کی بجائے اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے داسی بنا کر رکھتا تھا۔

اگر اس دوران کوئی لڑکی حاملہ ہو جاتی تو اسے بچے کی پیدائش تک زندہ رکھا جاتا۔ بچی پیدا ہونے کی صورت میں ماں بیٹی کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ لیکن اگر وہ لڑکے کو جنم دیتی تھی تو اسے بچے کے پرورش پانے تک زندہ رکھا جاتا۔ جب مندر میں ایک سے زیادہ لڑکے جوان ہو جاتے تھے اور پروہت بوڑھا ہونے لگتا تو مندر میں ایک خونی کھیل کھیلا جاتا جس میں سب لڑکوں کو تلوار بازی کی مہارت دکھانی ہوتی تھی۔ اس مقابلے میں بچ جانے والا لڑکا نیا پروہت بن جاتا تھا۔ یہ باتیں تیمور برنی کو اُس بوڑھے شخص نے بتائی تھیں جو کبھی شوکال کے باپ کا خاص خادم ہوا کرتا تھا۔

تیمور برنی کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ آخری پروہت جگرال جو رباب کو اغوا کر کے لے گیا تھا، یونان کے کسی مندر سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے شوکال سے تعلقات پیدا کر کے جزیرے کے بارے معلومات حاصل کیں اور پھر اشیائے خورد و نوش کی فراہمی کی آڑ میں یہاں آ دھمکا۔ وہ اس بنی بنائی سلطنت پر قبضہ کر کے یہاں کے لوگوں کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ لیکن تیمور اور فاخر کی آمد سے اس کا بھانڈا پھوٹ گیا اور وہ رباب کو ڈھال بنا کر یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

اب تیمور ہر صورت یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ فاخر کو تو نہیں بچا سکا تھا لیکن رباب ابھی بھی اُمید کی کرن بن کر اس کے تاریک ذہن میں اُجالا کیے ہوئے تھی۔

اگلے روز سردار، تیمور برنی کو جوتشی کے پاس لے گیا۔ جوتشی اسی مندر کے تہہ خانے میں اپنا ڈیرہ جمائے ہوئے تھا۔ وہ عام لوگوں کے سامنے بہت کم آتا تھا اور زیادہ وقت تہہ خانے کے اس چھوٹے سے کمرے میں گزارتا تھا جہاں پروہت نے اُسے برسوں قید رکھا تھا۔

تہہ خانے کی سیڑھیاں اُترنے کے بعد وہ دونوں ایک تنگ سی نیم تاریک راہداری میں آگے بڑھنے لگے جہاں ہر طرف کوڑا کرکٹ بکھرا ہوا تھا اور ایک ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ راہداری میں دور تک آگے بڑھنے کے بعد وہ لوہے کے ایک بند دروازے کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

وہاں پہنچنے کے بعد سردار نے ہاتھ بڑھا کر دروازے پر دستک دی تو اندر سے ایک کھردری مگر مختصر آواز سنائی دی۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

"آ جاؤ....."

اجازت ملنے پر وہ اندر داخل ہو گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کی دیوار پر نصب مشعل ماحول کو منور کیے ہوئے تھی۔ کمرے میں پہنچ کر تیمور برنی کی نظر جس شخص پر پڑی چند لمحے کے لیے تو اسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ یہ واقعی کوئی انسان ہے۔ اس کا حال حلیہ اور شکل وصورت بہت عجیب تھی۔ اس کی آنکھیں باہر کو اُبلی ہوئی اور گہری سرخ تھیں جب کہ ناک چپٹی سی تھی۔ اس کے سر پر گھنے سفید بال اور پیشانی پر گہری لکیریں تھیں۔ اس نے میلا اور بوسیدہ سا چوغہ پہن رکھا تھا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں انگوٹھیاں تھیں۔ تیمور برنی نے ایسا عجیب وغریب حلیے والا شخص پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ گفتگو کا آغاز کہاں سے کرے کہ جوتشی کی بھر دری آواز سنائی دی۔

"کیا نام ہے تمہارا.....؟"

جوتشی مقامی زبان میں بات کر رہا تھا۔ اب تیمور برنی باآسانی ان کی زبان بول اور سمجھ سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے مختصر جواب دیا۔

"تیمور برنی....."

"بیٹھو....."

لہجے کی سرد مہری کم نہیں ہوئی تھی۔ اس کی آواز میں ایک ایسی سنگدلی تھی جسے سننے والا واضح محسوس کر سکتا تھا۔ اب جوتشی کی نظریں تیمور برنی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ اتنے انہماک سے اس کی پیشانی اور آنکھوں میں دیکھ رہا تھا کہ تیمور برنی کو کوفت محسوس ہونے لگی۔ اس کے بعد جوتشی نے سرسری طور پر تیمور برنی کے ہاتھوں کی لکیریں دیکھیں اور ایک بوسیدہ کاغذ پر عجیب وغریب زائچہ سا بنانے لگا جو بالکل غیر مانوس زبان میں تھا۔

زائچہ مکمل ہونے پر جوتشی نے سر اُٹھایا تو چہرے پر الجھن کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے اور بھنویں سکڑ کر ایک دوسری سے مل گئی تھیں۔ اس کے تاثرات دیکھ کر تیمور کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا کہ خدا جانے وہ پراسرار بڈھا کیا کہنے والا تھا۔ جوتشی کچھ دیر گم صم بیٹھا تیمور کو دیکھتا رہا اور پھر سردار کی طرف متوجہ ہوا۔

"میرا اندازہ درست ہے۔ یہی وہ شخص ہے جسے میں جزیرے والوں کے لیے نجات دہندہ قرار دے رہا تھا۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ ہمیں نجات دلانے والے کی اپنی آیندہ زندگی اتنی پرسکون نہیں ہے۔ یہ عنقریب عجیب وغریب حالات کا شکار ہونے والا ہے۔"

اس سے قبل کہ سردار اسے کوئی جواب دیتا تیمور برنی نے تیز لہجے میں مداخلت کی۔

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔" تیمور برنی کی بات سن کر جوتشی دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا اور چند لمحے توقف کے بعد بولا۔

"کیا تمہارے سینے پر کوئی ایسا تل موجود ہے جو حجم میں عام تلوں سے بڑا ہو؟"

"ہاں! ایسا ایک تل میرے سینے پر موجود ہے۔" تیمور برنی نے تصدیق کی تو جوتشی اس کے ہاتھ کی لکیریں دیکھنے لگا۔

"میں تمہاری پیدائش کے بارے کچھ جاننا چاہوں گا، میرا مطلب ہے کہ جس وقت تم پیدا ہوئے کیا وہ چاند گرہن کی رات تھی؟"

تیمور برنی جوتشی کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ وہ واقعی چاند گرہن کی رات پیدا ہوا تھا، اور ٹھیک اس وقت جب چاند کو گرہن لگا ہوا تھا یہ بات نانی ماں نے اُسے بتائی تھی۔ تیمور برنی کی ماں اس کی پیدائش کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکی تھی۔ وہ چند لمحے تک اپنے ماضی کی راکھ کو کریدتا رہا اور پھر گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

"ہاں یہ سچ ہے۔ اس رات واقعی چاند گرہن تھا۔"

جوتشی خاموش ہو گیا اور پھر ایک کاغذ پر نئے سرے سے زائچہ بنانے کے بعد اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"تمہارے زائچے اور ہاتھ کی لکیروں نے مجھے الجھا دیا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بے شمار زائچے بنائے ہیں لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ تم بہت مختلف شخص ہو۔ حیران کن بات یہ کہ تمہارے ہاتھ کی لکیریں بھی زائچے کی طرح انتہائی غیر معمولی ہیں۔ میں تمہیں صدمہ نہیں پہنچانا چاہتا لیکن اتنا بتانا بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ ایسا ہاتھ بہت غیر معمولی لوگوں کا ہوتا ہے۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" تیمور برنی نے حیرت سے پوچھا۔

www.pakistanipoint.com

''اس وقت میں تمہاری ہتھیلی میں اندھیرے دیکھ رہا ہوں، ہمارے محسن! میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ آنے والے چند سال تمہاری زندگی کے لیے بہت اہم ہیں۔ اس دوران تمہیں قدم قدم پر خطرات کا سامنا رہے گا۔ اگر تم نے ان مشکل سالوں کا مقابلہ جوانمردی سے کرلیا آیندہ زندگی پرسکون گزار سکو گے۔''

''آپ کھل کر بات کریں.....'' تیمور برنی نے گہری سانس لی۔

''ہمارے محسن! اگرچہ مجھے یہ بتانا تو نہیں چاہیے لیکن چونکہ اس میں تمہارا فائدہ ہے۔ لہٰذا بتا رہا ہوں کہ آیندہ پانچ سال میں اگر تم کسی بڑے حادثے کا شکار نہ ہوگئے تو طویل عمر پاؤ گے۔''

گو تیمور برنی اس قسم کی توہمات پر یقین نہیں رکھتا تھا مگر جوتشی کے بتانے کا انداز اس قدر ٹھوس تھا کہ اس کے دل کی دھڑکن خود بخود تیز ہوگئی۔

''یہ خطرات کس قسم کے ہوں گے اور مجھے اِن سے کیسے بچنا چاہیے؟''

''یہ خطرات کسی بھی قسم کے ہوسکتے ہیں اور کسی بھی وقت نازل ہوسکتے ہیں..... ممکن ہے تم کسی بلند عمارت سے گر جاؤ، کسی سنگین جرم میں پکڑے جاؤ یا پھر کسی جان لیوا بیماری میں مبتلا ہوجاؤ..... میں کوئی بھی بات یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ میری دو نصیحتیں ہمیشہ یاد رکھنا۔''

''جی بتائیں.....'' تیمور نے پوچھا۔

''دریا ہو یا سمندر کبھی پانی پر تنہا سفر مت کرنا..... اور ایسے لوگوں سے تعلقات مت قائم کرنا جن کی دونوں آنکھوں کی پتلیوں میں فرق ہو۔ ان دو باتوں پر عمل کرنے سے تم بہت سی مصیبتوں سے چھٹکارہ پاجاؤ گے۔''

''میں آپ کی ہدایت پر عمل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔'' تیمور برنی نے اثبات میں سر ہلایا تو جوتشی نے کہا۔

''اب تم جاسکتے ہو۔ میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔ دیوتا تمہاری ہر مشکل آسان کریں گے۔'' جوتشی نے اُسے الوداع کہا اور تیمور برنی، سردار کے ساتھ تہہ خانے سے باہر آگیا۔

-☆-☆-☆-

نگار بہت حد تک اپنے ماضی کو بھلا کر رانی بائی اور اس کی بیٹیوں کے ساتھ گھل مل گئی تھی۔ چندا کے نام سے نئی شناخت ملنے کے بعد اب تو وہ یہ بات بھی تقریباً بھول چکی تھی کہ کبھی اس کا نام نگار تھا۔ ذہنی سکون میسر آنے اور مکمل توجہ ملنے کے بعد چندا کی صحت پہلے سے بہت بہتر ہوگئی تھی اور وہ اپنی عمر سے بڑی دکھائی دینے لگی تھی۔ یہی نہیں وہ چندا اور پائل کے زیر اثر رہ کر اُن کے چٹکلے بھی سمجھنے لگی تھی۔

ایک روز وہ اپنے ٹیوٹر سے پڑھ کر باہر نکلی تو سامنے ڈرائنگ روم میں رانی بائی اپنی دونوں بیٹیوں نگینہ اور پائل کے ساتھ سر جوڑے بیٹھی تھی۔ تینوں کے چہروں پر پریشانی کے آثار تھے اور وہ سرگوشیوں کے سے انداز میں باتیں کر رہی تھیں۔

''کیا ہوا باجی! آپ سب پریشان کیوں دکھائی دے رہی ہیں.....؟'' اس کی بات سن کر سب خاموش ہوگئیں، پھر رانی بائی مسکرا کر بولی۔

''کچھ نہیں چندا! بس معمولی سی بات ہے تمہاری نگینہ آپی خوامخواہ پریشان ہوگئی ہے۔''

''کچھ مجھے بھی تو بتائیں ناں.....''

''پریشانی کی کوئی بات نہیں میری ماں۔ بس نگینہ کا سیٹھ سرمے والا سے جھگڑا ہوگیا۔ اس نے نگینہ کو مار ڈالنے کی دھمکی دی ہے، بس اسی لیے پریشان ہے تمہاری آپی۔''

گو چندا ابھی کم عمر تھی مگر رانی بائی کی یہ عادت تھی کہ وہ کبھی اس سے کوئی بات نہیں چھپاتی تھی تاکہ وہ اس ماحول اور یہاں کے مسائل کو بچپن ہی سے سمجھنے اور ان پر قابو پانے کی تربیت حاصل کرسکے۔ یہاں تک کہ وہ اکثر اسے نگینہ یا پائل کے ہمراہ باہر بھی بھجوا دیا کرتی تھی۔ رانی بائی کی بات سن کر چندا خود بھی گھبرا گئی۔ اسے نگینہ سے خاص انسیت تھی۔ اس کا زیادہ وقت نگینہ کے ہمراہ ہی گزرتا تھا۔

''تو پھر اب کیا ہوگا بڑی باجی.....'' اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا اور رانی بائی کی طرف دیکھا۔

''کچھ بھی نہیں ہوگا..... سرمے والا میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ رانی بائی کی بیٹی پر ہاتھ ڈال سکے۔ ہم جیسی عورتوں سے لڑنا ان نام نہاد باعزت لوگوں کے بس کی بات ہرگز نہیں ہے..... لیکن نگینہ کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اسے چند روز کے لیے اس کی روپا آنٹی

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

کے پاس بھیج دوں۔ اس دوران سیٹھ سرمے والا کا بڑھا ہوا بلڈ پریشر خود بخود کم ہو جائے گا اور نگینہ کا دل بھی روپا کے ہاں رہ کر بہل جائے گا۔"

رانی بائی نے نگینہ کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ روپا اس کی بچپن کی سہیلی تھی۔ ان دونوں نے بازار حسن میں طویل عرصہ ایک ساتھ گزارا تھا۔ روپا کے حالات اسے وہاں سے بھاگ نکلنے کی اجازت نہیں دیتے تھے جب کہ رانی بائی کو آگے بڑھنے کی جستجو سکون نہیں لینے دیتی تھی۔ لہٰذا روپا تو ساری زندگی کے لیے بازار حسن تک محدود ہو کر رہ گئی مگر رانی بائی ترقی کرتے کرتے کوٹھے سے بڑی سی شاندار کوٹھی میں شفٹ ہو گئی۔ یوں اس نے اپنی بیٹوں کو اعلیٰ نسل کے مرغے پھنسانے کی تربیت دے کر بگڑے ہوئے رئیس زادوں میں خاص مقام حاصل کر لیا۔

"لیکن روپا آنٹی رہتی کہاں ہیں؟" چندا نے روپا کو دیکھا ضرور تھا مگر اس کے بارے زیادہ جانتی نہیں تھی۔

"اسی شہر میں..... لیکن یہاں سے کافی دور رہتی ہے۔"

"پھر تو میں بھی نگینہ آپی کے ساتھ جاؤں گی۔" چندا نے جلدی سے جواب دیا

"نہیں بیٹا! تم وہاں جا کر کیا کرو گی..... وہ لوگ زیادہ پڑھے لکھے اور دولت مند نہیں ہیں۔ ان کے ہاں زیادہ سہولتیں بھی نہیں ہیں۔ تم وہاں جا کر بور ہو جاؤ گی۔"

"پلیز بڑی باجی..... جانے دیں ناں۔" چندا کے لہجے میں التجا تھی۔

"جانے دو ناں اماں..... جب سے یہاں آئی ہے کہیں نہیں گئی۔ ویسے بھی میں اس کے بغیر اداس ہو جاؤں گی۔"

نگینہ نے اس کی سفارش کی تو رانی بائی نے گہری سانس لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا اور چندا اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر خوشی سے جھومنے لگی۔

وہ رات تیاری میں گزری اور اگلے روز صبح سویرے رانی بائی کا ڈرائیور ان دونوں کو لے کر روپا کے فلیٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔

تنگ اور نیم تاریک راہداری سے جو سیڑھیاں گھومتی ہوئی اس کے فلیٹ تک پہنچتی تھیں اس کے گرد خستہ حال اور زنگ آلود تھے۔ ماحول میں عجیب سی گھٹن اور بدبو کا احساس تھا جب کہ ہر طرف جا بجا گندگی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ جب وہ دونوں ڈرائیور کے ہمراہ فلیٹ کے دروازے پر پہنچیں تو روپا نے خوشدلی سے ان کا استقبال کیا۔ اس کی دونوں بیٹیاں پروا اور کاجل بھی مہمانوں کی آمد پر خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

روپا ایک خوب صورت عورت تھی اور اس کے چہرے پر فطری خود اعتمادی جھلک رہی تھی۔ اگرچہ وہ کچھ فربا ہو چکی تھی مگر پھر بھی پرکشش دکھائی دیتی تھی۔ وہ آج بھی رقص میں مہارت رکھتی تھی۔ اسے دیکھ کر اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ چند برس قبل یقیناً وہ توبہ شکن حد تک خوب صورت رہی ہو گی۔ مگر اب بچوں کے جھنجھٹ میں پڑنے کے بعد روپا کا کیریئر تباہ ہو چکا تھا اور اس کے وجود میں پہلی سی تازگی نہیں رہی تھی۔

فلیٹ کا اندرونی منظر مڈل کلاس فیملی کی نشاندہی کر رہا تھا۔ ان دونوں کے پہنچنے سے قبل ہی رانی بائی نے روپا کو تمام صورتحال سے آگاہ کر دیا تھا۔

چندا وہاں پہنچنے کے بعد کچھ ہی دیر میں سب سے گھل مل گئی تھی۔ رانی بائی اور روپا کے معاشی حالات میں بہت فرق تھا۔ لیکن پھر بھی روپا کی بے لوث محبت نے ان دونوں کے دل جیت لیے تھے۔ وہ ایک پیشہ ور طوائف ضرور تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ مکمل گھر داری کا ہنر بھی جانتی تھی۔

اس لیے مہمانوں کے پہنچتے ہی کھانا پکانے کے لیے اپنے چھوٹے سے باورچی خانے میں چلی گئی۔ اسے مصروف پا کر نگینہ کچھ دیر تک کمرے میں بیٹھی ٹی وی کے ریموٹ کنٹرول سے کھیلتی رہی اور پھر چندا کو اپنی سہیلیوں کے ساتھ مصروف چھوڑ کر روپا کے پاس کچن میں جا پہنچی۔

"روپا آنٹی! گراؤنڈ فلور پر سیڑھیوں کے نزدیک فلیٹ میں کون رہتا ہے۔"

"تم نے کسے دیکھا؟" روپا چونکی۔

"کوئی بوڑھی عورت تھی۔ مجھے یوں گھور رہی تھی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"کچھ کہا تو نہیں اس نے؟" روپا نے پوچھا۔

"جی نہیں..... مگر وہ ہے کون؟"

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

قرآن اور کائنات کا سارا نظام دعوت فکر دے رہا ہے

اللہ کی ذاتِ عالی شان روشن اور لافانی حقیقت ہے

قرآن کریم ہر فرد و بشر کو دعوت و تدبّر دے رہا ہے

تقدیر قرآن حکیم کی روشنی میں

لوح محفوظ

مولف و محقق: مشتاق احمد قریشی

مسئلہ تقدیر قرآن کریم اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں تحریر کیا ہے

اس عظیم کائنات کا نظامِ حیات کس نے اور کیسے کس طرح سے قائم کیا

اللہ نے ہر چیز، ذرے، ہر مخلوق چاہے وہ نظر آ رہی ہو یا نظر نہ آ رہی ہو اس کی تقدیر پہلے لکھ کر محفوظ کر دی

اللہ نے مخلوقات تک کے نظام الاوقات اور اس کی تقدیر پہلے سے ہی لکھ کر محفوظ کر دی ہے

قرآن ان لوگوں کو جو اسے جھٹلاتے ہیں انہیں مخاطب کر کے کہتا ہے یہ قرآن لوح محفوظ میں ہے

نئے افق گروپ آف پبلیکیشنز
81 نیپئر بیرکس، ہاکی اسٹیڈیم، نزد آنچل پریس کراچی 75510
021-35680772/03008264242

''کچھ رشتے دار ٹائم بم کی طرح ہوتے ہیں، بظاہر بالکل خاموش، لیکن مناسب وقت کے منتظر۔ وہ میری دور کی رشتے دار نہیں، سگی ماں ہے۔ اُس کا لہجہ اکثر تلخ ہو جاتا ہے جوان لڑکیوں کو دیکھ کر، اُن کا اٹھلانا بدن برداشت نہیں ہوتا اس سے۔ عموماً خاموش رہتی مگر کچھ پتہ نہیں چلتا کب پھٹ پڑے۔'' روپا نے بے پروائی سے کہا۔

''حیرت ہے..... مگر کیوں؟''

''بوڑھی ہو چکی ہے ناں! اس لیے جوان لڑکیاں برداشت نہیں ہوتیں اس سے۔ یہ ہمیشہ سے ایک نفسیاتی مسئلہ رہا ہے ہمارے طبقے کی عورتوں کا۔ میری ماں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ وہ ساری زندگی ایک طوائف تو رہی مگر کبھی نائکہ نہ بن سکی..... اب گھر میں بھی کوئی اس پر توجہ نہیں دیتا۔ وہ سارے تماشبین جو کبھی اس کے حسن کے قصیدے پڑھتے نہیں تھکتے تھے، اب اس کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے۔ اگرچہ وہ شیطان صفت تماشبین خود بھی بوڑھے ہو چکے ہیں مگر رات گزارنے کے لیے اب بھی جوان عورت کو ترجیح دیتے ہیں..... یہی وجہ ہے کہ میری ماں اب پیسے کمانے کے قابل نہیں رہی۔''

''سچ کہا آپ نے روپا آنٹی! بہت برا وقت ہوتا ہے یہ ہر اُس عورت کے لیے جس نے ساری عمر اپنے جسم کی کمائی کھائی ہو۔'' نگینہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو روپا بولی۔

''ہاں ایسا ہی ہے..... اسی لیے میری ماں کا اصرار ہے کہ میں سارا دن گھر میں پڑنے رہنے کی بجائے خود کو کیش کرانے پر توجہ دوں۔ اس کا خیال ہے کہ دو بچیوں کے پیدائش سے میرا سراپا اتنا بدوضع نہیں ہوا کہ میں مردوں کا دل نہ جیت سکوں۔''

''اور آپ کی کیا رائے ہے؟'' نگینہ نے تجسس بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''پیسہ کس کی ضرورت نہیں ہے نگینہ! مگر اب میں کسی کوٹھے یا نجی محفل میں جا کر رقص نہیں کر سکتی۔ میرا شوہر سلیم مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ اپنی دوسری بیوی رخسانہ کے ساتھ شہر کے پوش علاقے میں رہتا ہے اور یہاں کبھی کبھار ہی چکر لگاتا ہے۔ البتہ اس نے میری خبر رکھنے کے لیے کچھ جاسوس ضرور چھوڑے ہوئے ہیں جو اسے میری ہر حرکت سے باخبر رکھتے ہیں۔''

وہ سلیم کی دوسری بیوی تھی۔ اب تو اس نے روپا اور بچیوں کی مالی معاونت سے بھی ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ روپا کو یقین سا ہونے لگا تھا کہ بہت جلد اسے طلاق ہونے والی ہے۔

وہ دونوں باتوں میں مصروف تھیں کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور پھر جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس ایک گورا چٹا نوجوان اندر آ گیا۔ اس کے انداز میں شرافت اور چہرے سے وقار جھلک رہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آہٹ سن کر روپا بھی کچن سے باہر آ گئی۔

''آداب آپی.....'' نوجوان نے مہذب انداز میں سلام کیا۔

''آداب! آ گئے جاوید بابو..... بھئی بہت انتظار کروایا تم نے۔ میرا تو دل گھبرانے لگا تھا تمہارے بارے میں سوچ کر۔ کم از کم ایک فون ہی کر دیتے کہ دو روز کی تاخیر سے پہنچو گے۔'' روپا محبت بھرے انداز میں شکوہ کرتے ہوئے آگے بڑھی اور اور کسی بزرگ عورت کی طرح اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر ماتھا چوم لیا۔

''بے فکر رہیں آپی، ہم جیسے لوگ جلدی نہیں مرتے ابھی بہت سسکنا ہے ہمیں اس پاپی دنیا میں۔'' نوجوان جس کا نام جاوید تھا کندھے سے بیگ اُتارتے ہوئے بولا۔

''مریں تمہارے دشمن۔ ایک رکھوں گی کنپٹی پر اگر آیندہ اس قسم کی بات کہی۔ یہ بتاؤ سفر کیسا رہا، اور اتنے دن کیوں لگا دیے تم نے؟''

''سفر تو کٹ ہی جاتا ہے آپی! بس آگے بڑھنے کی جستجو ہونی چاہیے، ایک ضروری کام کے سلسلے میں رُکنا پڑ گیا تھا۔ اطلاع اس لیے نہ دے سکا کہ اپنا موبائل فون فروخت کر کے دو دن گزارنے پڑے ہیں اس اجنبی شہر میں۔''

جاوید نے تاخیر سے آنے کی وجہ بتائی اور پھر کچن کے ادھ کھلے دروازے میں کھڑی نگینہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''ان محترمہ کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں آپ کے ہاں..... مہمان آئی ہیں کیا؟''

''ارے میں تو تعارف کروانا ہی بھول گئی۔ یہ نگینہ ہے، میری سب سے گہری سہیلی رانی کی بیٹی۔ تمہاری امی بھی واقف تھیں رانی سے۔ تم بہت چھوٹے تھے اس وقت جب وہ یہاں سے کافی دور منتقل ہو گئی تھی..... نگینہ یہاں

Waqar Azeem Pakistanipoint www.pakistanipoint.com

کچھ دن رہنے آئی ہے۔ دراصل اس کا ایک بگڑے ہوئے سیٹھ سے پھیڑا ہو گیا تھا۔ وہ کمبخت اس کی جان کا دشمن بن گیا ہے اور مسلسل مار ڈالنے کی دھمکیاں دے رہا ہے..... جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے رانی کو فون کر کے نگینہ کو فوراً اپنے پاس بلوا لیا۔ اب دیکھتی ہوں اس سورمے کو، کیسے بچی کو نقصان پہنچاتا ہے۔'' روپا نے تفصیل بتائی تو وہ نگینہ کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''آپ نے بہت اچھا کیا کہ یہاں آ گئیں۔ یقین کریں مصیبت کے وقت ہم جیسے لوگوں کو کوئی با اثر آدمی پناہ نہیں دیتا۔ وہ صرف اس وقت تک ہمیں انسان سمجھتے ہیں جب تک ان کی ضرورت پوری نہیں ہو جاتی۔''

جاوید نے اس کی ہمت بندھائی تو روپا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اچھا چھوڑو اس بحث کو۔ اتنا لمبا سفر طے کر کے آئے ہو، بھوک لگی ہو گی۔ کھانا تیار ہے، تم جلدی سے ہاتھ منہ دھو لو۔ جب تک میں دسترخوان سجاتی ہوں۔''

''نہیں آپی! سچ کہوں تو بھوک بالکل نہیں ہے مجھے۔ بس سے اترتے ہی جو ملا پیٹ پوجا کر لی۔ اس وقت تو چوہوں نے اودھم مچا رکھا تھا معدے میں۔ بس ایک کپ چائے کی طلب ہے۔ فلیٹ میں بھجوا دیجئے گا۔ ابھی تو میں نہا کر تھوڑا آرام کرنا چاہتا ہوں۔'' جاوید نے انہیں سلام کیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

''یہ کون تھا روپا آنٹی؟'' اس کے جاتے ہی نگینہ نے پوچھا۔

''جاوید نام ہے اس کا۔ پیدائش سے جوانی تک کی عمر بازارِ حسن میں یوں گزاری ہے اس بچے نے کہ برے سے برا شخص بھی اس کے اعلیٰ کردار کی گواہی دیتا ہے۔ اس کی ماں بہت اچھی رقاصہ تھی۔ مگر ایڈز جیسے موذی مرض نے پنجے گاڑ دیے تھے اس کے نازک سے وجود میں..... سب سے اہم بات یہ کہ اس نے جاوید کو ہاسٹل میں رکھ کر اپنے جسم کی کمائی سے تعلیم دلوائی۔ میں نے بارہا اس عظیم ماں کو اپنے بیٹے کی فیسوں، اس کی کتابوں، یونیفارم، یہاں تک کہ اس کے جوتوں کے لیے بھی خود کو بیچتے دیکھا۔ وہ کہا کرتی تھی میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ میری بیٹے کو دنیا میں انسان کا درجہ ملے۔ ورنہ لوگ تو ہمیں استعمال کے بعد کتوں سے بھی بدتر سمجھتے ہیں..... اور پھر جاوید نے بھی اپنی ماں کی محبت کا حق ادا کیا۔ اس نے سائنس کے ساتھ سولہ جماعتیں پاس کیں اور اب ایک سرکاری اسکول میں سائنس ماسٹر کی ملازمت کر رہا ہے۔''

روپا بولتی چلی جا رہی تھی اور نگینہ یوں محویت سے اس کی باتیں سن رہی تھی جیسے حرف حرف پر سچ کی گواہی دے رہی ہو۔''

-☆-☆-☆-

خستہ حال دروازے پر دوسری مرتبہ دستک کی آواز سنائی دیتے ہی ادھیڑ عمر رام پرشاد نے لالٹین کی مدہم روشنی میں گھڑیال کی طرف غور سے دیکھا تو رات کافی بیت چکی تھی۔ دستک سن کر اس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ یقیناً قریبی گاؤں میں کسی ہندو کی موت واقع ہو گئی ہو گی اور لوگ چتا جلانے کے لیے لکڑیاں خریدنے آئے ہوں گے۔

اسی خیال کے تحت لالٹین ہاتھ میں تھامے رام پرشاد دروازے کے قریب جا پہنچا اور زوردار جمائی لیتے ہوئے ہکلا کر پوچھا۔

''کون ہے بھئی.....؟''

''دروازہ کھولیے رام پرشاد جی..... یہ میں ہوں موہن۔'' رام پرشاد، موہن کی آواز اچھی طرح پہچانتا تھا، اس لیے فوراً دروازہ کھول دیا۔

لیکن موہن کے اندر داخل ہونے پر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ آج موہن اکیلا نہیں آیا تھا، اس نے اپنی بانہوں میں ایک نوعمر لڑکی اٹھا رکھی تھی۔ جو شاید بے ہوش تھی۔

''یہ لڑکی کون ہے موہن جی..... اور یہ بے ہوش کیوں ہے؟'' رام پرشاد نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''یہ مجھے مسلمانوں کے قبرستان سے ملی ہے۔'' موہن نے کمرے میں پہنچ کر ارینا کو بستر پر لٹاتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا مطلب..... ابے مورکھ کسی کی تازہ قبر تو نہیں کھود ڈالی تم نے؟''

''کیسی باتیں کرتے ہوئے رام پرشاد۔ یہ لڑکی زندہ ہے اور صرف بے ہوش ہے۔''

''تو پھر اسے یہاں کیوں اٹھا لائے ہو۔ مجھے تو ویسے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

بھی حال حلیے سے یہ مسلمان دکھائی دے رہی ہے۔ دیکھو اس کے گلے میں ایک لاکٹ بھی ہے جس پر عربی زبان میں کچھ لکھا ہوا ہے۔"

یوں اچانک کسی اجنبی لڑکی کو سامنے پا کر رام پرشاد کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

"سچ کہتا ہوں رام پرشاد! یہ بہت پراسرار ناری ہے۔ میں نے اسے پہلی مرتبہ ریلوے لائن کے قریب دیکھا تھا۔ لیکن جب میرے پکارنے کے باوجود یہ اپنی ہی دھن میں مست آگے بڑھتی رہی تو میں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ وہاں سے چلتے ہوئے یہ ٹوٹی ہوئی دیوار کے راستے شمشان گھاٹ میں داخل ہوئی اور پھر وہاں رکے بغیر آگے بڑھتی ہوئی مسلمانوں کے قبرستان میں جا پہنچی..... بھگوان کی سوگند پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ یہ لڑکی نہیں کوئی بھٹکی ہوئی آتما ہے۔ لیکن قبرستان میں پہنچ کر اس لڑکی نے ایک عجیب حرکت کی۔"

"کیسی حرکت.....؟" رام پرشاد جو غور سے ارینا کے چہرے کی جانب دیکھ رہا تھا اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"یہ چلتی ہوئی برگد کے بڑے سے پیڑ کے پاس جا پہنچی اور اس درخت کو دیکھ کر دھیرے دھیرے مسکرانے لگی اور پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولی، دیکھو وہ کتنا خوب صورت ہے۔ اس کی بات سن کر میں نے غور سے درخت کی سمت دیکھا مگر مجھے اندھیرے میں کچھ دکھائی نہ دیا۔"

"پھر کیا ہوا؟" رام پرشاد نے بے تابی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں..... اتنا کہتے ہی یہ بے ہوش ہو گئی۔"

"موہن! یہ لڑکی ہمارے لیے کوئی مصیبت کھڑی نہ کر دے۔"

"نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس پر بہت ترس آ رہا ہے۔ لگتا ہے یہ کوئی دیوانی لڑکی ہے اور آج کراچی جانے والی ٹرین سے اُتر گئی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ کل پرسوں تک کوئی نا کوئی اِسے ڈھونڈتا ہوا یہاں تک ضرور پہنچ جائے گا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم ایک دو روز کے لیے اسے اپنے گھر میں رہنے کے لیے جگہ دے دو..... میری بیوی بہت شکی مزاج ہے۔ وہ سمجھے گی کہ میں اس لڑکی کو اغوا کر کے لایا ہوں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ تمہارے پاس رہے۔"

موہن کی درخواست پر رام پرشاد نے بے دلی سے ارینا کو اپنے پاس رکھنے کی حامی بھر لی اور اُسے ہوش میں لانے کے بعد لکڑیوں کے ٹال سے ملحق دو کمروں کے مکان میں لے گیا۔

رام پرشاد کے گھر میں ایک بیوی اور تین بچے تھے۔ اس کی بڑی بیٹی شانتی جس کی عمر سات برس تھی دونوں ٹانگوں سے معذور تھی۔ جبکہ دونوں بیٹے اس سے چھوٹے تھے۔

گھر پہنچ کر اُس نے اپنی بیوی سومترا کو ارینا کے بارے میں بتایا تو وہ منہ بسور کر اسے کھری کھری سنانے لگی۔ وہ کسی مسلمان لڑکی کو اپنے گھر رکھنے کے لیے تیار نہیں تھی مگر شوہر کے سمجھانے پر نیم رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے اُٹھ کر اُس کے لیے کونے میں الگ بستر بچھا دیا۔ انھوں نے ارینا سے اس کے والدین کے بارے پوچھنے کی بہت کوشش کی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ جس پر وہ میاں بیوی یہی سمجھے کہ لڑکی بہت گھبرائی ہوئی ہے۔ اس لیے کل سکون سے اس کے ورثا کے بارے میں بات کریں گے۔

اگلے روز صبح سویرے سومترا اپنی پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر ارینا کے پاس کمرے میں پہنچی تو وہ اسی حالت میں بستر پر چت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ جیسے وہ اسے رات کو کمرے میں چھوڑ کر گئی تھی۔

سومترا دن کی روشنی میں نوعمر ارینا کا حسن دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ارینا سے اس کے والدین کے بارے پوچھا مگر وہ بدستور خاموش رہی اور کوئی جواب نہ دیا۔ اسی دوران رام پرشاد بھی آ گیا۔ ارینا کی حالت دیکھ کر وہ بھی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

"پرشاد جی! میں تو کہتی ہوں اس لڑکی کو آج ہی گھر سے چلتا کریں۔ ہمارے گھر میں تو پہلے ہی ایک معذور بیٹی بوجھ بنی بیٹھی ہے۔ اگر یہ گونگی بہری لڑکی بھی یہاں سے نہ گئی تو ہم پر ذمہ داری بہت بڑھ جائے گی۔ ویسے بھی میں کسی مسلمان کو اپنے گھر میں نہیں رکھنا چاہتی۔ آپ موہن سے کہیں کہ اس مصیبت کو یہاں سے واپس لے جائے اور کسی آتی جاتی ٹرین میں بٹھا کر کراچی بھیج دے۔"

سومترا صحن میں بیٹھی رام پرشاد سے باتیں کر رہی تھی کہ ارینا بھی روبوٹ کی طرح چلتی ہوئی ان کے قریب

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

فرش پر آ بیٹھی۔ اسے قریب پا کر دونوں میاں بیوی خاموش ہو گئے۔

رام پرشاد کے کہنے پر سومترا نے ناشتہ تیار کر کے سب لوگوں کے ساتھ رکھ دیا۔

اسی لمحے ان کی معذور بیٹی شانتی بھی زمین پر اپنے اپاہج وجود کو گھسیٹتی ہوئی ارینا کے قریب آ بیٹھی۔ وہ حیرت بھری نظروں سے اس نئے مہمان کی طرف دیکھنے لگی جو اس کے لیے بالکل اجنبی تھی۔ ناشتے کے دوران ارینا نے پانی کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں کو لگایا اور چند گھونٹ پی کر واپس زمین پر رکھ دیا جس پر قریب بیٹھی شانتی نے وہی گلاس اُٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

سومترا جو کہ دور بیٹھی یہ منظر دیکھ رہی تھی اپنی بیٹی کو ایک مسلمان کا جھوٹا پانی پیتے دیکھ کر جلدی سے اٹھی اور گلاس اس کے ہاتھ چھین لیا۔ لیکن اس وقت تک شانتی گلاس میں موجود چند گھونٹ پانی اپنے حلق سے نیچے اتر چکی تھی۔

''یہ کیا کر رہی ہے تو بدذات..... تجھ پر درگا ماں کا قہر نازل ہو، تو نے ایک مسلمان کا جھوٹا پانی پی لیا۔''

سومترا اُسے کوستی ہوئی واپس پلٹنے والی تھی کہ یہ دیکھ کر اس کی اور رام پرشاد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کہ اُن کی معذور بیٹی شانتی بنا کسی سہارے کے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

شانتی خود بھی اپنے اس عمل پر حیران پریشان سی تھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنا پہلا قدم اُٹھا کر آگے بڑھایا اور ماتا جی کا نعرہ لگا کر سومترا سے لپٹ گئی۔

صبح سویرے گھر میں رونما ہونے والے اس چمتکار نے ان کے برسوں پرانے خواب کو حقیقت میں بدل دیا تھا۔ کتنی خواہش تھی رام پرشاد کو کہ وہ اپنی بیٹی کو پیروں پر چلتا دیکھے۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر شانتی کا علاج کروایا تھا مگر ڈاکٹر، حکیم اُسے ہمیشہ کے لیے معذور قرار دے چکے تھے۔

سومترا اور رام پرشاد کو جہاں اپنی بیٹی کے صحت یاب ہو جانے کی خوشی تھی وہیں اس بات کا احساس بھی تھا کہ یہ نعمت انھیں ارینا کی وجہ سے ملی ہے..... وہی ارینا جو کچھ دیر قبل تک ان کے لیے ایک نہایت کمتر وجود تھا یکدم اتنی اہم ہو گئی تھی کہ سومترا بار بار اس کا ماتھا چوم رہی تھی۔

اس روز اُن کے گھر میں کئی ایک ایسے واقعات رونما ہوئے جو پہلے کبھی نہ دیکھے گئے تھے۔ ان کی بکریوں نے دوگنی مقدار میں دودھ دیا۔ سومترا کے کئی دن پہلے کھوئے ہوئے پیسے مل گئے اور رام پرشاد کے ٹال پر معمول سے کہیں زیادہ لکڑیاں فروخت ہوئیں۔

رام پرشاد کا لکڑیوں کا ٹال شمشان گھاٹ اور خستہ حال مندر کے بالکل قریب واقع تھا۔ اس مندر کا بوڑھا پجاری چند ماہ قبل دل کی دھڑکن بند ہو جانے کے سبب مر چکا تھا۔ تب سے رام پرشاد ہی اس مندر اور شمسان گھاٹ کا انتظام سنبھالے ہوئے تھا۔ اس طرح بنا ہاتھ پاؤں ہلائے وہ مفت کی رقم بھی اس کے ہاتھ آنے لگی تھی جو مندر میں آنے والے چڑھاوے کے طور پر پیش کر دیا کرتے تھے۔ جب انھوں نے ارینا کی آمد کے بعد اپنے گھر میں بہتری کے آثار دیکھے تو انھیں اُس کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا۔

''میرا خیال ہے کہ اس لڑکی کو کہیں اور بھیجنے کی بجائے اپنے ہی گھر میں رکھ لیتے ہیں۔ نہ تو یہ کچھ بولتی ہے اور نہ ہی کسی بات کی فرمائش کرتی ہے۔ خود ہی کسی کونے کھدرے میں پڑی اپنے نصیب کا کھاتی رہے گی۔ اس طرح ہمارے بھی دن سنور جائیں گے۔''

سومترا کی بات سن کر رام پرشاد نے مکاری سے بیوی کی جانب دیکھا۔

''تم نے تو صرف یہی سوچا ہے، میں تو مستقبل میں اس سے بہت زیادہ نفع کمانے والا ہوں۔''

''کیا مطلب..... میں سمجھی نہیں؟'' سومترا حیرت سے بولی تو رام پرشاد اسے تفصیل بتانے لگا۔

''میں نے سوچا ہے کہ اس لڑکی کو دیوی بنا کر مندر میں بٹھا دوں۔ لوگ اس کے پاس آیا کریں گے تو یہ ان کے مسئلے حل کر دیا کرے گی۔ یوں کام ہو جانے پر ہم اُن سے من مانے چڑھاوے وصول کر سکیں گے۔''

شوہر کی بات سن کر سومترا نے قابل ستائش نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور پھر آپس میں مشورہ کرنے کے بعد اس خیال کو حتمی شکل دے دی۔

اب سومترا نے رام پرشاد کی ہدایت کے مطابق ارینا کے لیے ایک زرد لباس تیار کرنا شروع کر دیا۔ اگلے روز صبح سویرے انھوں نے ارینا کو نیا لباس پہنایا اور رام پرشاد

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

اُسے مندر لے گیا۔

اس نے ارینا کو درگا کے بت کے قریب ایک چھوٹے سے چبوترے پر بٹھا دیا اور ہر آنے جانے والے کو یہ بتانے لگا کہ یہ لڑکی درگا ماں کا روپ لے کر آسمان سے اتری ہے۔ اگر یہ کسی سے خوش ہو جائے تو اس کے من کی ہر مراد پوری کر دیتی ہے۔

اس نے دو لڑکوں کو دوسرے گاؤں بھی بھیج دیا تا کہ وہ اس بات کا خوب ڈھنڈورا پیٹیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو گھیر کر اس لڑکی کے درشن کے لیے یہاں لائیں۔

گھر کا کام نبٹانے کے بعد سومترا بھی مندر میں آ گئی اس نے ارینا کے ساتھ ہی چبوترے پر ڈیرا ڈال لیا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''رام پرشاد جی! آپ نے اس لڑکی کے گلے سے عربی زبان والا لاکٹ تو اُتار دیا تھا۔ کیوں نہ اب ہم اسے درگا ماں کے نام والا لاکٹ پہنا دیں..... یوں ہم درگا کے نام کے بہت سے لاکٹ یہاں مہنگے داموں فروخت کر سکیں گے۔''

سومترا کا مشورہ معقول تھا۔ چنانچہ رام پرشاد نے جلدی سے مندر کے کونے میں ایک چھوٹی سے الماری کھولی اور اس میں رکھا ہوا درگا کے نام والا لاکٹ نکال کر سومترا کو دیتے ہوئے اشارہ کیا کہ اسے ارینا کے گلے میں پہنا دو۔

سومترا نے وہ لاکٹ اس کے گلے میں پہنا کر ہاتھ پیچھے کھینچا ہی تھا کہ لاکٹ کھل کر زمین پر جا گرا۔

''دھیان سے پہناؤ۔ یوں درگا ماں کا نام زمین پر گرانے سے ہم پر اس کا قہر نازل ہو سکتا ہے۔''

اس کی بات سن کر سومترا نے دوسری بار لاکٹ اس کے گلے میں ڈالا، مگر نتیجہ پھر وہی رہا اور اس بار بھی گلے میں باندھی جانے والی ڈوری کھل گئی۔

''مجھے دو..... میں خود اس کے گلے میں لاکٹ پہناتا ہوں۔''

رام پرشاد نے ارینا کے گلے میں لاکٹ پہنانے کی کوشش کی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے ہاتھ ہوا میں ہی پکڑ لیے ہوں۔ اسے اپنے سامنے ایک نادیدہ دیوار محسوس ہونے لگی تھی..... ایک ایسا احساس جس نے اس کے دل کی دھڑکن بہت تیز کر دی تھی۔

-☆-☆-☆-

مزید چند روز جزیرے پر گزارنے کے بعد تیمور برنی نے واپس جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو سردار نے اُسے مہان جوتشی کے وہ کلمات یاد دلائے کہ تنہا پانی پر سفر کرنے کی صورت میں وہ کسی بڑی مصیبت میں پھنس سکتا ہے۔

تیمور ان توہمات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ فاخر اور رباب کے بغیر اب اس جزیرے پر اُس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ جلد از جلد یونان پہنچ کر رباب کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔ چناں چہ سردار سے اصرار کر کے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اُسے کھلے سمندر میں پہنچا دے تا کہ وہ کسی بحری جہاز کے ذریعے یونان پہنچنے کی کوشش کر سکے۔

اس کا اصرار حد سے بڑھا تو سردار نے بھی ہتھیار ڈال دیے اور مدد کی حامی بھر لی۔ تیمور برنی کے ہوش میں آنے کے بعد سردار نے وہ بیگ بھی اس کے حوالے کر دیا تھا جس کی خفیہ جیب میں ہیرے اور ضروری دستاویز محفوظ تھے۔ یہ بیگ مرتے وقت فاخر کے پاس تھا جسے اب تیمور برنی کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

اگلے دن جزیرے کے چند لوگ اُسے لے کر کشتی کے ذریعے کھلے سمندر میں پہنچ گئے۔ یہ سمندری علاقہ یونان جانے والے جہازوں کی گزرگاہ تھا۔ اس لیے انھیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا اور شام ہونے سے پہلے ہی ایک کپتان نے مدد کا سگنل وصول کر کے تیمور برنی کو اپنے جہاز میں سوار کروا لیا۔

یہ ایک کارگو جہاز تھا اور یونان جا رہا تھا۔ عرشے پر پہنچتے ہی تیمور برنی کو کپتان کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے یہی کہانی سنائی کہ اُن کی لانچ تباہ ہو گئی تھی اور وہ چند روز ایک جزیرے پر گزارنے کے بعد مدد کی تلاش میں کھلے سمندر میں لوٹ آیا۔ تیمور برنی کی بات سن کر کپتان نے برا سا منہ بنایا اور سگریٹ کا لمبا کش لیتے ہوئے بولا۔

''ایک تو میں اس خدمت خلق سے بہت تنگ آ چکا ہوں۔ مجھے بہت کوفت ہوتی ہے اس وقت جب کسی انسانی جان کو بچانے کے لیے اتنا بڑا جہاز رُوکنا پڑتا ہے..... خیر اب تم آ ہی گئے ہو تو سوائے برداشت کرنے کے کوئی چارہ نہیں ہے۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ تمہارے پاس

www.Pakistanipoint.com

پاسپورٹ وغیرہ بھی نہیں ہوگا۔"

"بالکل نہیں....."

تیمور برنی نے اس کے خیال کی تائید کی تو وہ مزید بھڑک گیا۔

"مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ تم ایشیائی لوگ یورپ میں داخل ہونے کے لیے اپنی جان تک کی بازی لگا دیتے ہو۔ وہاں پہنچ کر چاہے تمہیں ہماری جوتیاں ہی کیوں نہ صاف کرنی پڑیں..... لعنت بھیجتا ہوں میں تم پر۔ ویسے بھی میرے سمجھانے سے کون سا تم سدھر جاؤ گے۔"

"تو میرے لیے کیا حکم ہے جناب۔"

تیمور برنی نے اس کی تمہید کو نظر انداز کر کے مسکین صورت بناتے ہوئے پوچھا۔ وہ اس نازک موقع پر کپتان سے جھگڑنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ اس کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔

"یہ ایک کارگو جہاز ہے۔ اس میں بہت محدود تعداد میں مہمان مسافر اور جہاز کا عملہ ہے۔ میں تمہیں اس بات کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا کہ تم ان خاص مہمانوں سے گھلنے ملنے کی کوشش کرو۔ یاد رکھو کہ تمہیں کھانے پینے اور گھومنے پھرنے کے لیے صرف درجہ سوئم تک محدود رہنا ہو گا۔"

"مجھے منظور ہے..... مگر یہ بھی بتا دیں کہ میں رہوں گا کہاں؟"

"نیچے کسی اسٹور روم میں سو جانا۔"

کپتان نے ایک گارڈ کو بلایا اور اُسے جہاز کے اندرونی حصے میں بھیج دیا۔ وہ تیمور برنی کو ہمراہ لیے سیڑھیاں اُترنے کے بعد کر مختلف راستوں سے گزر کر ایک تنگ سی راہداری میں داخل ہوا اور ایک بند دروازے کے سامنے پہنچ کر بولا۔

"اگلے چھ دن تمہیں اسی کیبن میں گزرنے ہیں۔"

"کیا میں بالکل باہر نہیں آسکوں گا؟" تیمور کے لہجے میں حیرت تھی۔

"دن میں صرف ایک گھنٹہ کے لیے ڈیک پر آنے کی اجازت ہوگی۔"

تیمور اس کا حکم سن کر خاموش ہو گیا تو وہ مسکرا کر بولا۔

"اب تم آرام کرو۔ مجھے اُمید ہے کہ تم فضول گھومنے پھرنے میں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھو گے۔" گارڈ ذو معنی ہنسی ہنسا اور واپس چلا گیا۔

اس کی بات سمجھ نہ آنے کے باوجود تیمور نے سر کو جنبش دی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

یہ درمیانے سائز کا کیبن نما کمرہ تھا جس میں مدہم روشنی والا چھوٹا سا بلب روشن تھا۔ کمرے کے فرش پر بستر بچھا ہوا تھا جس پر بھاری کمبل کھلی ہوئی گٹھڑی کی مانند پڑا تھا۔

اس عارضی ٹھکانے پر پہنچ کر تیمور برنی نے بیگ اُتار کر دیوار کے ساتھ رکھا اور سکون سے کمبل پر بیٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس گٹھڑی نما کمبل میں حرکت پیدا ہوئی اور ایک ہلکی سی نسوانی چیخ سنتے ہی تیمور برنی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہزار بار کہا ہے کہ ان ہڈیوں کو توڑنے سے تم لوگوں کو کچھ نہیں ملنے والا۔ اِن کی سلامتی میں ہی تمہارے لیے کشش کا سامان ہے۔ مگر مجال ہے جو کسی جاہل کو میری بات سمجھ آتی ہو۔"

کسی صنف نازک نے اپنے چہرے سے کمبل اتار کر اس کی جانب دیکھا۔ تو تیمور برنی نے جلدی سے دیوار پر دوسرا بٹن بھی دبا دیا۔ کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی تو تیمور برنی یہ دیکھ کر سٹپٹا سا گیا کہ سامنے بستر پر سانولی سلونی

غزل

بدل چکی ہے ہر اک یاد اپنی صورت بھی
وہ عہد رفتہ کا ہر خواب ہر حقیقت بھی
کچھ ان کے کام نکلتے ہیں دشمنی میں مری
میں دشمنوں کی ہمیشہ ہوں ضرورت بھی
یہ جس نے روک لیا مجھ کو آگے بڑھنے سے
وہ میری بے غرض تھی میری ضرورت بھی
میں اپنی بات کس سے بھی کر نہ پاؤں گی
مجھے تباہ کرے گی یہ میری عادت بھی
یہ میرا عجب عجز کہ دل میں اسے اترنے دلا
یہ اس کا مان کہ مانگی نہیں اجازت بھی

شاعرہ: شبنم شکیل

انتخاب: عامر وسیم..... کراچی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

رنگت والی ایک نیگرو لڑکی کمبل سے چہرہ باہر نکالے بلی کی طرح جھانک رہی تھی۔

''آئی ایم سوری..... دراصل مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس کمرے میں کوئی اور بھی ہے۔ مجھے تو گارڈ یہاں چھوڑ گیا ہے۔ اگلے چند روز مجھے یہیں گزارنے ہیں۔'' تیمور برنی نے جلدی سے انگریزی میں معذرت کی۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے..... لیکن تم اتنا گھبرا کیوں رہے ہو..... بیٹھ جاؤ سکون سے۔''

وہ خود بھی کمبل لپیٹ کر اُٹھ بیٹھی اور اپنے بکھرے ہوئے بالوں کی پونی ٹیل بناتے ہوئے بولی۔

''میں لارا ہوں..... لارا فرگوسن۔''

اس نے تیمور کی بدحواسی سے محظوظ ہوتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا اور چہک کر بولی۔

''تم شاید ایشیائی ہو۔''

''ہاں میں پاکستانی ہوں۔ میرا نام تیمور برنی ہے، تم سے مل کر خوشی ہوئی۔'' تیمور برنی نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے ہاتھ ملایا۔

''لگتا ہے تم بالکل اناڑی ہو، تمہیں تو خوشی کا اظہار بھی نہیں کرنا آتا۔ حالانکہ کہنا یہ چاہیے تھا کہ ایک جوان لڑکی کو اپنے کمرے میں پا کر میری باچھیں کھل گئی ہیں۔''

لارا نے یوں قہقہہ لگایا جیسے وہ تیمور برنی کو برسوں سے جانتی ہو۔

''ایسی بات نہیں۔ تم شاید غلط سمجھ رہی ہو۔''

''چھوڑو یہ فضول جملے۔ مجھے وہ لوگ بہت برے لگتے ہیں جو دوسروں کو مرعوب کرنے کے لیے پارسا بننے کی کوشش کرتے ہیں..... ویسے میں منتظر رہوں گی کہ تم دل کھول کر میرے حسن کی تعریف کرو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ پہلے ہمیں تعارف جیسے بور مرحلے سے گزر جانا چاہیے۔''

باتونی لارا نے توقف اختیار کیا اور بولی۔

''جیسا کہ میں بتا چکی ہوں کہ میرا نام لارا فرگوسن ہے اور میرا تعلق برطانیہ سے ہے۔ پیشے کے لحاظ سے میں ایک ماڈل گرل ہوں۔ مشرقی لوگ مجھے بہت پسند ہیں۔ یوں سمجھو کہ پراسرار مشرق سے مجھے عشق ہے۔ لیکن افسوس کہ میرے دوستوں میں سے کوئی ایک بھی ایشیائی نہیں۔ کیا میں تمہیں اپنا دوست کہہ سکتی ہوں۔''

''ہاں ضرور! بشرطیکہ ہمارے اجداد میں کوئی دشمنی نہ پائی جاتی ہو۔'' تیمور نے کہا تو لارا کا مترنم قہقہہ کمرے میں گونج اُٹھا۔

''کہیں تم مجھ سے اخلاقاً دوستی تو نہیں کر رہے ہو؟''

''میں اخلاق کا اتنا بھی اچھا نہیں ہوں جتنا تم سمجھ رہی ہو۔'' تیمور برنی کا ترکی بہ ترکی جواب سن کر لارا بہت محظوظ ہو رہی تھی۔

''مجھے تمہارا جواب اچھا لگا۔ اس لیے اب اگر تم اخلاقاً کی بجائے جبراً دوستی کی کوشش کرو تب بھی مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

لارا نے اپنی دائیں آنکھ کا کونہ دباتے ہوئے ہونٹوں کو سکیڑا تو تیمور جھینپ کر رہ گیا تھا۔

پھر وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ تیمور محسوس کر رہا تھا کہ لارا کی خوشی مصنوعی نہیں تھی۔ شاید واقعی کسی ایشین کو اپنا دوست بنانے کا بڑا ارمان تھا اس کے دل میں۔ وہ پیسوں کی کمی کی وجہ سے اس کارگوشپ میں عملے کے کئی لوگوں کو خراج ادا کر کے مفت یونان جا رہی تھی۔ جہاں کسی فلم ڈائریکٹر نے اُسے روشن مستقبل کے سبز باغ دکھلا کر اپنے پاس بلایا تھا۔

تیمور برنی کے آجانے سے اس کے چہرے پر رونق سی آگئی تھی۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں کھل مل گئی تھی۔ اس نے تیمور کو اپنے بارے بہت کچھ بتایا۔ اپنے مشاغل اور پھر برطانیہ کے اس قصبے کے بارے بھی جہاں اس کا بچپن گزرا تھا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد اس کی پرورش چچا نے کی تھی۔ جب وہ جوان ہوئی تو لندن چلی آئی۔ اس نے اپنا پیٹ پالنے کے لیے بہت سے چھوٹے موٹے کام کیے تھے اور اب کچھ عرصے سے ماڈلنگ کر رہی تھی۔ اس کی تصاویر کئی غیر معروف رسائل کے ٹائیٹل پر شائع ہو چکی تھیں۔ اپنی ماڈلنگ کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے لارا نے بتایا۔

''میرا فوٹو گرافر ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ میں بہت خوب صورت ہوں۔ وہ میرے انگ انگ کی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قدرت نے تمہیں بہت محبت سے تراشا ہے، تم بتاؤ! کیا میں واقعی بہت حسین ہوں۔''

''ہاں تم بہت خوب صورت ہو۔'' تیمور برنی نے جان

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

چھڑانے کے سے انداز میں جواب دیا۔

''جھوٹ بول رہے ہو تم؟''

''میں سمجھا نہیں؟'' تیمور برنی حیرت سے بولا۔

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں بہت خوب صورت ہوں۔ جب سے تم آئے ہو میں کمبل میں چھپی بیٹھی ہوں۔ تم نے ابھی میرے جلوے دیکھے ہی کہاں ہیں کہ میں تمہیں حُسن کی مورت دکھائی دوں..... میرا فوٹو گرافر کہتا ہے کہ عورت دریافت کا نام ہے اور اس کے حسن کا جادو تبھی سر چڑھ کر بولتا ہے جب مرد اسے دریافت کرلے۔''

''پتا نہیں..... مگر میں ایک حقیقت ضرور جانتا ہوں کہ اگر کسی مہم جو کو دریافتوں کی لت پڑ جائے تو وہ نت نئی مہمات کا متلاشی رہتا ہے..... ویسے تمہاری آنکھیں بھی خوب صورت ہیں۔'' تیمور نے اپنی بات کو سمیٹا۔

''ہاں آنکھیں تو اچھی ہیں مگر ناک تھوڑی چھوٹی ہے، خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ اب تم آگئے ہو تو باقی سفر مزے سے گزرے گا۔''

لارا نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تو تیمور اس بے تکلفی ہڑبڑا سا گیا۔

''شام گہری ہو رہی ہے، میرا خیال ہے ڈائننگ ہال میں چلتے ہیں۔ بار بھی وہیں ہیں۔ کچھ دیر سکون سے بیٹھیں گے۔ اس وقت بہت ہلا گلا ہوتا ہے وہاں۔''

لارا نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر نشیلے لہجے میں کہا تو تیمور برنی نے بھی اس سے اتفاق کیا۔

''جیسے تمہاری مرضی۔''

''اوکے..... تو آؤ پھر چلتے ہیں۔''

لارا نے کمبل سے نکل کر جیکٹ پہنی اور بال کھول کر کنگھی کے سے انداز میں انگلیاں پھیرتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔

کچھ دیر بعد وہ ایک ہال میں موجود تھے۔ یہاں دکھائی دینے والے اکثر افراد عملے کے ارکان تھے جب کہ کچھ ایسی لڑکیاں بھی تھیں جنھیں جہاز میں ساتھ لانے کا مقصد محض سفر کو رنگین بنانا تھا۔

دونوں کھانے سے فارغ ہوئے تو لارا نے وہسکی اور تیمور نے کافی کا آرڈر دے دیا۔ لارا بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ ہنگامے اور تفریح نے اس کے جوش میں کچھ زیادہ ہی اضافہ کر دیا تھا۔ وہ ہال میں بجنے والے میوزک پر دھیرے دھیرے تھرک رہی تھی اور ساتھ ہی نعرے لگا کر گانے والوں کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ جبکہ تیمور برنی اُسے دیکھ کر مسکرانے پر ہی اکتفا کیے ہوئے تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہال میں ہلڑ بازی بڑھنے لگی تو تیمور برنی کو بہت عجیب محسوس ہونے لگا۔ وہ فطرتاً خاموش طبع آدمی تھا اور شور شرابے سے دُور بھاگتا تھا۔

جب اُکتاہٹ بڑھنے لگی تو اس کے بے چین اور اُکھڑے اُکھڑے سے دل میں اضطراب بھی بڑھنے لگا۔ ہال میں اب ہر عمر کے جوڑے محو رقص تھے۔ لیکن اس رقص میں نہ تو کوئی ربط تھا اور نہ سلیقہ۔ لارا خود بھی رقص کرنے والے گروہ میں شامل ہونے کے لیے بے چین تھی۔ وہ اُسے خاموش دیکھ کر دھیمے لہجے میں بولی۔

''تم بور تو نہیں ہو رہے ہو؟''

''بالکل نہیں۔''

''میں تین روز سے اس محفل میں آرہی ہوں۔ یہاں آکر کچھ دیر کے لیے ہی سہی، میں اپنا ہر دکھ ہر درد بھول جاتی ہوں۔ مجھے امید تھی کہ تم بھی اس ماحول کو پسند کرو گے۔''

''یہاں کافی رونق ہے۔'' تیمور برنی نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے لارا کے چہرے کی طرف دیکھا۔

لارا واقعی پرکشش تھی۔ سنہری رنگت نے اُسے مزید دلکش بنا دیا تھا۔ اسی دوران ایک دراز قد آدمی نے لارا کو رقص کی دعوت دی تو اس نے تیمور کی طرف دیکھا اور پھر کوئی تاثر نہ پا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اسے محو رقص دیکھ کر تیمور بھی کرسی سے اُٹھ گیا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا ہال سے باہر آگیا۔ اسے ہال میں گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔

باہر نکل کر وہ آگے بڑھا اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا عرشے کے عقبی حصے پر آگیا۔ آسمان پر تاروں کا راج تھا اور سردی کی وجہ سے عملے کا کوئی فرد دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ سکون سے چلتا ہوا آگے بڑھا اور ایک بینچ پر بیٹھ کر انگلیوں میں دم توڑتے سگریٹ کے کش لینے لگا۔

وہ اپنی سوچوں میں گم تھا کہ بائیں جانب کسی کے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے جلدی سے گردن گھمائی تو چند میٹر کے فاصلے پر ایک نوجوان لڑکی کھڑی اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

وہ لڑکی اتنی خوب صورت تھی کہ تیمور برنی محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔ وہ اُسے دیکھتے ہی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

لڑکی نیم تاریکی میں کھڑی تھی مگر پھر بھی اس کی دودھیا رنگت چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ اس کا قد لمبا اور جسم بے حد گداز تھا۔ تیمور اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا کہ وہ سکون سے چلتی ہوئی آگے بڑھی اور قریب پہنچ کر بولی۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟''

''جج..... جی کیوں نہیں۔''

تیمور نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو گہری نیلی آنکھوں میں کھو سا گیا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی مقناطیسی کشش اور چمک تھی۔

وہ ایک اجنبی عورت تھی لیکن پھر بھی تیمور لحہ بہ لحہ اس کی شخصیت سے مرعوب ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اپنی بدحواسی پر قابو پانے کے لیے اس نے جیب سے ڈبیا نکالی اور سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر سلگانے ہی والا تھا کہ لڑکی کی مدھر آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''میں سگریٹ نہیں پیتی..... اور چاہتی ہوں کہ جو لوگ میرے قریب ہوں وہ بھی اس سے دور رہیں۔''

''او کے.....''

تیمور نے کسی معمول کی طرح پیکٹ واپس جیب میں رکھ لیا تو وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

''میرا نام ارسلا ہے.....؟''

''اور میں تیمور برنی۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''خوشی ہوئی تم سے مل کر۔''

''مجھے بھی..... تم شاید کافی دنوں سے جہاز پر ہو۔'' تیمور نے گفتگو کو آگے بڑھایا۔

''ہاں کہہ سکتے ہو..... کیا تم بھی یونان جا رہے ہو۔''

''ہاں اور تم؟''

''میں بھی..... یونان مجھے بہت پسند ہے۔ میں یونان کو ناپسند کر بھی کیسے سکتی ہوں۔ وہ میری اور میں اس کی ذات کا حصہ ہوں۔'' ارسلا نے جواب دیا اور دونوں خاموش ہو گئے۔

تیمور برنی چاہتا تھا کہ وہ ارسلا سے ڈھیروں باتیں کرے اور اس کی مدھر آواز سنتا رہے۔ مگر ارسلا نے اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی اور کچھ دیر بیٹھنے کے بعد خاموشی سے اُٹھ کر واپس چلی گئی۔

اسے جاتا دیکھ کر تیمور برنی نے سوچا کہ وہ ارسلا کا تعاقب کر کے معلوم کرے کہ وہ جہاز کے کس حصے میں قیام پذیر ہے مگر اس کے قدم زمین نے جکڑ سے لیے تھے۔

''تم یہاں بیٹھے تارے گن رہے ہو اور میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں۔''

لارا کی تیز آواز تیمور برنی کو ہوش کی دنیا میں واپس لے آئی تھی۔

''بس ویسے ہی۔ کچھ گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ سوچا چند سانس تازہ ہوا میں لے لیے جائیں۔'' تیمور نے اُسے ٹالنا چاہا۔

''جھوٹ بول رہے ہو۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ تمہیں ٹونی کے ساتھ میرا رقص کرنا پسند نہیں آیا۔'' وہ اس کے پاس بینچ پر بیٹھ گئی۔

''ایسی بات نہیں..... یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے کچھ برا نہیں لگے گا بھلا۔''

''کیا میں اتنی بری ہوں کہ تم مجھے کسی کے ساتھ بھی دیکھ سکتے ہو؟''

''میں نے ایسا کب کہا؟''

''ایک بات کہوں؟''

''ہاں بولو.....'' تیمور برنی نے بے پروائی سے کہا۔

''کبھی کبھی اپنائیت کا ہلکا سا احساس ہی دوسروں کو راہ راست پر لانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ محض اس وجہ سے بھٹک جایا کرتے ہیں کہ کوئی ان پر اپنا حق جتانے والا نہیں ہوتا۔ کوئی انھیں ان کے انمول ہونے کا احساس نہیں دلاتا..... اچھا خیر چھوڑو ان باتوں کو، میں تو عادی ہوں اس قسم کے جملے سننے کی۔ آؤ کمرے میں چلتے ہیں یہاں خاصی ٹھنڈ ہے۔''

لارا نے بے تکلفی سے تیمور کا ہاتھ تھاما اور دونوں اپنے ٹھکانے کی طرف چل پڑے۔ جب وہ کمرے کے پاس پہنچے تو لارا یوں اس کی طرف دیکھنے لگی جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

''تیمور! کیا تمہیں معلوم ہے کہ زندگی بہت پراسرار چیز ہے اور بعض واقعات ایسے ناقابل یقین ہوتے ہیں کہ کہ انسان کو مرتے دم تک اُن کی صحت پر شک رہتا ہے۔''

''ہاں بالکل! جیسے تمہاری اور میری ملاقات بھی تو ایک عجیب وغریب واقعہ ہے۔ کون جانتا تھا کہ ہم اس بحری جہاز میں یوں ایک ساتھ کمرے میں رہیں گے۔'' تیمور برنی مسکرادیا۔

''صحیح کہا تم نے..... لیکن آؤ! میں تمہیں اس سے بھی عجیب وغریب چیز دکھاؤں۔''

اس نے تیمور کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور تیزی سے راہداری میں آگے بڑھنے لگی۔ طویل راہداری سے گزرنے کے بعد وہ دونوں ایک دروازہ کھول کر سیڑھیاں اُترتے ہوئے جہاز کے کارگو سیکشن میں جا پہنچے۔ یہاں بہت سا سامان ترتیب سے رکھا ہوا تھا۔ رات کے اس پہر وہاں کوئی بھی نہیں تھا اس لیے لارا سکون سے چلتی ہوئی ایک بڑے ڈبے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

اب وہ بنا کچھ بولے ایک جانب سے اس ڈبے کی پیکنگ کھولنے لگی۔ ڈبے کو شاید پہلے بھی کھولا جا چکا تھا اس لیے دوبارہ کھولنے کے لیے زیادہ تردد نہ کرنا پڑا۔ کچھ دیر بعد لارا نے اس کی پیکنگ الگ کی تو تیمور برنی کے جسم میں سردی کی تیز لہر دوڑ گئی۔

ان کے سامنے شیشے کا ایک مضبوط تابوت تھا جس میں ایک حنوط شدہ لاش ابدی نیند سو رہی تھی۔ اُس کے جسم پر مٹیالے رنگ کی پٹیاں اس طرح لپٹی ہوئی تھیں کہ جسم کا کوئی حصہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ چہرہ کسی حد تک کھلا ہوا تھا مگر وہ بھی کوئی خوشگوار منظر پیش نہیں کر رہا تھا۔ وہ ایک بھیانک چہرہ تھا، بالکل سوکھا ہوا جس پر آنکھوں کی جگہ دو گڑھے تھے۔

تابوت پر درج معلومات کے مطابق اس کا نام کرسٹی تھا اور وہ تقریباً تین ہزار سال پرانی تھی۔ اس کی دریافت کچھ عرصہ قبل ہوئی تھی۔ جس مقبرے سے اس ممی کو نکالا گیا وہ سطح زمین سے بہت نیچے ریت میں دبا ہوا تھا۔ ماہرین آثار قدیمہ کا کہنا تھا کہ اس ممی کا تعلق اپنے دور کے فرعون خاندان سے نہیں تھا۔

یہ اس کے محل کی خاص کنیزوں میں سے ایک تھی۔

کرسٹی کے مقبرے سے کئی چیزیں ملی تھیں جن سے اس کے متعلق بہت سی معلومات حاصل کرنے میں مدد ملی۔ جب کرسٹی مری تو اس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ تھی۔ اس کا قد لمبا، بال سنہرے اور دراز تھے اور اس کی آنکھیں گہری نیلی تھیں اور وہ شاہی محل میں ایک حسین عورت تصور کی جاتی تھی۔

یہ تمام معلومات اس پرچے پر درج تھیں جو اس کے تابوت پر چسپاں تھا۔

تیمور نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی حنوط شدہ لاش نہیں دیکھی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ایک ممی کے سرہانے کھڑا وارفتگی کے عالم میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ جانے کیوں اسے گمان ہو رہا تھا کہ یہ لاش تین ہزار سال پرانی نہیں۔ وہ پٹیوں میں لپٹی ہوئی کوئی لاش نہیں بلکہ ایک زندہ عورت ہے اور اس تابوت میں گہری نیند سو رہی ہے۔

شاید وہ اس کو دیکھ کر ہزاروں سال کا سفر طے کر کے قدیم عہد میں پہنچ گیا تھا اور گداز بستر پر کرسٹی کو سوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ تیمور کو یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ اس کے سانسوں کی سرسراہٹ تک سن سکتا ہے۔

تیمور نے سر جھٹک کر لارا کی جانب دیکھا تو اُس کے چہرے پر پریشانی تھی۔

''تم کچھ گھبرائی ہوئی لگ رہی ہو؟''

اس نے اپنی حالت چھپانے کے لیے لارا پر سوال داغ دیا۔

''میرا پرس نہیں ہے جیب میں۔ شاید میں اسے کھانا کھاتے ہوئے میز پر بھول آئی ہوں۔ تم یہیں، رُکو میں ابھی لے کر آئی۔''

لارا اس جواب سنے بغیر آگے بڑھی اور کھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔

تنہائی میسر آتے ہی تیمور ایک بار پھر لاش کی طرف دیکھنے لگا۔ جب لارا کچھ دیر تک واپس نہ آئی تو اس نے خود جا کر پتا کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ دروازے کی طرف پلٹنے ہی والا تھا کہ چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ارسلا کو دیکھ کر اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com
www.pakistanipoint.com

بلیک ایگل

صبیح الحسن

پاکستان اور اس کی خفیہ ایجنسیوں کو غیر ملکی زیادہ اہمیت دینے سے ہمیشہ گریزاں رہتے ہیں حالانکہ وہ ان کی حیثیت و اہمیت کو دل سے تسلیم تو کرتے ہیں مگر اظہار نہیں کرتے۔ اکثر مواقعوں پر انہیں ہذیمیت کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ مگر افواج پاکستان ہمارے سر کا تاج ہیں۔

زیر نظر کہانی بھی کچھ ایسے ہی لوگوں کی ہے جنہیں ان کی حد سے زیادہ خود اعتمادی لے ڈوبی تھی۔

چند سرفروشوں کا احوال جو وطن سے محبت کرتے تھے

ایلن اور جان، فینکس جیل کے ایک اداس گوشے میں کھڑے مزدوروں کو قبر کھودتے دیکھ رہے تھے۔ قریب ہی تابوت میں بلیک ایگل کی لاش پڑی تھی۔ مزدوروں نے قبر کی کھدائی مکمل کر کے تدفین کی اجازت چاہی۔ ایلن کی ہدایت پر جان چند مسلمان قیدیوں کو لے آیا تھا۔ انہیں اس بات سے بالکل بے خبر رکھا گیا تھا کہ انہیں کس کا جنازہ پڑھنا ہے۔

"کیا یہ سب ضروری تھا؟" جان نے قیدیوں کو جنازہ پڑھتے دیکھ کر ایلن کے کان میں سرگوشی کی۔

"ہاں! ایجنٹ چاہے دشمن کا ہو اسے اتنی عزت تو ملنی ہی چاہیے۔" ایلن سرد آواز میں بولا۔

تدفین مکمل ہونے کے بعد وہ دونوں ایک دفتر میں گئے جہاں بلیک ایگل کی فائل پر آخری ریمارکس لکھ کر فائل کلوز ڈلکھ دیا گیا۔ بلیک ایگل کا باب ختم ہو چکا تھا۔

❖❖❖❖

"کنگ جارج ائیر بیس چلو۔" جیل سے نکلنے سے بعد جان اور ایلن گاڑی میں بیٹھے۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

جان نے حیرت سے ایلن کی جانب دیکھا اس کی معلومات کے مطابق آج ایسا کوئی کام نہ تھا جس کے لیے ایئر بیس کی جانب جانا پڑتا۔ ڈرائیور نے کرگاڑی آگے بڑھادی اور کچھ ہی دیر میں وہ ایئر بیس پہنچ گئے۔ چیک پوسٹ پر ان کے ایم آئی سکس کے شناختی کارڈ دیکھتے ہی انہیں بیس میں جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ ایپرن پر پہنچے تو بیس کمانڈر ان کے استقبال کے لیے موجود تھا اور ایک چھوٹا مسافر طیارہ بھی تیار کھڑا تھا۔

''ہیلو کرنل! سب شیڈول کے مطابق ہے نا؟'' ایلن نے کمانڈر سے ہاتھ ملاتے ہوئے استفسار کیا۔

''یس سر! سب کچھ بالکل معمول کے مطابق ہے۔ سامان لوڈ ہو چکا ہے اور وہ لوگ پہنچنے ہی والے ہیں۔'' کمانڈر کا جواب سن کر ایلن نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔

جان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ ایجنسیوں کے معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جو اسے معلوم ہونا چاہیے وہ ایلن سے پتا چل جائے گا۔

انہیں انتظار کرتے ہوئے چند منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ ایک کالے شیشوں والی گاڑی ایپرن پر نمودار ہوئی اور تیزی سے چلتی ہوئی ان کے پاس آ رکی۔ گاڑی جان کا ایک کولیگ چلا رہا تھا۔ اس نے گاڑی سے اتر کر دونوں سے ہاتھ ملایا۔ ایلن کے اشارے پر اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور ہتھکڑیوں میں جکڑا ایک شخص گاڑی میں سے نکلا۔ وہ کوئی جنوبی ایشیائی تھا اور اس کے ساتھ ایک اسی جیسا سوٹ میں ملبوس شخص تھا جس کا ہیئر کٹ اس کے فوجی ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔

''تم لوگوں سے کیا گیا معاہدہ پورا ہو گیا ہے۔ یہ جہاز تمہیں اسلام آباد تک پہنچائے گا اور اس فلائیٹ کا کوئی ریکارڈ نہیں۔ تمہارا سامان لوڈ کیا جا چکا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم لوگ بھی اپنے وعدے کا پاس رکھو گے۔'' ایلن نے چند لمحے اس قیدی کو دیکھا اور پھر مسکرا کر بولا۔

''آپ فکر نہ کریں۔ یہ جہاز آپ کے بندے لے کر واپس آئے گا۔'' قیدی کے ساتھ آئے بندے نے ایلن سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

ایلن نے مسکرا کر انہیں گڈ بائے کہا اور وہ دونوں جہاز میں سوار ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد جہاز نے اڑان بھری اور دور افق میں کہیں گم ہو گیا۔

❖❖❖❖

اس شام کو جان اور ایلن ایم آئی سکس کے ہیڈ کوارٹر میں ایک پرشکوہ آفس میں بیٹھے تھے۔

''سر! آج یہ سب کیا ہوتا رہا؟'' جان اپنے تجسس پر قابو نہ رکھ سکا اور ایلن سے پوچھ ہی بیٹھا۔

''جان! یہ سیکرٹ ہے۔ لیکن ٹھیک ایک ہفتے بعد میں ریٹائر ہو رہا ہوں اور میری جگہ تمہاری تعیناتی کے احکامات جاری ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد یہ کیس تمہارے ہاتھ میں ہی ہوگا لہٰذا میرے خیال میں تمہیں بتانے میں حرج نہیں۔ تمہیں پتہ ہے کہ ہم آج فینکس جیل کیوں گئے تھے؟'' ایلن اس کی بات سن کر مسکرایا۔

''جیل میں قید ایک پاکستانی سیکرٹ ایجنٹ بلیک ایگل نے خودکشی کر لی تھی۔ اس کی تصدیق کرنے کے لیے ہمیں بلایا گیا تھا۔'' جان کا لہجہ کچھ الجھا ہوا تھا۔

''ہاں! یہ کہانی چھ ماہ پہلے شروع ہوئی تھی۔'' ایلن نے کرسی سے ٹیک لگالی اور سگار کا کش لے کر جان کو اپنی سب سے بڑی جیت کی کہانی سنانے لگا۔

''تمہیں یاد ہے کہ امپریئل انڈسٹریز میں مزدوروں نے ہڑتال کی تھی۔''

''مجھے یاد ہے۔ تب حالات اتنے خراب ہو گئے تھے کہ پارلیمنٹ کی ایک کمیٹی کو جا کر معاملات سلجھانے پڑے۔'' جان کو سب تفصیل سے یاد تھا۔

''قسمت کے کھیل دیکھو کہ پارلیمنٹ کی جانب سے جو دو ممبر پارلیمنٹ مزدوروں اور مل مالکان کے درمیان ثالثی کے لیے بھیجے گئے ان میں جارج شیلڈن بھی تھا۔''

''جارج شیلڈن؟ وہی جو نیوکلیئر سائنٹسٹ بھی ہے؟'' جان نے استفسار کیا۔

''ہاں! وہی جارج شیلڈن۔ یہی تو قسمت کی ستم ظریفی تھی۔ وہ جب وہاں پہنچے تو پتا چلا کہ مل کے مالکان نے دو ماہ سے مزدوروں کو تنخواہیں نہیں دیں۔ جارج نے مل مالکان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ان کے پاس سرمایہ نہیں۔ لیکن جب جارج نے مزدوروں سے پوچھا تو پتا چلا کہ کچھ ہی دن پہلے کسی پاکستانی بزنس مین نے ان سے تین ہزار واٹر سپننگ سوئچز کا آرڈر وصول کیا تھا جس کی ادائیگی وہ مل مالکان کو کر چکا تھا۔ لیکن وہ اسے چھپا رہے تھے۔'' ایلن کی آواز خواب ناک ہوتی

جارہی تھی۔

''جارج کو یہ معلوم ہوا تو وہ بہت حیران ہوا کیونکہ اس نے معاہدے کی فائل دیکھی تو پتا چلا کہ ایک پاکستانی فرم نے یہ سوئچز اپنی ٹیکسٹائل مل کے لیے خریدے تھے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ سوئچز ایٹمی ری ایکٹر کے لیے بھاری پانی اکٹھا کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔''

''تو کیا وہ پاکستانی فرم ایٹمی ری ایکٹر کے لیے پرزے اسمگل کررہی تھی؟'' جان بے صبری سے بولا۔

''ہاں! ہماری قسمت اچھی تھی کہ جارج نے ہم سے رابطہ کیا اور ہم نے تھوڑی ہی دیر میں معلوم کرلیا کہ ان سوئچز کا ٹیکسٹائل مل میں کہیں استعمال نہیں ہوتا۔ تب ساری دنیا جان چکی تھی کہ پاکستانی فوج ایٹمی ری ایکٹر کے لیے مختلف پرزے بلیک مارکیٹ سے خرید رہی ہے یا انہیں اسمگل کرنے کی کوشش کررہی ہے۔ ہم نے فوری طور پر اس پر ایکشن لیا اور اس بزنس مین کے پتے پر چھاپا مارا لیکن۔'' ایلن بولتے بولتے رہا تو جان کی محویت ٹوٹی۔

''لیکن.....لیکن کیا ہوا؟'' جان نے حیرت سے پوچھا۔

''لیکن ہمیں دیر ہوچکی تھی۔ بلیک ایگل تو ہمارے ہاتھ آ گیا لیکن اس سے پتا چلا کہ اس نے سات سو ساٹھ کلوگرام کا ایک کارگو کریٹ اسی دن کچھ گھنٹے پہلے ایک پرائیویٹ کمرشل فلائٹ کے ذریعے پاکستان بھیجا تھا۔ ہم نے چیک کیا تو ان سوئچز کے کریٹ کا وزن اتنا ہی تھا یعنی وہ پرزے پاکستان کے لیے روانہ ہوچکے تھے۔'' ایلن ہولے سے ہنسا اور بولا۔

''یعنی وہ اپنے مشن میں کامیاب رہا۔'' جان مایوس سے لہجے میں بولا۔

''نہیں۔ بھئی ورلڈ پاور ہونے کے کچھ فائدے بھی ہوتے ہیں۔'' ایلن ہنسا۔

''کیا مطلب؟'' جان الجھ کر بولا۔

''ہم نے فوری طور پر سی آئی اے سے رابطہ کیا اور انہیں ساری صورتحال بتائی۔ امریکہ اور برطانیہ دونوں ہی کسی بھی قیمت پر پاکستان کو ایٹمی ری ایکٹر بنانے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ امریکی حکام نے فوری ایکشن لیا اور بحیرہ روم کے ویران پانیوں پر امریکی جنگی جہازوں نے اس کمرشل جہاز کو ہوا میں ہی تباہ کردیا۔ بلیک ایگل کا مشن کبھی کامیاب نہ ہوسکا۔'' ایلن طمانیت بھرے لہجے میں بولا۔

''لیگ ایگل؟'' جان نے پوچھا۔

''اسے ہم نے کافی سخت تفتیش سے گزارا لیکن پتا چلا کہ وہ یہاں تنہا کچھ پرائیویٹ کمپنیوں کے ذریعے کام کررہا تھا۔ لہٰذا اس کا نیٹ ورک ختم ہوگیا۔ اسے فینکس جیل میں بھیج دیا گیا۔ لیکن سرکاری طور پر اس کا ریکارڈ خفیہ ہی رکھا گیا۔''

''اور اس نے وہیں خودکشی کرلی؟'' جان نے بے صبری سے پوچھا۔

''ہاں! سرکاری ریکارڈ میں بلیک ایگل فینکس جیل میں دفن ہوچکا ہے۔'' ایلن ہولے سے ہنسا۔

''سرکاری ریکارڈ؟ تو کیا یہ سچ نہیں؟'' ایلن کی ہنسی کچھ اور بتلا رہی تھی۔

ایلن نے سر اٹھا کر جان کی آنکھوں میں دیکھا اور مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

''بلیک ایگل اس وقت اسلام آباد میں لینڈ کرچکا ہوگا۔'' ایلن کی بات سن کر جان چونک اٹھا۔ اس کی نگاہوں میں وہ نوجوان گھوم گیا جسے وہ اس صبح جہاز پر بٹھا کر آئے تھے۔

''کیا وہ..... وہ بلیک ایگل تھا.....؟'' جان حیرت سے بولا۔

''حیران کیوں ہورہے ہو۔ وہ نوجوان جسے آج صبح پاکستان بھیجا وہی بلیک ایگل تھا۔'' ایلن نے قہقہہ لگایا۔

''سمجھ گیا سب۔'' جان سر ہلا کر بولا۔

''کیا سمجھ گئے ہو جان؟'' ایلن نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

''یہی کہ ہم نے کوئی اپنی چیز چھڑانے کے بدلے اس کا تبادلہ کرلیا۔'' جان کی بات سن کر ایلن کے چہرے پر ستائش کے تاثرات ابھرے۔

''تم واقعی ذہین ہو۔ ہمارے لیے اس کا کوئی مصرف باقی نہیں بچا تھا۔ اس کا نیٹ ورک ختم ہوچکا تھا۔ اس کی تصاویر اور تمام ڈیٹا سب ایجنسیز کے پاس ہے لہٰذا وہ دوبارہ کوئی مشن بھی نہیں کرسکتا۔ اس لیے اسے چھوڑنے سے ہمیں کوئی نقصان نہیں ہوسکتا تھا۔''

''ہم نے اس کے بدلے کیا لیا؟'' جان ہنس کر بولا۔

''ہمارے تین ایجنٹ جو کوہوٹہ کے علاقے میں کام کررہے تھے آئی ایس آئی کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ ہم نے بلیک ایگل کے بدلے وہ چھڑوا لیے۔'' ایلن نے جواب پر جان کے

Alaqa Azeem
www.pakistanipoint.com

ہے پر طمانیت چھا گئی۔

''گڈ! ایک کے بدلے تین برا سودا نہیں۔ لیکن کیا اسے چھوڑنے سے ایک منفی تاثر نہیں ابھرا؟''

''نہیں جان! دنیا کی ہر سیکرٹ ایجنسی کے لوگ یہ جانتے ہیں کہ اگر وہ پکڑے گئے تو ان کی ایجنسی انہیں چھڑوانے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔ ہم نے اپنے بندے چھڑوا لیے اس سے ساری دنیا میں ہمارے ایجنٹس کو مورال اچھا ہوا۔'' ایلن اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''یہ تو ٹھیک کہا۔ کیا تمہیں اسی مشن کی وجہ سے میڈل ملا تھا؟'' جان کے پوچھنے پہ ایلن مسکرایا اور بولا۔

''ہاں! یہ میرے تمام کیریئر کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔'' ایلن نے دراز کھولا اور ایک میڈل نکال کر اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''بلیک ایگل کا مشن ناکام ہوا۔ میڈل سے زیادہ یہ میرے لیے اہم تھا۔''

''بالکل اگر وہ پکڑا جاتا لیکن پرزے نکل جاتے تو ہمارے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔'' جان بولا۔

''لیکن تمہیں ایک بات بتاؤں۔ یہ پاکستانی بہت خبیث لوگ ہیں۔ تمہیں پتا ہے بلیک ایگل کے ساتھ انہوں نے اپنے جنرل کے بنگلوں کے لیے یہاں کی ایک مشہور کمپنی سے ایک مخصوص اور اسپیشل ڈیزائن کے فانوس فراہم کرنے کی شرط بھی رکھی۔ وہ کمپنی انہیں پانچ سال بعد کا وقت دے رہی تھی لیکن ہم نے مداخلت کر کے فانوسوں کا انتظام کیا اور اور آج کی فلائٹ پر وہ سامان بھی ساتھ گیا ہے۔ ان خبیثوں نے اپنا ایجنٹ چھڑوانے میں بھی رشوت کھائی۔'' ایلن حقارت بھرے لہجے میں بولا۔

جان کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''یس کم ان!'' ایلن کی آواز پر دو لوگ اندر آئے۔

''سر! اسلام آباد سے ہماری ایمبیسی سے کال آئی ہے کہ جہاز ہمارے بندے لے کر واپس روانہ ہو چکا ہے۔''

''گڈ! یہ معاملہ بھی اپنے انجام کو پہنچا۔'' ایلن نے اس کی بات سن کر اطمینان کا سانس لیا اور بولا۔

''سر!'' دوسرے ایجنٹ نے ایلن کو مخاطب کیا۔

''یس! کیا بات ہے؟'' ایلن نے سوالیہ نظروں سے اسے گھورا۔

''سر ایک عجیب چیز پتا چلی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ کیا ماجرا ہے۔''

''کہانیاں نہیں سناؤ سیدھی طرح بات بتاؤ۔'' ایلن بے صبری سے بولا۔

''سر وہ لوگ جو فانوس ایئر پورٹ پر پہنچانے کے لیے گودام گئے تھے۔ ان سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ ابھی پتا چلا کہ وہ اس گودام میں ہی بے ہوش پڑے ہیں اور.....'' وہ بولتے بولتے رک گیا۔

''اور کیا؟ جلدی بکو۔'' جان کو تاؤ آ گیا۔

''سر! وہ فانوسوں کا کریٹ بھی گودام میں ہی موجود ہے۔'' ایجنٹ الجھے لہجے میں بولا۔

''لیکن جہاز پر تو سامان لوڈ کیا گیا تھا۔ وہ کون سا سامان تھا سر؟'' جان حیرت سے بولا۔

''جان! بیس کمانڈر کو کال کرو اور اس سے معلوم کرو کہ جو سامان جہاز پر لوڈ کیا اس کا وزن کتنا تھا۔'' ایلن پرسوچ لہجے میں بولا۔

جان دوبارہ آفس میں آیا تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

''سر! جہاز پر جانے والے سامان کے کریٹ کا وزن سات سو ساٹھ کلوگرام تھا۔''

اس کی بات سن کر ایلن کے منہ سے بے ساختہ ایک گالی نکلی۔

''سر کیا اس کا مطلب وہی ہے جو میں سمجھ رہا ہوں؟'' جان کا لہجہ گھمبیر تھا۔

''ہاں! اس حرامزادے نے ہم سے جھوٹ بولا۔ وہ سوئچز ابھی تک کہیں چھپا رکھے تھے اور اب ان کے کسی ایجنٹ نے ہمارے بندوں کو بے ہوش کر کے باندھ دیا اور خود ہمارا ایجنٹ بن کر سامان ایئر پورٹ پہنچا دیا۔'' ایلن زہر خند لہجے میں بولا۔

''یعنی ہم نے خود اپنے جہاز پر ہی وہ پرزے پاکستان پہنچا دیئے۔'' جان کی ہنسی نکل گئی۔

''وہ بھی ایسی فلائٹ پر جس کا کوئی ریکارڈ ہی نہیں۔'' ایلن کے چہرے کی مسکینی سے جان کی ہنسی اور تیز ہو گئی۔

''سر آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ پاکستانی واقعی بہت خبیث ہیں۔'' جان کا قہقہہ آفس میں گونجا اور ایلن کی کھسیانی سی ہنسی بھی اس میں شامل ہو گئی۔

www.pakistanipoint.com

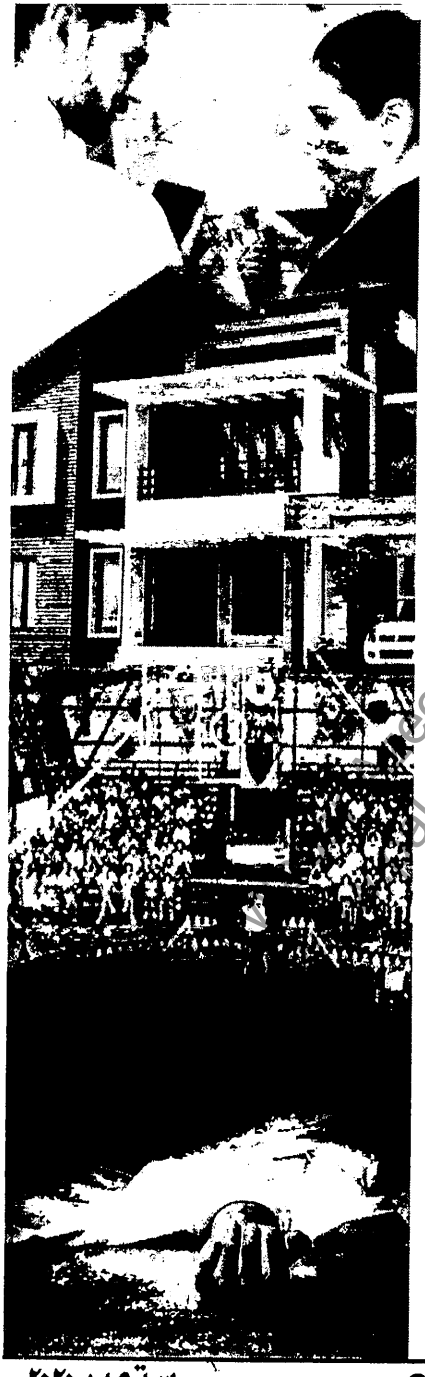

مجرم کون

مسز اصہیب اکرام

معاشرہ کتنا ہی ترقی کیوں نا کر جائے مگر جب تک انسان میں انسانیت نہیں ہوگی ہم پستی کی گہرائیوں میں ہی رہیں گے۔ بہترین معاشرہ انسانوں سے بنتا ہے، یہ تب ہی ممکن ہے جب ہم میں ضمیر زندہ ہو۔

زیر نظر کہانی بھی ایک ایسے غربت کے مارے انسان کی ہے جس کو مردہ پرست انسانوں نے حقارت کی آخری سطح پر پہنچادیا تھا۔

غربت سے تنگ مجبور و بے بس انسان کی کہانی

شہر کے سب سے عالیشان ہوٹل میں آج سال کا سب سے اہم اور بڑا دن تھا۔ آج جہانگیر صدیقی اپنی خوشی سنبھال نہیں پا رہا تھا کیوں کہ آج یورپ کا مشہور طائفہ ہوٹل میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والا تھا۔ ریٹا گریک کا نام تو اس کے آنے سے قبل ہی ہر ایک کی زبان پر تھا۔ اس کو دیکھنے والے آج مہنگی ٹکٹ بھر کر پہنچے تھے۔ اسٹیج کا پردہ جب آہستہ آہستہ سرک رہا تھا تو ہال میں بیٹھے تماشائیوں کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو رہی تھی۔

یہ کوئی معمولی تماشا نہیں تھا بلکہ حسینہ ایک کم عمر بچی کو اپنے بازوں میں سنبھالتی ہوئی کبھی آگ سے کود کر گزر جاتی اور کبھی جلتی آگ کے اوپر رسی پر چلتی ہوئی بچی کو اچھالتی جاتی۔ تماشائی انگشت بدنداں تھے مگر ساتھ ہی ساتھ اپنے بچوں کو اپنی گرفت میں لے رہے تھے۔ موت اور زندگی کا یہ تماشا ہر ایک بنا آنکھ جھپکے دیکھ رہا تھا۔ معصوم بچی اپنی زندگی و موت سے بے پروا لوگوں سے بار بار تالیاں بجانے کا کہہ رہی تھی۔ رزق کامیابی اور شہرت کا راستہ کتنا دشوار ہوتا ہے یہ ریٹا گریک بخوبی جانتی تھی۔

ابھی ایک خطرناک تماشا ختم ہوا تھا۔ تماشائی حیرت و پریشانی کی کیفیت میں ہی تھے کہ ایک گانے پر رقص کرنے کے لئے ریٹا دوبارہ سب کے سامنے موجود تھی۔ اس کے حسن کے جلوے میں بہہ کر دیکھنے والے بھول گئے تھے کہ ابھی کچھ لمحوں قبل یہاں موت کا رقص جاری تھا۔ پورے اسٹیج پر وہ ایسے تھرکتی پھر رہی تھی جیسے اس کے جسم میں بجلیاں بھر چکی ہوں۔ دیکھنے والے مبہوت تھے۔

رقص ختم ہوا۔ ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ جہانگیر صدیقی نے مائیک پر سب دیکھنے والوں کا شکریہ ادا کرنا شروع کر دیا۔ وہ بتا رہا تھا کہ اب اس رات کا سب سے دلفریب شعبدہ پیش کیا جائے گا۔ ابھی آدھے الفاظ اس کی زبان پر ہی تھے کہ اچانک ہال سے سات افراد اٹھے اور وہ اسٹیج کی طرف چڑھ دوڑے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک پستول تھا۔ اسٹیج پر عجیب بھگدڑ کا سماں بندھ گیا۔ اچانک ہال کی لائٹ بند ہوئی۔ اسی لمحے ایک فائر ہوا اور ایک دل خراش چیخ نے سننے والوں کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ لائٹ جیسے ہی بحال ہوئی سب دیکھنے والے حیران و پریشان رہ گئے۔ اسٹیج کے وسط میں جہانگیر صدیقی کی لاش پڑی تھی۔

پولیس کے آنے تک ہال کے تمام دروازے بند کر دیے گئے۔ انسپکٹر سدھیر اپنی جونیئر لیڈی سب انسپکٹر مایا کے ساتھ پہنچا۔ سدھیر پورے محکمے میں اپنے مزاج کا ایک ہی آفیسر تھا۔ اس کے ذہن میں کیا چل رہا ہے یہ سامنے والے کبھی محسوس نہیں کر پاتے تھے۔ کبھی وہ ایک نرم مزاج اور ہنس مکھ انسان نظر آتا تو دوسرے ہی لمحے موت کی حد تک سنجیدہ نظر آتا۔ پولیس کے محکمہ سراغ رسانی کی شان اس کی وجہ سے قائم تھی۔ وہ ایسا عجیب اصول پسند انسان تھا جو قانون و انصاف کی حرمت سے مقدم کچھ نہیں رکھتا تھا۔ تیس سے کچھ اوپر اس کی عمر تھی۔ خدوخال کے اعتبار سے نہایت خوب صورت، کشادہ پیشانی اس کی ذہانت کا اعتراف چیخ چیخ کر کرتی تھی۔ کالے سلکی بال بھوری مگر جھیل کی طرح گہری آنکھیں دراز قد چوڑے شانے جسم کسرت کا عادی۔ ہمیشہ نہایت تراش خراش کے کپڑوں میں ملبوس ہوتا۔

سدھیر نے لاش کا جائزہ لیا۔ تمام وہ لوگ جو اسٹیج پر موجود تھے۔ ان کو ایک طرف کر دیا گیا تھا۔ سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ بھگدڑ کا باعث بننے والے سات افراد بھی وہیں موجود تھے۔ دوران تلاشی ایک پستول برآمد ہو چکا تھا۔

"آپ تو جناب اصغر علی سانی ہیں۔" سدھیر نے سات افراد میں سے ایک کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"جی ہاں۔" اس نے کہا۔

"آپ کے پاس پستول کی موجودگی کیا ثابت کرتی ہے جب کہ میگزین میں ایک گولی بھی کم ہے۔" سدھیر نے پستول کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"جی پستول میرا ہے۔ مگر اس واقعہ سے میرا یا میرے ساتھیوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔" اصغر علی سانی کے چہرے پر اچانک ایک رنگ آ کر اتر گیا۔ مگر سدھیر یہ تبدیلی محسوس کر چکا تھا۔

تھوڑی دیر میں سب کے بیانات لئے جا چکے تھے۔ لاش اٹھائی جا چکی تھی۔ اسٹیج کا جائزہ لینے کے دوران سدھیر کو پچھلی جانب ایک دراز میں جو بالکل آخر میں تھی کوئی چیز نظر آئی۔ سدھیر فوری نیچے جھکا۔ اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں ایک اور پستول تھا۔ اس پستول سے بھی تازہ گولی چلنے کی خوشبو آ رہی تھی۔ جیسے ہی سدھیر پستول کے ساتھ پلٹا۔ مینیجر اشفاق کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں۔

"یہ تو میرا ہے۔" مینیجر نے بوکھلا کر کہا۔ "مگر یہ تو میرے کمرے میں تھا۔"

سدھیر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔ تمام افراد کی فہرست مرتب کر کے سب کو تاکید کر دی گئی تھی کہ پولیس کی اجازت کے بنا کوئی شہر نہیں چھوڑے گا۔

سدھیر ہوٹل سے دفتر آ چکا تھا۔

اصغر علی کے بیان کے مطابق وہ صرف پروگرام میں خلل ڈال کر اس اسے خراب کرنا چاہتا تھا کیوں کہ یہ پروگرام اگر جہانگیر تعلقات استعمال نا کرتا تو ضرور اصغر علی کو حاصل ہوتا۔ مگر جب پروگرام اسے نا مل سکا تو وہ بے عزتی اور ہزیمت کا بدلہ لینے آیا تھا۔ مگر اس کا واحد مقصد پروگرام کو خراب کرنا تھا۔ پستول سے ایک گولی ضرور چلی تھی مگر وہ اس نے اپنے بنگلے پر صرف پستول کا جائزہ لینے کے لئے چلائی تھی۔

مینیجر اشفاق کے بیان میں بس اتنا ہی تھا کہ یہ پستول اس کا ہے مگر اسے نہیں معلوم یہ ہال میں کیسے آیا۔ ایک سوال سدھیر کو دوبارہ ہوٹل لے گیا تھا۔ آخر لائٹ کیسے گئی اور پھر واپس کیوں آئی۔ مگر جواب ندارد۔ لاش کے پوسٹ مارٹم سے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

کئی سوال واضح ہو چکے تھے۔ گولی صرف آدھا فٹ دور سے چلی تھی۔ پستول اشفاق کا تھا۔ اصغر علی کا بیان درست تھا۔

اگلے دن سدھیر کی گاڑی جہانگیر کے گھر کی طرف چلی جا رہی تھی۔ مایا ساتھ خاموش بیٹھی سارے حالات پر غور کر رہی تھی۔

"کیا سمجھی ہو ابھی تک؟" سدھیر نے خاموشی کا طلسم توڑا۔ سگار اس کے ہاتھ میں تھا مگر ذہن قتل میں الجھا ہوا تھا۔

"کیس سادہ ہے بالکل، اشفاق مجرم ہے۔" مایا نے کہا۔

"مگر کیوں، اسے کیا فائدہ؟ اور کوئی بیوقوف ہی ہوگا جو اپنے ہی پستول سے قتل کر کے موقع واردات پر چھوڑ دے گا۔"

مایا نوکری کے آغاز سے ہی سدھیر کے ساتھ تھی۔ حسن و جمال میں مکمل مگر ذہن کے استعمال میں تھوڑی کنجوس تھی۔ مگر کبھی کبھار دور کی کوڑی بھی ڈھونڈ لاتی تھی۔ سدھیر کے زیر سایہ اس کی تربیت شاندار انداز میں ہو رہی تھی۔

گاڑی جلد ہی بنگلے کے گیٹ پر پہنچ چکی تھی۔ آج قتل کو دوسرا دن تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں مسز صدیقی کے پاس بیٹھے تھے۔

مسز صدیقی سفید کپڑوں میں ملبوس تھی۔ چہرہ غم سے عبارت تھا۔ آنکھیں سوجھی ہوئی تھیں۔ عمر بیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ سدھیر خاموشی سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

"آپ کے لئے یہ مشکل مرحلہ ہے مگر قانون کو اپنا کام کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے میں حاضر ہوا ہوں تاکہ آپ سے کچھ پوچھ سکوں۔"

"جی آپ پوچھیں۔"

"مسٹر جہانگیر کی کسی سے کوئی دشمنی تھی؟"

"یہ تو نہیں معلوم، مگر چند دنوں سے وہ کچھ خائف تھے۔"

"کس چیز سے خائف تھے؟"

"یہ تو نہیں پتا، مگر آج کل بہت فکر مند تھے۔ میں نے پوچھا بھی مگر انہوں نے بتایا کچھ نہیں۔"

"آپ کو کسی پر شک ہے؟" مایا نے سوال پوچھا۔

"نہیں مجھے کسی پر شک نہیں ہے۔" مسز صدیقی نے جواب دیا۔

"پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میرے پاس موجود ہے۔ مسٹر صدیقی کا قتل اشفاق کے ریوالور سے ہوا ہے۔"

اس سے پہلے کہ مسز صدیقی کچھ کہتی ملازم نے آ کر اطلاع دی کہ ایڈووکیٹ اے ڈی صابری آئے ہیں۔ اے ڈی صابری کو اندر بلا لیا گیا۔ تعارف کے بعد صابری نے ایک فائل نکالا جو ابھی کھولا نہیں گیا تھا۔

"میں صدیقی صاحب کا قریبی دوست اور وکیل ہوں، میرے پاس ان کی وصیت ہے۔"

"تو آپ وصیت سنانے آئے ہیں؟" سدھیر نے کہا۔

"جی نہیں میں صرف اطلاع کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ وصیت کل شام کو کھلے گی جب دونوں متعلقہ فریق موجود ہوں گے۔"

"دوسرا فریق کون؟" سدھیر نے چونک کر پوچھا۔ کیوں کہ اس کی معلومات کے مطابق صدیقی کی بیوی ہی اس کی جائیداد کی وارث تھی۔

"صدیقی صاحب کا ایک چھوٹا بھائی امجد ہے۔" اے ڈی صابری نے کہا۔

اس وقت مایا کی نظر مسز صدیقی پر تھی۔ ان کے چہرے پر غصے اور نفرت کا ایک رنگ آ کر اتر تا نظر آیا۔

"مگر صدیقی صاحب کا تو کوئی بھائی نہیں ہے۔" سدھیر نے مسز صدیقی کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں انسپکٹر صاحب، ان کا ایک بھائی ہے۔ یہ بہت لمبی کہانی ہے۔ ہم تین افراد کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔"

"میں جاننا چاہوں گا مسز صدیقی۔"

"اب سے قریب تین سال قبل مجھے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ جہانگیر کے باپ کی ایک ناجائز اولاد تھی۔ جس کو اب جہانگیر پال رہا تھا۔ میں نے کئی دفعہ ان کو کہا بھی، مگر وہ اپنے باپ کے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہے تھے۔"

"اب امجد کہاں ہے؟"

"وہ ہمارے ہوٹل کا مینیجر ہے۔"

"مگر مینیجر تو اشفاق ہے۔"

"اشفاق ہی امجد ہے۔ میرے مرحوم شوہر کی ہدایت پر ہی امجد کا نام تبدیل کر کے اشفاق کیا گیا تھا۔"

"اوہ..... اور اسی اشفاق کے پستول سے مسٹر جہانگیر قتل ہوئے ہیں۔ اشفاق کے بیان کے مطابق اس کا پستول اس کے کمرے میں تھا۔ اسے نہیں معلوم کہ اس کا پستول اسٹیج پر کیسے پہنچا۔ سدھیر نے سگار کا کش لیتے ہوئے کہا۔

"میرے شوہر کو اسی نے قتل کیا ہے؟" مسز صدیقی نے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

بھری ہوئی آواز میں کہا۔
"ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔" سدھیر نے شائستگی سے جواب دیا۔ "اب ہم چلتے ہیں۔ وصیت کس وقت سنائی جائے گی۔" سدھیر نے پوچھا۔
"کل صبح دس بجے۔" جواب ملا۔
گاڑی سڑک پر رینگ رہی تھی۔ "کیا محسوس کیا تم نے؟" سدھیر نے پوچھا۔
"بس ایک بات۔ مجھے مسز صدیقی کا غم اصلی نہیں لگا۔ ایک عورت دوسری عورت کے جذبات کو محسوس کر سکتی ہے۔ اس کا غم وغصہ اور جذبات حقیقی نہیں لگ رہے تھے۔"
سدھیر سگار سلگاتے ہوئے کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ باقی راستہ خاموشی رہی۔ گاڑی ہوٹل پہنچ چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اشفاق ان کے سامنے تھا۔
"کیا مسٹر صدیقی تمہارے بھائی تھے؟"
"جی ہاں۔" اشفاق کے چہرے پر ایک دم تلخی آ گئی۔
"تمہارے بارے میں مسز صدیقی کی رائے ہے کہ تم حلالی نہیں ہو۔" سدھیر نے اشفاق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
"یہ بکواس ہے۔" ایک دم اشفاق چیخ اٹھا۔ "وہ عورت بکتی ہے۔ میری ماں کا باقاعدہ نکاح ہوا تھا۔ ہمارا سارا گاؤں اس بات کا گواہ تھا۔"
"تمہارے پستول پر تمہاری انگلیوں کے نشان ہیں۔ قتل بھی اسی پستول سے ہوا ہے۔ کیا کہتے ہو اس پر؟"
"یہ کوئی سازش ہے۔ میں بھائی صاحب کو پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ کہیں نا کہیں میں سمجھتا تھا کہ میں بھی کاروبار اور جائیداد میں برابر کا شریک ہوں۔ مگر ہر چیز پر قابض بھائی صاحب ہیں۔ مگر ان کو قتل میں نے نہیں کیا۔"
اشفاق کے گاؤں کا پتا نوٹ بک میں لکھنے کے بعد سدھیر اور مالا اس کے کمرے سے باہر نکل آئے۔
"آپ نے اسے گرفتار کیوں نہیں کیا؟" مالا نے واپسی پر پوچھا۔
"ابھی بہت سے سوال تشنہ ہیں۔ اس دن گولیاں دو چلی تھیں۔ ابھی ایک پستول باقی ہے مالا۔ صبح وصیت کا اعلان ہوگا۔ مسز صدیقی کا رویہ بھی عجیب ہے۔"
دونوں چلتے چلتے ہوٹل کی لائٹ برانچ میں پہنچ گئے۔ جہاں ان کے کہنے کے مطابق لائٹ کا انتظام سنبھالنے والے تینوں افراد موجود تھے۔
"ہاں تو اس دن کیا ہوا تھا۔ لائٹ کس وجہ سے گئی تھی؟"
"صاحب میں چند منٹ کے لئے اپنی جگہ سے اٹھ کر رفع حاجت کے لئے گیا تھا۔ اسی دوران لائٹ گئی اور آئی۔" انچارج نے ایک ہی سانس میں کہا۔
"تو تم بتاؤ۔ اس کے جانے کے بعد کیا ہوا؟" سدھیر نے دوسرے ملازم سے پوچھا۔
"مجھے کچھ نہیں معلوم صاحب۔ لائٹ خود ہی گئی اور واپس آ گئی۔" یہ کہتے ہوئے اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں واضح نظر آ رہی تھیں۔ زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ جو سدھیر اور مالا دونوں کو نظر آ رہی تھیں۔
"میں جانتا ہوں تم قاتل نہیں ہو۔ بتاؤ کتنے روپے ملے تھے بجلی بند کرنے اور چلانے کے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اس عمر میں جیل جاؤ۔" سدھیر نے انچارج اور جونیئر لڑکے سے کہا۔
"صاحب میں بے قصور ہوں۔ مجھے اس کام کے پانچ سو روپے ملے تھے۔ بس دو منٹ کے لئے جا کر مین سوئچ بند کر کے چلانا تھا۔" کچھ لمحے خاموشی رہی۔
"کس نے دیے تھے پیسے؟"
"شکل نہیں دیکھی۔ اس نے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔"
"اس کی کوئی خاص بات نوٹ کی ہو؟"
"بس اتنا ہی دیکھا تھا کہ وہ تھوڑا ایک طرف کو جھک کر چلتا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا اس لئے چہرہ نہیں دیکھ سکا۔"
"اچھا تم اس بات کا تذکرہ اب کسی سے نہیں کرو گے۔" سدھیر کی آنکھوں میں خاص چمک آ گئی۔
"مجھے تو اب شدید بھوک لگ رہی ہے۔" واپسی پر سدھیر نے کہا۔
کھانا کھاتے وقت مالا کی زبان ساتھ چل رہی تھی۔ سدھیر کو کھانے کے دوران کم بولنے کی عادت تھی۔
"پھر کیا لگتا ہے، مجرم کون ہے؟" مالا نے پوچھا۔
"مجرم ویٹر ہے جو ابھی تک تازہ روٹی نہیں لایا۔" سدھیر نے سکون سے جواب دیا۔
مالا کے چہرے پر ہلکی سی مسکان آ گئی۔
"تو تمہیں یاد ہے کہ ہم کھانا کھانے آئے ہیں۔" مالا نے

www.pakistanipoint.com

ہلکا سا طنز کیا۔
"نہیں تو مجھے لگا ہم گھوڑوں کی ریس دیکھنے آئے ہیں۔" سدھیر نے مسکرا کر کہا۔
"اچھا جی گدھے بھی گھوڑوں کی ریس دیکھتے ہیں۔"
"ہاں نا، جب گدھی ساتھ ہو تو یہ کام بھی ہو سکتا ہے۔" اس جواب پر مالا منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔
"اچھا اچھا چلو جلدی کرو۔ ابھی بہت سے کام باقی ہیں۔" سدھیر نے کہا۔
مالا اور سدھیر ایک دوسرے کے ساتھ کالج دور سے ساتھ تھے۔ دوستی اور مذاق کے خوب صورت رشتے میں بندھے ہونے کے باوجود محکمانہ کام کے دوران ان کا آپسی تعلق آڑے نہیں آتا تھا۔ دونوں ہی کام اور تعلق میں ہمیشہ توازن رکھتے تھے۔
کافی پینے کے ساتھ ساتھ سدھیر مالا کو آئندہ کا پلان بتا رہا تھا۔ جس کے تحت مالا کو آج ہی اشفاق کے گاؤں جانا تھا۔ اور سدھیر کو اصغر علی سانی کے پاس جانا تھا۔
مالا گاڑی میں گاؤں کی طرف روانہ ہو گئی۔ سدھیر نے آفس آ کر چند سپاہی سادہ کپڑوں میں تاکید کے ساتھ مختلف سمتوں میں روانہ کیے۔ خود وہ اصغر علی کی کوٹھی کی جانب روانہ ہوا۔ جب اس کی کار کوٹھی کے قریب رکی تو اسی وقت کوٹھی سے ایک آدمی نکلا۔ جسے دیکھ کر سدھیر چونک گیا۔ سدھیر نے کوٹھی جانے کی بجائے اس کی موٹر سائیکل کا تعاقب شروع کر دیا۔ موٹر سائیکل ایک چھوٹے سے ہوٹل کے سامنے رک گئی۔ اس نے ایک کونے میں ایک میز منتخب کی اور بیٹھ کر کافی کا آرڈر دیا۔ سامنے کی میز پر وہ آدمی بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ سدھیر اٹھ کر کاؤنٹر پر آیا اور کال کے لئے فون اٹھایا۔ وہ اپنے محکمے کے آدمی کو کوڈ ورڈز میں پوری بات سمجھا چکنے کے بعد واپس اپنی میز پر بیٹھ گیا۔
تھوڑی دیر بعد اس کی نظر اپنے محکمے کے آدمی پر پڑی۔ اپنی جیب سے پین نکال کر کاغذ پر کچھ تحریر کرنے کے بعد وہ بل ادا کر کے اٹھا اور باہر نکلتے وقت اپنے محکمے کے آدمی سے ٹکراتے وقت کاغذ اس کی جیب میں ایسے منتقل کیا کہ اسے بھی معلوم ہو گیا۔ سدھیر سیدھا باہر نکل گیا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ اس نے اصغر علی کے گھر جانے کا ارادہ ترک کیا۔ وہ کیس کی کڑیاں ملاتا گھر آ کر سو گیا۔

اگلے دن ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد سدھیر کی پہلی منزل اصغر علی کی کوٹھی تھی۔ اصغر علی کی کوٹھی میں بیل کے جواب میں ایک لڑکی نے گیٹ کھولا۔ لڑکی کی عمر بیس سال سے زیادہ نا تھی۔ اس کی آنکھوں میں گہری اداسی اور چہرے پر عجیب سے کرب کے آثار تھے۔
"اصغر علی صاحب گھر ہیں؟ میں انسپکٹر سدھیر ہوں۔"
"جی وہ تو ابھی کہیں گئے ہیں۔ میں ان کی بیٹی صالحہ ہوں۔" ایک لمحے کو لڑکی کی آنکھوں میں چمک آ گئی مگر فوری ہی دوبارہ پہلی حالت بحال ہو گئی۔ "آپ اندر آ جائیں۔" لڑکی پیچھے ہٹتی ہوئی بولی۔
"آپ کے گھر میں گیٹ کیپر کیوں نہیں ہے؟" سدھیر اس کے پیچھے چلتا ہوا کمرے تک آیا۔
"گیٹ پر بابا نور دین ہوتے ہیں۔ مگر پرسوں سے ان کی طبیعت نہیں ٹھیک۔ وہ ہسپتال ہیں۔"
"کیا پرانے بیمار ہیں۔"
"کبھی کبھی ایک لمحہ انسان کو بوڑھا کر دیتا ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"نہیں کچھ نہیں ایسے ہی بس کہہ گئی میں۔"
"چوبیس تاریخ کو آپ کے گھر میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہو۔ جس کی وجہ سے مسٹر اصغر نے ایک گولی چلائی ہو؟"
صالحہ کے چہرے پر درد کے آثار نمایاں ہو گئے۔ مگر اس نے نا میں گردن ہلا دی۔
"اچھا میں چلتا ہوں۔" اچانک سدھیر اٹھ کھڑا ہوا۔
ہسپتال کا پتا نوٹ کر کے سدھیر سیدھا ہسپتال پہنچا۔ ڈاکٹرز سے معلوم ہوا کہ نور دین کسی شدید ذہنی اضمحلال کا شکار ہوا ہے۔ نور دین نیم پاگل حالت میں ایک بیڈ پر پڑا تھا۔
"بابا تمہاری صحت کیسی ہے اب، کیا ہوا ہے تم کو؟"
"مم میرا بیٹا، بی بی جی۔" اس نے بدحواسی کے عالم میں کہا۔
"کیا..... کہا..... بابا؟" سدھیر نے چونک کر پوچھا۔
"مم..... میں نے کچھ نہیں کہا۔ جج..... جاؤ یہاں سے۔" نور دین نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ اچانک جیسے نور دین کو ہوش آ گیا۔
سدھیر واپسی کے لئے اٹھ چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

اسے کیا کرنا ہے۔ دوپہر کے وقت مالا کی واپسی ہوئی۔ اشفاق کا بیان سچا ہے۔ اس کا پچھلا ریکارڈ بھی صاف ہے۔ شام کو مالا اور سدھیر مسٹر صدیقی کی کوٹھی میں موجود تھے۔ اشفاق بھی پہنچ چکا تھا۔ مسز صدیقی کی آنکھوں میں اس کے لئے نفرت صاف دیکھی جاسکتی تھی۔ اشفاق نے آنے سے انکار کرنا چاہا تھا مگر سدھیر کے کہنے پر اس کو آنا ہی پڑا تھا۔ اے ڈی صابری نے وصیت کھولی اور اس کو پڑھنا شروع کیا۔ وصیت کی رو سے مسز صدیقی جائیداد کے تین حصوں کی وارث تھیں۔ اشفاق کو بھی کل جائیداد کا ایک حصہ دیا گیا تھا۔

سدھیر کی نظر دونوں کے چہرے پر تھی۔ مسز صدیقی کی آنکھوں میں خوشی اور اشفاق کی آنکھیں خالی خالی تھیں۔ وہ وہاں سے اٹھا اور چپ چاپ روانہ ہوگیا۔ مالا سدھیر کا اشارہ پا کر فوری کمرے سے نکل کر اشفاق کے ساتھ ہولی۔

''اشفاق صاحب آئیں ایک کپ کافی ہو جائے۔ اس دوران کچھ باتیں بھی ہو جائیں گی۔''

کافی پیتے وقت اشفاق کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''آپ کو کیا لگتا ہے، جہانگیر صاحب نے جائیداد کا بٹوارہ ناانصافی سے کیا ہے؟'' مایا نے پہلا سوال پوچھا۔

''وہ اپنی مرضی کے مالک تھے۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''اگر آپ یونہی خاموش رہے تو پھانسی گھاٹ پر جھولتے نظر آئیں گے۔''

''آپ کو کیا لگتا ہے مسز صدیقی آپ کے مرحوم شوہر نے اپنے بھائی کو کیوں برابر کا حق کیوں نہیں دیا؟'' سدھیر نے مسز صدیقی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''شاید وہ اس کی اصلیت کے پیش نظر ایسا چاہتے ہوں۔ آخر اشفاق ہے تو ایک غلطی ہی۔ کب تک اس کو پالتے۔'' اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''آپ کیس حل ہونے تک اشفاق کو ہوٹل سے بے دخل نہیں کریں گی۔'' یہ کہہ کر سدھیر وہاں سے روانہ ہوگیا۔

اگلے تین دن بہت مصروفیت بھرے تھے۔ مایا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر سدھیر کر کیا رہا تھا۔ مگر اسے سدھیر کی آنکھوں میں ایسی چمک نظر آرہی تھی جو اکثر شکاری کی آنکھوں میں شکار کے وقت ہوتی ہے۔

''کیا یہ کیس یونہی چلتا رہے گا۔'' مایا نے خاموشی کا سحر توڑا۔

''مجرم میرے سامنے ہے۔ بس میں ثبوت جمع کر رہا ہوں۔''

فون کی گھنٹی بجی۔ سدھیر نے فون اٹھایا۔ آگے سے کیا کہا گیا یہ تو مایا کو نا معلوم پڑ سکا مگر سدھیر آندھی اور طوفان کی طرح بھاگتا ہوا باہر نکلا اور گاڑی میں کہیں روانہ ہوگیا۔ مایا آوازیں دیتی رہ گئی۔ تین گھنٹے بعد سدھیر کی کال مایا کو ملی کہ فوری مسز صدیقی کی کوٹھی میں پہنچو۔ مایا وہاں پہنچی تو سدھیر بھی داخل ہو رہا تھا۔

دونوں اندر داخل ہوئے، مسز صدیقی اور اے ڈی صابری سے سامنا ہوا۔

''میں ایک اطلاع کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ اشفاق نے اب سے تین گھنٹے قبل خودکشی کر لی۔ اس کے کمرے سے ایک خط ملا ہے۔ اس کے مطابق اس نے اپنے بھائی کو دولت کے لیے قتل کیا۔ مگر اس کے بعد جب اس کو معلوم ہوا کہ اس کے مرحوم بھائی نے اپنی جائیداد کا ایک حصہ اس کے نام کر دیا ہے تو وہ جیتے جی زمین میں دفن ہوگیا۔ اسی وجہ سے اس نے ضمیر کے ہاتھوں تنگ آکر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا ہے۔''

''اس نے کس طرح خودکشی کی؟'' مسز صدیقی نے پوچھا۔

''اس نے شراب میں زہر ڈال کر پیا ہے۔ کیس قریب قریب اختتام پذیر ہے۔ کل شام میں اس کی تفصیل بیان کروں گا۔'' سدھیر نے کہا۔

اگلے دن شام کو مسز صدیقی کے ہاں اصغر علی سانی، اس کے ساتھی، ان کی بیٹی، ہوٹل کا مکمل عملہ موجود تھا۔ ان سب کو انسپکٹر سدھیر نے بلایا تھا۔ کوٹھی کے لان میں تمام افراد کرسیوں پر براجمان تھے۔ سادہ کپڑوں میں ملبوس افراد چاک و چوبند کھڑے تھے۔

''قتل کے بعد میرے لئے پریشانی کا باعث بات یہ تھی کہ دو گولیاں چلی ہیں جن میں سے ایک تو جہانگیر صاحب کو لگی تھی۔ مگر دوسری کا سر پیر غائب تھا۔ خیر تو میں بتا رہا تھا دوران تفتیش مجھے معلوم ہوا کہ اشفاق جہانگیر کا بھائی ہے۔ قتل کے وقت بجلی کا بند ہو جانا کوئی اتفاق نہیں تھا۔ سدھیر ساتھ ساتھ تمام سننے والوں کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ بجلی بند کروانا اور پھر بجلی کا آجانا منصوبے کا حصہ تھا۔ اب میں آپ کو ملاتا ہوں اس انسان سے جس نے یہ کام سرانجام دیا تھا۔ چچا غفور کھڑے ہو جائیں۔'' سدھیر کھڑا بول رہا تھا۔

بجلی کے شعبے کا بزرگ کھڑا ہوا۔ تمام نظریں اس پر تھیں۔ کچھ چہروں پر حیرت اور کچھ پر پسینہ آچکا تھا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

"دوران تحقیق جہانگیر صاحب کی وصیت کا راز کھلا۔ جس کے مطابق ان کا سوتیلا بھائی جوان سے کسی حد تک نفرت رکھتا تھا اس کو جائیداد میں ایک حصہ کا مالک بنایا گیا تھا۔ مگر اشفاق نے اچانک جذبات کی رو میں بہہ کر بھائی کے احسانات اور اپنے گناہوں کا کفارا ادا کرنے کی نیت سے خودکشی کر لی۔ اس سے آگے کیا ہوا۔ آپ کو بتائیں گے خود اشفاق صاحب۔" سدھیر نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

یہ جملہ سننا تھا کہ لان میں چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں۔ اشفاق آہستہ آہستہ چلتا اسٹیج پر پہنچا۔ اس سے قبل کہ اشفاق کچھ کہتا۔ ایک فائر ہوا اور بلند چیخ کے ساتھ اے ڈی صابری زمین پر گرا۔ فائر سدھیر نے کیا تھا۔ اے ڈی صابری کو فوری سادہ کپڑوں میں ملبوس افراد نے حراست میں لے لیا۔ ہر فرد پریشان و حیران یہ سب دیکھ رہا تھا۔ صابری کا پستول بھی پولیس اٹھا چکی تھی۔

"ہاں تو صابری صاحب آپ سے ایک نہیں کئی غلطیاں ہوئیں۔ آپ اپنی انگلیوں کے نشان جلدی میں اشفاق کے کمرے میں کرسی پر چھوڑ آئے۔ آپ نے یہ بھی غور نہیں کیا۔ میرے چند لوگ ہمہ وقت اشفاق پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ آپ نے بھیس تو اچھا بدلا۔ مگر اشفاق کی جان بروقت کاروائی سے محفوظ رہی۔" سدھیر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے مرحوم شوہر کو بھی اسی منحوس نے قتل کیا ہے؟" مسز صدیقی نے خونخوار نظروں سے صابری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں اس دن ہال میں اشفاق کا پستول چرا کر انہوں نے ہی مسٹر صدیقی پر گولی چلائی تھی۔ یہ صدیقی صاحب کے قریبی دوست اور آستین کے سانپ تھے۔ مگر ابھی ایک سوال میرے سامنے تھا کہ اے ڈی صابری کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا تھا۔" سدھیر نے مسز صدیقی کی جانب دیکھ کر سوال کیا۔ "آپ کچھ جانتی ہیں مسز صدیقی؟" اچانک سدھیر نے سوال پوچھا۔

"مم ..... میں ..... کچھ نہیں جانتی۔" مسز صدیقی کی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔

"چلیے میں بتا دیتا ہوں۔" سدھیر نے کہا۔

"گولی تو اے ڈی صابری نے چلائی تھی۔ مگر بجا بند کروانے کون گیا تھا۔ یہ سوال ادھورا تھا۔ مسز صدیقی انسان ہر چیز بدل سکتا ہے مگر بے دھیانی میں اپنی چال نہیں بدل پاتا۔ آپ ذرا اسٹیج تک آئیں۔" مسز صدیقی اسٹیج پر آ رہی تھیں۔

"یہی تھیں اس دن۔ جس نے مجھے پیسے دیے تھے" اچانک غفور چچا کی آواز گونجی۔

"یہ کیا بکواس ہے۔" مسز صدیقی نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"مسز صدیقی آپ کا وہ لباس کوٹ ہیٹ دستانے میں برآمد کر چکا ہوں۔ آپ چلتے وقت دائیں طرف تھوڑا جھک کر چلتی ہیں۔ آپ آواز بدلنے پر بھی قادر ہیں۔ مگر آپ اپنا چلنے کا مخصوص انداز تبدیل نا کر سکیں۔" سدھیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ میں قاتل ہوں۔" مسز صدیقی کی آواز میں لرزش تھی۔

"درست کہتی ہیں آپ۔ ایک بات اور رہ گئی۔ مسٹر صدیقی کی حقیقی وصیت اے ڈی صابری اور صدیقی صاحب کے بینک لاکر سے میں حاصل کر چکا ہوں۔ میرا خیال ہے آپ کو اس میں دلچسپی ہوگی۔ یہ رہی اصلی اور حقیقی وصیت جس کے مطابق آپ کو جائیداد سے مکمل بے دخل کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے صابری نے آپ کے ساتھ مل کر یہ سارا منصوبہ بنایا۔" سدھیر آہستہ آہستہ سگار کے کش لے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ مکمل انتظام کے ساتھ آیا تھا۔ بابا چپ چاپ بدلتے حالات دیکھ رہی تھی۔

"اگر آپ کہیں تو میں آپ کی بے دخلی کی وجوہات پر بھی روشنی ڈال سکتا ہوں مسز صدیقی۔" سدھیر نے نہایت سنجیدگی مگر سفاکی سے کہا۔

مسز صدیقی نے سر اٹھایا تو آنکھوں میں رحم کی اپیل تھی۔

"میں اپنا جرم قبول کرتی ہوں۔" مسز صدیقی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اگر یہ ڈرامہ ختم ہو گیا ہو تو میں جا سکتا ہوں سدھیر صاحب۔" اچانک اصغر علی نے بلند آواز میں کہا۔

"بس دو منٹ۔ پھر آپ شوق سے جا سکتے ہیں۔ اب آپ کے سامنے تشریف لائی ہیں مس صالحہ۔" سدھیر نے اس بار پھر ڈرامائی انداز اختیار کیا۔

"یہ کیا بیہودگی ہے۔ آپ نے میری بیٹی کو کیوں بلایا ہے۔" اصغر علی نے بگڑ کر کہا۔

"آپ تشریف رکھیں۔" سدھیر کی آواز گونجی۔ مگر آواز کی ہیبت کچھ ایسی تھی کہ بابا نے چونک کہ سدھیر کی جانب دیکھا۔ ایسا

Waqar Azeem Pakistanipoint.com
www.pakistanipoint.com

لگ رہا تھا جیسے کوئی بھیڑیا مزے لے لے کر اپنا شکار کھا رہا ہو۔

صالحہ چپ چاپ اسٹیج پر موجود تھی۔ ایک کمزور سا بوڑھا سہارے سے چلتا سدھیر پاس پہنچ گیا۔

"دوسری گولی جہانگیر صدیقی کے قتل سے تین دن قبل چلائی تھی۔ گولی اور مردہ دونوں برآمد ہو چکے ہیں۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ، بابا نور دین اور صالحہ کی گواہی کی بنیاد پر میں اصغر علی صاحب آپ کو گرفتار کرتا ہوں۔ آپ نے اپنے ہی ملازم کے بیٹے کو بے رحمی سے قتل کیا۔" سدھیر کا لہجہ سرشاری سے بھرپور تھا۔

اصغر علی، مسز صدیقی، اور اے ڈی صدیقی کو پولیس نے ہتھکڑیاں لگا دی۔ اشفاق کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ صالحہ اور نور دین بھی گم سم کھڑے تھے۔ تقدیر کا لکھا ہو کر رہا تھا۔ قاتل جیل میں تھے۔ معصوم اور بے گناہ اپنے پاک دامن کے ساتھ سر اٹھا کر کھڑے تھے۔

"مجھے ابھی بہت سے سوال کرنے ہیں۔" شام کو مایا نے سدھیر کو آخر پکڑ ہی لیا۔

"جانتا ہوں تم کیا پوچھو گی۔ تو سنو۔ ایک بیک میلر نے مسز صدیقی کو ان کی کچھ ایسی تصاویر بھیجیں جن کو اگر کوئی دوسرا دیکھ لیتا تو اس کو مشکلات ہو سکتی تھی۔ وہ تصاویر غلطی سے مسٹر صدیقی کے ہاتھ لگ گئیں۔ مرد سب کچھ برداشت کر سکتا ہے مگر بے وفائی نہیں۔ اس نے اپنے جگری دوست اے ڈی صابری کو بلا کر ان تصاویر کا بتایا اور ساتھ ہی اسے اپنی وصیت تیار کرنے کا کہا۔ وہ اسے طلاق دینا چاہتا تھا مگر صابری نے اسے پروگرام تک روکے رکھا تا کہ یہ خبر نہیں پروگرام کو گہنا نا دے۔ مگر اصل مقصد وقت حاصل کرنا تھا۔ مسز صدیقی کی تصاویر میں مسز صدیقی تو واضح تھیں مگر دوسرا انسان جس کا چہرہ تصویر میں نہیں آ سکا تھا وہ اے ڈی صابری خود تھا۔ صابری اور مسز صدیقی نے مل کر قتل کا منصوبہ بنایا۔ ایک ایسا انسان جس پر قتل ڈالا جا سکتا تھا وہ ان کی نظر میں اشفاق تھا۔ اس کا پستول چرا کر اس سے قتل کیا گیا۔ پھر ہماری نظر میں اسے حرامی بنایا گیا تا کہ ہم اس سے نفرت محسوس کر سکیں۔ پھر ایک جعلی وصیت میں اس کو آدھی جائیداد کا مالک بنایا گیا۔ اس کے بعد اس کو قتل کر کے خودکشی کا رنگ دیا گیا تا کہ ایسا لگے کہ اپنے بھائی کی وصیت سن کر دل برداشتہ ہو کر اس نے اپنی جان لے لی۔ مگر میرے مقرر کردہ آدمی بروقت پہنچ کر اس کی جان بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ یوں منصوبہ ناکام ہوا۔

مسز صدیقی اپنی چال سے پکڑی گئیں۔ اور اب آ و اصغر علی کی طرف میں پہلی دفعہ جب اس کے گھر گیا وہاں پر میں نے ایک بدنام زمانہ بدمعاش کو اس کے گھر سے نکلتا دیکھا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا۔ اس پر ایک آدمی مقرر کیا۔ پھر اس کو اٹھوا کر زیرو پوائنٹ پر لے آیا۔ تھوڑی سی دھلائی کے بعد اس نے نور دین کے بیٹے کے قتل کا قصہ بیان کر دیا۔ بلال نام تھا اس نوجوان کا۔ اس کو صالحہ سے محبت کرنے کے جرم میں اصغر علی نے صالحہ اور نور دین کے سامنے قتل کر دیا تھا۔ صالحہ ایک دم خاموش اور نور دین نیم پاگل ہو کر ہسپتال داخل تھا۔ میں نے نور دین کو ہسپتال سے اٹھوا کر اس کو ایک دوست کے پاس رکھا۔ اس کی طبیعت میں بہتری آئی تو اس نے تھوڑی سی مزاحمت کے بعد سچ اگل دیا۔ پورا کیس میرے سامنے واضح ہوتا چلا گیا۔

دولت اور طاقت کے نشے میں چور انسان جرم کرتے وقت یہی سوچتے ہیں کہ ان کا اثر و رسوخ ان کی منصوبہ سازی انکو بچا لے گی۔ مگر انسان یہ کہاں سوچتا ہے کہ ہر دنیا مکافات عمل بھی ہے۔ یہ تمام جعلی نشے بھی ہرن ہونے والے ہیں۔ مالا میں یا تم نجومی نہیں ہیں۔ مگر مجرموں کی بدحواسیاں اور اتفاقات ہی سے ہم اپنی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔ انسان دولت و شہرت اور طاقت کے حصول میں مگن ہو کر کب درندہ بن جاتا ہے خود انسان کو ہی معلوم نہیں پڑتا۔ کیا یہ نشہ ابدی ہے۔ اگر نہیں تو کیوں انسان اس دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ دنیا اپنے وجود کے وقت سے ایسے انسانوں سے بھری پڑی ہے جو یہ سمجھتے تھے کہ طاقت و دولت ان کو ہمیشگی عطا کرے گی مگر وقت نے دیکھا وہ لوگ زمانے کے لئے ایک دردناک اور عبرت ناک سبق سے زیادہ کوئی معنی و مقصد نہیں رکھتے۔

ہر کیس کے خاتمہ پر میں یہی سوچتا رہتا ہوں کہ انسان کی اس عملی گراوٹ کی وجہ کیا ہے۔ اس کے خمیر میں ایسا کون سا آب و دانہ شامل ہے جس کی بدولت وہ کئی زندگی کے چراغ گل کر کے سوچتا ہے کہ اس کے آنگن کا دیا سدا روشن رہے گا۔" سدھیر چپ کا روزہ توڑ کر بولتا چلا جا رہا تھا۔ مالا چپ سادھے اسے دیکھ رہی تھی۔ وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے رواں تھا۔

www.pakistanipoint.com

نوبل کاز

شہزاد خان

انسانیت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا مگر اس نفسا نفسی کے دور میں آج انسانیت ناپید ہوگئی ہے۔ موجودہ عالمی وبائی صورت حال میں ہر انسان دوسروں کے بجائے اپنی ذات کے بارے میں سوچ رہا ہے اور اسی دائرے میں رہ کر آگے بڑھنے کی تگ و دو میں مصروف ہے۔ انسان کو اس بات کی پروا نہیں ہے کہ اس کے ساتھ کا انسان کس قدر مشکلات سے دو چار ہے۔ ان تمام باتوں سے الگ ہٹ کر یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ اس دنیا میں ابھی بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو دوسروں کے لیے سوچتے ہیں۔

کرونا وائرس کی تباہ کاریوں کے پس منظر میں لکھی گئی ایک فکر انگیز تحریر ایک پاکستانی نوجوان ڈاکٹر کا قصہ

پری میڈیکل میں اچھے نمبر نہ آنے کی وجہ سے راحیل کا ملک کے کسی بھی اچھے میڈیکل کالج میں ایڈمشن نہ ہوسکا۔ جس کی وجہ سے آج کل اس پر اداسی کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ ایک دو بار تو اس کے ذہن میں یہ آیا کہ وہ اپنا ڈاکٹر بننے کا خواب بھول کر کوئی اور فیلڈ جوائن کرلے لیکن پھر جب یہاں آکر اس کی سوچ کی سوئی اٹک بلکہ بالکل رک جاتی تھی۔ خاندان کے افراد اور ان کی چبھتی ہوئی نظریں اور طعنوں کا خیال آتا تو لرز جاتا۔ اسے اپنے ملک کے ایجوکیشن سسٹم اور داخلوں کے طریقہ کار پر غصہ آنے لگتا جو اچھے خاصے ٹاپرز کو ان نام نہاد امتحانوں سے گزار کر چغد بنا دیتے تھے۔ اچھا خاصا پوزیشن ہولڈر ایک چھوٹے سے امتحان میں اچھے نمبر نہ لے سکنے کی وجہ سے دوسروں کی نظروں میں بیوقوف اور نالائق جیسے خطابات پانے کا اہل قرار پاجاتا تھا۔ اس نے اپنے تئیں بہت سے میڈیل کالجوں میں داخلے کے لئے بھاگ دوڑ بھی کی اور ایڈمشن ٹیسٹ بھی دیئے لیکن نتیجہ ندارد، کبھی ٹیسٹ میں نمبر کم کبھی کالجوں کے میرٹ کا بھوت اس کے سر پر سوار رہتا۔

❖❖❖❖

راحیل اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا لاڈ پیار میں پلا بڑھا تھا اس کے والد نادرا آفس میں ایک چھوٹے سے افسر تھے لیکن اپنے بیٹے کی ہر خواہش کو پورا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔ وہ چونکہ خود ایک ڈاکٹر بننا چاہتا تھا لیکن مالی حالات کی وجہ سے اپنے اس خواب کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ باپ اپنے خوابوں کی تکمیل اپنے بچوں میں ڈھونڈتا ہے شاید یہی وجہ تھی کہ میٹرک پاس کرنے کے بعد اس نے راحیل کو شہر کے ایک اچھے اور نامی گرامی کالج میں داخل کروادیا تھا۔ میٹرک میں راحیل کے اچھے نمبروں کی وجہ سے حکومت کی طرف سے اسے ایک لیپ ٹاپ اور تعریفی سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا تھا۔ اس کی محنت دیکھتے ہوئے اور خود راحیل کے ڈاکٹر بننے کے شوق کو دیکھ کر اس نے اسے مزید اچھے کالج میں داخل کروادیا تھا۔ لیکن شاید قسمت کو کچھ اور منظور تھا کہ اس کے ایف ایس سی پری میڈیکل میں اچھے نمبر نہ آنے کی وجہ سے اسے اپنا خواب ادھورا نظر آرہا تھا۔

راحیل خود بہت پریشان تھا اس کے بقول اس نے امتحان میں اچھے پیپر دینے میں بہت محنت کی تھی لیکن یہ بات اسے قطعی ہضم نہ ہورہی تھی کہ آخر اس کے نمبر اچھے کیوں نہیں آئے؟

بحر حال تقدیر سے تو کوئی نہیں لڑسکتا اس لئے اس نے ان تمام کالجوں کی خاک چھان لی جہاں جہاں اسے امید تھی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

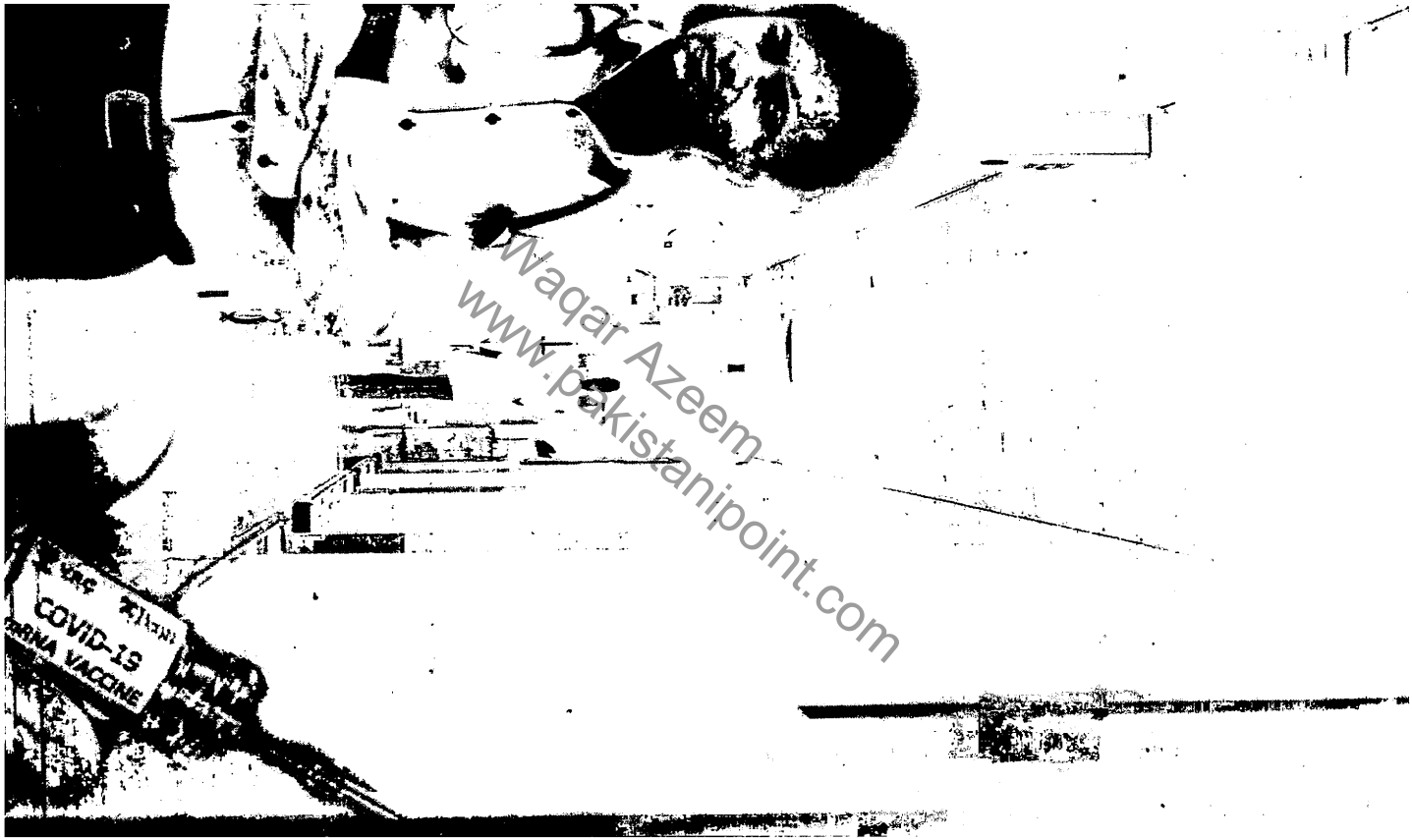

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

کہ اس کا داخلہ ہوسکتا تھا۔ راحیل کے ابو مشتاق احمد نے اپنے کچھ دوستوں سے اس بات کا ذکر کیا تو ان میں سے دو ایک نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ اگر اس کے بیٹے راحیل کا داخلہ پاکستان میں نہیں ہو رہا تو وہ روس یا چائنہ میں کوشش کرے کیونکہ وہاں میڈیکل اور انجینئرنگ کا میرٹ بہت مناسب ہوتا ہے اور آسانی سے داخلہ مل سکتا ہے چونکہ ایسے ممالک کو صرف زرمبادلہ سے مطلب ہوتا ہے کہ کسی بھی صورت ملک میں پیسہ آنا چاہئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ چائنہ اور روس میں میڈیکل کا سالانہ خرچہ تقریباً پاکستانی چار تا پانچ لاکھ تک ہوتا ہے اور اگر کسی طور وہاں اسکالرشپ کا بھی بندوبست ہو جائے تو پھر بچوں کے وارے نیارے ہوتے ہیں اور انہیں صرف اپنا خرچ چلانے کے لئے کچھ رقم درکار ہوتی ہے۔ بحرحال یہ تو ایک الگ ٹاپک ہے۔ راحیل کے ابو کی تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ وہ بغیر اسکالرشپ کے اپنے بیٹے کو روس یا چائنہ بھیج سکے اس لئے اس نے کسی اچھے کنسلٹنٹ سے مشورہ لینے کا سوچا اور پھر ایک روز دفتر سے چھٹی کر کے ایک کنسلٹنٹ سے ملاقات کی اور اسے اپنا مدعا بیان کیا۔ جواب میں اسے وہ تمام معلومات پہنچا دی گئیں جسے سن کر اسے کچھ اطمینان ہوا۔ پھر ایک روز اس نے چائنہ میں موجود ایک میڈیکل کالج سے رابطہ کر کے ان کی ضرورت کی تمام دستاویزات تیار کروالیں اور پھر ایک مکمل کیس تیار کر کے وہ تمام دستاویزات ڈی ایچ ایل کوریئر کے ذریعے چائنہ کے اس کالج کو بھجوا دیں۔ تقریباً ایک ماہ کے بعد اسے ایک پیکٹ موصول ہوا جس میں اسے اس بات کی نوید سنائی گئی تھی کہ اس کے بیٹے راحیل کو اسکالرشپ دینے کی منظوری ہو گئی ہے لیکن اس کے لئے اسے کچھ تھوڑی بہت رقم جو کالج کی فارمیلٹی ہوتی ہے وہ لازمی بھیجنا ہوگی۔ مشتاق احمد کی خوشی دیکھنے والی تھی اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے اب اسے اپنا خواب پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔ اس نے برے وقت کے لئے کچھ رقم بینک میں رکھوائی ہوئی تھی اور آج اسے اس بات کی خوشی اور اطمینان تھا کہ وہ رقم اس کے اور اس کے بیٹے راحیل کے خوابوں کی سیڑھی بننے جا رہی تھی۔ اس نے بینک منیجر سے بھی مشورہ کیا جو اس کا دیرینہ دوست تھا اس نے بھی اپنے تئیں تمام تحقیقات کر لیں تھیں کہ آیا وہ کالج کوئی فراڈ تو نہیں ہے اس کے لئے اس نے اپنے دوست کو اس کالج کا ایڈریس ای میل کر دیا تھا جو اس وقت شنگھائی میں ہی جاب کے سلسلے میں مقیم تھا۔ راحیل کا ایڈمشن چائنہ میں نین جنگ میڈیکل کالج جیانگ سو میں ہو گیا تھا اور تمام کاغذات کی جانچ پڑتال کے بعد ہی اسے پاکستان سے چائنہ کے لئے روانہ ہونا تھا۔ اس تمام کام میں تقریباً تین ماہ لگ گئے اور پھر آخر کار اس کو کالج کی جانب سے روانگی کا پروانہ موصول ہو گیا۔ راحیل کے والدین کی خوشی سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔ راحیل الگ اڑا اڑا پھر رہا تھا۔ اپنی ضرورت کی اشیاء اپنے ابو کے ساتھ بازار جا کر خرید لی تھیں اور اس وقت ان سب چیزوں کو ترتیب سے ایک نئے سوٹ کیس میں رکھنے میں مصروف تھا اور اس کام میں اس کی امی اس کی مدد کر رہی تھی۔ گھر میں اس وقت وہ دونوں ہی موجود تھے اور اس کے ابو بازار سے کچھ اور سامان لینے کے لئے گئے ہوئے تھے۔

ایڈمشن خط کے مطابق اسلام آباد سے روانگی مورخہ ۳ اگست کو تھی اور کلاسز کا آغاز ستمبر میں ہونا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے وہاں ایک اچھے اور تقریباً سستے ہاسٹل میں ایک کمرہ بھی شیئرنگ میں مل گیا تھا جس کی اطلاع خط میں موجود تھی دو وقت کے میس کے علاوہ پاکستانی روپوں میں اٹھارہ ہزار کے لگ بھگ رقم بنتی تھی جو کہ مشتاق احمد نے دینے کی حامی بھر لی تھی اور تعلیم کا خرچہ اس کی اسکالرشپ کے ذریعے پورا ہو گیا تھا۔ روانگی کے مطابق اسے رات دس بجے کی فلائٹ سے تین گھنٹے پہلے لاہور سے اسلام آباد پہنچنا تھا اس لئے وہ صبح ہی وہاں سے روانہ ہو چکے تھے اور اس وقت ایئرپورٹ پر تھے۔ ویٹنگ ہال میں وہ اس وقت اکیلا موجود تھا سامان ساتھ ہی رکھا ہوا تھا اور پھر روانگی کا وقت بھی آ پہنچا اور وہ دس بجے کی فلائٹ سے چائنہ کے لئے روانہ ہو گیا۔

❖❖❖❖

صبح کے چھ بجے ہوں گے جب اس کا جہاز چائنہ کے ایئرپورٹ پر لینڈ کر گیا۔ پاکستان سے چائنہ کا فضائی فاصلہ تقریباً پانچ گھنٹے چھ منٹ کا ہے اور چائنہ پاکستانی وقت سے تقریباً تین گھنٹے آگے ہے۔ ایئرپورٹ سے تمام ضروری چیکنگ کے بعد اسے ٹیکسی کے ذریعے کالج کی جانب سے بتائے گئے ہاسٹل میں پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کیونکہ

Waqar Azeem Pakistani Cyber Magazine www.pakistanipoint.com

اسے ایک انڈین ٹیکسی ڈرائیور مل گیا تھا جس سے باآسانی بات چیت کرکے وہ اپنے ہاسٹل پہنچ گیا تھا۔ اور اس وقت وہ اسی کے ایک ایسے کمرے میں موجود تھا جس میں چار بیڈ لگے ہوئے تھے جن میں سے ایک اس کے لئے تھا۔ بقایا تین بیڈ ابھی خالی تھے اور وہ کس کے تھے کچھ پتا نہیں تھا اور نہ ہاسٹل کی انتظامیہ نے اسے کچھ بتانا مناسب سمجھا تھا۔

اس نے اپنے سوٹ کیس سے کچھ ضروری سامان نکال کر لاکر میں رکھ دیا تھا اور پھر ہاسٹل کے کاؤنٹر پر فون کرکے اپنے لئے کھانے کے لئے کہا۔ جواب میں اسے آدھے گھنٹے بعد ہال میں ناشتہ کے لئے کہا گیا اور ساتھ ہی اسے ہال کی نشاندہی بھی کردی جو اسی بلڈنگ میں ہی تھا۔ مقررہ وقت پر ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ واپس اپنے کمرے میں آکر بیڈ پر لیٹ گیا اور نہ جانے کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ نیند کی وادیوں میں خواب خرگوش کے مزے لینے لگا۔

❖❖❖❖

کمرے میں یک دم شور ہوجانے کی وجہ سے اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اس کے ساتھ والے بیڈ پر تین نوجوان لڑکے موجود تھے جن میں سے گندمی رنگ والا انڈین اور بقایا دو میں سے ایک پاکستانی اور تیسرا کوئی حبشی لگ رہا تھا جس کا کالا رنگ کمرے میں بھی خوب چمک رہا تھا۔ انہیں اپنے نزدیک بیٹھا دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا اور پھر ان سے تعارف ہونے پر معلوم ہوا کہ اس کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا جن میں ایک پاکستانی جس کا نام معاذ تھا اس کا تعلق بہاولپور سے تھا اور دوسرا انڈین ہی تھا اور اس کا تعلق جے پور سے تھا اور تیسرا سوڈانی تھا جس کا نام آکونگ تھا۔

وہ تینوں بھی اس کی طرح اسکالرشپ پر ہی یہاں آئے تھے لیکن وہ تینوں مختلف پرنسپلز میں ڈگریاں کررہے تھے۔ چونکہ یہ ایک بوائز ہاسٹل تھا اس لئے یہاں بہت سے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ملکی اور غیر ملکی طلباء مقیم تھے۔

قصہ مختصر کچھ ہی دنوں میں یہ سب دوستوں کی طرح رہنے لگے۔ ہاسٹل سے کالج اور کالج سے دوبارہ ہاسٹل روزانہ کا معمول بن گیا۔ اس عرصے میں راحیل نے صرف ضرورت کے وقت اپنے ابو سے رابطہ کیا کیونکہ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ جس قدر ہوسکے یہاں پیسے بچا پائے کیونکہ اسے اپنے مالی حالات کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ اس لئے وہ پھونک پھونک کر پیسے خرچ کرتا تھا۔ اس کی تعلیم کا دوسرا سال شروع ہوچکا تھا۔ جائنہ میں بہت سے پاکستانی لوگوں نے وہاں کے مقامی باشندوں کے ساتھ ساز باز کرکے مختلف ایجوکیشن کالجز بنا رکھے تھے اور دوسرے ممالک سے بہت سے طلباء کم خرچ کے سلسلے میں یہاں داخلے لیکر اپنی تعلیم کا شوق پورا کررہے تھے۔

راحیل کو اور اس جیسے کچھ طلباء کو وہاں کے ایک مقامی ادارے ایکشن ایڈ نے سپورٹ کیا تھا اور وہی ان کے اخراجات کالجز کو ادا کررہا تھا۔ دیگر اخراجات اسے خود ادا کرنے پڑتے تھے۔ پھر بھی اسے کافی سہارا تھا اور وہ جلد از جلد اپنی تعلیم مکمل کرکے اپنے ملک پاکستان جانا چاہتا تھا تاکہ وہاں جاکر اپنے ملک کے لوگوں کی خدمت کرسکے۔

جائنہ میں رہتے ہوئے دو سال ہوگئے تھے اور اب اسے ان کی زبان کی کافی حد تک سمجھ لگنے لگی تھی۔ وہاں کے کھانے اور بازاروں میں پاکی ناپاکی کو ملحوظ خاطر رکھے بغیر جانوروں کی طرح خورد و نوش کی اشیاء کا استعمال بے دریغ کیا جارہا تھا۔ اکثر جب بھی اسے کسی کام سے وہاں کے بازاروں سے گزرنا پڑتا تو بمشکل اپنی متلی کو روکنا پڑتا لیکن وہ مجبور تھا کیونکہ حقیقت سے نظریں چرانا اس کے بس سے باہر تھا۔

تعلیم کا سلسلہ جاری تھا اور دھیرے دھیرے وقت کا پنچھی پر لگائے اپنی منزل کی جانب پرواز کرتا رہا اور ایک دن اسے ڈاکٹری کی ڈگری سے نواز دیا گیا۔ اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا اس نے سب سے پہلے فون کرکے اپنے گھر والوں کو اس کا بتایا اور پھر ساتھ ہی ہاؤس جاب کے لئے وہاں کے ایک پررونق علاقے وہان میں موجود ایک بہت بڑے جنرل ہسپتال میں اپلائی کردیا۔ جلد ہی اسے وہاں ہاؤس جاب کرنے کا لیٹر موصول ہوگیا اور پھر اس نے ایک سال کے لئے وہاں اپنی خدمات سرانجام دینی شروع کردیں۔ راحیل نے اپنی تعلیم کے سالوں میں دن رات محنت کی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ قدرت نے اسے یہ ایک موقع دیا ہے جسے وہ گنوانا نہیں چاہتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اسے اس بات کا بھی شدت سے احساس تھا کہ اس کے ابو کا کوئی اور ذریعہ آمدن نہیں ہے اس لئے وہ چاہتا تھا کہ وہ ایک کامیاب ڈاکٹر بن کر اپنے ابو کا سہارا بننے کے

www.pakistanipoint.com

ساتھ ساتھ اپنے ملک کے عوام کی خدمت بھی کر سکے۔ اس لئے جب اسے ڈاکٹری کی ڈگری ملی تو اسے اس کے ساتھ ساتھ اس کی قابلیت کی تعریفی سند علیحدہ دی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی ہاؤس جاب کے لئے وہاں کی انتظامیہ کو ایک ریکمنڈیشن لیٹر بھی بھیج دیا گیا تھا جس کے بل بوتے پر اسے فوری ہاؤس جاب کا لیٹر روانہ کر دیا گیا تھا اور اس کے نتیجے میں آج وہ وہاں ایک کامیاب ڈاکٹر کے طور پر اپنی خدمات سرانجام دینے میں مصروف تھا۔

ہاؤس جاب کے دوران اس کی محنت کو دیکھتے ہوئے وہاں کی انتظامیہ نے اعزازی طور پر اس کے لئے ایک معقول وظیفہ کا بندوبست کر دیا تھا جس کی وجہ سے اسے کچھ اخراجات کی ادائیگی ہونے لگی تھی اور پھر ان پیسوں میں سے کچھ پیسے اس نے گھر بھی بھجوانے شروع کر دیئے تھے لیکن اس کے باوجود اس کے والدین اسے جلد از جلد پاکستان پہنچنے کے لئے زور دیتے رہتے تھے لیکن اس کی یہ کوشش تھی کہ وہ جب واپس اپنے ملک جائے تو ایک کامیاب ڈاکٹر کے طور پر وہاں کے لوگوں سے ملے۔ اس لئے وہ بڑے پیار سے اپنے امی ابو کو ٹال دیتا تھا اور اس کے والدین کو اس کی خوشی بھی عزیز تھی اس لئے وہ بھی مجبور ہو جاتے تھے لیکن کبھی کبھی جب راحیل کا فون آتا تو سب سے پہلے یہی مطالبہ ہوتا کہ گھر کب آ رہے ہو؟

❖❖❖❖

یہ رات کے تقریباً ایک بجے کا وقت ہوگا جب وہ وہاں کے ایک علاقے کے سڑک پر ایک سیاہ کار بڑی تیزی سے فراٹے بھرتی جا رہی تھی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک کرخت چہرے والا شخص موجود تھا جس کے چہرے سے اس کی سفاکی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا وہ اسٹیرنگ کو یوں گھما رہا تھا جیسے کسی کی گردن کو پکڑ کر دائیں بائیں مروڑ رہا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کے خدوخال میں بھی اتار چڑھاؤ نمایاں محسوس ہوتا تھا۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ایک درمیانی عمر کی عورت اور ایک ادھیڑ عمر کا شخص موجود تھا، عورت نے اپنے گھٹنوں پر ایک سیاہ بریف کیس رکھا ہوا تھا جس کے اندر مختلف قسم کی شیشے کی رنگ برنگی ٹیوبیں موجود تھیں۔ جن میں مختلف رنگوں کے محلول دکھائی دے رہے تھے۔ بوڑھا شخص بڑے غور سے اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا جیسے اسے پیسے ہی اسی کام کے لئے دیئے گئے ہوں کہ اس نے اس عورت کے کام پر نظریں ٹکا کر رکھنی ہیں۔ اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے کام میں پوری طرح ایمانداری دکھا رہا ہو۔ عورت مختلف قسم کے ٹیوبس کو الٹ پلٹ کر رہی تھی لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ کوئی بھی ٹیوب ایک دوسرے سے ٹکرا نہ سکے ویسے بھی بریف کیس اس انداز کا اندر سے بنا ہوا تھا کہ اس میں ٹیوبس رکھنے کے لئے مختلف سائز کے خانے بنے ہوئے تھے جن میں تمام ٹیوبس بڑی ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ وہ نہ جانے انہیں الٹ پلٹ کر کے کیا دیکھنا چاہ رہی تھی۔ کافی دیر اسی کارروائی میں مصروف رہنے کے بعد اس نے ایک طویل سانس لی اور آہستہ سے بریف کیس کو بند کر کے پچھلے والی سیٹ کے اوپر رکھ دیا۔

''کیا ٹیوبس پوری ہیں؟'' بوڑھے نے اسے بریف کیس بند کرتے دیکھ کر پوچھا۔

''جی ہاں پوری ہیں۔ مجھے شک ہوا کہ شاید میں اورنج والی ٹیوب وہیں لیبارٹری میں ہی بھول آئی ہوں۔''

یہ سن کر اس بوڑھے کے منہ سے بھی اطمینان کی سانس خارج ہوئی اور اس نے کوئی اور بات کئے بغیر ہی پیچھے سیٹ کے ساتھ اپنا سر ٹکا لیا۔ گاڑی کے اندر دوبارہ گھمبیر خاموشی چھا گئی۔ اس دوران ڈرائیور نے کوئی بات نہیں کی اور نہ ان دونوں میں سے کسی نے اس سے کوئی بات کی۔ سڑکوں کے علاوہ چاروں طرف بھی ایک خاموشی طاری تھی یہ وجہ نہ تھی کہ وہاں لوگ سوئے ہوئے تھے بلکہ یہ وہ وہاں کا ایک سنسان علاقہ تھا۔ جہاں سے صرف وہی لوگ رات کے اس وقت گزرنے کی ہمت کرتے تھے جنہیں وہاں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل تھی ورنہ عام لوگ تو اس علاقے کی طرف دن میں بھی نہیں بھٹکتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ دونوں یہیں کے باشندے تھے لیکن اس وقت کسی اور ملک سے آنے والی فلائٹ سے یہاں پہنچے تھے اس لئے اس وقت ان کی منزل وہاں کے اس علاقے میں موجود اپنی ایک خفیہ لیبارٹری کی جانب تھی۔ ان کے انداز سے یوں لگتا تھا جیسے وہ بریف کیس میں کوئی بہت بڑا راز یا خزانہ لے کر جا رہے ہوں۔ عورت کا چہرے پر ایک خاص قسم کا جوش تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس سارے کام میں اس کا کردار بہت اہم تھا

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

لیکن اس کے برعکس بوڑھا اطمینان سے سر ٹکائے ادھ کھلی آنکھوں سے نیند کے مزے لے رہا تھا۔

❖❖❖❖

ایک بہت ہی بھیانک اور لرزا دینے والا تجربہ تھا جو اس وقت کامیابی کے دھانے پر کھڑا تھا اور کسی بھی لمحے ایک زوردار دھماکے کی مانند یہ خبر گونجی تھی کہ ان کا یہ بھیانک تجربہ کامیاب ہوگیا ہے اور وہ ایک بڑی سپر پاور بن کر پوری دنیا میں ابھریں گے اور دنیا کے تمام ممالک کی تقدیریں ان لوگوں کی مٹھی میں ہوں گی۔ وہ جب اور جہاں چاہیں گے ایک بیماری یا وائرس کی صورت میں قیامت برپا کر کے اس ملک کو نیست و نابود کردیں گے یا دوسرے لفظوں میں ایسے ملکوں کو دھمکیاں دیکر ان سے بہت سی دولت اور دیگر راز اگلوا سکیں گے۔ اس خونی کھیل میں دو جائینز ایک عورت زنگ چاؤ اور ایک ادھیڑ عمر مرد وانگ فینگ کا بہت بڑا ہاتھ تھا وہ دونوں پیشے کے لحاظ سے سائنسدان تھے اور جاب کے سلسلے میں یہاں ایک لیبارٹری میں تعینات تھے۔ انہیں لگ بھگ دس تا بارہ سال ہوگئے تھے اور اس دوران انہوں نے بہت سے ایسے تجربات اور ایجادات کیں کہ جنہیں استعمال کر کے بہت سے ملکوں نے مالی فائدہ اٹھایا اور بہت سے ملکوں نے ان کی بنائی ہوئی ایجادات کو غلط مقاصد کے لئے استعمال کر کے اپنے ظالمانہ کردار کو اجاگر کیا اور اپنی سفاکانہ طبیعت کے لئے تسکین حاصل کی۔

اس تجربہ سے کسی بھی ملک میں ایک بہت ہی خطرناک اور جان لیوا وائرس کو چھوڑ کر وہاں موجود تمام جانداروں کو ایک بہت ہی موذی مرض میں مبتلا کیا جاسکتا تھا جس کی وجہ سے وہ جاندار سانس گھٹنے یا پھیپھڑوں کے ضائع ہوجانے کی وجہ سے موت کے منہ میں چلے جاتے۔ اور سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ یہ لوگ زہر تو تیار کرچکے تھے لیکن اس کے تریاق کے لئے انہوں نے کوئی کام نہیں کیا تھا دوسرے لفظوں میں اگر کوئی اس موذی وائرس کا شکار بنتا تو سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہتا کہ وہ سسک سسک کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کو گلے لگالیتا۔ پوری دنیا کا قانون ہے کہ جب بھی دنیا میں کوئی میڈیسن تیار کی جاتی ہے تو جب تک اس کے ری ایکشن کا توڑ نہ ڈھونڈ لیا جائے تب تک اس میڈیسن کو مارکیٹ میں نہیں لایا جاتا۔ لیکن اس وقت لیبارٹری میں موجود تمام کے تمام بیوقوف جی ہاں میری نظر میں وہ سب بڑے بڑے اور نامور سائنسدان بیوقوف ہی تھے جنہوں نے ایک وائرس تو تیار کرلیا تھا جو اس وقت وہاں ایک مخصوص اور چاروں طرف سے بند جگہ پر چھوڑا جاچکا تھا لیکن اس سے ہونے والے نقصان کی شدت کا اندازہ لگائے بغیر بڑی خوشی سے اس کے نتیجے کے انتظار میں آنکھیں گاڑے اس شیشے کے کیبن کی طرف سانس روکے دیکھنے میں مگن تھے جس میں ایک چھپن سالہ شخص بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور اس بیڈ کے سوا کمرہ ہر قسم کے سامان سے خالی تھا۔

گھڑکی پر لگا شیشہ یکطرفہ تھا یعنی کمرے کے اس طرف کھڑے تمام افراد اس بوڑے کو دیکھ رہے تھے لیکن وہ بوڑھا بڑی حیرت سے آنکھیں پھاڑے کمرے میں ادھر ادھر نظریں گھما رہا تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اسے ہسپتال کے وارڈ سے اٹھا کر اس کمرے میں کیوں لاکر چھوڑ دیا گیا ہے اور حیرت ناک بات یہ بھی تھی کہ یہ بیڈ اسی ہسپتال کا ہی تھا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں ہسپتال والوں نے اسے کسی اور کمرے میں تو نہیں شفٹ کردیا لیکن پھر اسے اپنا یہ خیال جھٹکنا پڑا کیونکہ اگر یہ ہسپتال کا کمرہ ہوتا تو کم از کم اس میں کچھ ساز و سامان تو ہوتا اور ہسپتال کا کوئی عملہ یا کوئی نرس ہی دکھائی دے جاتی لیکن یہاں تو اس کے علاوہ کوئی دکھائی نہ دیا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بیڈ سے نیچے اتر کر سامنے نظر آنے والے کمرے کے اکلوتے دروازے کو کھولنا چاہا لیکن دروازہ تو ایسے بند تھا جیسے کسی نے اسے بڑی مضبوطی سے دوسری جانب سے بند کردیا ہو۔ چونکہ شیشہ اس قسم کا تھا کہ جس سے صرف باہر سے اندر کی طرف دیکھا جاسکتا تھا لیکن کمرے میں موجود اس کو شیشے میں صرف اپنی شکل ہی دکھائی دے رہی تھی اس لئے وہ اس بات سے قطعی لاعلم تھا کہ اس کی ہر حرکات و سکنات کو دوسری طرف کھڑے افراد بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ تقریباً پندرہ منٹ گزرے ہونگے کہ اچانک دروازے پر ایک کھٹکا ہوا اور دوسرے لمحے آہستہ آہستہ دروازہ کھلنے لگا اور دوسری طرف ایک چقندر کی شکل والے شخص کی صورت دکھائی دی جس نے چہرے پر ایک فیس ماسک پہنا ہوا تھا اور اس کے ہاتھوں میں ایک ٹرے پکڑی ہوئی تھی اس نے دروازے میں کھڑے کھڑے اسے اشارہ کیا اور ٹرے آگے بڑھادی۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

بوڑھا جو دروازہ کھلتا دیکھ کر ایک دم چونک گیا تھا اس نے حیرت کے ملے جلے رجحان سے قدم بڑھاتے ہوئے دروازے کے اندر سے ٹرے تھام لی اور دوسرے لمحے ایک پانی کی بوتل بھی اسے تھما دی گئی اور پھر اچانک اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے دروازہ دوبارہ ایک زوردار جھٹکے سے یوں بند ہوگیا جیسے کسی نے بڑی عجلت سے اسے بند کردیا ہو۔ بوڑھا ٹرے ہاتھ میں لئے دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گیا اور پانی کی بوتل ایک جانب رکھ کر کھانا کھانے لگا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ سب کچھ کیا ہورہا ہے؟۔ اور یہ کون لوگ ہیں اور اسے کیوں یہاں قید کر رکھا ہے۔ کافی دیر سوچ سوچ کر اس کے سر میں درد شروع ہونے لگا تو اس نے کندھے جھٹکتے ہوئے برتن ایک جانب رکھے اور لمبی تان کر سوگیا۔

❖❖❖❖

اسی طرح روزانہ کا معمول بن چکا تھا اور اسے اس کمرے میں قید ہوئے تقریباً چودہ روز ہوگئے تھے اس دوران وہی شخص اسے برابر تین وقت کا کھانا پہنچا دیتا تھا اور اس کے کسی سوال کا جواب دیئے بغیر تیزی سے دروازہ بند کردیتا تھا۔ دو چار روز تک اس بوڑھے نے جب کوئی جواب نہ پایا تو خاموش ہوگیا اور پھر خود بھی بڑی خاموشی سے اس سے کھانا وصول کرتا اور پھر خود ہی دروازہ بند کردیتا۔ ایک رات اچانک اسے کھانسی کا دورہ پڑا اس نے کھانسی روکنے کی بہت کوشش کی لیکن اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے اس کا ناک اور منہ چٹکی سے پکڑ کر بند کردیا ہو اور اسے سانس لینے میں بہت مشکل پیش آنے لگی کھانس کھانس کر اس کے سینے میں درد شروع ہوچکا تھا۔ اس نے کوشش کرکے بہت دفعہ دروازہ پیٹا لیکن دوسری طرف سے بالکل خاموشی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس بلڈنگ میں اکیلا ہو۔ جب اسے کھانسی کا دورہ پڑتا تو اس کی آنکھیں خون کبوتر ہوجاتی تھیں۔ ایک رات اسے اچانک بہت تیز بخار بھی ہوگیا لیکن اس دوران کوئی بھی اس کی خبر گیری کو نہیں آیا۔

شام کے وقت جب اسے کھانا دینے وہ شخص آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی چمک تھی جیسے کسی کو اس کی من پسند چیز نظر آگئی ہو۔ لیکن اس دوران اسے کھانسی کچھ کم محسوس ہوئی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ اسے کوئی دوا لانے کا کہتا وہ جاچکا تھا۔ اور اس وقت رات کے تقریباً گیارہ بجے تھے کہ اسے ہلکا ہلکا بخار ہونے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اسے بہت تیز بخار ہوگیا اور اسے سردی محسوس ہونے لگی اور اس کے ساتھ ساتھ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے پکڑ کر اسے الیکٹرک چیئر پر بٹھا دیا ہو اور وہ تیزی سے جھٹکے لینے لگا درد کی شدت سے اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں لیکن کوئی بھی اس کی مدد کے لئے کمرے میں نہیں آیا اور چند ہی منٹوں میں اس نے ایک زوردار سانس لیا اور دوسرے لمحے اس کی جان قفس عنصری سے پرواز کرگئی اور دوسرے لمحے رات کے وقت دوسری جانب موجود چند افراد نے خوشی کا ایک نعرہ لگایا اور کمرہ تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ ان کا تجربہ کامیاب ہوچکا تھا اور اب پوری دنیا پر حکمرانی کا خواب پورا ہونے جارہا تھا اس نئی ایجاد کی بناء پر انہیں ان ممالک پر بھی فوقیت حاصل ہونے جارہی تھی جو اس کی طرح ایک ایٹمی طاقت تھے لیکن اس ایجاد کی بدولت وہ اس کے غلاموں کی لسٹ میں شامل ہونے جارہے تھے۔

❖❖❖❖

آج اسی کامیاب اور بھیانک تجربہ کو لئے یہ عورت زنگ چاؤ اور وہ ادھیڑ عمر شخص وانگ فینگ چائنہ کے لئے روانہ ہوچکے تھے اور اس وقت کار میں بیٹھے وہ ہان کی جانب بڑھ رہے تھے۔ گاڑی میں گھمبیر خاموشی طاری تھی اور اس کی اسپیڈ سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہوا میں اڑتی جارہی ہو۔ چونکہ رات کے اس پہر اور سنسان ہونے کی وجہ سے ٹریفک سارجنٹ وغیرہ بھی ندارد تھے اس لئے کسی نے بھی اسے غیر معمولی اسپیڈ کے ساتھ سفر کرتے نوٹس نہیں کیا۔ جب وہ لیبارٹری کے نزدیک پہنچے تو اس وقت رات کے پونے دو بج چکے تھے چونکہ انہوں نے وہاں کے عملے کو پیشگی اطلاع دے دی تھی اس لئے انہیں خوش آمدید کہنے کے لئے چند افراد پہلے سے موجود تھے۔ ان کی حیثیت ملک کے صدر جیسی ہوگئی تھی یہ ان کے استقبال کے لئے آنے والے بڑے افسران کے رکھ رکھاؤ سے ظاہر ہورہا تھا۔

ان دونوں نے بڑے نخوت بھرے میں انداز میں ان کے سلام کا جواب صرف اپنا سر ہلا کر دینا زیادہ مناسب سمجھا

Nazar Zeeshan
www.pakistanipoint.com

اور اور عورت نے ہاتھ میں پکڑے بریف کیس کو بڑی احتیاط سے لیبارٹری میں داخل ہوکر ایک ہال میں موجود شیشے کی ایک بڑی سی میز پر رکھ دیا ان دونوں کے پیچھے پیچھے وہ چند افراد بھی ہال میں داخل ہوکر ایک جانب کھڑے ہوگئے۔ پھر کچھ دیر تک وہ دونوں انہیں اپنی کامیابی کے متعلق بریفنگ دیتے رہے کہ کس طرح انہوں نے ایک بہت بڑا اور ناقابل یقین کارنامہ سرانجام دے دیا ہے اور یہ بھی کہ اس کا تجربہ اپنی زندہ آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ وہ لوگ پتھر کے بت بنے اور حیرت سے اپنے منہ کھولے ان دونوں کی باتیں سن رہے تھے اور پھر ان کے خاموش ہوتے ہی جیسے غباروں سے ہوا نکلتی ہے ان لوگوں نے اپنے روکے سانسوں کو یک دم باہر نکال دیا، اور پھر اپنے لاشعور کے بیدار ہوتے ہی تمام کہانی ان کی سمجھ میں آتے ہی ان سب نے ایک فلک شگاف نعرہ بلند کیا۔

لیبارٹری کی خاموش فضا میں جیسے ایک بھونچال آگیا ہو ظاہر ہے اپنے تئیں انہوں نے ایک ناقابل یقین حقیقت کو ثابت کرکے دکھا دیا تھا۔ پھر ضروری کارروائی کے بعد انہوں نے خاموشی سے اس ایجاد کو ایک لاکر میں محفوظ کرکے مقفل کردیا اور کچھ دیر آپس میں گفتگو و شنید اور کچھ ہدایات دینے کے بعد وہ دونوں ایک طرف دکھائی دینے والے چھوٹے سے دروازے کی جانب بڑھ گئے۔

❖❖❖❖

راحیل اپنی ڈیوٹی باقاعدگی سے سرانجام دینے میں مشغول تھا کہ ایک روز اسے ایک سائنسی میگزین میں کسی کا لکھا ہوا پیپر پڑھنے کو ملا جس میں مختلف اقسام کے وائرسز پر بڑی جامع تحقیقاتی رپورٹ لکھی گئی تھی جیسے جیسے وہ رپورٹ کا متن پڑھتا گیا ویسے ویسے اسے بھی ایک وائرس فلو وائرس کے متعلق اسپیشلائزیشن کرنے کا شوق پیدا ہونے لگا۔ رپورٹ کے مطابق اس وائرس سے کسی بھی جاندار کی موت واقع ہوسکتی تھی۔ لیکن سب سے حیرت انگیز بات یہ لکھی گئی تھی کہ جو بھی جاندار اس وائرس کا شکار بنے گا اس میں بظاہر واضح نشانیاں دکھائی نہیں دیتی تھیں لیکن دو تین ہفتوں میں ہی مریض دم توڑ دیتا تھا۔

بڑا ہی خوفناک قسم کا وائرس تھا۔ مزید یہ بھی لکھا گیا تھا کہ اس وائرس کا ابھی تک کوئی توڑ تیار نہیں کیا جاسکا تھا اور نہ ہی ابھی تک کسی بھی سائنسدان نے کوئی ایسا تریاق تیار نہیں کیا تھا جو ایسے وائرس کے زہر کا اثر کم کرسکے۔ یہ بات پڑھ کر راحیل کسی سوچ میں گم ہوگیا اور پھر اچانک ایک خیال بجلی کے کوندے کی مانند اس کے دماغ میں لپکا کہ کیوں نہ وہ اس خوفناک اور بھیانک اہمیت کے حامل وائرس کا کوئی اینٹی تیار کرکے رہتی دنیا کے لئے کوئی کام کرسکے۔ لیکن جس ڈاکٹر کی لکھی گئی رپورٹ وہ پڑھ چکا تھا وہ بھی ایک نامور ڈاکٹر تھا جس نے دعویٰ کیا تھا کہ ابھی تک کوئی بھی اس وائرس کے اثر کو ختم کرنے والی دوا تیار نہیں کرپایا تھا۔ لیکن اس کے باوجود راحیل کو اپنے اللہ پر پورا یقین تھا۔ پھر اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ ضرور اس کے لئے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس موذی وائرس کے توڑ کے لئے کوئی دوا تیار کرلے گا۔ یہ سوچ کر اس نے اطمینان کی گہری سانس لی اور میگزین ایک جانب رکھ کر لائٹ بند کی اور کچھ دیر بعد کمرے میں اس کے خراٹے گونج رہے تھے۔

❖❖❖❖

راحیل نے یہ فیصلہ اپنے امی ابو کو بھی فون کرکے بتادیا پہلے انہوں نے صاف انکار کردیا کہ اب ہاؤس جاب مکمل کرتے ہی وہ واپس اپنے گھر لوٹے لیکن راحیل نے جب انہیں تمام حقیقت سے آگاہ کیا تو کسی قدر مان گئے۔ راحیل کو اجازت ملتے ہی اس نے تمام معلومات اکٹھی کرکے ایک نامور سائنسدان سے رابطہ کیا اور اسے اپنے کام کے متعلق بتایا۔ تھوڑی سی گفتگو اور باہم معلومات کا تبادلہ کرنے کے بعد بالآخر اسے ایک گائیڈ لائن مل گئی اس نے اس سائنسدان کی تمام باتیں بڑے غور سے سنیں اور اس سے اجازت ملنے کے بعد اس پر اپنے کام کا آغاز کردیا۔ وہ ڈیوٹی سے واپس آکر اپنے پروجیکٹ پر کام شروع کردیتا اور رات کے تقریباً دو ڈھائی بجے تک مسلسل کام کرتا رہتا۔ اب چونکہ اس نے ایک علیحدہ فلیٹ لے لیا تھا اس لئے بغیر کسی روکاوٹ کے اسے کام کرتے دیکھ کر کسی کے آنے کا تصور ہی نہیں تھا۔ صرف ایک نوکر تھا جو اس کے لئے کھانا وغیرہ پکادیتا اور گھر کی صفائی وغیرہ کردیتا تھا۔

مسلسل نو ماہ گھر میں بنائی گئی چھوٹی سی تجربہ گاہ میں اسے کام کرتے ہوگئے تھے۔ وہ ستر فیصد اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تھا اور اس دوران اسے اس سائنسدان کی

Waqar Azeem Pakistanipoint www.pakistanipoint.com

مکمل راہنمائی ملتی رہی تھی۔اس عرصے میں وہ اس کی قابلیت اور اخلاق سے بہت متاثر ہوا تھا اس لئے اس نے بھی راحیل کی ہر ممکن مدد کی تھی اور کوئی بھی اپنی پیشہ ورانہ بات اس سے نہیں چھپائی تھی۔اب تک کے کام کے مطابق راحیل اپنی ایجاد کردہ دوا سے فلو وائرس سے متاثرہ مریض کی زندگی تو نہیں بچا سکتا تھا لیکن اس کے اثرات کو کسی قدر کم کرنے میں مدد ضرور دے سکتا تھا۔اس کے مطابق ایسے مریض پر استعمال کرنے پر اگر مریض دو ہفتوں میں سسک سسک کر مر جاتا تھا تو اس دوا کے استعمال سے ایک تو اسے تکلیف میں کچھ کمی محسوس ہوتی تھی اور دوسرے اس کی قوت مدافعت کو بہت تقویت ملتی تھی۔

لیکن راحیل ابھی مایوس نہیں ہوا تھا وہ چاہتا تھا کہ اس کی ایجاد کردہ دوا سے متاثرہ مریض مکمل صحت یاب ہوں تا کہ وہ دوبارہ اپنی نارمل زندگی گزار سکیں۔وہ ایک عام مقولہ ہے کہ ہمت مرداں مدد خدا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کبھی کسی کی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دیتا۔راحیل کی دن رات کی محنت اور اپنے کام سے لگن کو دیکھتے ہوئے ہسپتال میں اسے ایک بہت بڑے عہدے سے نواز دیا گیا اور اب راحیل کو اپنے فلو وائرس والے پروجیکٹ پر کام کرنے کے لئے ایک وسیع پلیٹ فارم مل گیا، معاشی طور پر بھی اسے کافی سپورٹ مل گئی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی سیٹ پر رہتے ہوئے اس نے مزید سائنسدانوں سے روابط تیز کر دیئے۔

جیسے جیسے وہ اپنے وائرس والے موضوع پر گفتگو شنید کرتا ویسے ویسے اس کا جوش بڑھتا جاتا کیونکہ باہم گفتگو کرنے اور معلومات شیئر کرنے کی وجہ سے اسے مزید راہنمائی ملنے لگی۔ایک روز لیبارٹری میں کام کرتے ہوئے اسے تقریباً چار گھنٹوں سے زائد گزر چکے تھے اور اس دوران اس نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے بہت بڑی خوش خبری یا کامیابی ملنے والی ہے۔اس کے مطابق اس کا پروجیکٹ پچاسی فیصد کامیابی کے زینے پر پہنچ گیا تھا اور اب صرف پندرہ فیصد اس کی منزل دور تھی۔اس بات کو لے کر اس کی بھوک پیاس سب اڑ چکی تھی۔رات کے تقریباً دو بج چکے تھے چونکہ صبح اس کا آف تھا اس لئے بھی آج اس نے کافی وقت لیبارٹری میں ہی گزارا تھا۔کچھ دیر بعد اسے تھکاوٹ محسوس ہونے لگی تھی جو اس کے چہرے سے صاف عیاں تھی۔اس نے گھڑی پر وقت دیکھا تو ڈھائی بج چکے تھے اس نے باقی کام کل کے لئے چھوڑا اور تمام بکھرا سامان سمیٹ کر ترتیب سے رکھا اور لیبارٹری سے نکل کر اسے تالا لگایا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔لیبارٹری چونکہ اس نے گھر میں ہی بنا رکھی تھی اس لئے اسے گھر پہنچنے کی بھی فکر نہیں تھی۔

❖❖❖❖

زنگ چاؤ اور وانگ فینگ بڑے نخوت بھرے انداز میں ایک بڑی سی کانفرنس میز کے سامنے بیٹھے تھے ان دونوں کے بیٹھنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کسی بہت بڑی سلطنت کے ولی عہد ہوں۔میز کے اردگرد تقریباً بارہ افراد اور بھی بیٹھے تھے جنہوں نے کالے رنگ کے سوٹ زیب تن کیئے ہوئے تھے اور سب نے سیاہ سوٹوں پر بلیو ٹائی لگائی ہوئی تھی۔ان سب کے چہروں پر ایسے منحوست چھائی ہوئی تھی جیسے وہ ابھی ابھی کسی کو دفنا کر آئے ہوں۔کمرے میں خاموشی تھی حتیٰ کہ ہلکی سی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ابھی انہیں بیٹھے دس منٹ ہی گزرے تھے کہ دائیں جانب کا دروازہ خودکار طریقے سے کھلا اور ایک انتہائی مسخرے چہرے کا شخص اندر داخل ہوا جس نے بڑا مضحکہ خیز قسم کا لباس پہنا ہوا تھا۔اس کے جسم پر زرد رنگ کا سوٹ تھا جس پر کالے رنگ کی ٹائی لگی ہوئی تھی اور اس کے جوتوں کا رنگ سرخ تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں ایک سفید رومال تھا۔سر پر پائیڈ پائپر کی طرح کی ٹوپی تھی سمجھ سے باہر تھا کہ اتنی سنجیدہ قسم کی میٹنگ میں یہ جوکر کیسے آ گیا؟۔لیکن اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر ان سب کے چہرے یوں ہو گئے جیسے سب کی ماں مر گئی ہو۔وہ سب یوں مؤدب ہو کر بیٹھ گئے جیسے کلاس میں استاد کو آتا دیکھ کر تمام بچے بیٹھ جاتے ہیں۔صدارت کی کرسی پر بیٹھتے ہی اس جوکر نے سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور پھر اس کی گھومتی ہوئی نظریں زنگ چاؤ اور وانگ فینگ دونوں پر آ کر ٹک گئیں۔انہیں دیکھتے ہی جیسے اس کے مسخرے چہرے پر ایک انتہائی پروقار قسم کی مسکراہٹ آ گئی اس نے ان دونوں کو دیکھ کر اپنا سر ہلایا اور مخاطب ہوا۔

”ہیلو ڈیجورس آپ کو اس ایمرجینسی میٹنگ میں خوش آمدید کہتا ہے اور یہ کارنامہ جو آپ لوگوں نے سرانجام دیا ہے اس کی قدر کرتے ہوئے آپ دونوں کے جو چھ ملین

Waqar Azeem Pakistanipoint www.pakistanipoint.com

روپے اپروو ہوئے ہیں وہ ٹوکن منی کے طور پر آپ دونوں کے بنک اکاؤنٹس میں منتقل کرنے کے احکامات جاری کردیئے گئے ہیں۔ بہت جلد یہ رقم آپ دونوں کے اکاؤنٹس میں ڈیپازٹ ہوجائے گی"۔

جس طرح اس نے یہ تمام گفتگو کی اس سے ایک فیصد بھی نہیں لگتا تھا کہ یہ شخص جو چہرے مہرے یا لباس سے ایک جوکر لگ رہا تھا اس طرح کی سنجیدہ گفتگو بھی کرسکتا ہے۔ اس کی بات ختم ہوتے ہی ان دونوں کے چہرے خوشی سے تمتمانے لگے اور انہوں نے بھی جواب میں ڈیجورس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کردیا۔ اس کے ساتھ ہی دیگر لوگوں کے مرے ہوئے چہروں کی وجہ سمجھ آگئی کیونکہ ہر میٹنگ کی طرح اس میٹنگ میں یہ بات آشکار ہوگئی تھی کہ ان دونوں کو ایک بہت بڑی رقم سے نوازا جائے گا اسی لئے ان سب کے چہروں پر جلن اور حسد کے آثار چھائے ہوئے تھے۔ لیکن ہر ایسے موقعہ پر ان لوگوں نے بھی منافقت کے ساتھ ان دونوں کو ان کی کامیابی اور انعام کے لئے مبارکباد دے دی۔ پھر اسی طرح کی مختصر گفتگو کرنے کے بعد وہ لوگ اپنے اصل مقصد پر آگئے اور اس موقعہ پر وہ سب آپس میں سر جوڑ کر بیٹھے جو پلاننگ کرنے لگے اسے اگر شیطان بھی سن لیتا تو شاید ایک لمحے کے لئے خوف سے جھرجھری لے لیتا۔ لیکن وہ لوگ تو اس طرح اس بھیانک منصوبے پر بات چیت کررہے تھے جیسے یہ سب ان کا روز کا معمول ہو۔ ان کے منصوبے کے مطابق وہ چائنہ کے ایک شہر ووہان میں ایک ایسا وائرس پھیلانا چاہتے تھے جس کی وجہ سے وہ بغیر ہتھیار کے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے۔ اس سے چونکہ یہ اموات ایک بیماری کی وجہ سے واقع ہوتیں اس لئے کوئی کسی پر شک بھی نہیں کرسکتا تھا۔ جو وائرس زنگ چاؤ اور وانگ فینگ اپنے ساتھ لائے تھے وہ اس کو اس شہر میں پھیلا دینا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے وقت اور دن مقرر کیا اور پھر کچھ دیر تک اپنے بھیانک منصوبے کو عملی جامع پہنانے کے لئے وہیں موجود دیگر افراد کو کام کا طریقہ کار سمجھایا اور میٹنگ برخواست کرکے وہی مسخرہ شخص دوبارہ اپنے چہرے پر ازلی حماقت سجائے جس دروازے سے آیا تھا واپس اسی میں داخل ہوگیا۔

❖❖❖❖

راحیل کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا آج کی رات اس کی زندگی کی سب سے اہم رات تھی سر شام ہی وہ کھانا وغیرہ کھا کر اپنی لیبارٹری میں آگیا تھا اور گھر کے ملازم کو سختی سے منع کردیا تھا کہ کسی قسم کا فون یا ملنے جلنے والے کو اس کی غیر موجودگی کا ہی بتائے اور اسے بالکل بھی مداخلت پسند نہ ہوگی۔ یہ ہدایات دے کر وہ شام سے ہی لیبارٹری میں گیا اپنے پروجیکٹ کو فائنل شکل دینے میں لگا ہوا تھا۔ رات دھیرے دھیرے اپنی منزل کی جانب گامزن تھی۔ رات کا سناٹا ہونے کی وجہ سے بہت خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ رات کے تقریباً گیارہ بج چکے تھے اسے مسلسل کام کرتے ہوئے چار گھنٹے گزر چکے تھے۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا ویسے ویسے اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہوتا جارہا تھا۔ پھر یک دم وہ لیبارٹری میں باقاعدہ ناچنے لگا اسے یقین ہی نہیں ہورہا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تھا اس نے اپنے پروجیکٹ کو بالآخر مکمل کرلیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے بھی اسے کامیابی سے ہمکنار کردیا تھا۔ وہ ایک ایسی دوا ایجاد کرچکا تھا جس سے کسی بھی قسم کا وائرس کسی جاندار کی جان نہیں لے سکے گا۔ اس کا تجربہ وہ اپنی لیبارٹری میں موجود ایک چھوٹے سے جانور پر جسے وہ ایک وائرس سے متاثر کرچکا تھا اس پر آزمانا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لئے آج اسی جانور کو بڑے آرام سے بیٹھا دیکھ کر اسے بہت اطمینان ہوچکا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے روزانہ کے تجربہ کو اسی پر ہی آزما کر دیکھتا رہا تھا۔

آج اس کو اس دوا کی ڈوز دیئے پندرہ دن ہوچکے تھے اور اس دوران وہ اس کی حرکات بہت غور سے دیکھتا رہا تھا جس میں اسے دن بہ دن بہتری ہی دکھائی دے رہی تھی لیکن وہ اپنی ایجاد کردہ دوا کا نتیجہ دیکھنے کے لئے آخری حد تک جانا چاہتا تھا اور آج جب اس نے دیکھا کہ وہ جانور بالکل چنگا بھلا دکھائی دے رہا تھا اور پنجرے میں بڑی پھرتی سے ادھر ادھر بھاگتا پھر رہا تھا اسے یقین ہوگیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ایجاد کردہ دوا کو کامیابی سے ہمکنار کردیا تھا۔ وہ لیبارٹری میں ہی جائے نماز بچھا کر سجدہ ریز ہوگیا اور خوشی کے آنسوؤں سے اپنے رب کا شکر بجالانے لگا۔ اس نے اپنی اس دوا کو ابھی خفیہ ہی رکھنا بہتر سمجھا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب کسی ملک میں کوئی اچھا اور انسانیت کے لئے فائدہ مند کام شروع کیا جاتا ہے تو اس کے موجد کو دنیا کی نظروں

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

سے غائب کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ طاغوتی اور دجالی قوتیں سب انسان دشمن ہیں وہ بھلا انسانیت کا بھلا کیوں چاہیں گی؟ اس لئے راحیل کو بھی اس بات کی فکر تھی کہ کہیں اس کی ایجاد کردہ دوا کو دیکھ کر کوئی اسے نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔ اسی لئے اس نے اپنی اس کامیابی کو اپنے گھر کے ملازم حتیٰ کہ پاکستان میں موجود اپنے والدین کو بھی فون پر بتانے سے گریز کیا ایسا وہ صرف حفظ ماتقدم کے طور پر کر رہا تھا۔ کافی دیر تک مصلے پر بیٹھے رہنے کے بعد اس نے تمام سامان سمیٹا اور لیبارٹری کو تالا لگا کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

❖❖❖❖

زنگ چاؤ اور وانگ فینگ کا ایجاد کردہ وائرس ووہان شہر میں ایک مذموم طریقے سے پھیلا دیا گیا تھا اس کے لئے انہوں نے اس شہر میں گھوم پھر کر ایسے گھر تلاش کئے تھے جن میں موجود بزرگوں سے ان کے اپنے تنگ اور بیزار تھے اس کے لئے انہوں نے ان کے گھر کے افراد کو بڑی بڑی رقمیں دے کر ان بزرگوں پر وہ وائرس چھوڑ دیا تھا۔ اس وائرس کا خاصہ یہ تھا کہ اس کا اثر ڈینگی کی طرح آہستہ آہستہ جسمانی طور پر ختم کرتا تھا۔ اور اس کا مکمل اثر پندرہ روز کے بعد نمودار ہونا شروع ہو جاتا تھا۔ ان بزرگوں کو ہمدردی دکھا کر ان کے گھر والوں سے ایک ایسی جگہ رکھا گیا تھا جہاں انہیں کھانے پینے اور آزادانہ زندگی گزارنے کا جھانسہ دیکر لایا گیا تھا۔

تمام بزرگ چونکہ خود اپنے گھر والوں سے تنگ تھے اس لئے بڑی خوشی سے ان لوگوں کے ساتھ ان کے بنائے ہوئے فارم ہاؤسز میں آ کر رہنے لگے تھے۔ ان سب کو ایک ہی وقت میں اس وائرس کا شکار بنایا گیا تھا وہ یہ بھی دیکھنا چاہتے تھے کہ کتنی عمر والے بزرگ پر کتنی دیر میں اس وائرس کا اثر ہوتا ہے۔ ان سب کو ان کی تفریح کے لئے ہر قسم کا سامان دیا گیا تھا اور وہ سب وہاں موج مستی میں موجود تھے۔ لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ ایک انتہائی دردناک قسم کا عذاب اور خونی عفریت ان کی گھات لگائے بیٹھا ہے۔ ان کی حرکات وسکنات کو روزانہ کی بنیاد پر جانچا جا رہا تھا اور اب ان میں سے کچھ بزرگ جو قدرے زیادہ عمر کے تھے ان پر نقاہت اور سستی طاری ہوتی دکھائی دینے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ جب انہیں کھانسی کا دورہ پڑتا تو چاروں طرف ان کے کھانسنے کی آوازوں کی گونج سنائی دیتیں لیکن ان کے علاج وغیرہ کے لئے کوئی بھی ان کی مدد کو نہ پہنچتا۔

وہ تکلیف سے چیختے رہتے تھے لیکن ان کی پکار کسی کو سنائی نہ دیتی بلکہ اب تو ایک کمرے میں خاموشی سے کھانا لگا کر ایک اسپیکر کے ذریعے انہیں کھانا کھانے کے لئے کہا جاتا تھا اور کوئی بھی ان کے سامنے نہیں آتا تھا۔ بارہویں دن ان بزرگوں میں سے دو اچانک یوں زمین پر گر کر تڑپنے لگے جیسے کسی نے مچھلی کو پانی میں سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا ہو۔ ان کے دیگر ساتھیوں نے انہیں سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کا جسم ان کے قابو میں نہیں آ رہا تھا چند ایک نے چیخ چیخ کر کسی کو بلانے کی کوشش کی لیکن یوں لگتا تھا جیسے وہاں ان کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔ ہر طرف ایک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان سب کی نظروں کے سامنے وہ تڑپتے ہوئے بزرگ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

وہ سب ہکا بکا ان کی لاشوں کو دیکھتے رہ گئے۔ جو دس بارہ روز پہلے ان کے ساتھ تھے اب لاشوں کی ڈھیر کی صورت میں ان کے سامنے پڑے تھے۔ سب سے حیرت ناک بات تو یہ تھی کہ ان کی لاشوں کو اٹھانے تک کے لئے کوئی نہیں آیا بس کھانے کی اطلاع انہیں اسپیکر پر مل جاتی تھی اور پھر ایک گھمبیر خاموشی چھا جاتی۔ لاشوں کے گلنے سڑنے سے بہت تعفن پھیل چکا تھا وہ سب ایک اور کمرے میں داخل ہو گئے اور دروازہ اچھی طرح بند کر دینے کے باوجود لاشوں کی بدبو اور سڑاند سے ان کی حالت بھی غیر ہونے لگی اور پھر ایک دو روز میں ان میں سے صرف دو افراد کچھ بہتری محسوس کر رہے تھے لیکن زیادہ تر اسی حالت کو پہنچ چکے تھے۔ بڑی عجیب اور پریشان کن صورتحال پیدا ہو چکی تھی۔ باقی بچ جانے والے دونوں افراد کو بھی اپنے سانس اکھڑتے محسوس ہونے لگے لیکن ان کی چیخ و پکار کو سننے والا وہاں کوئی نہ تھا۔ تھک ہار کر انہوں نے چپ سادھ لی اور اپنی موت کا انتظار کرنے لگے۔ انہیں محسوس ہو چکا تھا کہ کسی نے جان بوجھ کر انہیں اس مصیبت کا شکار بنایا ہے لیکن اس کے پیچھے ان کا کیا مقصد ہے یا تھا؟ اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ رات ہوتے ہی اسی طرح انہیں اسپیکر پر کھانا کھانے کے لئے ہال میں موجود ٹیبل کا کہا گیا جہاں ان کے

www.pakistanipoint.com
Magazine Section

لئے کھانا رکھا جا چکا تھا۔

مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق وہ دونوں تقریباً پاؤں گھسیٹنے کے انداز میں کھانے والے کمرے کی جانب بڑھتے چلے گئے۔ ظاہر ہے جب تک جسم میں جان باقی ہے کھانا کھانے کے لئے انہیں اپنے پیٹ کی آگ تو لازمی طور پر بجھانا تھی کمرے میں داخل ہوتے ہی ان دونوں کی حیرت سے آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ کیونکہ سامنے ٹیبل پر صرف دو افراد کے لئے کھانا چنا گیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ان تمام یعنی پندرہ افراد میں سے صرف وہ دو ہی بچے تھے اور اس سے صاف ظاہر تھا کہ انہیں کھانا پہچانے والے ان کے دیگر ساتھیوں کی اموات کے متعلق بخوبی جانتے تھے اور جان بوجھ کر ان کی لاشیں اٹھانے نہیں آئے تھے۔ اب تو انہیں پورا یقین ہو گیا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی خوفناک کھیل گیا ہے۔ وہ اب اس وقت کو پچھتا رہے تھے کہ جب یہ لوگ انہیں ان کے بچوں کے گھروں سے اپنے ساتھ لائے تھے اس سے تو اچھا یہی تھا کہ وہ وہیں رہتے کم از کم اس اذیت ناک موت سے تو بچ جاتے۔ لیکن اب کیا ہوت جب چڑیا ں چگ گئیں کھیت۔

اب تو جیسے تیسے انہیں ان حالات کا مقابلہ کرنا ہی تھا لیکن یہ ان دونوں کی خام خیالی تھی کیونکہ موت کا فرشتہ ان کی تاک میں تھا اور کسی بھی روز وہ دونوں بھی عنقریب اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح لاشوں میں تبدیل ہو کر اسی کمرے میں پہلے سے پھیلے ہوئے تعفن میں اضافے کا سبب بنتے۔

یہ سوچ کر انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی کسی نہ کسی طرح کھانا کھا کر اپنے پیٹ کی آگ بجھائی۔ اور اسی طرح قدم گھسیٹتے ہوئے اپنے اس کمرے کی جانب بڑھنے لگے جہاں ان کے سونے کے لئے بستر موجود تھے۔

❖❖❖❖

دوسری صبح کا سورج ان دونوں بزرگوں کے لئے ایک خوشی کی نوید لے کر ابھرا۔ کیونکہ جب ان دونوں کی آنکھ کھلی تو انہوں نے دیکھا کہ وہ ایک ایسے کمرے میں موجود تھے جس کے سامنے والا دروازہ کھلا ہوا تھا اور باہر لان کا منظر صاف نظر آ رہا تھا وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے جب لان میں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ باہر کے بڑے گیٹ میں موجود چھوٹا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا انہوں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں تو وہاں کوئی موجود نہ تھا انہوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور جیسے کوئی فیصلہ کرتے ہوئے آہستہ آہستہ محتاط انداز میں قدم اٹھاتے اس کھلے ہوئے چھوٹے دروازے کی جانب بڑھنے لگے۔ جلد ہی وہ اس کے نزدیک پہنچ کر رکے اور پھر اپنا سر باہر نکال کر دیکھا تو باہر کسی کو موجود نہ پا کر باہر نکل گئے۔ باہر خاموشی چھائی ہوئی تھی کوئی گاڑی یا شخص دکھائی نہ دے رہا تھا۔

سڑک کے دونوں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا انہوں نے اندازے سے ایک جانب بڑھنا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ اس گیٹ سے دور ہونے لگے تقریباً بیس پچیس منٹ تک مسلسل چلنے کے بعد انہیں تھکن محسوس ہونے لگی وہ تھک کر ایک سائیڈ پر بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ آخر انہیں چھوڑ کیسے دیا گیا۔ لیکن انہیں اس بات کی بہت خوشی تھی کہ وہ اس موت گھر سے بچ نکلے تھے اور اب وہ یہی بات سوچ رہے تھے کہ اب انہیں واپس گھروں کو جانا چاہیے یا کہیں اور ابھی انہیں وہاں بیٹھے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ دور سے ایک گاڑی آتی دکھائی دی قریب آنے پر دیکھا کہ وہ ایک کار تھی جسے ایک نوجوان عورت چلا رہی تھی۔ اس عورت نے قریب آتے ہی ان کے نزدیک کار روک دی اور ان سے کچھ پوچھنے لگی جواب میں انہوں نے مختصر سا بتایا کہ وہ اپنے گھر کا پتہ بھول گئے ہیں اور کچھ یاد نہیں آ رہا ہے کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس عورت نے انہیں کار میں بیٹھنے کے لئے کہا اور پھر انہیں ایک بارونق علاقے میں موجود ایک فلاحی ادارے کی بلڈنگ کے سامنے اتار کر چلی گئی۔ وہ دونوں اس کا شکریہ ادا کر کے سامنے موجود ایک دوکان میں داخل ہو گئے جہاں بتانے پر انہیں اس فلاحی ادارے کے دفتر پہنچا دیا گیا۔ اس تمام عرصے میں ان دونوں کی طبیعت میں یہ تبدیلی آ چکی تھی کہ وہ وقفے وقفے سے کھانسنے لگے تھے اور ان کا سانس بھی ٹھیک طور پر نہیں آ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر دفتر کے اسٹاف نے انہیں ایک طرف رکھے صوفہ پر بٹھا دیا اور انہیں پانی وغیرہ پلایا اور ان کے لئے کھانا وغیرہ منگوا کر دیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر ان سے تفصیلات پوچھی گئیں جو انہوں نے مختصر بتائیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ان کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ یہ سن کر انہیں ایک اولڈ ہاؤس میں

www.pakistanipoint.com

پہنچا دیا گیا۔ وقت گزرتا چلا گیا اور پھر فلاحی ادارے کے چند افراد کی حالت بھی غیر ہونے لگی انہیں بھی کھانسی اور سانس کی تکلیف ہونے لگی ان کے دیکھتے ہی دیکھتے چند دنوں میں تقریباً پورا آفس سٹاف اس مرض کا شکار ہوگیا۔ میڈیکل رپورٹس کے مطابق یہ ایک انتہائی خطرناک وائرس تھا جسے "کرونا" کا نام دیا گیا تھا اور یہ کہ اس کا اینٹی ابھی تک دستیاب نہیں تھا۔ ہسپتال میں اس کا علاج کرنے کی بھرپور کوششیں کی گئیں لیکن چند ہی روز میں وہ سب تڑپ تڑپ کر موت کو گلے لگا چکے تھے۔

ہسپتال کی انتظامیہ بہت حیران اور پریشان تھی کہ آخر یہ کیسا وائرس ہے جس کی ابھی تک کوئی دوا نہیں بنائی جاسکی تھی۔ انہوں نے اپنے طور پر بہت سے ملکوں کے بڑے بڑے ڈاکٹروں سے بھی آن لائن روابط کئے لیکن کہیں سے بھی کوئی مثبت جواب موصول نہ ہوسکا۔ تھک ہار کر وہ کسی معجزے کا انتظار کرنے لگے۔ سب سے حیرت ناک اور پریشان کن یہ بات تھی کہ آفس سٹاف کے تمام خاندان کے افراد بھی اس موذی مرض کا شکار بن چکے تھے اور وقفے وقفے سے وہ سب موت کا شکار بنتے جارہے تھے۔ لیکن میڈیکل سائنس بے بسی سے انہیں مرتا دیکھتی رہی۔

❖❖❖❖

کل کا سورج راحیل کے لئے ایک بہت بڑی خبر لیکر طلوع ہوا۔ صبح کی اخبار میں شہہ سرخی کے ساتھ یہ خبر چھپی تھی کہ شہر وہان میں بہت سے خاندان ایک بہت ہی خطرناک وائرس کا شکار ہوکر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور یہ کہ اس وائرس کا ابھی تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا ہے۔ ڈاکٹر بہت پریشان ہیں اور کسی معجزے کا انتظار کررہے ہیں۔ لیکن اس ساری خبر میں یہ بات بہت اہم تھی کہ تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ یہ وائرس کھانسنے اور نزلہ کی کیفیت سے پھیلتا ہے اور اس کے لئے اس بیماری سے متاثرہ شخص کے سامنے جاتے وقت چہرے پر ماسک کا استعمال لازمی کرنے سے کسی قدر اس کے اثرات سے بچا جاسکتا ہے۔

خبر بہت بڑی تھی اور اس کے پیشے سے تعلق رکھتی تھی اس لئے اس نے اس کا کھوج لگانے کا فیصلہ کیا اور جلدی جلدی ناشتہ کرکے اور تیار ہوکر ہسپتال کی جانب بڑھ گیا۔ ہسپتال پہنچ کر اس نے اخبار میں دیئے گئے پتا پر معلوم کرکے ان کے بچ جانے والے افراد سے ملنے کا فیصلہ کیا تھا اور پھر دو تین گھنٹوں بعد وہ اس خاندان کے بچ جانے والے ایک دو افراد کے سامنے اپنے چہرے پر ماسک لگائے موجود تھا۔ پھر ان سے مرنے والے افراد کے متعلق کچھ تفصیلات پوچھیں اور انہیں کل صبح اپنے ہسپتال پہنچنے کے لئے کہا اس نے اپنے خدشے کے پیش نظر انہیں آگاہ کرتے ہوئے بتادیا تھا کہ وہ ان دونوں کا ٹیسٹ کرنا چاہتا ہے جس پر وہ دونوں آمادہ ہوگئے تھے اور اس سے وعدہ کیا وہ کل صبح دس بجے تک اس کے ہسپتال پہنچ جائیں گے۔ راحیل کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد ان سے اجازت لیکر اپنے گھر واپس لوٹ گیا۔ وہ اس نقطے پر سوچ رہا تھا کہ قدرت نے اس کے ایجاد کئے ہوئے اینٹی وائرس کو اس وقت ایک نئے تجربے سے روشناس کروانے کا ایک موقع فراہم کردیا ہے۔

چونکہ اس وقت اس موذی وائرس کا کوئی علاج موجود نہیں ہے اور یہ کہ اگر یہ دونوں افراد اس وائرس سے متاثرہ ہوئے تو وہ ان کا علاج کرکے وائرس کے توڑ کو آزما کر اس دنیا میں ایک تہلکہ مچا سکتا تھا۔

❖❖❖❖

وہان شہر میں پریشانی کی لہر دوڑ گئی تھی ہر گھر میں ایک آدھ مریض اسی موذی وائرس کا شکار بن چکا تھا۔ زیادہ تر افراد ان میں وہ تھے جو پچاس سال سے زیادہ عمر کے لگ بھگ تھے جن میں عورتیں اور مرد دونوں شامل تھے۔ شہر کے ہسپتالوں میں چیخ و پکار مچ گئی تھی یوں لگتا تھا جیسے شہر کا ہر بڑی عمر کا شخص اس موذی وائرس کا شکار ہوچکا ہے۔ ہسپتالوں میں افراتفری پھیل گئی تھی ڈاکٹر اور نرسیں ادھر ادھر بھاگ پھر رہی تھیں۔ لوگوں نے اپنے چہروں پر ماسک چڑھا لئے تھے۔

پورے شہر میں ہر شخص اپنے چہرے کو ڈھانپے بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے بھی حفاظت کے طور پر اپنے چہروں کو ماسک سے ڈھانپ رکھا تھا۔ مریضوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ ایک ایک بیڈ پر دو دو مریض لٹائے ہوئے تھے۔ بیڈ کم پڑ گئے تھے غرض پورے شہر میں ایک ہنگامی صورتحال پیدا ہوچکی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس سے پہلے مرنے والے اس وائرس سے متاثرہ لوگوں کی وجہ سے یہ وائرس شہر بھر میں پھیل گیا تھا اور دوسرے لوگوں کو بھی یہ مرض لگ چکا تھا۔

www.pakistanipoint.com
Qaiser Azeem

جب تک لوگ اپنی حفاظت کے لئے کوئی تدبیر کرتے یہ وائرس ان پر حملہ کر چکا تھا۔ اور چونکہ اس کی ابھی تک کوئی دوا ایجاد نہیں ہوئی تھی اس لئے ڈاکٹر صرف اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے ادھر ادھر بھاگ دوڑ میں مصروف تھے ورنہ وہ بے بسی سے اپنے ہونٹ بھینچے ایک دوسرے کو بیچارگی سے دیکھتے رہتے تھے اور لوگ مکھیوں کی طرح تڑپ تڑپ کر اپنی جان سے ہاتھ دھوتے جا رہے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں یہ وباء اس قدر پھیل گئی کہ ہر گھر کا فرد اس کا بری طرح سے شکار ہونے لگا۔

پرنٹ میڈیا اور ٹی وی چینل والوں نے آسمان سر پر اٹھالیا اور یہ خبر دو ہان سے نکل کر پوری دنیا میں پھیل گئی۔ راحیل کے والدین نے جب ٹی وی پر یہ خبر سنی تو انہوں نے فوراً راحیل کو پاکستان پہنچنے کے لئے کہا۔ لیکن راحیل کے سمجھانے پر کہ وہ بالکل خیریت سے ہے اور یہ کہ وہ ابھی پاکستان واپس نہیں آسکتا کیونکہ ہسپتال میں اس کی ڈیوٹی مزید سخت ہوگئی تھی۔ لیکن اس کی امی نے اسے اپنی قسم دیکر گھر پہنچنے کے لئے زور دیا۔ راحیل اس کے اس اصرار پر کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ اور اس کی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھیں کہ وہ اس مصیبت کی گھڑی میں یہاں سے بھاگ جائے۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے اس بات کا فیصلہ کسی اور دن کے لئے چھوڑا اور اطمینان سے اپنی ڈیوٹی کرنے لگا۔

❖❖❖❖

راحیل کے ہسپتال میں بھی ایمرجینسی نافذ ہو چکی تھی اور دھڑا دھڑ مریض وہاں لائے جانے لگے۔ راحیل کو انتظامیہ کی طرف سے فوراً اطلاع دیکر ہسپتال بلالیا گیا تھا اور اس وقت وہ لیبارٹری میں ایک مریض کے ٹیسٹ کے ساتھ موجود تھا رپورٹس اس کے ہاتھ میں تھیں اور وہ ایک گھمبیر سوچ میں مبتلا تھا۔ اس نے فوری طور پر اپنی اینٹی وائرس دوا کا استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ سوچ کر اس نے لیبارٹری سے نکل کر سیدھا اپنے گھر کا رخ کیا جلد ہی وہ اپنے گھر کی لیبارٹری میں موجود تھا اور ایک بیگ میں اس نے وہ دوا رکھ لی تھی۔ جو نارنجی رنگ کی ٹیوبس میں موجود تھی۔ اس نے احتیاط سے وہ بیگ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھ دیا اور تیزی سے گاڑی بھگاتا ہسپتال پہنچ گیا۔ بیگ اپنے آفس میں رکھ کر اس نے دو تین ٹیوبس نکال کر بیگ بند کیا اور ایک بڑے سے کمرے کی جانب بڑھ گیا جہاں بہت سے مریض شور و غل مچانے میں مصروف تھے ہر کوئی تکلیف سے بری طرح تڑپ رہا تھا۔

راحیل کے لئے یہ فیصلہ بہت مشکل ہو گیا تھا کہ وہ پہلے کس پر اس دوا کا استعمال کرے۔ کیونکہ سب کے سب تکلیف میں مبتلا تھے پھر اس نے کمرے میں ایک طائرانہ نظر ڈالی اور ایک ایسے بیڈ کی طرف بڑھ گیا جس پر ایک ادھیڑ عمر کا شخص لیٹا زور زور سے کھانسنے میں مصروف تھا اور اس کے نزدیک ایک چھوٹا بچہ جس کی عمر تقریباً دس پندرہ سال کے قریب ہوگی موجود تھا۔ شاید ہسپتال کی انتظامیہ نے اسے بھی ماسک فراہم کر دیا تھا اسی لئے اس کے چہرے پر ماسک موجود تھا یہ دیکھ کر راحیل نے اطمینان کا ایک سانس لیا اور اس بوڑھے کے نزدیک پہنچ کر ایک انجکشن اسے لگا دیا۔

اس کے لئے راحیل کو بڑی مشکل سے اسے انجکشن لگانا پڑا کیونکہ وہ شخص مسلسل کھانس رہا تھا اور اس حالت میں انجکشن لگانا بہت مشکل تھا، اسے انجکشن لگا کر راحیل دوسرے بیڈ کی جانب بڑھ گیا اسی طرح اس نے ایک ہی وقت میں تقریباً سات افراد کو انجکشن لگا دیئے۔ اب وہ دوسرے روز ان کے دوبارہ ٹیسٹ کروا کر دیکھنا چاہ رہا تھا کہ اس کے لگائے ہوئے انجکشن کا کیا اثر ہوا ہے۔ اپنی ڈیوٹی پوری کر کے وہ واپس گھر آ گیا تھا۔ رات کا کھانا کھا کر اور لیبارٹری میں موجود دیگر کام نبٹا کر وہ واپس اپنے کمرے میں آ کر اس وقت بیڈ پر موجود تھا۔ پھر ایک کتاب کا مطالعہ کرتے کرتے اسے نیند نے آدبوچا اور وہ لائٹ آف کئے بغیر ہی نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

❖❖❖❖

یہ ایک بہت بڑا صحرا تھا دور دور تک ریت ہی ریت تھی۔ آسمان لگتا تھا حقیقت میں سوا نیزے پر آ گیا تھا۔ ایسے میں راحیل نے خود کو وہاں موجود پایا وہ دور دور تک اپنی پھیلی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن سوائے ٹیلوں کے اسے وہاں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ابھی اسے وہاں کھڑے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ جیسے دور ریت کا ایک طوفان اٹھتا دکھائی دیا یوں لگتا تھا جیسے کسی نے ایک بہت بڑا پنکھا لگا کر ریت اڑا دی ہو۔ پھر اس کے دیکھتے ہی

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

دیکھتے یک دم ریت کے بادل چھٹ گئے اور سامنے بہت سے افراد کھڑے نظر آنے لگے۔

راحیل اپنی آنکھیں مل مل کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا کیونکہ کچھ دیر پہلے وہاں سوائے ریت کے ٹیلوں کے کچھ نہیں تھا اور اب وہاں بہت سے افراد کھڑے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ چونکہ فاصلہ کافی تھا لیکن اس کے باوجود اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ افراد اس سے صرف چند قدموں کے فاصلے پر ہوں۔ یہ دیکھ کر وہ قدم اٹھاتا ان کی جانب بڑھنے لگا جیسے جیسے وہ ان کے نزدیک بڑھتا جا رہا تھا ویسے ویسے وہاں کا منظر واضح ہوتا جا رہا تھا اور پھر ان کے نزدیک پہنچتے ہی راحیل کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ وہ سب وہی مریض تھے جنہیں وہ صبح سے دیکھ رہا تھا اور پھر وہ چیختا ہوا اس بیڈ کی جانب بھاگ اٹھا جہاں اسے اپنی والدہ تڑپتی دکھائی دی اور اس کے قریب اس کا والد بیٹھا تھا جس نے اپنے چہرے پر ایک ماسک لگا رکھا تھا لیکن وہ اپنے والد کی نظریں پہچانتا تھا اس لئے بہت آسانی سے پہچان گیا کہ وہی اس کا والد ہے۔ اس کی والدہ درد کی شدت سے بن پانی کی مچھلی کی مانند تڑپ رہی تھی۔ وہ جیسے ہی اس بیڈ کے نزدیک پہنچا اور زور سے امی پکارا تو یک دم اس کی آنکھ کھل گئی وہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اس کے کپڑے پسینے سے تر ہو چکے تھے اور اس کے جسم پر ایک لرزہ طاری تھا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ بھیانک خواب ہی تھا کوئی حقیقت نہ تھی۔ لیکن اس نے صبح اپنے امی ابو کی خیریت پوچھنے کے لئے اپنے گھر فون کرنے کا ارادہ کیا اور دوبارہ بیڈ پر لیٹ گیا بڑی مشکل سے اسے نیند آئی اور کمرے میں اس کے خراٹے گونجنے لگے۔

❖❖❖❖

ووہان شہر میں قیامت برپا تھی ہر طرف چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ مریضوں کی تعداد اس قدر بڑھ چکی تھی کہ سڑکوں اور بازاروں میں مریض تڑپتے دکھائی دے رہے تھے۔ حقیقت میں ایک قیامت کا سماں تھا جو اس وقت ووہان شہر میں برپا تھا۔ 1945 میں دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپان کے شہر ہیروشیما اور ناگاساکی پر جو ایٹم بم گرائے گئے تھے جس میں لاکھوں معصوم افراد پل بھر میں موت کا شکار بن گئے تھے۔ اس کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔

چاروں طرف لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ شہر میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی۔ وہاں رہنے والے دوسرے ملکوں کے باشندے جیسے تیسے وہاں سے اپنے ملکوں کو لوٹنے لگے۔ حکومت نے ووہان شہر میں کرفیو نافذ کرتے ہوئے تمام علاقہ مکمل لاک ڈاؤن کر دیا۔ جو اس شہر کے اندر تھے انہیں وہیں قید کر دیا گیا۔ اتنی پابندی اور احتیاط کے باوجود وہ موذی وائرس ووہان شہر سے نکل کر دوسرے شہروں اور پھر کچھ دنوں بعد خبر آئی کہ اس کا دائرہ کار ایک مخصوص علاقے سے نکل کر دوسرے ملکوں تک جا پہنچا ہے۔

میڈیا کے مطابق جو باشندے فلائٹس سے اپنے ملکوں کو لوٹ گئے تھے ان کی وجہ سے وہاں بھی یہی وائرس پھیل چکا تھا اور کئی اموات ہو چکی تھیں اور بہت سے لوگ ہسپتالوں میں تڑپ رہے تھے۔ سب سے پریشان کن بات یہ تھی کہ کسی ملک سے بھی ابھی تک کوئی ایسی تسلی بخش خبر نشر نہیں کی گئی تھی کہ اس موذی وائرس سے متاثرہ کوئی مریض صحت یاب ہو چکا ہے۔ راحیل اپنے ان مریضوں پر برابر نظر رکھے ہوئے تھا جنہیں اس نے یہ دوا ایک انجکشن کی صورت میں دی تھی۔

تین چار دنوں کے بعد اس نے ان کے دوبارہ ٹیسٹ لئے تو یہ دیکھ کر اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا کہ ان میں قوت مدافعت بڑھ چکی تھی اور اس وائرس کے کسی قدر اثرات کم ہو چکے تھے اس کا مطلب تھا کہ اگر انہیں باقاعدگی سے دو ہفتوں تک مزید انجکشن دیئے جائیں تو وہ اس بیماری سے مکمل طور پر صحت یاب ہو جائیں گے۔ پھر یک دم ایک خیال بجلی کے کوندے کی مانند اس کے دماغ میں آیا کہ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے اس روز اس کی امی کی بیماری کی صورت میں غیبی اشارہ کر دیا تھا کہ یہاں موجود مریض جو اس مرض سے تڑپ رہے تھے انہیں اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ وہ چونکہ دوسرے روز اپنے گھر فون کر کے اپنی امی کی خیریت دریافت کر چکا تھا وہ دونوں بالکل خیریت سے تھے۔ لیکن وہ سمجھ گیا کہ اس کی ضرورت گھر کی بجائے یہاں تھی۔ اس لئے اس نے اپنی دوا کا نتیجہ دیکھتے ہی اس کے متعلق ہسپتال کی انتظامیہ کے سینئرز سے فوری بات کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ وہ اکیلا اتنی مقدار میں اس طرح کے انجکشن تیار نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے فوری طور پر اپنے سینئرز سے بات کر کے ایک

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

ہنگامی میٹنگ طلب کروالی اور پھر جب اس نے ان کے سامنے اپنی اس ایجاد کا ذکر کیا تو وہ سب حیرت سے اسے تکنے لگے اور پھر وہ اٹھ کر اس کی طرف بڑھے اور اسے اپنے گلے سے لگالیا۔ ان سب کے چہرے خوشی سے تمتمانے لگے۔ فوری طور پر سینئرز نے اعلیٰ حکام سے رابطہ کر کے میڈیسن کمپنیوں کو راحیل کا فارمولہ مہیا کردیا جس پر وسیع پیمانے پر انجکشن تیار ہونے کی کارروائی شروع کردی گئی۔ راحیل کے پاس زیادہ انجکشن موجود نہیں تھے جو تھے وہ تقریباً مزید سات اور افراد کو لگائے جاسکتے تھے۔ اس لئے اس نے یہی انجکشن اپنے ان مریضوں پر ہی استعمال کئے جن میں ریکوری کے اثرات شروع ہو چکے تھے۔

❖❖❖❖

دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا میں یہ وائرس انتہائی تباہ کن انداز میں پھیل چکا تھا اور بہت سے معصوم لوگوں کی زندگیاں نگل چکا تھا اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ ہسپتالوں میں سسک سسک کر اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی۔

میڈیا والے الگ چیخ رہے تھے۔ کسی کو کسی کی کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ ایک قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔ چاروں طرف لاشوں کے ڈھیر، ان سے اٹھتا ہوا تعفن، ٹرکوں میں بھر بھر کر لاشوں کو اجتماعی طور پر ایک گڑھے میں جلانے کی کوشش کی جارہی تھی۔

حفاظتی سامان ناپید ہو چکا تھا جو بچ گیا تھا وہ سونے کے بھاؤ مل رہا تھا۔ دنیا کے سپر پاور ملکوں میں بھی یہ وائرس پھیل چکا تھا اور یہ پیغام دے رہا تھا کہ انسان چاہے جتنی بھی ایٹمی ترقی کرلے لیکن یہ دنیا صرف ایک وائرس کی مار ہے۔ ان سب سے بڑی سپر پاور تو اوپر بیٹھی ہوئی ہے جس کے آگے یہ دنیاوی طاقتیں کچھ بھی نہیں ہیں۔ حکومتی لیول پر اس کی ایٹمی دوا فوری طور پر تیار کر کے اسے ہسپتالوں میں تڑپتے مریضوں پر استعمال کروانا شروع کردی گئی۔

ہسپتال کی انتظامیہ کی نظروں میں راحیل ایک مسیحا سے کم نہ تھا وہ اسے بڑی عقیدت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ بہت سے انجکشن راحیل کے ہسپتال میں بھی پہنچادیئے گئے تھے جنہیں بڑی تیزی سے وہاں مریضوں پر استعمال کیا جانے لگا اور کچھ ہی دنوں میں وہاں شہر میں مریضوں کی تعداد صحت یابی کی جانب بڑھنے لگی۔ مریض بڑھنے کی ریشو بہت کم ہوگئی اور پھر کچھ ہی دنوں میں وہاں شہر کو دوبارہ کھول دیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود کچھ حفاظتی اقدامات کے پیش نظر وہاں موجود لوگوں کو حکومت کی طرف سے ہدایات پر عمل پیرا ہونے کے لئے سخت احکام دیئے گئے۔ راحیل نے دن رات محنت کر کے اپنی ڈاکٹری کی تعلیم کا بھرم رکھا اور کچھ دنوں تک وہاں شہر اور آس پاس کے دیگر ہسپتالوں کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی ان انجکشنوں کا استعمال کر کے بہت سے مریضوں کو صحت یاب کردیا گیا۔

چونکہ ہسپتال کی انتظامیہ نے حکومت کو اس بات کی سفارش کی تھی کہ راحیل نے انسانیت کی بھلائی کے لئے ایک بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے اس لئے اسے جائنہ کی اعزازی شہریت کے علاوہ نوبل پرائز سے بھی نوازا جائے۔ حکومت نے ان کی اس پیش کش کو بخوشی تسلیم کرتے ہوئے راحیل کو ایک بہت بڑے اور اعلیٰ سطح کے اجلاس میں اسے وہاں کی شہریت اور نوبل پرائز سے نوازا گیا۔ اس کی اس کامیابی کو پوری دنیا میں براہ راست دکھایا گیا اور یہ منظر راحیل کے والدین نے بھی پاکستان میں اپنے گھر ٹی وی پر دیکھا۔

راحیل کے ابو کے تو پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اس کے بیٹے نے ان کے ساتھ ساتھ اپنے ملک پاکستان کا بھی سر فخر سے بلند کردیا تھا۔ انہوں نے فوراً راحیل سے رابطہ کر کے اسے اس کی اس بہت بڑی کامیابی پر ڈھیروں مبارکبادیں اور دعائیں دیں۔ راحیل کی امی نے روتے ہوئے اسے واپس گھر پہنچنے کے لئے کہا جسے راحیل نے فوری قبول کرتے ہوئے پہلی فلائٹ میں سیٹ بک کروالی۔ وہ جلد از جلد پاکستان پہنچ کر اپنے والدین کے ساتھ مل کر اپنی اس کامیابی کا جشن منانا چاہتا تھا۔

www.pakistanipoint.com

قلم پارے

انتخاب: یاسین صدیق

لفاظوں کی قید میں کہانی لکھنا گو کہ ایک مشکل کام ہے مگر موجودہ دور میں کہانی سمت گئی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے سمندر کو کوزہ میں بند کردیا گیا ہو۔ کہانی کی اس مشکل صنف کو نئے اور پرانے مصنفین بڑی خوش اسلوبی سے لکھ رہے ہیں اور اس میں بے حد کامیابی بھی حاصل کررہے ہیں۔ اسی بات کو مد نظر رکھ کر مختصر کہانیوں کے شوقین قارئین اور نئے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ادارے کی جانب سے ایک اہم قدم۔ قلم پارے میں مختصر مگر پر اثر کہانیوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔

مختصر مگر پر اثر کہانیوں کا انتخاب، دلچسپ سلسلہ

پگلی..... مہرین سلیم، کراچی

ایک سانولی دوشیزہ کی کہانی اس نے خوابوں میں اپنی من پسند دنیا بسا لی تھی۔

کالی گھٹاؤں پر چھائے سرمئی بادلوں کی اوٹ میں چھپے تارے کسی کہکشاں کی سی مانند اپنی زینت سے آسمان کو چار چاند لگا رہے تھے، وہیں رقص کرتی ٹھنڈی ہوائیں کھڑکی کے سرہانے کھڑی ثانی کے سراپے میں سرائیت کرکے عجیب کپکپاہٹ کا احساس غالب کررہی تھیں۔ ثانی دنیا جہاں سے کنارہ کشی برتے کبھی آسمان کی تاریکی میں ٹمٹماتے تاروں کے حسن کو تکتی، تو کبھی ان اونچی عمارتوں کا جائزہ لیتی کہ جو بالکل گھر کے سامنے جلوہ افروز تھیں۔ ثانی کچھ ناسمجھی کی حالت میں اپنی زلفوں کو کانوں کے پیچھے اڑسنے لگی، اور ساتھ ہی سماعتوں سے ٹکرانے والی اماں کی آواز پر آگ بگولہ ہوگئی اور منہ بسورے رہ گئی۔ جو اسے کمرے میں آکر مہمانوں کے ساتھ بیٹھنے کا حکم صادر کررہی تھیں۔ جسے وہ نظر انداز کرچکی تھی۔

ہاں! وہ تھک چکی تھی اب روز روز کے چکروں سے، جب لوگ آتے اور اسے ٹھکرا جاتے، جب معاشرے میں پلنے والے بے حس لوگ رشتے کے نام پر دروازہ کھٹکھٹاتے اور عیب جوئی کی بھٹی میں اس کے وجود کو سلگا کر رخصت ہوجاتے۔ وہ بیزار ہوچکی تھی ان جھمیلوں سے جہاں ذلت و رسوائی کے سوا کچھ بھی مقدر نہ تھا۔ کیونکہ جب چوٹ عزت نفس پر لگتی ہے نا تب جسم کے ساتھ روح بھی تڑپ اٹھتی ہے۔ لہٰذا وہ اب دنیا سے کٹ کر رہنے میں ہی جان امان پاتی تھی۔ امی کے غصے سے بے نیاز وہ اپنی تخیلاتی دنیا کی سیر کرنے میں مگن تھی۔

اسے دھتکارا گیا، اس کے نین ونقوش پر طعنے کسے گئے۔ لہٰذا اسے اب ہر ایک انسان سے جیسے اکتاہٹ سی محسوس ہوتی تھی۔ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا کہ نا جانے وہ اس مے خانے میں کیوں تشریف لائی ہے؟ جہاں لوگ ایک دوسرے کی تشنگی بجھانے کے بجائے مزید بڑھا رہے ہیں۔ ایک حساس سا دل لیے وہ خود کو لوگوں سے دور رکھنے میں ہی جان امان پاتی تھی۔ وہ اکثر اپنی عقل کے گھوڑوں کو دوڑا کر سوچتی ''اس کی سانولی رنگت اور واجبی سے نقوش میں اس کا قصور؟ یہ تو رب کی عطا ہے۔ لیکن عقل اور دل کے اندھوں کو کون سمجھائے؟''

وہ عام سی شکل وصورت والی لڑکی اب بغاوت پر اتر آئی تھی۔ اسے اپنوں کے تلخ رویوں نے ذہنی مریض بنا دیا تھا۔ دوسری طرف ثانی کے بالوں میں بڑھتی ہوئی سفیدی اماں کو پریشان کردیتی، تو وہ نا چاہتے ہوئے ثانی پر طعن و تشنیع کی بارش کردیتیں۔ جبکہ ثانی بس اپنے حال ہی میں مست رہتی اک پگلی جو کبھی بلاوجہ روتی، تو کبھی کھلکھلا کر ہنس دیتی۔ اسے سب پگلی کہتے تھے اور کیوں نہ کہتے کہ دنیا سے بغاوت کرنے والوں کو پاگل ہی تو کہا جاتا ہے۔

☆☆☆

اب کی بار امی کی دھاڑتی ہوئی آواز نے جب سماعتوں کا رخ کیا تو پل بھر میں ہی ثانی کو تخیل کے جہاں سے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

حقیقت حال کی طرف لا گھسیٹا اور اس تلخ سچائی کو اپنانے پر مجبور کیا کہ امی کے اشتعال انگیز لہجے سے انگارے اڑ اڑ کر ثانی کے دل کا رخ کر کے اسے سلگانے لگے ہیں۔ جو ظاہر کر رہے ہیں کہ مہمان رخصت ہو چکے ہیں۔ اب یہ اس کے لیے معمول تھا۔ وہ لفظوں کے گھاؤ سہتی، سانولی رنگت کے مدھم پڑتے چہرے پر مسکراہٹ سجائے، آنکھوں کے کٹوروں میں موتی نما پانی لیے پلنگ پر آنکھیں موندے چت لیٹ گئی۔ امی جان ثانی کو لعنت ملامت کرتی رہیں۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے گانہ دکھتے دل کے ساتھ نیند کی وادیوں میں خواب کی سیج پر کسی ملکہ کی طرح براجمان ہو گئی۔

☆☆☆

مکافات عمل ..... ماہم انصاری، یوپی انڈیا

اپنی اولاد کی خوشی کے لیے دوسروں کی اولاد کی زندگی سے کھیل جانے والوں کا سچا واقعہ

اس نے دروازہ اچھی طرح بند کر کے ٹی وی آن کیا اور بیگ کی زپ کھولی اور اس میں موجود نوٹوں کی خوشبودار گڈیاں باہر نکالیں۔

''آج کی تازہ خبر! ناظرین ہم سٹی اسکول کے باہر موجود ہیں۔ ہمیں خبر ملی ہے کہ اس اسکول کے درجہ اول کا طالب علم جس کا نام حیدر وقار بتایا جا رہا ہے۔ اسکول سے اغوا ہو گیا ہے۔ حیدر وقار کا نام سنتے ہی تیزی سے نوٹوں کو گنتے اس کے ہاتھ ساکت ہو گئے۔ اس نے زرد پڑتے چہرے کے ساتھ ٹی وی اسکرین کی سمت دیکھا۔ ''بتایا جا رہا ہے کہ یہ بچہ اپنی ماں جو اسکول کی استانی تھی، کے ساتھ اسکول آتا جاتا تھا۔ یہ بچہ اور اس کی ماں ہر روز کی طرح آج بھی اسکول پہنچے مگر کلاس شروع ہونے کے چند منٹوں بعد کچھ لوگ کلاس میں گھس آئے۔ اغوا کار کو دیکھتے ہی استانی حفاظتی اقدام کرنے کے بجائے کلاس چھوڑ کر بھاگ گئی۔ ہاں مگر کلاس چھوڑنے سے پہلے اغوا کار اور اس کے بیچ چند الفاظ کا تبادلہ ہوتے دیکھا گیا۔ سی سی ٹی وی کیمروں میں صاف نظر آ رہا ہے کہ اغوا کار نے استانی کو کوئی پیکٹ دیا ہے۔ اس بات سے صاف ظاہر ہے کہ اس گھناونے جرم میں ان درندوں کے ساتھ اسکول کی استانی بھی ملوث تھی۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ غائب ہونے والا بچہ حیدر وقار خود اس کا اپنا بیٹا تھا۔''

نیوز اینکر اور بھی نا جانے کیا کچھ کہے جا رہا تھا مگر وہ تو اس ایک نام پر ہی اٹک چکی تھی۔

''یا میرے اللہ! یہ میں نے کیا کیا؟'' اس کے ہاتھ سے نوٹوں کی گڈی چھوٹ گئی۔

نازو کو اپنے بدن سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھی رہی۔ کچھ لمحوں بعد اس نے بہ مشکل خود کو سنبھالا اور بستر پر پڑا فون اٹھا کر ایک نمبر ڈائل کرنے لگی۔ کال ملا کر اس نے فون کان سے لگایا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ وہ بے چینی سے اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ چند منٹوں تک بیل جاتی رہی پھر کال کاٹ دی گئی۔ اس نے تیزی سے دوبارہ کال ملائی۔ اس دفعہ کچھ دیر کے توقف کے بعد کال ریسیو کر لی گئی۔

''پلیز! حیدر کو چھوڑ دیں۔ وہ میرا بیٹا ہے۔'' ضبط کا دامن چھوٹ چکا تھا۔ وہ زار و قطار روتے ہوئے گویا ہوئی۔

''ہمیں اس سے مطلب نہیں کہ وہ کس کا بچہ ہے۔ ہمارے بیچ معاہدہ ہوا تھا۔ معاہدے کے مطابق تجھے اس بچے کے پیسے دیے جا چکے ہیں۔ آئندہ ہمیں فون کرنے کی غلطی مت کرنا۔'' دوسری طرف سے احساس سے عاری لہجے میں جواب دیا گیا۔

''پلیز میری بات سنو! چھوڑ دو اسے.....'' وہ بری طرح گڑگڑائی۔ ''اب بھاگ جا وہاں سے۔ لگتا ہے تو اپنے ساتھ ساتھ ہمیں بھی مروانا چاہتی ہے۔ میں یہ سم پھینک رہا ہوں۔'' وہ غرایا۔

''پلیز! پلیز مجھ پر رحم کرو..... میں نے اپنے حیدر کے لیے ہی تو پیسے لیے تھے تم سے.....''

''دیکھو مس نازو! ہمارے لیے ہر بچہ ایک ہی جیسا ہے۔ رحم کی بھیک مانگتے تجھے شرم نہیں آتی۔'' اس نے استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے کال بند کر دی۔ جبکہ نازو! اسے تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ زندگی نے یہ کیسا سبق دیا تھا اسے؟ وہ جو اپنے بچے کی خاطر دوسروں کے بچوں کی زندگیاں برباد کرنے چلی تھی۔ وہ جانتی تھی چند لمحوں میں پولیس اسے گرفتار کرنے پہنچ جائے گی مگر اب وہ یہاں سے روپوش ہو جانے کے منصوبے پر عمل کرنے لائق نہیں تھی۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

اس میں کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت باقی ہی نا رہی تھی۔ چند لمحوں بعد پولیس نازو کو گرفتار کیے لے جا رہی تھی۔ لوگوں کا جم غفیر تھا جو عبرت کا یہ منظر دیکھنے کے لیے امڈا چلا آ رہا تھا۔ وہ کسی بے جان شے کی طرح ان کے ساتھ کھنچی جا رہی تھی۔ اس نے اپنے گھٹیا منصوبے کا یہ انجام سوچا بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

ماں کا بٹوارہ ..... محمد احمد زاہد
سانگلہ ہل

ماں سے محبت کرنے والے دو بوڑھے بیٹوں کی روداد ،کوئی بھی اپنی ماں کو خود سے دور نہیں کرنا چاہتا تھا ۔اور پھر جج نے فیصلہ سنایا

''جج صاحب مجھے انصاف چاہیے، بس انصاف۔''

زاہد نے حتمی تعین کرتے ہوئے ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کے روبرو اپنا فیصلہ سنا دیا۔ زاہد نے اپنے بڑے بھائی کے خلاف عدالت میں کیس کر رکھا تھا جو وہ سیشن کورٹ سے ہار چکا تھا، وہ اپنی ماں کو اب اپنے گھر خدمت کے لئے رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن بڑا بھائی جو اسی سال کی عمر ہونے کے باوجود ماں کی خدمت کے حق سے دستبردار ہونے سے انکاری تھا اور یہی وہ وجہ تھی جس کے سہارے زاہد کو مکمل یقین تھا کہ بالآخر فیصلہ اسی کے حق میں ہوگا۔

''پندرہ دن ماں کو تم اپنے گھر رکھو اور دوسرے پندرہ دن تمہارا بڑا بھائی رکھ لے میرے خیال میں اس طرح دونوں کو خدمت کا موقع ملتا رہے گا۔''

جج صاحب نے دوران سماعت مقدمہ نمٹاتے ہوئے کہا تو زاہد بے تابی سے دلائل دینے لگا۔

''میرے لیے یہ ناممکن ہے، میں نے یہ مقدمہ اس لئے نہیں کیا کہ حق خدمت کو آدھا آدھا کر لیا جائے کیوں کہ میرے بڑے بھائی اپنا یہ حق استعمال کر چکے ہیں وہ بوڑھے بابے بن چکے ہیں اور میری طرح اب ان کی خدمت نہیں کر سکیں گے کیونکہ اب ان کے قویٰ کمزور ہو چکے ہیں لہٰذا اب ان کی خدمت کا حق صرف اور صرف میرا ہے۔''

عدالت میں یہ انوکھا مقدمہ زیر سماعت تھا۔ جس میں دو بھائی ماں کی خدمت کو صرف اور صرف اپنا حق سمجھتے تھے ۔اس وجہ سے کافی اخباری رپورٹرز اور کثیر تعداد میں لوگ جمع تھے۔

''اگلی پیشی پر اپنی والدہ کو بھی ساتھ لائیں۔'' جج صاحب نے اس روز کی سماعت کا فیصلہ سناتے ہوئے کہا

اگلی پیشی پر ایک سو بیس سالہ بوڑھی ماں بھی اپنے بوڑھے بچوں کے ساتھ جب عدالت پہنچی تو ماں کو جج نے پوچھا۔

''آپ کس بیٹے کے ساتھ جانا چاہتی ہیں؟'' ماں نے کہا۔

''میرے لیے دونوں بچے برابر ہیں، دونوں مجھ سے محبت کرتے ہیں، دونوں خدمت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو فیصلے کی کرسی پر بااختیار بنایا ہے۔ آپ جس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کریں گے میں اسی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔''

جج صاحب نے فیصلہ محفوظ کرتے ہوئے کہا کہ اگلی پیشی پر فیصلہ سنا دیا جائے گا۔

دی گئی تاریخ پر جب عدالت لگی تو جج صاحب نے کہا۔

''یہ مقدمہ میری عدالتی تاریخ کا بہت ہی انوکھا اور عجیب مقدمہ تھا جو کہ جائیداد کے بٹوارے کی بجائے ماں کے بٹوارے کا تھا۔ جس نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا ہے کہ ماں نے اپنے دونوں بیٹوں کی کتنی اچھی تربیت کی ہے کہ ہر ایک خوشی خوشی ماں کی خدمت کرنا چاہتا ہے اور ایک تو ضعیفی کے باعث بھی اس حق سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا۔ حقائق و واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے عدالت اس فیصلے پر پہنچی ہے کہ بڑا بھائی اپنی عمر کا کثیر حصہ ماں کی خدمت کر چکا ہوں اور اب وہ عمر کے جس حصے میں ہے وہ اپنے چھوٹے بھائی کی طرح اپنی ماں کی خدمت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ لہٰذا عدالت ماں کو چھوٹے بیٹے کے ساتھ جانے کا حکم دیتی ہے۔''

یہ سنتے ہی زاہد کے بڑا بھائی شاہد کا چہرہ پہلے غصے سے سرخ ہوا۔ پھر اس کا جسم کانپنے لگا۔ اس نے چیخ کر کہا۔

''کوئی جج مجھے میری ماں کی خدمت سے کیسے روک سکتا ہے؟'' وہ اپنے ماں کی طرف بڑھا، زاہد نے لپک کر اس سے پہلے ماں کا بازو تھام لیا۔

''نہیں مجھ سے میری ماں کوئی نہیں چھین سکتا۔'' یہ کہہ

www.Azeem-Pakistanipoint.com

ہوئے وہ زمین پر گر گیا۔ زاہد اور اس کی والدہ بھاگ کر اس کے پاس پہنچے۔ ماں نے بوڑھے ہاتھوں سے اس کا سر اپنی گود میں لیا۔ شاہد نے مسکراتے ہوئے ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

خط..... حماد رزاق چدھڑ، پورے والا

گل فاطمہ حسرتوں بھرا بستہ اٹھائے ٹوٹی ہوئی چپل سے اپنی عزت نفس کو سڑک سے گھسیٹتی سہلیوں کے ساتھ اسکول جایا کرتی۔ اسمبلی حال میں روزانہ استانی سلوٹ زدہ وردی اور ٹوٹی ہوئی چپل پہننے پر گل کو کھلنے سے پہلے الفاظوں کی بوچھاڑ سے مرجھا دیتی تھی۔ سہلیوں کے طنز و مزاح اور غربت نے معصوم سی کلی کو احساس کمتری کا پہلا درس دیا۔ بریک کے وقت اچار اور سوکھی روٹی کو رول کر کے شوار ما سمجھ کر گزارا کرلیتی۔ دنیا کے شور و شر نے گل کو خاموشی عنایت کردی۔ گل کی ماں اپنی لخت جگر کی بھوک مٹانے کیلئے لوگوں کے گھروں کی صفائیاں کرتیں۔

رات ہوتی تو ماں کہانیاں سنا کر گل کو حوصلہ دیتی۔ ایک دن چودھویں کا چاند خوب چمک رہا تھا تو گل نے پوچھا۔

''ماں! یہ چاند اتنا پیارا کیوں ہے؟'' سوال نے ماں کو یادوں کے کنویں میں گرا دیا اس کو اپنے چاند کی چمک یاد آ گئی جس چمک نے ماں کو اندھیروں کا تحفہ دیا تھا۔ لڑکھڑاتے ہونٹ اور لرزتے ہوئے لہجے سے ماں نے حوصلہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''گل چاند کی چمک کا تعلق صاف آسمان سے بھی ہے اس کے آگے گرد و غبار آجائے تو چمک اس کے نظر ہو جاتی ہے۔'' ماں نے اپنی گڑیا کو باہوں میں سمیٹتی اور لوری والی اداس دھن میں سُلا دیتی تھی۔

آخر کار گل زندگی کی تلخیوں کو عبور کرتی جوان ہو جاتی ہے۔ ماں کے ہاتھ پیر بڑھاپے کی نظر ہو جاتے ہیں۔ بھوک و پیاس کی آگ کو بجھانے کیلئے اسے اپنی تعلیم کی قربانی دینی پڑتی۔ مرتی کیا نہ کرتی پیسے کی عدم دستیابی نے علم کا زیور تو چھینا ہی ساتھ ماں کی جگہ گھروں کی صفائی کرنے پر بھی مجبور کردیا۔ مہر النساء اس کے بچپن کی دوست تھی اس نے اپنے والدین سے بات کر کے گل کو اپنے گھر کام دلوا دیا۔ ماں جو کہ چلنے پھرنے سے لاچار ہو چکی تھی مہر النساء اسے بھی اپنے گھر لے آئی۔ مہر النساء کے والدین انتہائی شریف اور پرخلوص انسان تھے۔ انہوں نے دونوں کو مستقل طور پر اپنے گھر شفٹ کرلیا۔ نیوز چینل میں آل پاکستان تحریری مقابلہ ''طلاق کے اسباب'' کا اعلان ہوا۔ مہر النساء جانتی تھی کہ گل اچھا لکھ لیتی ہے اس نے مقابلے میں نام لکھوا دیا اور گل کو مقابلے میں شرکت پر مجبور کردیا۔

کچھ دنوں بعد ڈاکیے نے دروازے پر دستک دی اور گل کے ہاتھ میں خط تھما دیا۔ اتنے میں مہر النساء آجاتی اور خط کو جلدی سے چھین کر پڑھنے لگی۔ وہ خوشی سے زور زور سے چلانا شروع کردیتی ہے کہ ''گل نے تحریری مقابلہ فتح کرلیا ہے اور گورنمنٹ کی طرف سے دو لاکھ روپے کا چیک آیا ہے۔'' یہ بات سنتے ہی ماں کی آنکھ سے خوشی کے آنسو بہنے لگے۔

اگلے دن ٹی وی پروگرام پر جانے کا دعوت نامہ وصول ہوا۔ ادھر ماں اپنے آخری سانس گن رہی تھی۔ ماں نے زبردستی حوصلہ دے کر ٹی وی شو پر بھیج دیا۔ وہاں پر اینکر نے گل سے کامیابی کا راز دریافت کیا تو گل کی آنکھ سے بے ساختہ آنسو نکل آئے اور کہا۔

''کامیابی کا راز میری ماں ہے۔'' اینکر اگلے دن اس کی ماں سے ملنے گیا۔ وہ اینکر اصل میں گل کا حقیقی باپ تھا۔ جس نے غلط فہمی کی وجہ سے اس کی ماں کو طلاق دے دی تھی۔ جب اینکر انٹرویو لینے اس کی ماں کے سامنے آتا ہے ماں اسے پہلی نظر میں پہچان لیتی ہے جبکہ اینکر اسے نہیں پہچان پاتا۔ اینکر سوال پوچھتا ہے۔

''گل کی کامیابی کی وجہ کیا ہے؟'' تو ماں نے گل کو کہا کہ صندوق میں ایک خط پڑا ہے وہ لے آؤ۔ وہ ہی طلاق نامے والا خط ماں نے اینکر کو مسکراتے ہوئے تھما دیا اور کہا ''گل کے گندگی پر کھلنے کی وجہ کوئی اور نہیں آپ کا دیا یہ خط ہے جو اس کے قلم میں درد کا موجب بنا ہے۔''

www.pakistanipoint.com

(قسط نمبر 6)

بساط گر

وحید سلطان

دنیا کے مسترد کردہ جاگیردارانہ معاشرے کی ایک جھلک جو اب بھی ہمارے خطے میں اپنی تمام تر توانائیوں اور برائیوں کے ساتھ زندہ ہے۔ جہاں زمین کو ماں کا درجہ دے کر معصوم انسانوں کا خون بہا کر اسے سیراب کیا جاتا ہے۔ جہاں گھوڑی کی چوری کو بیٹی کے اغوا کے برابر تصور کیا جاتا ہے۔

ایک لڑکی کی محبت میں مبتلا دو دوستوں کی سازشی لڑائی کا ایک دلچسپ احوال۔ سمجھوتے کے تحت شادی کرنے والے جوڑے کی نفرت اور محبت کی کہانی۔ شوہر کی موت کا دشمن سے بدلا لینے کا انوکھا طریقہ اختیار کرنے والی بیوی کی داستان، محبت کرنے والوں کی کہانی دشمن ان کے پیچھے موت کی طرح تعاقب میں تھے۔ دو ایسے بااثر افراد کا قصہ خاص جو مزاج میں ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے۔

دلچسپ کہانیوں کے شائق قارئین کے لیے بطور خاص ہر لمحہ رنگ بدلتی ایک ناقابل فراموش کہانی

اقراش حیاتی نامی آدمی جسے ملک ہشام نے اسمگلنگ اور منشیات کی سپلائی کے لیے منتخب کیا تھا لیکن آج ملک ہشام اسمگلنگ اور منشیات کی بجائے اجالا کی بازیابی کے بارے میں اقراش حیاتی سے بات کرنے جوئے کے بہت بڑے اڈے پر پہنچ کر اس کا انتظار کر رہا تھا کہ اسے ایس ایچ او منیر کا فون آ گیا۔ ملک ہشام نے فون پر منیر سے طویل گفتگو کی اور آخر میں اسے یقین دلایا کہ وہ بہت جلد اس کا تبادلہ کروائے گا اور منیر دوبارہ نورنگی پورہ تھانہ میں واپس آ جائے گا۔ ملک ہشام کال منقطع کر کے اپنی نشست کی طرف پلٹا ہی تھا کہ اقراش حیاتی اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"ایس ایچ او منیر کو کسی نامعلوم نمبر سے فون آیا تھا، فون کرنے والے نے مہرالنساء کو اغوا کر رکھا ہے، فون کرنے والے نے بولا ہے کہ سودا کرو اور مہرالنساء کو لے جاؤ۔" ملک ہشام نے ایس ایچ او منیر سے فون پر ہوئی گفتگو کی ساری تفصیل اقراش حیاتی کو بتا دی اور اسے کہا کہ وہ ایس ایچ او منیر سے رابطہ کر کے مہرالنساء کو لائے۔ ملک ہشام نے اقراش حیاتی کو بتایا کہ قاسم مہرالنساء سے محبت کرتا ہے اس لیے ہم مہرالنساء کے بدلے میں اجالا کو بازیاب کروائیں گے۔ اقراش حیاتی نے سوال داغا کہ ہم قاسم سے کیسے رابطہ کریں گے؟

"مہرالنساء خود قاسم سے ہمارا رابطہ کروائے گی۔" ملک ہشام نے کہا تو اقراش نے چونکتے ہوئے اردگرد دیکھا اور پھر ملک ہشام کے ایک کارندے نے اسے بتایا کہ یہ جو اغوا ہے اور یہاں پولیس نے چھاپہ مار دیا ہے۔ اس کارندے کی بات سنتے ہی اقراش اور ملک ہشام نے ایک دوسرے کو چونکتے ہوئے دیکھا۔ پورے ہال میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ اقراش اور ملک ہشام بھاگنے والے افراد میں شامل ہو گئے۔

❖❖❖❖

"ہیلو..... کون؟" مشرف نے کال اٹینڈ کرنے کے بعد پوچھا۔

"مشرف صاحب! کام کا آدمی بول رہا ہوں، آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔" فون پر دوسری طرف سے کہا گیا۔ مشرف کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔

"کیا بات کرنی ہے؟" مشرف نے پوچھا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

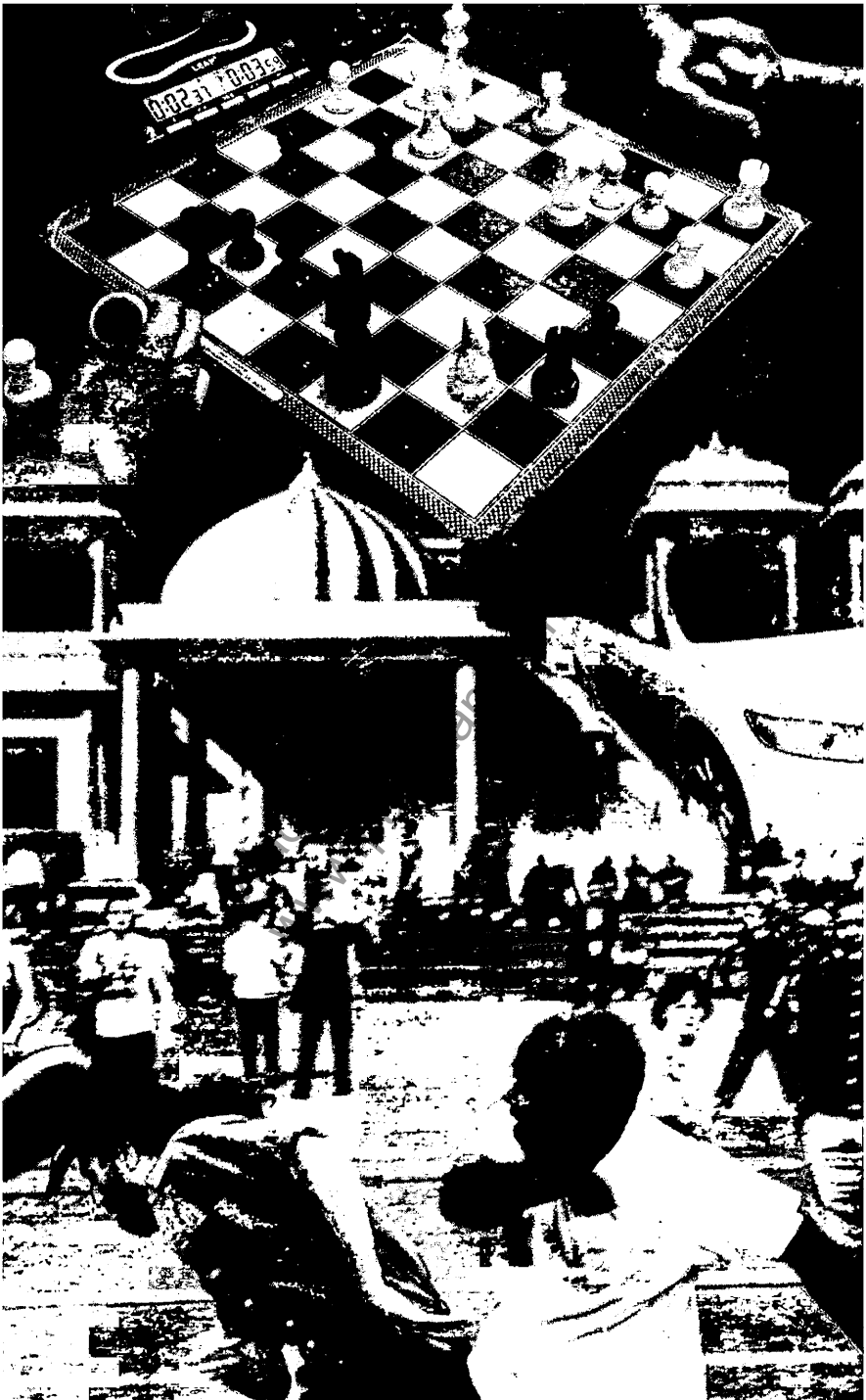

''میں مختصر اور مدعے کی بات کرنے کا عادی ہوں، مجھے پتا چلا ہے کہ تمہیں مہر النساء کی تلاش ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''تم کون ہو؟'' مشرف نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''میں کون بول رہا ہوں اس سے آپ کو کیا لینا دینا، اپنے کام کی بات کرو۔'' دوسری طرف سے کہا گیا تو مشرف کے چہرے کے تاثرات ایک بار پھر بدل گئے۔

''مہر النساء کے بدلے تم کیا چاہتے ہو؟'' مشرف نے پوچھا۔

''اگر مہر النساء کو لینا ہے تو سودا کرو۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''میں تمہیں پانچ منٹ بعد فون کرتا ہوں۔'' مشرف نے کہا۔

''تم وقت ضائع کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟، اگر پانچ منٹ میں دیر ہوگئی تو؟'' دوسری طرف سے استفہامیہ انداز میں پوچھا گیا۔

''میں نے کہا نا کہ میں پانچ منٹ بعد فون کرتا ہوں۔'' مشرف نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، میں پانچ منٹوں بعد خود ہی فون کرتا ہوں یہ فون بات کرنے کے لیے ہی کھلتا ہے اب بند ہو جائے گا۔'' دوسری طرف سے کہا گیا اور فون بند کر دیا گیا۔

❖❖❖❖

اقراش حیاتی سے ملاقات کے بعد ملک ہشام اس فلیٹ میں واپس آیا جہاں پر ناہید بیگم اس کا انتظار کر رہی تھی۔

''کیا کہیں جانے کی تیاری ہے؟''

ملک ہشام نے اعلیٰ اور نفیس لباس سمیت ناہید بیگم کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''امینہ شہر آئی ہوئی ہے بس اسی ملنے کو دل چاہ رہا تھا۔۔'' ناہید بیگم نے کہا اور جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''امینہ..... مینہ.....'' ملک ہشام نے ایسے انداز میں کہا جیسے وہ یاد کر رہا ہو کہ امینہ کون ہے۔

''آپ کے ساتھ نکاح سے پہلے امینہ میری ملازمہ تھی، ملازمہ تو وہ تھی لیکن میری بہت اچھی دوست بھی ہے۔'' ناہید بیگ نے ملک ہشام سے کہا۔

''بہرام کہاں ہے؟'' ملک ہشام نے پوچھا۔

''وہ گاؤں چلا گیا ہے۔'' ناہید بیگم نے ملک ہشام کو بتایا۔

''اوکے میں خود آپ کے ساتھ جاؤں گا۔'' ملک ہشام نے کہا تو ناہید بیگم دل ہی دل میں چونکی۔

''نہیں..... نہیں، میں ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤں گی، اصل میں امینہ اپنی بیٹی کے گھر آئی ہے۔ اس لیے میں خود ہی جا رہی ہوں۔'' ناہید بیگم نے ملک ہشام سے کہا تو ملک ہشام نے چند کرنسی نوٹ ناہید بیگم کی طرف بڑھائے تو ناہید نے مسکراتے ہوئے وہ کرنسی نوٹ لے لیے۔

آٹھ سے دس کلومیٹر سفر طے کرنے کے بعد ڈرائیور نے گاڑی اس گھر کے سامنے روک دی جس کا پتہ ناہید بیگم نے بتایا تھا۔ ناہید بیگم مختلف قسم کے تحائف لے کر گھر میں داخل ہوئی تو امینہ کی بیٹی ناہید کو ایک کمرے میں لے گئی جہاں پر امینہ موجود تھی۔ امینہ نے ناہید بیگم کو خوش آمدید کہا تو ناہید بیگم اس کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

''اب ہمیں ملک ہشام کے خلاف سازشوں کا ایک نیا سلسلہ شروع کرنا ہوگا۔'' رسمی گفتگو کے بعد ناہید بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

امینہ نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''اگر صابرہ مائی کے شوہر کو قتل کر دیا جائے تو صابرہ اپنے شوہر کے قتل کا ذمہ دار بہرام کو ٹھہرائے گی اور اب تو ایس ایچ او منیر کا ٹرانسفر بھی ہو چکا ہے، ملک ہشام کو بے بس دیکھ کر مجھے بہت سکون ملے گا۔'' ناہید بیگم نے امینہ سے کہا۔

''میں سمجھ گئی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔'' امینہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''کوئی ثبوت ہرگز مت چھوڑنا۔'' ناہید نے امینہ کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے بعد وہ دونوں چائے بسکٹ کے ساتھ انصاف کرنے میں مشغول ہوگئیں۔

❖❖❖❖

''تیمور صاحب! کام کا آدمی بول رہا ہوں۔'' تیمور نے کال اٹینڈ کی تو دوسری طرف سے مردانہ بھاری آواز میں کہا گیا۔

''کون کام کا آدمی؟'' تیمور نے خمار آلود لہجے میں پوچھا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

"تمہیں مہرالنساء چاہیے؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا تو اس کی بات سن کر تیمور کو حیرت ہوئی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" تیمور نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"اگر تم مہرالنساء کی بازیابی چاہتے ہو تو مجھ سے سودا کرو۔" فون پر دوسری طرف سے کہا گیا۔

"کون بول رہے ہو تم؟" تیمور نے تلخی سے پوچھا۔

"یہ پوچھنے کا کیا فائدہ؟، سیدھا مدعے پر آؤ، اگر تمہیں مہرالنساء چاہیے تو سودا کرو اور اسے لے جاؤ۔" دوسری طرف سے بارعب لہجے میں کہا گیا تو تیمور لمحے بھر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔

"اگر سوچ میں پڑو گے تو سودا دوسری پارٹی سے ہو جائے گا۔" فون پر بات کرنے والا شخص بڑی ہوشیاری سے بات کر رہا تھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" مختصر توقف کے بعد تیمور بولا۔

"تم کیا دو گے؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا تو حریف کا سوال سن کر تیمور الجھن کا شکار ہو گیا۔

"ایک لاکھ روپے۔" تیمور الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں سمجھ گیا، تمہیں مہرالنساء نہیں چاہیے۔" فون پر بات کرنے والے شخص نے کہا اور کال منقطع کر دی اور پھر موبائل فون کی پاور بھی آف کر دی۔

"اب تیمور نے ایس ایچ او کامران کو فون کر کے اپنے پاس بلایا تو آدھا گھنٹہ بعد ایس ایچ او تیمور کے پاس پہنچ گیا۔

"کل مہرالنساء میرے پاس آئی تھی اور ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے اور جب وہ یہاں سے گئی تو اسے کسی نے اغوا کر لیا۔" تیمور نے کہا اور پھر اس نے فون پر نامعلوم شخص سے ہونے والی گفتگو کی ساری تفصیل بتا دی۔

تیمور کو جس نمبر سے کال آئی تھی وہ نمبر اس نے کامران کو دے دیا۔ کامران نے اسے یقین دلایا کہ وہ اس نمبر کو ٹریس کروائے گا اور بہت جلد مہرالنساء کو بازیاب کروالے گا۔ ایس ایچ او کامران کے جانے کے بعد عشرت وہاں آئی تو تیمور نے اس پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اس کا موڈ بہت اچھا ہے لیکن عشرت کو جلد معلوم پڑ گیا کہ تیمور اداس اور بہت دکھی ہے۔ اس نے رسمی گفتگو کے بعد تیمور سے اس کی اداسی اور پریشانی کی وجہ دریافت کی تو جواب میں تیمور نے جو بات کہی وہ بات عشرت کو حیرت میں ڈال گئی۔

"کیا تم میرے لیے جان دے سکتی ہو؟" تیمور نے پوچھا تو عشرت اسے متحیر نگاہوں سے دیکھنے لگی جبکہ تیمور بھی اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ لمحہ بھر توقف کے بعد عشرت نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اس کا مطلب تم میرے اور مہرالنساء کے دشمنوں سے لڑ سکتی ہو اور اس کے لیے تمہیں خاص تربیت دی جائے گی۔" تیمور نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو عشرت نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور پھر تیمور نے اسے بتایا کہ مہرالنساء اغوا ہو چکی ہے۔

"میں یہ خاص تربیت کہاں سے حاصل کروں گی؟" عشرت نے پوچھا۔

"اس خاص تربیت کے حصول کے لیے میں بندوبست کروں گا۔" تیمور نے کہا۔

"مہرالنساء کو کس نے اغوا کیا؟" عشرت نے سوال داغا۔

"معلوم نہیں۔" تیمور نے مختصر جواب دیا۔

"آپ پریشان نہ ہوں، میں ہوں نا، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" عشرت نے تیمور کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں..... یہ لڑکی صحیح کہہ رہی ہے، بہت جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا میرے بیٹے۔" تیمور کی سماعتوں سے اس کی والدہ کی آواز ٹکرائی تو وہ کرسی سے اٹھا اور اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اپنی والدہ کو دیکھتے ہی تیمور ساری اداسی اور پریشانی بھول گیا۔

"یاور صاحب کی بیٹی تمہارے ڈیڈی کے پاس آئی تھی، اس نے تمہاری طرف سے معافی طلب کی تھی، ڈیڈی نے تمہیں معاف کر دیا ہے اور اب میں تمہیں ساتھ لے جانے آئی ہوں۔" تیمور کی والدہ نے تیمور سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تو تیمور نے گھر واپس جانے سے انکار کر دیا اور پھر عشرت نے منت سماجت کی تو تیمور گھر واپس جانے کے لیے راضی ہو گیا۔

❖❖❖❖

مشرف، قاسم کے پاس گیا اور اسے ساری تفصیل سے آگاہ کیا اور اسے یہ بھی بتایا کہ وہ شخص پانچ منٹ بعد دوبارہ فون کرے گا۔ قاسم سننے کے بعد سوچنے لگا کہ یہ کون ہو سکتا ہے جس کے پاس مہرالنساء ہے اور اب اس کا مقصد ہے کہ

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

اسے مہرالنساء کے عوض پیسے مل جائیں۔ قاسم اس پر مزید سوچنے لگا لیکن اس کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی اور وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

مشرف کو پھر نامعلوم نمبر سے فون آ گیا۔

''مہرالنساء کے بدلے میں تمہیں کتنا پیسہ چاہیے؟'' کال اٹینڈ کرتے ہی مشرف نے پوچھا۔

''پانچ لاکھ روپے۔'' دوسری طرف سے مختصر جواب دیا گیا۔

''مہرالنساء اتنی بھی قیمتی نہیں ہے ہمارے لیے۔'' مشرف نے ہوشیاری سے بولتے ہوئے کہا تو قاسم نے چونک گیا اور اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے مشرف کو دیکھا۔

''ہوسکتا ہے وہ کسی اور کے لیے تم سے بھی زیادہ قیمتی ہو۔'' فون پر بات کرنے والا شخص شاید مشرف سے بھی زیادہ شاطر تھا۔

''وہ کون ہے؟'' مشرف نے پوچھا۔

''تم صرف اپنی بات کرو۔'' فون پر بات کرنے والے شخص نے سخت لہجے میں کہا تو مشرف نے قاسم کی جانب دیکھا اور قاسم کے اشارے پر مشرف نے فون کا لاؤڈ اسپیکر آن کر دیا۔

''اس کا مطلب ہے کوئی اور بھی ہے جو مہرالنساء کو بازیاب کروانا چاہتا ہے۔'' مشرف نے کریدا۔

''تم ہم سے فائنل بات کرو، باقی باتیں چھوڑو، جس کی بولی زیادہ ہو گی میں مہرالنساء کو اس کے حوالے کروں گا۔'' دوسری طرف سے دوٹوک انداز میں کہا گیا تھا۔ مشرف نے قاسم کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تو قاسم نے سر کو جنبش دی۔

''مجھے یہ بتاؤ کہ پیسے لے کر آنا کہاں ہے۔'' مشرف نے پوچھا۔

''پہلے سودا تو کرلو۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''مجھے منظور ہے؟'' مشرف نے کہا۔

''پیسے لے کر مویشی منڈی میں بھٹی بھئی کھل چوکھر والی شاپ کے پیچھے آجاؤ اور اپنا فون آن رکھنا۔'' دوسری طرف سے کہا گیا اور کال منقطع ہوگئی۔

''آپ مجھے پانچ لاکھ روپے بیگ میں ڈال دیں، ایک پیسہ نہیں جائے گا اور مہرالنساء کو ساتھ لے کر آؤں گا۔'' مشرف نے پراعتماد لہجے میں کہا تو قاسم دیوار میں نصب الماری کی طرف بڑھ گیا۔

❖❖❖❖

ملک ہشام بہت کشمکش میں تھا۔ وہ کمرے میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ ایک کارندہ کمرے میں آیا۔ اس نے ملک ہشام کو بتایا کہ اقراش حیاتی کا فون آیا تھا۔ ایس ایچ او منیر نے وہ نمبر ٹریس کروالیا ہے جس سے مہرالنساء کے اغوا کار نے رابطہ کیا تھا۔ وہ نمبر مویشی منڈی والے علاقے میں دوبارہ آن ہو چکا ہے۔

''اقراش حیاتی سے کہو کہ وہ مویشی منڈی والے علاقے میں مہرالنساء کے ساتھ ساتھ اغوا کار کو بھی تلاش کرے۔'' ملک ہشام نے اپنے کارندے سے کہا تو وہ سر ہلاتا ہوا کمرے سے چلا گیا۔

❖❖❖❖

مویشی منڈی میں بھٹی بھئی کھل چوکھر والی شاپ کے پیچھے مشرف کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کرنسی نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ تھا۔ ابھی دو منٹ ہی گزرے تھے کہ مشرف کا فون بجنے لگا۔ ''اکیلے آئے ہو۔'' مشرف نے کال اٹینڈ کی تو دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''ہاں اکیلا ہی آیا ہوں۔'' مشرف نے جواب دیا۔

''سچ بول رہے ہو؟'' دوسری طرف سے فون پر بات کرنے والے شخص نے اچھی طرح سے تسلی چاہی۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' مشرف نے جواب دیا۔

''مویشی منڈی کے شمالی حصے میں مویشیوں کے چارے اور گھاس کے تین بڑے گودام ہیں، تم پیسہ لے کر اس طرف آجاؤ۔'' فون پر بات کرنے والے شخص نے کہا تو مشرف نے شمال کی جانب دیکھا اور پھر فون پر بات کرتے ہوئے بتایا کہ وہ گوداموں کی طرف آ رہا ہے۔

''گوداموں کے پیچھے کچرے کا ایک ڈرم پڑا ہے، تم پیسوں والا بیگ ڈرم کے اندر موجود کچرے میں دبا دو۔'' مشرف کو بتایا گیا۔

''مہرالنساء کہاں ہے؟'' مشرف نے پوچھا۔

''بیگ رکھ کر آگے آجاؤ، میں بتاتا ہوں کہ مہرالنساء کہاں ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''میں ایسے بیگ نہیں رکھوں گا، پہلے مجھے بتاؤ کہ

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

مہرالنساء کہاں ہے؟ میں جونہی بیگ رکھوں گا تم مہرالنساء کو میری طرف بھیج دو گے۔'' مشرف نے کہا تو فون پر بات کرنے والے شخص کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا حریف حاضر دماغی سے بات کر رہا ہے۔

''پہلے تم بیگ رکھو اور پھر ڈرم سے تھوڑا آگے آؤ اور ایک راہداری میں گھس جاؤ، راہداری کے اختتام پر ایک کمرہ ہے جس کا تالا کھلا ہوا ہے، مہرالنساء اسی کمرے میں محفوظ ہے۔''

''جب تک میں مہرالنساء کو نہیں دیکھوں گا تب تک پیسے نہیں رکھوں گا۔'' مشرف نے دوٹوک انداز میں کہا۔ دراصل مشرف اپنی ضد پر جم گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ فون پر بات کرنے والا شخص کوئی ایسی غلطی کرے جس سے یہ پتا چل جائے کہ فون پر کون ہے۔ وہ شاید اس غصے میں سامنے بھی آ جائے تو اس کا کام آسان ہو جائے گا۔ مشرف جان بوجھ کر بات کو الجھا رہا تھا۔

''دیکھو میرے پاس وقت نہیں ہے، اگر تم ضد کرو گے تو میں غصہ کروں گا اور غصے میں اگر گولی چلنے سے مہرالنساء کی جان چلی گئی تو پھر مجھے الزام مت دینا۔'' فون پر بات کرنے والا شخص بھی نہایت شاطر تھا۔ وہ کسی قیمت پر اپنی کوئی کمزوری عیاں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس بات نے مشرف کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔

''اچھا ٹھیک ہے، میں بیگ رکھتا ہوں۔'' مشرف نے کہا اور پھر جیسے ہی مشرف بیگ رکھ کر آگے کی جانب بڑھ گیا تو دوسری طرف کال منقطع کر دی گئی۔ مشرف راہداری میں داخل ہوا تو اس نے طلحہ کا نمبر ڈائل کیا۔ فون پر رابطہ ہوتے ہی طلحہ نے اسے بتایا کہ وہ گوداموں کے قریب ہی ہے۔ مشرف نے طلحہ کو وہ جگہ بتائی جہاں اس نے پیسوں والا بیگ رکھا تھا۔ کال منقطع کرنے کے بعد مشرف محتاط انداز میں اس کمرے میں داخل ہو گیا جو راہداری کے اختتام پر تھا۔ کمرے بہت اندھیرا تھا۔ مشرف نے اپنے موبائل فون کی لائٹ آن کی اور آگے بڑھنے لگا۔ اس نے مہرالنساء کے ہاتھ پاؤں کھولے اور پھر منہ سے ٹیپ اتاری۔

''یہ جو شخص مجھے کھول رہا ہے، یہ جو کوئی بھی ہے مجھے پروا نہیں، ایک بار اس کمرے سے میں نکل گئی تو میں آسانی سے فرار ہو جاؤں گی۔'' مہرالنساء نے سوچا جبکہ اس کے منہ میں جو کپڑا ٹھونسا گیا تھا وہ مشرف نے نکال لیا تھا۔ مہرالنساء کرسی سے اٹھی تو مشرف نے اسے دبوچ لیا اور اس نے کلوروفام لگا رومال مہرالنساء کی ناک پر رکھ دیا۔ مہرالنساء نے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کروانے کی بھرپور کوشش کی لیکن اس گرفت زیادہ مضبوط ہو گئی اور چند لمحوں میں وہ بے ہوش ہو کر مشرف کے بازوؤں میں جھول گئی۔

❖❖❖❖

ملک ہشام اور ناہید بیگم جس فلیٹ میں رہائش پذیر تھے اس کی چھت کے اوپر نہایت ہی عالیشان حوض بنایا گیا تھا۔ چاند کی چاندنی میں حوض بہت ہی دلکش منظر پیش کر رہا تھا جبکہ چاند کے اطراف میں سیاہ بادل الگ منظر پیش کر رہے تھے اور اب یہ سیاہ بادل رفتہ رفتہ چاند کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ملک ہشام اور ناہید بیگم حوض کے پاس کھڑے تھے جبکہ کچھ فاصلے پر ایک لڑکی کھڑی تھی۔ ناہید بیگم کو ایسا محسوس ہوا جیسے لڑکی کی نگاہیں ناہید پر مرکوز ہوں۔ ناہید بیگم ملک ہشام کی جانب متوجہ ہوئی۔

''یہ ملازمہ یہاں کیوں کھڑی ہے؟'' ناہید بیگم نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

''اس کا مطلب ناہید یوں ہی امینہ سے ملنے نہیں گئی تھی، کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہے ورنہ ناہید کے چہرے پر یوں پریشانی کے آثار نہ ہوتے۔'' ملک ہشام نے ناہید بیگم کے چہرے کو دیکھتے ہوئے سوچا اور پھر ناہید بیگم سے مخاطب ہوا۔

''یہ ملازمہ نہیں ہے۔ دراصل میں میرے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اس لیے نوشین کو میں نے آپ کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی ہے۔'' ملک ہشام نے اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مطلب کہ ملک صاحب کو اب بھی شک ہے کہ میں ان کے خلاف سازش کر سکتی ہوں اور اب حفاظت کے نام پر میری نگرانی ہو گی۔'' ناہید بیگم نے نوشین کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

''ناہید کے چہرے کی پریشانی بتا رہی ہے کہ وہ ساری حقیقت جاننے کے بعد بھی میرے ساتھ مخلص نہیں ہے۔'' ملک ہشام نے ناہید کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

''کیا میں آپ کے ساتھ اپنی پرانی یادیں شیئر کر سکتی ہوں؟'' ناہید بیگم نے پوچھا تو ملک ہشام نے سر ہلا کر ''ہاں۔'' میں جواب دیا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

"بارش مجھے ہمیشہ سے بے حد پسند ہے۔" ناہید بیگم نے چاند کی طرف بڑھتے بادلوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوہ تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ میں آپ کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں اس لیے آپ نے اپنی بات بدل لی۔" ملک ہشام نے مسلسل ناہید کے چہرے کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

"خاص کر جب بارش ہونے کے بعد گہرا سا اندھیرا چھا جاتا تھا، بادل سیاہ ہو جاتے تھے، ہر چیز اپنی طرف متوجہ سی کرتی محسوس ہوتی تھی، درختوں کے گیلے پتے ہوا کے تھپیڑوں سے اپنے ہونے کا احساس دلاتے تھے، قدرت کا ایک شور سا بچ جاتا تھا۔" ناہید بیگم نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا جبکہ ملک ہشام نے ناہید کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ ناہید کو لگا کہ ملک ہشام اسے نظر انداز کر رہا ہے تو اس نے ہشام کو تلملاتے ہوئے دیکھا۔

"حالانکہ زرشاد صاحب کو یہ منظر بہت خوفزدہ لگتا تھا لیکن میں ان کی نسبت مختلف سوچتی تھی، میں بارش والے اندھیرے سے بہت لطف اندوز ہوا کرتی تھی اور جب موسم برسات میں مینڈک آوازیں کرتے تھے تو....." ناہید بیگم نے کہا اور جملہ ادھورا چھوڑ دیا جبکہ زرشاد کا نام سنتے ہی ملک ہشام چونک پڑا اور اس نے گہری سانس لیتے ہوئے ناہید کے چہرے سے نظریں ہٹا دیں۔

"ہماری گفتگو میں زرشاد کا ذکر کہاں سے آ گیا؟" ملک ہشام نے تیور بدلتے ہوئے کہا۔

"زرشاد سے میری یادوں کا بہت گہرا تعلق ہے، اگر میں اپنی بہترین یادیں شیئر کروں اور اس دوران زرشاد کا ذکر نہ ہو تو ایسا بالکل ممکن نہیں۔" ناہید بیگم نے دوٹوک انداز میں کہا اور ملک ہشام کو زچ کرنے کی کوشش کی۔

اس کا موڈ بگڑ گیا تھا اور وہ چھت سے نیچے آ گیا تھا جبکہ ناہید بیگم اب بھی نوشین کے ساتھ چھت پر موجود تھی۔ سیڑھیاں اترنے کے بعد ملک ہشام لاؤنج میں آیا تو اسے بتایا گیا کہ اقراش حیاتی کا خاص آدمی ہے اور وہ ملک ہشام سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ ملک ہشام کے اشارے پر اقراش حیاتی کے خاص آدمی کو لاؤنج میں ہی بلا لیا گیا۔

"ایس ایچ او منیر نے جو لوکیشن بتائی تھی وہاں سے ایک شخص کو یرغمال بنایا تھا، تھوڑا تشدد کرنے کے بعد اس نے اپنا نام راشد بتایا اور وہ بشارت کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے، بشارت اور راشد نے ہی مہر النساء کو اغوا کیا تھا اور پانچ لاکھ روپے کے عوض انہوں نے مہر النساء کو مشرف کے حوالے کیا تھا۔" اقراش حیاتی کے خاص آدمی نے ملک ہشام کو ساری تفصیل بتا دی تھی۔

"اقراش سے کہو کہ وہ مشرف کو تلاش کرے جبکہ راشد کو چھوڑ دیا جائے اور پھر اس کا تعاقب کر کے بشارت کا کھیل ختم کر دے۔" ملک ہشام نے کہا تو وہ آدمی سر ہلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

بشارت نے پانچ لاکھ روپے کمانے کے لیے کئی دنوں تک مہر النساء کا تعاقب کر کے یہ معلوم کیا ہو گا کہ وہ کونسے افراد ہیں جن کے لیے مہر النساء بہت اہم ہے۔ ملک ہشام نے سوچا اور پھر وہ صوفے پر دراز ہو گیا۔

ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ملک ہشام کا فون بج اٹھا۔ اس نے کال اٹینڈ کی تو اسے بتایا گیا کہ صابرہ مائی کے شوہر کے قتل کے الزام میں پولیس بہرام کو گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ لمحہ بھر میں ملک ہشام کی نیند غائب ہو گئی۔ وہ صوفے سے اٹھا اور اس نے کال منقطع کی۔ وہ ناہید بیگم کو بتائے بغیر گارڈز کے ہمراہ روانہ ہو گیا۔

رات کے دو بجے ملک ہشام اپنے گارڈز کے ہمراہ تھانہ نورنگی پورہ پہنچا۔ اس تھانے میں جس طرح ایس ایچ او منیر کی موجودگی میں ملک ہشام کا استقبال ہوتا تھا آج تھانے میں ویسا کچھ بھی نہیں تھا۔ آج ملک ہشام کا استقبال نہیں ہوا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ برہم ہو گیا۔ ملک ہشام ایس ایچ او کے آفس میں گیا تو ایس ایچ او کامران نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دیا اور وہ نہایت مغرور انداز میں اپنے کام میں مگن رہا۔

"میرے ساتھ سودا کرو، تمہیں کتنا پیسہ چاہیے، بہرام کو ابھی اور اسی وقت رہا کرو۔" ملک ہشام نے تحکمانہ لہجے میں کہا تو ایس ایچ او کامران اس کی جانب متوجہ ہوا۔

"مجھے اندازہ تھا کہ آپ مجھ سے سودے بازی کرنے کے لیے ضرور آئیں گے لیکن میں آپ سے کسی قسم کی سودے بازی نہیں کروں گا، آپ کے بیٹے نے قتل کیا ہے، اس کے خلاف ایف آئی آر کٹے گی اور اسے سزا بھی ہو گی اور آپ اپنے بیٹے کو قانون کے شکنجے سے نہیں چھڑوا سکو گے۔" ایس ایچ او کامران نے دوٹوک انداز میں کہا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

"تم بہت غلط کر رہے ہو، میں تمہیں دیکھ لوں گا۔" ملک ہشام نے سرد لہجے میں کہا اور فون پر نمبر ڈائل کرتا ہوا آفس سے نکل گیا۔

"ایس ایچ او کامران نے میرے بیٹے بہرام کو قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے جبکہ میرا بیٹا بے قصور ہے۔" ملک ہشام نے فون پر بات کرتے ہوئے ایم این اے محمود صاحب سے کہا۔

"ملک صاحب! آپ تھوڑا صبر کریں، آپ کا بیٹا قصور وار ہے یا بے قصور اس کا فیصلہ عدالت کرے گی۔" محمود صاحب نے خمار آلود لہجے میں کہا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے محمود ابھی نیند سے بیدار ہوا ہو۔

"اگر میرا بیٹا صبح ہونے تک رہا نہ ہوا تو پھر میں پارٹی لیڈر شپ سے رابطہ کروں گا۔" ملک ہشام نے دھمکی خیز لہجے میں کہا اور کال منقطع کر دی تو محمود نے فون کر کے ایس ایچ او کامران کو اپنی رہائشگاہ پر طلب کر لیا۔

❖❖❖❖

رات کے تین بجے ایس ایچ او کامران ایم این اے محمود کی رہائشگاہ پہنچا تو محمود صاحب نے اسے خوش آمدید کہا تو کامران نے صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے محمود صاحب کا شکریہ ادا کیا اور پھر محمود صاحب نے ملک ہشام کے بیٹے بہرام کے بارے میں پوچھا کہ اسے کیوں گرفتار کیا گیا۔

"صابرہ مائی نے تھانے میں درخواست دائر کی تھی، درخواست میں موقف بیان کیا گیا تھا کہ بہرام نے صابرہ مائی کے شوہر کو قتل کیا ہے لہٰذا قانونی کاروائی کرتے ہوئے بہرام کے خلاف ایف آئی آر درج کی جائے۔" ایس ایچ او کامران نے محمود صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"کیا ایف آئی آر درج ہو گئی؟" محمود صاحب نے پوچھا تو کامران نے نفی میں سر ہلایا۔

"بہرام کو فوری طور پر رہا کر دو اور صابرہ مائی سے کہو کہ ملزم کو تلاش کیا جا رہا ہے۔" محمود صاحب نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"آپ جو کہہ رہے ہیں وہ تحریری طور پر لکھ کر نیچے اپنے دستخط کر دیں تو میں بہرام کو رہا کر دوں گا۔" کامران نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"شاید تم بھول گئے ہو کہ میری سفارش سے تمہاری پروموشن ہوئی تھی اور اب تم چاہتے ہو کہ تمہارا ٹرانسفر بھی ہو جائے۔" محمود صاحب نے دھمکی خیز لہجے میں کہا تو ایس ایچ او کامران محمود صاحب کو گھورتے ہوئے صوفے سے اٹھ گیا۔

"میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا، فیصلہ آپ نے کرنا ہے۔" کامران نے کہا اور سیٹنگ روم کے خارجی دروازے کی طرف بڑھ گیا جبکہ محمود صاحب اسے غصیلی نگاہوں سے تب تک گھورتے رہے جب تک وہ خارجی دروازے سے باہر نہیں چلا گیا تھا۔

❖❖❖❖

"مجھے پختہ یقین تھا کہ اس تھانے میں ایماندار اور بہادر آفیسر ضرور آئے گا جو پوری لگن اور دیانتداری سے عوام کے مسائل حل کرے گا۔" رسمی گفتگو کے بعد ایک ادھیڑ عمر شخص نے ایس ایچ او کامران سے کہا۔

"حق نواز صاحب! آپ نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی اس کے لیے میں آپ کا بے حد مشکور ہوں۔" ایس ایچ او کامران نے اس ادھیڑ عمر شخص کو حق نواز کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے فخر ہے تم نے ملک ہشام پر ہاتھ ڈالا ہے، جب تک اس کا بیٹا جیل میں ہے تب تک سکون اس پر حرام ہے۔" حق نواز صاحب نے کہا۔

"میں آپ کو کافی دنوں سے تلاش کر رہا تھا۔" ایس ایچ او کامران نے حق نواز سے کہا۔

حق نواز نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میرے ایک دوست نے ملک ہشام اور اس کے کارندوں سے نمٹنے کے لیے ایک لڑکی کا انتخاب کیا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس لڑکی کو تربیت دیں۔" کامران نے حق نواز سے کہا۔

"برسوں پہلے ملک ہشام نے میرا تبادلہ کروایا اور اسی کی وجہ سے مجھے معطل کیا گیا تھا اس لیے جو شخص ملک ہشام کی مخالفت کرے گا وہ مجھے اپنے ساتھ کھڑا پائے گا۔" حق نواز نے گردن اکڑاتے ہوئے کہا۔ حق نواز کے جانے کے بعد ایس ایچ او کامران نے تیمور کو فون کیا اور اسے بتایا کہ عشرت کی رہائش اور ٹریننگ کا بندوبست ہو گیا ہے۔

❖❖❖❖

اجالا، قاسم کو اس عمارت کا پتہ بتا چکی تھی جس عمارت

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

میں ملک ہشام نے مہر النساء کے بھائی دلشاد کو قید کر رکھا تھا۔ قاسم نے بھی وعدے کے مطابق اجالا کو چھوڑ دیا تھا۔ اجالا روڈ کے کنارے پیدل جا رہی تھی۔ اسے جلد ہی احساس ہو گیا تھا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے اور وہ تعاقب کرنے والے کو متلاشی نگاہوں سے تلاش کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے پاس نہ تو فون تھا اور نہ ہی کیش۔ وہ شام ہونے سے پہلے ہی کسی محفوظ جگہ پہنچنا چاہتی تھی لیکن اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کسی اپنے سے کیسے رابطہ کرے۔ کیوں کی اس کے پاس فون نہیں تھا۔

اجالا ایک شاپنگ سینٹر کی طرف چلی گئی۔ وہ شاپنگ سینٹر کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے اپنے لباس کا جائزہ لیا۔

اس کا لباس کافی گندہ ہو چکا ہے، چہرے اور بالوں کی حالت بھی زیادہ مختلف نہ تھی۔ اجالا نے اپنا دوپٹہ درست کرتے ہوئے سوچا۔ اس نے شاپنگ سینٹر کے اندر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس نے متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ ایک لڑکے کی جانب متوجہ ہوئی جو کچھ فاصلے پر روڈ کے کنارے موٹر بائیک کے ساتھ وہ اپنے فون کی اسکرین پر نگاہیں مرکوز کیے ہوئے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اجالا اس لڑکے کے پاس گئی۔ اس نے لڑکے کو بتایا کہ اس کا فون اور پرس گم ہو گیا ہے اور وہ اس کے فون سے اپنے گھر والوں سے رابطہ کرنا چاہتی ہے تو اس لڑکے نے اجالا کو فون دے دیا۔ اسنے قدیر کا نمبر ڈائل کیا لیکن اس کا نمبر آف تھا۔ اس نے قدیر کا دوسرا نمبر ٹرائی کیا لیکن وہ بھی آف تھا۔ مسلسل تین نمبروں پر رابطہ کرنے کے بعد اجالا نے مایوس ہوتے ہوئے فون اس لڑکے کو واپس دیا اور وہاں سے چلی گئی۔

❖❖❖❖

قدیر بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھا۔ اسے وہ منظر یاد آ رہا تھا جب دو افراد اجالا کو اغوا کر کے لے جا رہے تھے تو اس نے اپنے دوست بدر کے ساتھ مل کر اجالا کو اغوا ہونے بچانے کی کوشش کی تھی لیکن ایک حملہ آور نے ان دونوں پر ہتھوڑی سے وار کیے تھے۔ بدر زخموں کی تاپ نہ لا سکا اور اس کی موت ہو گئی۔

کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دینے پر قدیر سوچوں کے بھنور سے بے نیاز ہوا اور وہ دروازے کی جانب متوجہ ہوا۔ ذونیا اور مہرو کو دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"بدر کے جنازے کے دوران تم دوبارہ بے ہوش ہو گئے تھے، میں نے جب عقیل کو کھویا تھا تب مجھے معلوم ہوا تھا کہ ایک وفادار اور بہترین ساتھی کو کھونے کا دکھ کیا ہوتا ہے، بدر کی موت کا بے حد افسوس ہے مجھے۔" ذونیا نے قدیر سے کہا تو اس نے ذونیا اور مہرو کو دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

"تم فٹ ہو گئے ہو، اچھا لگا۔" ذونیا نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے غیر جذباتی انداز میں کہا جبکہ مہرو خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ قدیر سمجھ گیا کہ اس کے بالکل ٹھیک ہو جانے کے بعد ذونیا اب اس سے کوئی کام لینے والی ہے۔

"آپ مجھ سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں تو مجھے بتا دو یا پھر چلا جاؤں۔" قدیر نے کوئی وقت ضائع کیے بغیر دوٹوک انداز میں کہا۔

"ہم فی الحال تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔" ذونیا نے کہا۔

"مطلب یہ مجھ سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہے۔" قدیر نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوچا۔

"ہم تینوں مل کر اجالا کو تلاش کریں گے۔" ذونیا نے مہرو اور قدیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اجالا کو تلاش کرنا بہت مشکل ہے، اجالا کو اس کے باپ کے کسی دشمن نے اغوا کیا ہے اور اس کے باپ کے بہت سارے دشمن ہیں۔" قدیر نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"میں کوئی نہ کوئی حل نکال لوں گی۔" ذونیا نے کہا اور وہاں سے چلی گئی جبکہ مہرو کچن کی طرف بڑھ گیا۔ وہ قدیر کے لیے کھانا لایا۔ جب تک قدیر نے کھانا کھایا تھا تب تک مہرو چائے بنا لایا تھا۔ مہرو اب قدیر کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ دونوں خاموشی سے چائے پینے لگے تھے۔

"تم نے ذونیا سے کام کے بارے میں کیوں پوچھا، تمہیں اس کا شکریہ ادا کر کے چلے جانا چاہیے تھا۔" مہرو نے کہا تو قدیر نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"مجھے اجالا کو تلاش کرنے کے لیے ذونیا کی مدد درکار ہے۔" قدیر نے مدہم سے لہجے میں کہا۔

"اگر تم ذونیا کے ساتھ رہو گے تو تمہاری دشمنی مزید بڑھ جائے گی۔" مہرو نے مشورہ دیتے ہوئے کہا اور پھر چائے کی چسکی لی تو قدیر نے اسے الجھے ہوئے انداز سے دیکھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ مہرو اس کے ساتھ ہمدردی جتا رہا تھا یا

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

اسے ڈرا رہا ہے۔

"دُنیا کو بتا دینا، میں آج شام یہ جگہ چھوڑ دوں گا اور پھر بہت جلد اس سے رابطہ کروں گا۔" قدیر نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا اور مہرو کے چہرے پر دیکھنے لگا۔

❖❖❖❖

شام ڈھل چکی تھی۔ قدیر سڑک کے کنارے ٹہلتا ہوا جا رہا تھا۔ مہرو نے چند ہزار روپے اس کی جیب میں ڈال دیئے تھے۔ قدیر جانتا تھا یہ چند ہزار روپوں والی مہربانی بھی دُنیا کی جانب سے کی گئی تھی۔ بہرحال وہ وقتی طور پر پیسوں کی فکر سے آزاد تھا۔ اس کے دماغ میں بس ایک ہی بات تھی کہ اس شخص تک کیسے پہنچا جائے جس نے اجالا کو اغوا کیا تھا۔ اردگرد آتے جاتے لوگوں سے بے نیاز وہ چلتا جا رہا تھا۔ تبھی اسے ایک ریستوران دکھائی دیا۔ اس نے اس ریستوران سے ڈنر کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہوٹل میں نچلے درجے کے غریب لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ وہ بھی ایک میز کے گرد بیٹھ گیا۔ ویٹر اس کے پاس آیا تو اس نے کھانے کا آرڈر لکھوا دیا۔ ویٹر سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ وہ کھانا آنے کا انتظار کر رہا تھا اور اسی دوران شکل سے ہی دکھائی دینے والے چند غنڈے ریستوران میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی کاؤنٹر پر بیٹھے شخص پر حملہ کر دیا اور اسے مارنا شروع کر دیا۔ قدیر یہ سب دیکھ رہا تھا کہ ایک غنڈے نے کاؤنٹر والے شخص کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور اسے فرش پر پٹخ دیا۔ قدیر کرسی سے اٹھا اور ان غنڈوں کی جانب بڑھا۔

"بس اب نہیں مارنا اسے۔" قدیر نے ایک غنڈے کو اشارہ کرتے ہوئے کہا جبکہ دو غنڈے فرش پر پڑے شخص کو لاتیں مار رہے تھے۔

"اوئے..... تو کون ہوتا ہے ہمیں روکنے والا۔" ان میں سے ایک غنڈے نے کہا اور قدیر کو گھونسا مارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو قدیر نے پوری قوت سے اس کے پیٹ میں لات مار دی۔ اس دوران ایک غنڈے نے اسے عقب سے گھیر لیا۔ قدیر نے ہاتھ عقب کی جانب بڑھایا اور اسے بالوں سے پکڑ لیا۔ جس غنڈے کو پیٹ میں لات ماری تھی وہ دوبارہ قدیر کی جانب بڑھا ہی تھا کہ اس نے عقب والے کے بالوں کو پوری قوت سے کھینچا تو وہ قلابازی کھاتا ہوا اس غنڈے پر گرا تھا جو بھی ابھی قدیر کی جانب بڑھا تھا۔ تیسرا غنڈہ قدیر پر حملہ آور

آپ دنیا کے کسی بھی خطے میں مقیم ہوں

ماہنامہ نئے اُفق کراچی

ہم بروقت ہر ماہ آپ کی دہلیز پر فراہم کرینگے

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے ہر کونے میں 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے

6000 روپے

مڈل ایسٹ، ایشیائی، افریقہ، یورپ کے لیے

5000 روپے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر، منی گرام، ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہیں۔ مقامی افراد

ایزی پیسہ اکاؤنٹ نمبر
0316-0128216

موبی کیش اکاؤنٹ نمبر
0300-8264242

رابطہ: طاہر احمد قریشی..... 0300-8264242

نئے اُفق گروپ آف پبلی کیشنز

81 چیمبر برکس، ہائی کلب آف پاکستان
اسٹیڈیم نزد آنچل پریس کراچی 75510

فون نمبرز: +922-35620771/2

naeyufaq.com

Info@naeyufaq.com

ہونے ہی والا تھا کہ قدیر نے اس کے چہرے پر گھونسا مارا تو وہ پیچھے کی جانب گرا تھا۔ حملہ آور غنڈوں کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ چوتھے غنڈے نے کاؤنٹر والے شخص کو چھوڑا اور پستول نکال کر اس کا رخ قدیر کی جانب کر دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ قدیر پر گولی چلاتا کاؤنٹر والے شخص اٹھا اور اس نے لکڑی کی کرسی اٹھا کر چوتھے غنڈے کے سر میں ماری تو اس کے ہاتھ سے پستول گر گیا۔ قدیر نے جست لگائی اور فرش پر گرا ہوا پستول اٹھا لیا۔ اس نے پستول کا رخ فرش کی جانب کیا اور گولی فائر کر دی۔

''چلو، بھاگ جاؤ یہاں سے ورنہ تم پر فائر کر دوں گا۔'' قدیر نے غنڈوں کو دھمکاتے ہوئے کہا تو وہ اسے گھورتے ہوئے وہاں سے چلے گئے جبکہ قدیر کاؤنٹر والے شخص کی جانب متوجہ ہوا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' قدیر نے پوچھا۔

''میرا نام گلفام ہے۔'' کاؤنٹر والے شخص نے بتایا۔

''ان غنڈوں سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟'' قدیر نے پوچھا۔

''صاحب یہ کجلا گینگ کے لوگ تھے اور مجھ سے بھتہ لینے آئے تھے۔'' گلفام نے کہا۔

''تمہیں کیسے معلوم کہ وہ کجلا گینگ کے غنڈے تھے؟'' قدیر نے پوچھا۔

''میں نے بشارت سے بولا تھا کہ ان لوگوں سے نمٹنے کی منہ مانگی قیمت دوں گا تو اس نے بتایا تھا یہ کجلا گینگ کے غنڈے ہیں اور وہ کجلا گینگ سے پنگا لینے کی حماقت نہیں کر سکتا۔'' گلفام نے قدیر کو بتایا۔

یہ گینگ کس کا ہو سکتا ہے؟ قدیر نے سوچا۔

''آپ کوئی بھی ہو، آپ نکل جاؤ یہاں سے، یہ ابھی زیادہ غنڈوں کو ساتھ لے کر آئیں گے۔'' گلفام نے قدیر سے کہا۔

''میں ان سے ڈرتا نہیں ہوں، میں ان کا انتظار کروں گا۔'' قدیر نے کہا اور ریستوران کے خارجی دروازے کے باہر کھڑا ہو گیا۔

چند منٹوں بعد ایک وین آئی اور ریستوران کے سامنے رکی۔ وین سے بارہ غنڈے نکلے۔ وہ ڈنڈے اور ہاکیاں پکڑے ہوئے تھے۔ ایک غنڈے کے اشارے پر وہ سب قدیر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ جس سمت سے وین آئی تھی قدیر اس کی مخالف سمت میں بھاگ گیا۔ وہ غنڈے بھی اس کے پیچھے بھاگے تھے۔ قدیر ایک قبرستان کی چار دیواری میں داخل ہو گیا۔ وہ چھپنے کے لیے کوئی محفوظ جگہ تلاش کر رہا تھا کہ قبرستان میں موجود درختوں پر اس کی نگاہ پڑی اور اس نے تین درختوں میں سے ایک درخت پر چڑھنے کا فیصلہ کیا۔

''کون ہو تم؟'' وہ درمیان والے درخت پر چڑھ رہا تھا کہ ایک نسوانی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو قدیر نے اوپر دیکھا۔ درخت کی شاخوں اور پتوں کے درمیان اجالا چھپ کر بیٹھی تھی۔

''تم یہاں؟'' اجالا اور قدیر ایک دوسرے کو دیکھتے ہی ایک ساتھ بولے تھے۔ جس شاخ پر اجالا بیٹھی تھی اس کے ساتھ دوسری شاخ پر قدیر بیٹھ گیا۔ اجالا اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

''میرے پیچھے بہت سارے غنڈے لگے ہیں۔'' قدیر نے کہا اور پھر اس نے ریستوران میں جو واقعہ پیش آیا تھا اس واقعہ کی تمام تفصیل اجالا کو بتا دی۔ اجالا نے قدیر کو بتایا کہ اسے قاسم نے اغوا کروایا تھا اور پھر مہر النساء کے بھائی دلشاد کا پتہ بتانے پر قاسم نے اسے چھوڑ دیا تھا۔

''قاسم نے جب مجھے چھوڑا تھا تو اس نے ایک کارندے کو میرے تعاقب پر لگا دیا تھا اور اسی کارندے کے تعاقب سے بچنے کے لیے میں یہاں چھپ کر بیٹھی ہوں۔'' اجالا نے قدیر کو مزید بتاتے ہوئے کہا اور پھر قدیر نے دیکھا کہ جو غنڈے اس کے پیچھے لگے تھے وہ اب قبرستان کی چار دیواری میں داخل ہو چکے تھے اور وہ اب قبرستان میں اسے تلاش کر رہے تھے۔

❖❖❖❖

عشرت، حق نواز صاحب کے ساتھ ہوائی جہاز کے ذریعے اسلام آباد پہنچ چکی تھی۔ ہوائی جہاز میں سفر کرنے سے اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک گھنٹہ کے لیے کسی نئی دنیا میں چلی گئی تھی۔ حق نواز صاحب عشرت کو اپنے کسی دوست کے ٹریننگ سنٹر میں لے گئے۔ ٹریننگ والا کمرہ بھی عشرت کے لیے ایک نیا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس نے آج تک ایسی دنیا دیکھی ہی کب تھی؟۔ ہر جانب بھاری مشینری پڑی تھی۔ چھت کے ساتھ کپڑے سے تیار شدہ بڑے بڑے تھیلے لٹک

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

رہے تھے۔ نجانے ان تھیلوں میں کیا بھرا ہوا تھا۔ ایک کمرہ بیڈ منٹن اور اسکوائش کے لیے مختص تھا اور درمیان میں جالی لگی تھی۔ ایک کمرے میں بڑا سا تالاب تھا جہاں تیراکی سکھائی جاتی تھی۔ ایک بڑے کمرے میں کچھ لڑکے اور لڑکیاں آپس میں لڑ رہے تھے۔ حق نواز صاحب نے عشرت کو بتایا کہ اس بڑے کمرے میں کراٹوں کی پریکٹس ہو رہی ہے۔ حق نواز صاحب نے عشرت کو بتایا کہ اسے بھی سب سے پہلے کراٹے فائیٹ ہی سیکھنا ہوگی اور اس سلسلے میں عشرت کو پہلے کراٹے فائیٹ والی موویز اور وڈیو کلپ دکھائی جائیں گی۔ حق نواز صاحب عشرت کو ایک چھوٹے کمرے میں لے گئے جہاں پر کچھ کمپیوٹرز پڑے تھے اور دیواروں پر بڑی بڑی ٹی وی اسکرینیں نصب تھی۔ حق نواز صاحب نے ایک ٹی وی اسکرین آن کی اور اس میں کراٹوں کی فائیٹ والی مووی چلا دی۔ اب عشرت کو یہ پوری مووی دیکھنی تھی۔

❖❖❖❖

قاسم کو بتایا گیا کہ مہرالنساء کو ہوش آچکا ہے۔ وہ اس کمرے میں گیا جس میں مہرالنساء تھی۔ قاسم کو دیکھتے ہی مہرالنساء کھڑی ہوگئی۔ وہ اس کے قریب آیا تو مہرالنساء دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ قاسم نے اس کی جانب قدم بڑھائے تو وہ پیچھے ہٹتے ہوئے دیوار سے لگ گئی تھی جبکہ وہ مزید قریب آگیا۔ مہرالنساء کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔

''میں تمہیں نہیں چھوؤں گا مگر نکاح تمہیں کرنا ہی ہوگا۔'' قاسم نے مہرالنساء کے کان کے قریب لفظ چبا کر کہا تو مہرالنساء نے اسے گھورا۔

''چاہے مرضی سے کرو..... یا پھر زبردستی۔'' قاسم نے کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔

''میں نہیں کروں گی۔'' اس نے چیختے ہوئے کہا تو قاسم کے ماتھے پر بل پڑے جبکہ مہرالنساء نے گہری سانس لی تھی۔

''تمہارا بھائی دلشاد اب میرے پاس ہے، اگر آپ نکاح نہیں کرو گی تو وہ زندہ نہیں رہے گا۔'' قاسم نے دھمکی خیز لہجے میں کہا تو اس نے قاسم کو پھاڑ کھانے والی نگاہوں سے دیکھا اور پھر قاسم نے اسے وہ ساری تفصیل بتا دی کہ کس طرح اس نے اجالا کو اغوا کر کے اس جگہ کا پتہ معلوم کیا جہاں دلشاد بند تھا۔ قاسم کی باتیں سن کر مہرالنساء کو پختہ یقین ہوگیا تھا کہ اب دلشاد قاسم کے پاس ہی ہے۔

''ثریا آپا۔'' قاسم آواز دیتے ہوئے کچن کی جانب بڑھا۔

''جی صاحب۔'' ملازمہ نے جواب دیا اور قاسم کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''میں کام سے جا رہا ہوں، جب تک میں نہیں آتا اس کا خیال رکھیں، بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔'' قاسم نے مہرالنساء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جی ٹھیک ہے صاحب۔'' ملازمہ نے جواب دیا۔

وہ موبائل پر نمبر ڈائل کرتا ہوا باہر کی جانب روانہ ہوگیا۔

❖❖❖❖

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اس وقت قدیر دریا کے کنارے سے کچھ فاصلے پر بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ دور سامنے دریا کے پل کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ اجالا کو اس کے کہنے پر ایس ایچ او منیر کی رہائشگاہ پر چھوڑ آیا تھا۔ اجالا اسے فون پر بتا چکی تھی کہ وہ ملک ہشام کے پاس بحفاظت پہنچ چکی تھی لیکن قدیر کے چہرے پر اب بھی پریشانی کے آثار موجود تھے۔

مجھے کجلا گینگ کے غنڈوں سے پنگا نہیں لینا چاہیے تھا، میرے پاس نہ تو دولت ہے اور نہ ہی کوئی گینگ ہے جو میری قوت بن سکے۔ قدیر اپنی سوچوں میں گم تھا کہ اس کا فون بج اٹھا۔ قدیر نے کال اٹینڈ کی تو دوسری طرف سے نسوانی آواز سنائی دی اور قدیر کو معلوم ہوا کہ فون پر اجالا بات کر رہی ہے۔

''قدیر! بابا جانی بہت پریشان ہیں۔'' اجالا نے فون پر بات کرتے ہوئے کہا تو قدیر نے ملک ہشام کی پریشانی کی وجہ دریافت کی۔

''پولیس نے صابرہ مائی کے شوہر کے قتل کے الزام میں بہرام بھائی کو گرفتار کیا ہے، اگر تم اس معاملے میں ہماری مدد کرو گے تو بابا جانی تمہیں پے کریں گے۔'' اجالا نے قدیر سے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے، میں اس بارے میں کچھ سوچتا ہوں۔'' قدیر نے کہا۔

''اور ہاں یاد آیا..... میں نے بابا جانی سے پوچھا تھا تو انہوں نے بتایا کہ کجلا گینگ کا تعلق قاسم سے ہے۔'' اجالا نے کہا اور فون کال منقطع کر دی۔

''اس کا مطلب کجلا گینگ کا سربراہ قاسم ہے۔'' قدیر

www.pakistanipoint.com

نے سوچا اور پھر اس نے وہ پستول نکالا جو اس نے ریستوران میں غنڈوں سے چھینا تھا۔ پستول کو دیکھتے ہوئے وہ دریا کے کنارے کی مخالف سمت میں کچی سڑک پر چلتا گیا۔

❖❖❖❖

مہرالنساء گم سم کھڑی تھی۔

"بی بی! آپ کچھ کھائیں گی؟" ملازمہ نے مہرالنساء سے پوچھا تو وہ چونکی۔

"پانی۔" مہرالنساء بے اختیار بولی۔

"بی بی جی! آپ میرے ساتھ آئیں۔" ملازمہ کچن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی تو مہرالنساء ملازمہ کے ہمراہ کچن میں چلی گئی تو ملازمہ نے اسے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور گلاس میں پانی ڈالا۔ مہرالنساء نے آس پاس نگاہیں دوڑائیں تو اس کی نگاہیں ایک بڑے چاقو پر ٹھہر گئیں۔ ملازمہ نے گلاس مہرالنساء کو تھمایا تو اس نے بغیر سانس لئے پورا گلاس اندر اتار لیا۔ لبوں سے چند قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس نے گہری سانس لی۔

"ایک گلاس اور مل سکتا ہے پلیز۔" مہرالنساء معصومیت سے ملازمہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"ضرور بی بی جی۔" ملازمہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور دوبارہ گلاس میں پانی ڈالنے کے لیے مڑی تو مہرالنساء نے پتھر کی سلیب پر پڑے چاقو کو دوبارہ دیکھا۔

"کتنی پیاری بچی ہے، پتا نہیں کب سے پیاسی ہے۔" ملازمہ نے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے سوچا۔

ملازمہ نے گلاس فرش پر پھینکا اور مہرالنساء کی جانب مڑی۔ مہرالنساء چاقو پکڑنے کے لیے پتھر کی سلیب کی جانب بڑھی تو اس سے پہلے کہ مہرالنساء چاقو پکڑے وہ چاقو ملازمہ نے پکڑ لیا تھا۔ ملازمہ نے بہت شفقت سے مہرالنساء کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

"بی بی جی نہ خود مشکل میں پڑو اور نہ مجھے مشکل میں ڈالو۔" ملازمہ نے شائستگی سے کہا تو مہرالنساء اسے گھورتے ہوئے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

قاسم اس کمرے میں آیا جس میں مہرالنساء تھی۔

"مہرالنساء کہاں ہے؟" قاسم نے ملازمہ سے پوچھا تو اس نے کچن کی طرف اشارہ کیا۔ قاسم کچن کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ مہرالنساء کرسی کے ساتھ مضبوط رسی سے بندھی ہوئی تھی۔ گلاس کی کرچیاں کچن کے فرش پر پڑی تھیں۔ ملازمہ نے قاسم کو بتایا کہ مہرالنساء چاقو سے اس پر حملہ کرنے والی تھی اس لیے بہتر یہی تھا کہ اسے باندھ دیا جائے۔

"پس میں نے چاقو کی نوک پر بی بی جی کو قابو کیا اور پھر رسی سے باندھ دیا۔" ملازمہ نے قاسم کو بتایا تو ملازمہ کی بات سننے کے بعد وہ ڈائننگ ٹیبل پر کہنی رکھتے ہوئے مہرالنساء کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ مہرالنساء نے اسے بے بسی سے دیکھا۔

"میں نے آپ کے بھائی کو چھوڑ دیا ہے اور اب تک وہ گاؤں پہنچ چکا ہوگا۔" قاسم نے مہرالنساء کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

"تم شاید مجھے جانتے نہیں ہو، میں یہاں کبھی نہیں رہوں گی، میں بھاگ جاؤں گی یہاں سے۔" مہرالنساء نے قاسم کے چہرے کو گھورتے ہوئے سوچا۔

جبکہ ملازمہ نے قاسم کو بتایا کہ مولوی صاحب آچکے ہیں اور نکاح کی ساری تیاری مکمل ہے۔

"آپ مولوی صاحب اور گواہوں کو یہاں کمرے میں ہی بلالیں۔" قاسم نے کہا تو ملازمہ سر ہلاتی ہوئی چلی گئی۔

"میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔" مہرالنساء غراتے ہوئے بولی تو قاسم کرسی سے اٹھ گیا۔

"ریلیکس مائے ڈارلنگ۔" قاسم اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے بولا جبکہ مہرالنساء ہاتھ ہلا کر کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"نہ آپ کے ہاتھ کھل سکتے ہیں اور نہ ہی آپ کے پاؤں، اس طرح ہاتھ ہلانے سے صرف آپ کو تکلیف ہی ہو گی۔" قاسم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا مصیبت ہے تمہیں، مجھے کھولتے کیوں نہیں ہو؟" مہرالنساء نے اسے تفصیلی نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"کھول دوں گا آپ کو جب میرا کام ہو جائے گا، ابھی تو آپ کی والدہ کو بھی بیٹے کی رہائی اور بیٹی کے نکاح کی خوشخبری دینی ہے۔" قاسم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہارا رابطہ کیسے ہوا ناہید بیگم سے؟" وہ ابرو اچکا کر بولی تو قاسم نے توبہ توبہ کہتے ہوئے اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

"آپ تو ممانی جان کو امی جان کہا کرتی تھی تو آپ کی ڈکشنری میں امی جان سے وہ ناہید بیگم کب سے ہو گئیں؟" قاسم نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"جب سے اس نے ملک ہشام سے نکاح کیا ہے تب سے اس عورت سے میرا رشتہ ختم ہو گیا۔" مہرالنساء نے کرخت مگر دھیمے لہجے میں کہا۔

"مجھ سے نکاح کے بعد آپ کس سے رشتہ ختم کریں گی؟" قاسم نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا تو مہرالنساء نے اسے پھاڑ کھانے والی نگاہوں سے دیکھا اور پھر مولوی صاحب گواہوں کے ہمراہ کچن میں آ گئے۔ قاسم نے انہیں کرسیوں پر بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا اور خود کچن سے باہر چلا گیا۔

اگلے ہی لمحے وہ فون اسکرین کو دیکھتے ہوئے دوبارہ کچن میں آیا۔ اس نے دائیں ہاتھ میں پستول پکڑا ہوا تھا۔

"مائی ڈارلنگ! زیادہ کچھ نہیں بس تین لفظ بولنے ہیں۔" قاسم مہرالنساء کے چہرے سے زلفوں کی ایک لٹ پستول کی نال سے ہٹاتے ہوئے بولا تو مہرالنساء کسمسا کر رہ گئی۔

"بدتمیز، بے غیرت، کمینے انسان! میں نے تین لفظ بول دیئے ہیں، اب مجھے کھولو۔" مہرالنساء کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

"بہت بری ہو آپ۔" وہ نفی میں سر ہلاتا ہوا بولا۔

"نکاح پڑھو ورنہ گولی چلا دوں گا۔" مہرالنساء کو گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے قاسم بولا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے میں اس کھلونے سے ڈر جاؤں گی، نہیں پڑھتی میں نکاح، تم مجھ پر گولی چلا کر دکھاؤ۔" وہ طیش میں آ کر بولی۔

"ٹھیک ہے۔" قاسم نے کہا اور جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"آہ....." مہرالنساء کراہ کر اسے دیکھنے لگی۔ گولی اس کے بازو کو چھو کر گزری تھی۔

"اگر آپ یہ سمجھ رہی ہو کہ میرا نشانہ خراب ہے تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔" وہ غصیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا جبکہ مہرالنساء نے ایک نظر اپنے بازو کو دیکھا۔ بازو سے خون ٹپک رہا تھا۔

"مولوی صاحب نکاح شروع کریں۔" قاسم نے مہرالنساء کے بازو کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ وہ اب اس کے بازو پر ہاتھ رکھے خون کو بہنے سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"قبول ہے۔" مہرالنساء قاسم کو گھورتے ہوئے بولی تو مولوی صاحب دعا مانگنے کے بعد گواہوں سمیت کچن سے باہر چلے گئے۔

"اسے زخم میں نے دیا ہے تو پٹی بھی اسے میں خود ہی کروں گا۔" قاسم نے ملازمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلاتی ہوئی مرہم پٹی کا سامان لینے چلی گئی۔

❖❖❖❖

"تم نے ایسا کیا کیا کہ صابرہ مائی نے میرے بیٹے کے خلاف دی ہوئی درخواست واپس لے لی اور پولیس نے میرے بیٹے بہرام کو رہا کر دیا۔" ملک ہشام نے قدیر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"میں نے صابرہ مائی کے ساتھ جو کچھ کیا اس سے آپ کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔" قدیر نے دوٹوک انداز میں کہا تو ملک ہشام نے قدیر کو کرنسی نوٹوں سے بھری ایک تھیلی دے دی۔

"یہ تو بہت زیادہ ہیں۔" قدیر نے کرنسی نوٹوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری بیٹی اجالا تم سے ملنے کے لیے گئی تھی تو اسے اغوا کر لیا گیا تھا۔" ملک ہشام نے بات پلٹتے ہوئے کہا۔

قدیر نے ملک ہشام کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"تم آئندہ اجالا سے نہیں ملو گے اور نہ ہی اس کے آس پاس بھٹکو گے۔" ملک ہشام نے قدیر کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

قدیر نے ملک ہشام کے ساتھ موجود محافظوں کو دیکھا اور پھر اس نے ملک ہشام کے کان میں سرگوشیانہ انداز میں کوئی بات کہہ دی۔ قدیر کے جانے کے بعد ملک ہشام کو بتایا گیا کہ قدیر کے تعاقب پر ایک آدمی کو لگا دیا گیا ہے۔ ایک اور شخص ملک ہشام کے قریب آیا۔ اس نے ملک ہشام کو بتایا کہ جب ملک ہشام کی جیپ گاؤں سے فارم ہاؤس کے لیے روانہ ہوئی تھی ایک لڑکا جیپ کا تعاقب کر رہا تھا اور اب وہ لڑکا قدیر کے تعاقب میں گیا ہے تو اس لڑکے کے تعاقب پر بھی ایک آدمی کو بھیج دیا ہے۔ ملک ہشام مطمئن ہونے کی بجائے پریشان ہو گیا۔

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

❖❖❖❖

نکاح ہو چکا تھا اور قاسم مہرالنساء کے بازو پر پٹی کر چکا تھا۔ اب مہرالنساء کا نام قاسم آفتاب کے نام کے ساتھ جڑ چکا تھا۔

مہرالنساء تھک گئی تھی۔ آنکھیں جھپکتے کھولے رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ قاسم اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''ثریا آپا! میں اس کے ہاتھ پاؤں کھولنے لگا ہوں، آپ محتاط رہیے گا۔'' قاسم نے ملازمہ سے کہا تو وہ مہرالنساء کو شرارتی انداز میں گھورتے ہوئے مسکرا پڑی۔

''اب روم میں جا کر سو جاؤ۔'' قاسم نے مہرالنساء کے ہاتھ پاؤں کھولنے کے بعد کہا۔ اب مہرالنساء رسیوں کی قید سے پوری طرح آزاد تھی۔ وہ پوری آنکھیں کھول کر کھڑی ہوئی تو ملازمہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ مہرالنساء کچھ بھی الٹا سیدھا کر سکتی ہے۔

''میں تمہارے روم میں نہیں رہوں گی۔'' مہرالنساء نے قاسم کو گھورتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔

''تمہیں میرے روم میں ہی رہنا پڑے گا۔'' وہ غراتے ہوئے بولا۔

''میں ایک ہی صورت میں تمہارے روم میں سو سکتی ہوں اگر تم وعدہ کرو گے کہ تم مجھے نہیں چھوؤ گے۔''

مہرالنساء نے تیز تیز بولتے ہوئے کہا تو قاسم نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور پھر اس سے وعدہ کر لیا۔

❖❖❖❖

ملک ہشام گاؤں سے اپنے شہر والے فلیٹ میں واپس آ چکا تھا۔ اس کے ساتھ ناہید بیگم بھی تھی۔ اس نے ناہید بیگم کو اس کی محافظ نوشین کے ہمراہ اپنے روم میں بھیجا اور خود اجالا کے روم میں چلا گیا۔

''بابا جانی! آپ اتنے غصے میں کیوں ہیں؟'' اجالا نے ملک ہشام کو دیکھتے ہی پوچھا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے فارم ہاؤس پر قدیر سے ملاقات ہوئی تھی اور اس نے مجھے ایسی بات بتائی جو تم نے مجھ سے چھپائی تھی۔'' ملک ہشام نے تلخی سے بولتے ہوئے کہا تو اجالا نے پریشان ہوتے ہوئے ملک ہشام کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''قدیر نے مجھے بتایا کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے اور تم اس سے محبت کرتی ہو، آپ دونوں شادی کرنا چاہتے ہو۔'' ملک ہشام کے لہجے میں تلخی قدرے کم ہوئی تھی۔

''وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے یہ بات تو درست ہے لیکن میں اس سے محبت نہیں کرتی مگر شادی اسی سے کرنا چاہتی ہوں۔'' اجالا نے کہا۔

ملک ہشام نے اسے غصیلی نگاہوں سے دیکھا اور روم سے چلا گیا۔

''بابا جانی! میری بات مکمل نہیں ہوئی۔'' اجالا کہتے ہوئے ملک ہشام کے پیچھے بھاگی تو اسے دروازے پر ہی روک لیا گیا۔

''بی بی جی! آپ کا اس کمرے سے باہر نکلنا ممنوع ہے۔'' دروازے کے باہر موجود تین میں سے ایک گن مین نے کہا تو اجالا شاکڈ ہوئی اور وہ اپنے کھلے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے واپس روم میں چلی گئی۔

لاؤنج میں جاتے ہی ملک ہشام نے ایک نمبر ڈائل کیا اور فون کان سے لگا لیا۔

''قدیر کے بارے میں کوئی خبر ملی؟'' فون پر رابطہ قائم ہوتے ہی ملک ہشام نے پوچھا۔

''ہمارے آدمی قدیر کو قتل کرنے ہی والے تھے کہ کسی نے ان پر حملہ کر دیا، حملہ آور نے ہمارے آدمیوں کو قتل کر دیا اور قدیر کو وہ بچا کر لے گیا۔'' دوسری طرف سے فون پر بات کرنے والے شخص نے ملک ہشام کو بتایا تو وہ مزید پریشان ہو گیا۔

''حملہ آور کون تھا؟'' ملک ہشام نے پوچھا۔

''ہمارے آدمیوں کی لاشوں کے پاس ایک سنہرے رنگ کا رومال پڑا تھا۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''مطلب وہ حملہ آور عطر رانی کا آدمی تھا۔'' ملک ہشام نے آنکھیں سکیڑے سوچا اور فون کال منقطع کر دی۔

❖❖❖❖

مہرالنساء کی آنکھ کھلی۔ آنکھیں مسلتی وہ صوفہ پر اٹھ بیٹھی۔ اس نے ایک نظر گھما کر بیڈ پر لیٹے قاسم کو دیکھا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ سانس لیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''یہاں سے بھاگنے کا اچھا موقع ہے۔'' مہرالنساء نے سوچا اور پھر قاسم کو ایک نظر دیکھا۔ وہ چپکے سے دروازے کے پاس گئی لیکن وہ لاکڈ تھا۔ اس نے ہر طرح سے دروازہ چیک کر لیا لیکن وہاں نہ کوئی ہینڈل تھا اور نہ ہی لاک۔ اسے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

وہ پھنس گئی تھی۔ اپنے بھتیجے کے قاتل کے ساتھ ایک کمرے میں رہنا اسے بہت ناگوار گزر رہا تھا۔ اسے اب گھٹن ہو رہی تھی۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا۔

''اپنے دشمن کے گھر میں تم یوں گھوڑے بیچ کر کیسے سو سکتی ہو؟'' وہ خود کو کوستے ہوئے بڑبڑائی۔

''مہر النساء! اپنی آزادی کی جنگ تمہیں خود لڑنی پڑے گی، موقع ہے بھاگ جاؤ۔'' اس نے دروازے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے سوچا۔

اس نے دل میں خود کو ہمت دی۔ اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی قاسم کے بیڈ تک پہنچ گئی۔

ایک نظر دروازے کو دیکھا جس میں کہیں کوئی ہینڈل یا کی ہول نہیں تھا۔

''یہ دروازہ کیسے کھلے گا؟ وہ دماغ پر زور ڈال رہی تھی۔

''کسی ریموٹ سے کھلتا ہوگا یا فنگر پرنٹ سے یا پھر آنکھ سے۔''

''ریموٹ سے اگر کھلتا ہے تو ریموٹ یہیں کہیں ہوگا۔'' اس نے سائڈ ٹیبل کا دراز کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' مہر النساء نے دراز بند کرتے ہوئے سوچا۔

''ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہر چیز وہ پہلے ہی چیک کر چکی تھی۔ وہ سیف کی طرف بڑھی۔ ہر لاکر میں ایک چند چیز پڑی تھی لیکن چابی یا کسی قسم کا ریموٹ نہیں ملا۔ مہر النساء کو اب حیرت ہو رہی تھی۔ روم میں کہیں بھی کوئی کی ہول نہیں تھا۔ سارے لاکرز یوں ہی کھلے پڑے تھے۔ جس میں سے ایک لاکر میں پیسے بھی پڑے تھے۔

سب کچھ بغیر لاک کے تھا تو دروازہ کیوں نہیں کھل رہا؟ مہر النساء کے دماغ میں یہ سوال اٹک کر رہ گیا تھا۔ یقیناً قاسم نے دروازے پر کوئی ایسا لاک لگایا ہے کہ اندر کسی چیز پر لاک لگانے کی ضرورت نہیں، اگر کوئی ریموٹ ہے تو اس نے اپنے تکیہ کے نیچے یا ٹراؤزر میں رکھا ہوگا۔ وہ قاسم کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ اس نے سانس روک کر ایک قدم آگے بڑھایا، اس کا ہاتھ اب قاسم کے تکیے کی طرف تھا۔ اس سے پہلے کے ہاتھ تکیے کو چھوتا سائیڈ ٹیبل پر رکھا الارم اپنے فل والیم پر بجنے لگا تھا۔ ہڑبڑاہٹ میں وہ پیچھے ہٹی۔ الارم کی آواز پر قاسم نے کروٹ بدلی اور بند آنکھوں سے ٹیبل پر ہاتھ مارا اور ہاتھ کسی نرم چیز پر جا ٹکرایا۔ اس نے فوراً آنکھیں کھولیں۔ اس کا ہاتھ ایک اور ہاتھ پر تھا۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ مہر النساء کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ جس سائڈ ٹیبل پر ایک ہاتھ رکھ کر وہ تکیہ اٹھانے کے لیے جھکی تھی وہ ہاتھ اب قاسم کے ہاتھ کے نیچے تھا۔

''آپ یہاں کیا کر رہی ہو؟'' اس نے غصے سے مہر النساء کو گھورا جواب تک اپنا ہاتھ کھینچ چکی تھی۔

''وہ..... میں.....'' مہر النساء کو الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

''کہیں آپ بھاگنے کا تو نہیں سوچ رہی تھی؟'' قاسم نے آنکھیں سکیڑ کر اسے پوچھا۔

''نن..... نہیں۔'' مہر النساء نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

قاسم بیڈ سے نیچے اترا۔ مہر النساء ایک قدم پیچھے ہٹی۔

''آپ بھاگنے کا سوچ رہی تھی۔'' وہ اب مہر النساء کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''خبردار! جو میرے پاس آئے تم۔'' وہ پیچھے ہوتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل سے جا لگی۔

''میں نے آپ کو آرام سے سمجھایا تھا کہ بھاگنے کی کوشش مت کرنا، میں ایک بار کہتا ہوں بار بار نہیں۔'' قاسم نے غراتے ہوئے کہا۔ پہلے تو مہر النساء سہم گئی لیکن پھر قاسم کو پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھنے لگی جبکہ قاسم نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''میرا ہاتھ چھوڑ دو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔'' مہر النساء پہلی بار کسی شیرنی کی طرح غرائی تھی۔ قاسم نے فوراً ہاتھ چھوڑا۔

''دوبارہ اگر آپ نے بھاگنے کی کوشش کی تو نقصان کی ذمہ دار آپ خود ہوں گی۔'' قاسم نے دھمکی خیز لہجے میں کہا۔ وہ اب خود اس سے دور جانا چاہتا تھا اور وہ چلا گیا۔

مہر النساء وہیں ڈریسنگ ٹیبل کے پاس کھڑی کھلا دروازہ دیکھتی رہی۔

کچھ بھی تو نہیں کیا تھا اس نے، نہ ریموٹ کا بٹن دبایا اور نہ کہیں فنگر پرنٹ لگایا۔ دروازہ آسانی سے کھل گیا تھا پر کیسے؟ وہ حیران ہوتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

❖❖❖❖

وہ دونوں تنگ و تاریک گلی میں سے گزرنے کے بعد ایک کھلی سی ایسی جگہ پہنچ چکے تھے جس کے اطراف میں بہت ہی عالیشان بلند و بالا عمارتیں تھیں۔ قدیر نے اس آدمی کی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

طرف دیکھا جس نے اسے موت کے منہ سے بچایا تھا اور اس نے اپنا نام فیاض بتایا تھا۔ فیاض ایک کونے میں گیا اور گھاس کا ایک بڑا حصہ زمین سے ہٹایا تو قدیر حیران ہو گیا اور سمجھ گیا کہ وہ گھاس جو اصلی گھاس جیسی دکھائی دے رہی تھی وہ تو مصنوعی گھاس تھی۔ فیاض نے قدیر کو اشارہ کیا تو قدیر نے اس جانب دوبارہ دیکھا جہاں سے فیاض نے مصنوعی گھاس اٹھائی تھی۔ وہ لکڑی کا پھاٹک تھا جو نیچے کی جانب کھل چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ کسی عمارت میں جانے کے لیے زیر زمین راستہ ہے۔ قدیر نے سوچا اور پھر وہ فیاض کو فالو کرتے ہوئے لکڑی کی سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

❖❖❖❖

''کیا مہر النساء نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا؟'' کمرے میں داخل ہوتے ہی قاسم نے ملازمہ سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا اور پھر قاسم مہر النساء کی جانب متوجہ ہوا۔ مہر النساء صوفے پر بیٹھی تھی اور وہ قاسم کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''آپ مجھے نفرت سے دیکھ رہی ہو تو میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے آپ کی نفرت کو مزید ہوا دینے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔'' قاسم نے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے انتہائی مغرورانہ انداز میں کہا تو مہر النساء کے چہرے پر حیرت اور پریشانی کے آثار نمودار ہو گئے۔

''کل آپ کی مما یعنی ناہید بیگم دلشاد سے ملنے کے لیے گاؤں گئی تھی تو میرا ایک کارندہ جو دلشاد کے ساتھ محافظ کے طور پر موجود ہے اس نے ناہید بیگم کو میرا خط دے دیا تھا۔''

قاسم نے مسکراتے ہوئے کہا تو مہر النساء آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھ رہی تھی۔

''آپ یہ نہیں پوچھو گی کہ اس خط میں کیا لکھا ہے؟''

قاسم نے استفہامیہ انداز میں کہا تو مہر النساء نے نظریں دوسری طرف پھیر لیں اور گہری سانس لی۔

''چلیں میں خود ہی بتا دیتا ہوں کہ میں نے خط کے ذریعے ناہید بیگم کو بتایا کہ اس کی بیٹی مہر النساء میرے پاس ہے اور اب وہ مجھ سے اس فون نمبر پر رابطہ ضرور کرے گی جو نمبر میں نے خط میں لکھا تھا۔'' قاسم نے خط کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا تو مہر النساء دوبارہ اس کی جانب متوجہ ہوئی اور اسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھنے لگی۔

''اوہ سوری، میں بھول گیا تھا آپ ممانی جان یعنی ناہید بیگم کو اب اپنی ماں تسلیم نہیں کرتی لیکن وہ تو آپ کو اب بھی اپنی بیٹی مانتی ہیں۔'' قاسم نے مصنوعی طور پر منہ سا بناتے ہوئے کہا تو مہر النساء کا غصہ مزید بھڑک گیا اور وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ناہید بیگم نے فون پر طلحہ سے رابطہ کیا تھا، طلحہ نے ملک ہشام کو قتل کرنے کے لیے ناہید کو دو دن کا وقت دیا ہے اور دھمکی دی ہے کہ اگر وہ ملک ہشام کو قتل نہ کر سکی تو اس کی بیٹی زندہ نہیں رہے گی۔''

قاسم نے مہر النساء کے مقابل کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو مہر النساء نے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔

''میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم اس قدر گھٹیا انسان ہو۔'' مہر النساء نے قاسم کو گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا جبکہ قاسم نے مہر النساء کو کلائیوں سے پکڑا۔

''مجھے بدتمیزیاں بالکل پسند نہیں ہیں۔'' قاسم نے اس کی گرفت سے اپنا گریبان چھڑواتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ کمرے سے نکلتے ہی وہ چھوٹے کمرے میں گیا جہاں پر طلحہ موجود تھا۔

''میں نے دبے لفظوں میں مہر النساء کو باور کروا دیا ہے کہ اس کی جان کو خطرہ ہے، اب وہ پھڑ پھڑائے گی اور بھاگنے کی کوشش کرے گی اس لیے حفاظتی اقدامات مزید سخت کر دو۔'' قاسم نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

طلحہ نے سر ہلایا۔

''میں مہر النساء کو پوری طرح بے بس دیکھنا چاہتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ وہ پوری طرح ٹوٹ کر ڈپریشن شکار ہو جائے اور میرے سامنے ہار مان لے۔'' قاسم نے کہا۔

''جی ٹھیک ہے، آپ جیسا چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔'' طلحہ نے کہا تو قاسم نے کمرے سے جانے کے لیے دروازہ کھولا تو سامنے مشرف کھڑا تھا۔

''مشرف! کب آئے تم؟'' قاسم نے مشرف سے پوچھا۔

''جی..... میں ابھی آیا ہوں۔'' مشرف نے ہکلاتے ہوئے کہا تو قاسم وہاں سے چلا گیا جبکہ مشرف کمرے میں داخل ہو گیا۔

❖❖❖❖

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

تیمور باغیچے میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ اس کا فون بج اٹھا۔ اسکرین پر حق نواز صاحب کا نام دیکھ کر فوراً کال اٹینڈ کی۔

"عشرت کی ٹریننگ کہاں تک پہنچی؟" رسمی گفتگو کے بعد تیمور نے حق نواز سے پوچھا۔

"رننگ ریس میں کامیابی کے بعد اب وہ تیراکی سیکھ رہی ہے، اس کے علاوہ وہ بھوک پیاس کی حالت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا سیکھ چکی ہے۔" حق نواز نے تیمور کو بتایا۔

"میں بہت اپ سیٹ ہوں، کوشش کریں عشرت کی ٹریننگ جلد از جلد مکمل ہو۔" تیمور نے کہا اور کال منقطع کر دی۔

❖❖❖❖

قدیر فیاض کو فالو کرتے ہوئے تہہ خانہ میں داخل ہو گیا۔ قدیر اندر سے خوفزدہ تھا۔ فیاض نے آخری کمرے کی دیوار گیر تصویر ہٹائی تو سامنے ایک دروازہ تھا۔ فیاض نے دروازہ کھولا تو اندر کا منظر کچھ یوں تھا کہ کمرے کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ کمرے کا پہلا حصہ مختلف رنگوں کی روشنیوں سے منور تھا اور دوسرا حصہ نیم تاریک تھا جبکہ تیسرا حصہ گہری تاریکی پر مشتمل تھا۔ فیاض اور قدیر روشن حصے میں کھڑے تھے جبکہ کمرے کا دروازہ خود بخود بند ہو کر لاک ہو گیا تھا۔

"عطر رانی صاحبہ! میں ملک ہشام پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ ملک ہشام نے اس نوجوان سے ملاقات کی، مختصر سی ملاقات کے بعد یہ نوجوان ملک ہشام کے فارم ہاؤس سے چلا گیا، اس کے بعد ملک ہشام کے کارندے فارم ہاؤس سے نکلے تو میں نے ان کا تعاقب کیا، ان کارندوں نے اس نوجوان پر حملہ کر دیا۔" فیاض نے قدیر کی طرف دیکھتے ہوئے عطر رانی کو ساری تفصیل بتا دی تھی جبکہ قدیر اسے متحیر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"مطلب تم نے اس کی جان بچائی ہے۔" کمرے میں نسوانی آواز گونجی تھی۔

"جی ہاں..... وہ لوگ اس کو قتل کرنا چاہتے تھے، میں نے ان کو قتل کر کے اس کی جان بچائی ہے۔" فیاض نے قدیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اب اس نوجوان کو ہمارا اصول بھی بتا دو، ہم نے جان بچائی ہے تو یہ ہمیں اپنی جان کی قیمت یعنی دو

آپ دنیا کے کسی بھی خطے میں مقیم ہوں

ماہنامہ آنچل کراچی
ماہنامہ حجاب کراچی

ہم بروقت ہر ماہ آپ کی دہلیز پر فراہم کرینگے

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے ہر کونے میں 850 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے

8000 روپے

مڈل ایسٹ، ایشیائی، افریقہ، یورپ کے لیے

6000 روپے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر، منی گرام اور ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہیں۔ مقامی افراد

اپنی پیسہ اکاؤنٹ نمبر

0316-0

www.Paksociety.com

ادا کرے یا پھر ہمارے گروپ میں شامل ہو کر کام کرے۔" نسوانی آواز ایک بار پھر گونجی تھی۔ گویا قدیر کے سامنے دو آپشن رکھ دیئے گئے تھے۔

"اگر میں دوسرے آپشن کا انتخاب کروں تو مجھے کیا کام کرنا ہوگا؟" قدیر نے خاموشی توڑتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا اور فیاض سے پوچھا۔

"ایک لڑکی کو قتل کرنا پڑے گا۔" فیاض نے سپاٹ لہجے میں کہا تو قدیر کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔

"کون سی لڑکی؟" قدیر نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"پہلے تم فیصلہ کرلو کہ تم دو لاکھ روپے دو گے یا پھر لڑکی کو قتل کرو گے؟" فیاض نے دوٹوک انداز میں کہا تو قدیر ٹھٹک گیا۔

"میں دو لاکھ روپے دینے کے لیے تیار ہوں۔" قدیر نے کہا تو اب کی بار فیاض حیرت زدہ ہو گیا۔

"اگر تم لڑکی کو قتل کرو گے تو تمہیں مزید دو لاکھ روپے ملیں گے۔" نسوانی آواز میں کہا گیا تو قدیر چونک گیا۔

"مجھے پہلے اس لڑکی کے بارے میں معلومات مہیا کی جائے تو پھر اس بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔" قدیر نے کہا تو فیاض نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک تصویر نکالی اور قدیر کی طرف بڑھا دی۔ تصویر دیکھتے ہی قدیر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں تھیں۔ وہ لمحہ بھر تصویر دیکھتا رہا تھا۔

"یہ کہاں ملے گی؟" قدیر نے فیاض کو متحیر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تصویر کے پیچھے فون نمبر لکھا ہے، اس فون نمبر پر رابطہ کر لینا، تمہیں لڑکی کا پتہ بتا دیا جائے گا۔" فیاض نے قدیر سے کہا تو اس نے ایک بار پھر تصویر کو دیکھا اور پھر فیاض سے اجازت لینے کے بعد وہاں سے چلا گیا۔

❖❖❖❖

مشرف صابی ہاؤس سے نکلا اور اب وہ کار کی طرف جا رہا تھا۔ اسے طلحہ اور قاسم کے مابین ہونے والی وہ تمام باتیں یاد آ رہی تھیں جو مشرف نے چھوٹے کمرے کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر سن لیں تھیں۔

قاسم کے الفاظ مشرف کو یاد آئے تو اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قاسم مہر النساء کی جان کا دشمن ہو گیا۔ مشرف نے کار کے پاس کھڑے ہوتے ہوئے سوچا۔ کہیں سچ میں مہر النساء کی جان خطرے میں تو نہیں ہے؟ مشرف نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے سوچا اور پھر اگلے لمحے اس دروازہ بند کیا اور دوبارہ صابی ہاؤس کی طرف بڑھ گیا۔

❖❖❖❖

ملک ہشام لاؤنج میں ناہید بیگم کے پاس بیٹھا تھا جبکہ نوشین بھی ان کے قریب کھڑی تھی۔ ملک ہشام ناہید بیگم سے کوئی بات کرنے ہی والا تھا کہ فائرنگ کی آواز سن کر وہ صوفے سے اٹھ گیا اور نوشین کو لاؤنج کا دروازہ بند کرنے کے لیے اشارہ کیا۔ نوشین دروازے کی طرف بڑھی تھی لیکن وہ دروازہ بند کرنے میں ناکام ہوئی۔ ایک نقاب پوش نے اس کے پیٹ میں لات ماری اور وہ کمر کے بل فرش پر گر پڑی تھی۔ نقاب پوش لاؤنج میں داخل ہو چکا تھا اور اس نے پستول کا رخ ملک ہشام کی جانب کر دیا تھا۔ وہ ٹریگر دبانے ہی والا تھا کہ وہ نقاب پوش چیختا ہوا فرش پر گر گیا اور لمحے وہ مر گیا۔ اس کے عقب میں اجالا پستول پکڑے کھڑی تھی۔ وہ پستول کی ساری گولیاں نقاب پوش پر فائر کر چکی تھی۔ ملک ہشام اجالا کے پاس آیا اور اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"بابا جانی! آپ نے میری نگرانی کے لیے جو گارڈز میرے کمرے کے باہر تعینات کیے تھے میں نے ان میں ایک کو یرغمال بنا لیا تھا اور پھر باقی گارڈز نے ہتھیار ڈال دیئے تھے، میں یرغمالی کو لے کر خارجی دروازے کی طرف جا رہی تھی کہ اس نقاب پوش سے سامنے ہو گیا۔" اجالا نے تیز تیز بولتے ہوئے سارے واقعہ کی تفصیل ملک ہشام کو بتا دی تو وہ لاؤنج سے باہر چلا گیا اور کچھ دیر بعد واپس لوٹا۔

"گیٹ کے باہر جو گارڈ موجود تھا وہ بے ہوش پڑا ہے جبکہ اجالا کی نگرانی پر جو گارڈز معمور تھے وہ جان بحق ہو چکے ہیں۔" ملک ہشام نے افسردہ ہوتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں سی سی ٹی وی فوٹیج چیک کرتی ہوں، جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ نقاب پوش فلیٹ میں داخل کیسے ہوا تھا۔" نوشین نے ملک ہشام سے کہا تو ناہید بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ملک ہشام اس کی جانب متوجہ ہوا تو وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ملک ہشام بھی اس کے پیچھے گیا تو وہ دونوں ایک ساتھ کمرے میں

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

داخل ہوئے۔

''ملک صاحب! قاسم نے مجھے دھمکی دی تھی کہ فلیٹ میں داخل ہونے میں اگر میں نے اس کے کارندے کی مدد نہ کی تو وہ میری بیٹی مہرالنساء کو قتل کر دے گا۔'' ناہید بیگم نے روتے ہوئے کہا تو ملک ہشام غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے ناہید کو گردن سے دبوچ لیا۔

''آپ نے اپنی بیٹی کی خاطر میری جان خطرے میں ڈال دی۔'' ملک ہشام نے غراتے ہوئے کہا اور ناہید کو بیڈ پر پٹخ دیا۔

''پلیز مجھے معاف کر دیں۔'' ناہید بیگم نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''قاسم نے آپ سے رابطہ کیسے کیا؟'' ملک ہشام نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''مجھے نہیں معلوم اس نے میرا نمبر کہاں سے لیا، اس نے مجھے فون کیا تھا اور مہرالنساء سے میری بات بھی کروائی تھی۔'' ناہید بیگم نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کی نادانی کی وجہ سے میرے چار آدمی مارے جا چکے ہیں، میری طاقت کم ہوئی ہے۔'' وہ غصے سے بولتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

❖❖❖❖

فیاض نے جس لڑکی کی تصویر قدیر کو دی تھی اصل میں وہ لڑکی ذونیا ہی تھی۔ ذونیا کو قتل کرنے کے عوض قدیر کو دو لاکھ روپے ملنے والے تھے لیکن وہ ذونیا کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ شش و پنج میں تھا۔ وہ کوئی ایسا طریقہ سوچ رہا تھا کہ ذونیا بھی زندہ بچ جائے اور اسے دو لاکھ روپے مل جائیں اور ساتھ ہی فیاض جیسے منحوس آدمی سے اسے چھٹکارا بھی مل جائے۔ وہ دونو ہتھیلیاں ٹیبل پر رکھے ہوئے، ٹیبل پر وزن ڈالے ہوئے آگے کی جانب جھک کر کھڑا تھا۔ چند ہی منٹوں بعد قدیر کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ شاید اس نے کچھ ایسا سوچ لیا تھا جیسا وہ چاہتا تھا۔

❖❖❖❖

مشرف اس کمرے میں پہنچ چکا تھا جہاں مہرالنساء تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مشرف نے ملازمہ کے منہ اور ناک پر کلوروفام لگا رومال رکھ کر اسے بے ہوش کر دیا اور اب وہ مہرالنساء کی جانب متوجہ ہوا۔

''میں نے قاسم کو طلحہ کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے سنا ہے، وہ تمہارا قتل کر دے گا اس لیے میں نے تمہیں یہاں سے فرار کروانے کا بندوبست کر لیا ہے۔'' مشرف نے مہرالنساء کی کلائی پکڑتے ہوئے اسے بتایا تو مہرالنساء نے مشرف کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ مشرف کو گھورتے ہوئے اپنی کلائی کو ایسے سہلا رہی تھی جیسے مشرف کا ہاتھ کلائی کو لگنے سے اسے کرنٹ لگا ہو۔

''مجھے کہیں نہیں جانا، قاسم مجھے قتل نہیں کر سکتا، وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔'' مہرالنساء نے کہا تو مشرف شش و پنج کا شکار ہو گیا۔

''اچھا ٹھیک ہے، پلیز قاسم کو مت بتانا کہ میں نے تمہیں فرار کروانے کی کوشش کی تھی۔'' مشرف نے خوفزدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''اوکے، تم جلدی جلدی یہاں سے چلے جاؤ۔''

مہرالنساء نے اسے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ مشرف کے جانے کے بعد مہرالنساء نے ملازمہ کی طرف دیکھا جو کہ بے ہوشی کی حالت میں فرش پر پڑی تھی۔ وہ ملازمہ کو گھسیٹتے ہوئے کچن میں لے گئی اور اسے اسی رسی سے کرسی کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا۔ وہ کمرے سے باہر آئی۔ لاؤنج سے گزرنے کے بعد وہ ایک راہداری سے گزرتے ہوئے شیشے کے بہت بڑے دروازے کے پاس پہنچ گئی۔ دروازے کے باہر کافی سارے غنڈہ قسم کے مسلح افراد موجود تھے۔ شیشے میں سے وہ انہیں دیکھ رہی تھی۔

❖❖❖❖

ذونیا کو ہوش آیا تو اس نے خود کو بیڈ پر لیٹا ہوا پایا۔ وہ اپنے اردگرد ماحول کا جائزہ لے رہی تھی۔

''میں بے ہوش کیسے ہوئی تھی؟'' اس نے سوچا اور پھر اٹھ کر بیٹھی تو اس کے سر کے پچھلے حصے میں شدید درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں اور وہ بے بس ہو کر دوبارہ لیٹ گئی۔ چند لمحوں بعد اسے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی تو وہ چونک پڑی۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اس کے سامنے قدیر کھڑا تھا۔ قدیر کو دیکھ کر ذونیا مزید حیرت زدہ ہو گئی۔

''میں یہاں کیسے پہنچی؟'' ذونیا نے قدیر سے پوچھا۔

''میں تمہیں بے ہوش کر کے یہاں لایا تھا؟'' قدیر نے کہا تو ذونیا نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

"فیاض نامی شخص نے تمہیں قتل کرنے کے لیے مجھے سپاری کا لالچ دیا تھا مگر میں تمہارے احسانات کو بھلا نہیں پایا۔" قدیر نے کہا جبکہ فیاض کا نام سنتے ہی ذونیا چونک گئی۔

"فیاض تو عطر رانی کا کارندہ ہے۔" ذونیا نے قدیر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ تو بہت خطرناک لوگ ہیں، ان سے تمہاری ملاقات کیسے ہوئی؟" ذونیا نے قدیر سے پوچھا۔

"مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا اور فیاض نے میری جان بچائی تھی۔" قدیر نے ذونیا کو بتایا۔

"تم نے مجھے قتل نہیں کیا تو اب وہ تمہاری جان کا دشمن ہو جائے گا۔" ذونیا نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"میں اس کے ساتھ چال ہی ایسی چلوں گا جب اسے سمجھ آئے گی کہ میں نے اسے دھوکا دیا ہے تب تک ہم دونوں بہت دور جا چکے ہوں گے۔" قدیر نے کہا تو ذونیا کی پریشانی قدرے کم ہوگئی۔

❖❖❖❖

"میں قدیر کا تعاقب کرتے ہوئے ایک ہال میں گیا تھا تو وہاں دھواں ہی دھواں تھا، دھواں کی وجہ سے مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اس لیے میں قدیر کا مزید تعاقب جاری نہ رکھ سکا۔" فیاض نے فون پر بات کرتے ہوئے عطر رانی کو بتایا۔

"کیا قدیر نے ذونیا سے ملاقات کی تھی؟" عطر رانی نے پوچھا۔

"جی..... میں نے اسے ملاقات کرتے دیکھا تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے ہوں۔" فیاض نے عطر رانی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تو ساتھ ہی اس کا دوسرا فون بجنے لگا۔

"دوسرے فون پر قدیر کی کال آ رہی ہے۔" فیاض نے عطر رانی سے کہا اور کال منقطع کر دی۔ اب اس نے قدیر کی فون کال اٹینڈ کی۔

"میں نے ذونیا کو قتل کر دیا ہے۔" قدیر نے کہا۔

"مجھے اس کی لاش چاہیے۔" فیاض نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"لاش بھی مل جائے گی پہلے تمہیں جو پتہ سینڈ کیا ہے اس پتہ پر دو لاکھ روپے بھیج دیں۔" قدیر نے کہا اور کال منقطع کر دی۔

❖❖❖❖

فیاض قدیر کو دو لاکھ روپے بھیج چکا تھا اور اب وہ عطر رانی اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ اس جگہ پہنچ گیا جہاں پر ذونیا کی لاش لکڑی کے پھٹے پر پڑی تھی۔ ذونیا کی لاش خون آلود تھی حتیٰ کہ اس کے چہرے کی شناخت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ فیاض نے اس کے چہرے سے خون صاف کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ پورا ہال فائرنگ سے گونج اٹھا۔ عطر رانی اور اس کے ساتھی خوفزدہ ہو گئے۔

"رانی کی حفاظت کرو۔" فیاض نے زور سے آواز لگائی۔

لاش کا چہرہ صاف کرنے پر فیاض کو معلوم ہوا کہ وہ لاش ذونیا کی نہیں بلکہ کسی اور لڑکی کی ہے۔ وہ بھاگنے کے لیے واپس مڑا ہی تھا کہ قدیر نے اس کے سینے میں تین گولیاں اتار دیں اور وہ دھڑام کی آواز کے ساتھ فرش پر گر گیا۔ اس نے اپنے دائیں جانب دیکھا جہاں مہرو اور ذونیا کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوف تھی۔

"مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ ہم نے اتنے بڑے گینگ کا خاتمہ کر دیا۔" مہرو نے ہال میں بچھی لاشوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"گینگ کا خاتمہ نہیں ہوا، ذرا غور کرو یہاں پر عطر رانی کی لاش نہیں ہے۔" ذونیا نے افسردہ ہوتے ہوئے کہا۔

"مطلب عطر رانی بچ کر فرار ہو گئی۔" قدیر نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"چلو یہاں سے جلدی نکلو، دوسری صورت میں ہم پر جوابی حملہ بھی ہو سکتا ہے۔" ذونیا نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا تو مہرو اور قدیر نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے سر کو جنبش دی۔

❖❖❖❖

قاسم صابی ہاؤس میں داخل ہو رہا تھا تو اسے بتایا گیا کہ اس کی بیوی مہر النساء نے فرار ہونے کی ناکام کوشش کی ہے۔

"مجھے سی سی ٹی وی فوٹیج دیکھنی چاہیے تاکہ معلوم ہو سکے کہ مہر النساء نے فرار ہونے کی کوشش کی کیسے؟"

قاسم نے سیکیورٹی روم کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا۔ جب وہ سیکیورٹی روم میں پہنچا تو اس کی حیرت انتہا پر تھی۔ دونوں اسکرینیں اور تمام کمپیوٹر آف تھے جبکہ سیکیورٹی روم کا عملہ بے ہوش تھا۔ قاسم نے مین کمپیوٹر آن کیا تو اسے معلوم ہوا

www.waqarazeem.pk
www.pakistanipoint.com

کہ کمپیوٹر کا تمام ڈیٹا اور سی سی ٹی وی فوٹیج ڈیلیٹ ہو چکی تھیں۔

''سارے کمپیوٹرز، کیمرے آف کر دیئے، ساری فوٹیج بھی ڈیلیٹ ہیں، یہ سب مہرالنساء اکیلی نہیں کر سکتی، ضرور اندر کا کوئی آدمی اس کی مدد کر رہا ہے۔'' قاسم نے سوچا اور پھر چھوٹے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ چھوٹے کمرے میں گیا تو وہاں پر طلحہ اور مشرف بے ہوش پڑے تھے۔

''یہ دونوں بھی بے ہوش پڑے ہیں۔'' وہ سوچتا ہوا چھوٹے کمرے سے نکل کر اس کمرے کی طرف چلا گیا جہاں پر مہرالنساء تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ مہرالنساء کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ بے ترتیب انداز میں بیڈ پر لیٹی تھی۔

''آپ یہاں سے جانا چاہتی ہو؟'' قاسم نے سخت لہجے میں پوچھا تو مہرالنساء نے سر اٹھا کر قاسم کی طرف دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلایا۔

''چلو اٹھو اور ابھی یہاں سے چلی جاؤ۔'' قاسم نے انگلی سے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو مہرالنساء اٹھ کر بیٹھ گئی اور اسے متحیر نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اسے قاسم کا یہ رویہ بالکل بھی سمجھ نہیں آیا تھا۔ اس نے بیڈ سے اترنے کے بعد جوتا پہن کر قاسم سے نظریں چراتے ہوئے دروازے کی طرف چل پڑی۔

''رکو۔'' قاسم نے کہا تو مہرالنساء رکنے کی بجائے آگے بڑھتی گئی اور پھر کمرے سے باہر چلی گئی۔

مہرالنساء کے جانے کے بعد قاسم فوراً صابی ہاؤس سے باہر آیا اور صابی ہاؤس کے باہر موجود مسلح افراد کی طرف متوجہ ہوا۔

''مہرالنساء کس طرف گئی ہے؟'' قاسم نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

مسلح افراد میں سے ایک شخص نے اس جانب اشارہ کیا جس جانب مہرالنساء گئی تھی۔

❖❖❖❖

''اقراش حیاتی کو خبر دو کہ میں آیا ہوں۔'' ملک ہشام نے ایک ہال نما کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک کارندے سے کہا تو وہ فون پر اقراش حیاتی کا نمبر ڈائل کرنے لگا تھا۔ اس نے فون پر مختصر گفتگو کی اور پھر کچھ فاصلے پر کھڑے شخص کو اشارہ کیا تو وہ شخص سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ چند منٹوں بعد وہ شخص دوبارہ واپس آیا اور اس نے ملک ہشام کو سنگترے کا شربت پیش کیا۔ ملک ہشام شربت پی رہا تھا کہ اسی دوران اقراش حیاتی وہاں آ گیا۔

''تمہارے ذمے دو کام لگائے تھے؟'' ملک ہشام نے اقراش حیاتی سے مصافحہ کرتے ہوئے استفہامیہ انداز میں کہا۔

''کئی دنوں سے مشرف کے آفس کی نگرانی جاری ہے لیکن اس کا آفس بند ہے اور دوسری طرف راشد نامی شخص کا تعاقب جاری ہے جو بشارت کے لیے کام کرتا تھا لیکن پچھلے کئی دنوں سے اس نے بشارت سے کوئی ملاقات نہیں کی۔'' اقراش حیاتی نے ملک ہشام کو صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''مشرف کے آفس کی نگرانی جاری رکھو اور راشد کو دوبارہ اٹھا کر یہاں لے آؤ۔'' ملک ہشام نے اقراش سے کہا اور پھر خالی گلاس میز پر رکھ دیا۔

ملک ہشام جب اقراش سے ملاقات کے بعد واپس اپنے فلیٹ میں لوٹا تو ناہید بیگم لاؤنج میں اس کی منتظر تھی جبکہ دوسرے صوفے پر نوشین بیٹھی تھی۔ ملک ہشام نے گھڑی پر ٹائم دیکھا تو رات کے دو بج رہے تھے۔

''آپ ابھی تک سوئی نہیں ہیں؟'' ملک ہشام نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا

''میں ابھی تک بھوکی ہوں۔'' ناہید بیگم نے ملک ہشام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو ملک ہشام نے اسے ایک نظر دیکھا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ناہید بیگم صوفے سے اٹھی اور تیز تیز قدموں سے ملک ہشام کے پیچھے گئی۔ ملک ہشام کمرے میں داخل ہوا تو ناہید نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے بیڈ کی طرف لے گئی جبکہ نوشین دروازے کے باہر ہی رک گئی۔

''آپ کب تک ناراض رہیں گے مجھ سے؟'' ناہید نے ہشام کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''قاسم نے آپ کو دھمکایا تھا تو آپ کو کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے مجھ سے مشورہ کرنا چاہیے تھا لیکن آپ کو تو مجھ پر بھروسہ ہی نہیں۔'' ملک ہشام نے منہ سا بناتے ہوئے کہا اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو ناہید اٹھی اور الماری کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے دراز کھولی اور اس سے نہایت ہی خوبصورت ڈائری لے کر آئی اور ملک ہشام کے پاس بیٹھ گئی۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

''اس ڈائری کے ہر صفحے پر آپ کا نام لکھا ہوا ہے، اب اگر آپ نے ناراضگی ختم نہ کی تو میں یہ ڈائری جلا کر راکھ کر دوں گی۔'' ناہید بیگم نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا۔

''آپ نے بہت محنت سے یہ ڈائری لکھی ہے تو میں یوں ہی آپ کی محنت کو ضائع نہیں ہونے دوں گا۔'' ملک ہشام نے ناہید کے ہاتھ سے ڈائری لیتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ مجھ پر بھروسہ کرنے کا وعدہ کرلیں تو میری ناراضگی خود بخود ختم ہو جائے گی۔'' ملک ہشام نے ناہید کا ہاتھ پکڑ کر مسکراتے ہوئے کہا تو ناہید نے ہشام سے وعدہ کرلیا کہ وہ اس پر مکمل بھروسہ کرے گی اور آئندہ کوئی بھی اہم قدم اٹھانے سے پہلے ہشام سے مشورہ ضرور کرے گی۔

❖❖❖❖

مشرف کی کار تیمور کے آفس کے سامنے رکی۔ مشرف نے اپنے ڈرائیور نبیل کو کار میں رکنے کے لیے کہا اور خود ایک فائل لے کر آفس میں چلا گیا۔ مشرف کو اپنے آفس میں دیکھ کر تیمور حیران ہوگیا۔

''تمہیں آج میرے آفس کا راستہ کیسے یاد آگیا؟'' تیمور نے مشرف سے پوچھا۔

''اصل میں مجھے تم سے ایک ضروری کام تھا۔'' مشرف نے کہا اور اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے تیمور کی طرف دیکھا۔

''میں نے کسی مفاد کے بغیر تم سے دوستی کی تھی لیکن تم نے میری دوستی کا خوب مذاق اڑایا۔'' تیمور نے شکوہ سا کرتے ہوئے کہا۔

مشرف کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوگئے۔

''اب ایسا تو نہیں بولا میں نے۔'' تیمور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں نے ایک فلیٹ خریدا تھا اور اب میں وہ فلیٹ فروخت کرنا چاہتا ہوں لیکن اس فلیٹ پر ملک ہشام کے کارندوں کا قبضہ ہے۔'' مشرف نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''تم چاہتے ہو وہ فلیٹ میں خرید لوں اور میرے پاپا ملک ہشام کا قبضہ ختم کروالیں گے۔'' تیمور نے کہا تو مشرف نے اثبات میں سر ہلایا۔

''سوری! جو تم چاہتے ہو ویسا کچھ ممکن نہیں، آج کل میرے پاپا اور ملک ہشام کے تعلقات خراب ہیں۔'' تیمور نے کہا۔

''اگر تم میرے ساتھ دوستی بحال کرلو اور میری مدد کرو گے تو میں تمہیں مہرالنساء کا پتہ بتا دوں گا۔'' مشرف نے دوٹوک انداز میں کہا تو تیمور سوچ میں پڑ گیا اور لمحہ بھر تفکر کے بعد تیمور نے مشرف سے فائل لے لی۔

''مہرالنساء قاسم کے پاس ہے اور قاسم مہرالنساء سے نکاح کر چکا ہے۔'' مشرف نے کہا تو تیمور حیرت زدہ ہوگیا۔

''تمہارا کام ہو جائے گا تم اب جا سکتے ہو۔'' تیمور نے آنسوؤں کا گولا نگلتے ہوئے کہا تو مشرف مسکرایا اور بائے بول کر آفس سے باہر نکل گیا جبکہ تیمور بے آواز رونے لگا تھا۔

مشرف آفس سے نکل کر اپنی کار کی طرف گیا تو وہ حیران ہوگیا۔ اس کا ڈرائیور نبیل کار سے غائب تھا۔ مشرف نے فون پر نبیل کا نمبر ڈائل کیا۔ ''یہ نبیل کہاں گیا اور میرا فون کیوں نہیں اٹینڈ کر رہا۔'' مشرف نے بار بار نبیل کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے سوچا اور پھر کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر سوار ہوگیا۔

❖❖❖❖

ملک ہشام کو فون پر بتایا گیا کہ اقراش حیاتی کے کارندے مشرف کے ڈرائیور نبیل اور راشد کو اٹھا کر لے آئے ہیں۔ فون کال منقطع کرنے کے بعد ملک ہشام اپنے محافظوں کے ہمراہ اس عمارت میں پہنچ گیا جہاں راشد اور نبیل کو رکھا گیا تھا۔

''کچھ بتایا انہوں نے؟'' ملک ہشام نے نبیل اور راشد کی طرف دیکھتے ہوئے اقراش حیاتی سے پوچھا۔

''راشد نے بشارت کا فون نمبر بتایا ہے لیکن وہ کسی بھی نمبر سے کال اٹینڈ نہیں کر رہا جبکہ نبیل نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔

''نبیل کو چھت کے ساتھ الٹا لٹکا دو اور جب تک یہ قاسم کا پتہ نہیں بتاتا اسے الٹا لٹکائے رکھو۔'' ملک ہشام نے نبیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو دو آدمی نبیل کی طرف بڑھے ہی تھے کہ نبیل نے کہا کہ وہ قاسم کا پتہ بتانے کے لیے تیار ہے۔ ملک ہشام نے دونوں آدمیوں کو رکنے کے لیے اشارہ کیا اور پھر نبیل نے صابی ہاؤس کا پتہ بتا دیا۔

❖❖❖❖

قاسم دو مسلح افراد کے ہمراہ بی ایم ڈبلیو میں سوار ہوا۔ جونہی گاڑی نے روڈ کا رخ کیا تو قاسم نے فون پر مشرف کا

www.paksociety.com

نمبر ڈائل کیا۔

"جی محترم!" رابطہ قائم ہوتے ہی دوسرے طرف سے مشرف نے کہا۔

"یار! میں نے جذباتی ہو کر مہرالنساء کو جانے کے لیے بول دیا تھا اور وہ سچ میں چلی گئی۔" قاسم نے فون پر بات کرتے ہوئے مشرف سے کہا۔

"مہرالنساء کہاں جاسکتی ہے؟" مشرف نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ کہاں گئی ہوگی؟" قاسم نے پوچھا۔

"وہ سی مون ہوٹل جاسکتی ہے یا پھر تیمور کے آفس۔" مشرف نے کہا۔

"تم تیمور کے آفس جاؤ اور میں سی مون ہوٹل جا کر دیکھتا ہوں۔" قاسم نے کہا اور کال منقطع کر دی۔

❖❖❖❖

مہرالنساء سی مون ہوٹل کے کمرہ نمبر ایک سو چار میں گئی۔ اس نے کچھ ضروری سامان اور اپنی چیک بک لی اور وہاں سے چلی گئی۔ اب وہ روڈ پر ٹیکسی یا رکشہ کے انتظار میں کھڑی تھی کہ ایک طرف سے بشارت آرہا تھا۔ وہ مہرالنساء کو دیکھ کر بے اختیار مسکرا پڑا۔

"میری تو پھر سے لاٹری لگنے والی ہے، میں مہرالنساء کو دوبارہ اغوا کروں گا اور اب کی بار پورے دس لاکھ روپے وصول کروں گا۔" وہ شرارتی لہجے میں بڑبڑایا اور پھر اس نے فون پر ایک نمبر ڈائل کیا۔

"یار! اپنی وین لے کر جلدی سے رنگ روڈ پر آجاؤ۔" بشارت نے فون پر بات کرتے ہوئے کہا۔

"یار! پہلے تم رنگ روڈ پر آؤ پھر تمہیں بتاتا ہوں کہ کہاں آنا ہے۔" بشارت نے کہا اور کال منقطع کر دی۔

فون جیب میں ڈالتے ہوئے بشارت مہرالنساء کی جانب متوجہ ہوا تو وہ رکشہ میں سوار ہو چکی تھی۔ بشارت کی قسمت بھی اس کا خوب ساتھ دے رہی تھی۔ ایک رکشہ نے اسے بھی پک کر لیا تھا۔ اس نے رکشہ والے کو پانچ سو روپے کا نوٹ دیا اور جس رکشہ میں مہرالنساء سوار ہوئی تھی اس رکشہ کا تعاقب کرنے کو کہا۔

رکشہ اب ایک بینک کے سامنے رکا تھا۔ کچھ رقم کیش کروانے کے بعد وہ دوبارہ رکشہ میں سوار ہوئی جبکہ بشارت مسلسل اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

❖❖❖❖

مشرف مہرالنساء کو تلاش کرتے ہوئے تیمور کے آفس پہنچا اور تیمور سے رسمی گفتگو کی۔

"تم مجھے اس جگہ کا پتہ بتا سکتے ہو جہاں مہرالنساء ہے؟" تیمور نے پوچھا تو مشرف کو اندازہ ہو گیا کہ مہرالنساء ابھی تک تو یہاں نہیں آئی۔ مشرف نے لمحہ بھر کے توقف کے بعد اسے صابی ہاؤس کا پتہ بتا دیا۔ تیمور نے مشرف سے اس کے آنے کی وجہ دریافت کی تو مشرف کے بقول اس کی آمد کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ مشرف نے کولڈ ڈرنک نکال کر اسے دی۔

"تم یہ کولڈ ڈرنک پیو میں تھوڑی دیر تک واپس آتا ہوں۔" تیمور نے کہا اور پھر آفس سے چلا گیا۔ تیمور کے جانے کے چند منٹوں بعد مہرالنساء آفس میں آئی اور وہاں مشرف کو دیکھتے ہی وہ آگ بگولہ ہو گئی۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو اور تیمور کہاں ہے؟" مہرالنساء نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

"میں یہاں تیمور صاحب کا انتظار کر رہا ہوں۔" مشرف نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔

اسی دوران بشارت نے آفس بوائے کے منہ پر کلوروفام لگا رومال رکھا تو وہ بے ہوش ہو کر بشارت کے بازوؤں میں جھول گیا۔ اس نے محتاط انداز میں اسے فرش پر لٹایا اور پھر اپنی جیب سے پلاسٹک سے بنا ایک چھوٹا سا پسٹل نکالا اور اس کا ٹریگر دبایا تو سوئی نما کیپسول پستول کی نال سے نکلا اور مہرالنساء کی گردن سے ٹکراتے ہی وہ اس کی گردن میں جذب ہو گیا۔ چند سیکنڈز بعد مہرالنساء بے ہوش ہو کر فرش پر گر گئی۔ دھڑام کی آواز سنتے ہی مشرف کرسی سے اٹھا اور مہرالنساء کی طرف متوجہ ہوا۔ اس سے پہلے وہ بشارت کی طرف دیکھتا، بشارت نے دوسری بار ٹریگر دبا دیا۔

www.pakistanipoint.com

سات سلام

صفدر علی حیدری

اللہ کی قدرت میں تو ویسے ہر چیز ہے مگر پانچ خاص کام ایسے ہیں جو اس انسانوں پر نہیں چھوڑے۔ ہوا، پانی، موت، زندگی اور بارش اگر یہ چیزیں انسان کے اختیار پر چھوڑ دی جاتیں تو یہ انسان زمین کو مزید تنگ کردیتا۔

زیر نظر کہانی بھی ایک ایسے انسان کی ہے جس نے ظلم و زیادتی کے ستم اپنوں سے دیکھے تھے۔

زمینی ناخداؤں کے ظلم کی داستان عبرت

عمر یہی کوئی نو دس برس کی رہی ہوگی۔ مئی کی ایک تپتی ہوئی دوپہر میں گلی کی نکڑ پر چیتھڑوں میں ملبوس ایک شکستہ دیوار کے سہارے یوں ٹیک لگائے کھڑا تھا کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل لگتا تھا کہ کس نے کسے سہارہ دے رکھا ہے۔ چوٹی سے ایڑی تک پسینے میں بھیگا وہ لڑکا شاید کسی گہری سوچ میں ڈوبا تھا کملائے ہوئے زرد چہرے پر نظر پڑتے ہی معلوم ہوجاتا تھا کہ وہ شش و پنج کا شکار ہے۔ شاید کسی نتیجے تک پہنچنے میں دشواری کا اسے سامنا تھا۔ مگر پیٹ کو حالات کی سنگینی کی بھلا کیا فکر۔ چہرے پر لکھی بھوک کی تحریر تو شاید کوئی نابینا بھی پڑھ لیتا۔

کئی پہروں سے خوراک پر پہرہ تھا۔ سو حالت ایسی تھی کہ اب گرا کہ تب۔ دیوار کی طرح وہ بھی اپنے حالات سے لڑتے لڑتے عاجز آ گیا تھا۔ اب پتا نہیں دونوں میں کوئی پہلے شکست قبول کرنے والا تھا۔ بھوک اس کی کئی برس کی ساتھی تھی لیکن آج کل تو حد ہی ہوگئی تھی۔ اس نے کل صبح ناشتے میں ایک روٹی کھائی تھی جس پر اس کی سوتیلی ماں نے سرخ مرچیں ڈال دی تھیں۔ وہ گھی کا تقاضا کرتے کرتے رہ گیا۔ باپ کی تیز نظروں سے گھبرا کر وہ جلدی جلدی وہی

ایک روٹی نگل گیا۔ مرچوں نے پیٹ کی آگ کچھ اور بڑھائی تو بے ساختہ اس کا ہاتھ دوسری روٹی کی طرف بڑھا تھا، اور پھر زناٹے دار تھپڑ نے اس کے اسی ہاتھ کو اس کی گال تک پہنچا دیا تھا۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے باپ کی طرف دیکھا ہی تھا کہ دوسرے گال پر ایک اور تھپڑ پڑا اور پھر تو جیسے تھپڑوں کی بارش ہونے لگی۔ چند ہی لمحوں میں باپ نے روٹی کی دھنک کر رکھ دیا۔ بدقت تمام وہ وہاں سے بھاگا تھا اور پھر دروازے سے ٹکرا کر گلی میں آن گرا تھا۔ سوتیلے باپ کی شفقت سے یہ چوٹ ہی بھلی تھی۔ شام تک اسے سگے باپ کے گھر جانے کی ہمت نہ ہو پائی تھی۔

رات کو گھر میں آیا تو سوتیلی ماں استقبال کے لیے گویا تیار بیٹھی تھی۔ شوہر کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے بھی خوب ہاتھ سینکے۔ وہ چند لمحے بھی ٹھہر نہ پایا اور روٹی کی بجائے مار کھا کے گھر سے واک آؤٹ کر گیا۔ رات اس نے دور پار کے کسی چچا کے ہاں گزاری۔ روٹی کا پوچھا گیا تو جانے کیا سوچ کر کہہ دیا کھالی ہے۔ جلدی سے چارپائی پر پڑ رہا اور صبح سویرے منہ اندھیرے ناشتہ کیے بنا گھر سے باہر نکل آیا۔ اور تب سے اب تک کسی آوارہ کتے کی طرح ادھر سے ادھر چکراتا پھر رہا تھا۔ ٹانگوں نے دہائی دی تو دیوار کے سہارہ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ تھا اور پہروں کی بھوک۔

”اب تک تو سوتیلی ماں نے کھانا کھا بھی لیا ہوگا اور اب تو وہ لوگ قیلولے کو لیٹ بھی گئے ہوں گے۔“ اس نے سوچا۔

یہی مناسب وقت ہے چوروں کی طرح گھر جا کر بچی کھچی روٹی پر حملہ آور ہونے کا۔ یہ سوچا ہی تھا کہ آپ ہی آپ اس کے قدم گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ لیکن اچانک باپ کی سرخ سرخ ابلی ہوئی آنکھیں تصور کی سلیٹ پر ابھریں تو زمین نے گویا اس کے دونوں قدم جکڑ لیے۔

”کیا کل کی خاطر تو اصح بھول گئے؟“ اس کے اندر ایک سسکتی ہوئی سرگوشی گونجی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ وہ بت کی طرح ساکت وصامت تھا کہ یکا یک جانے کیا جی میں آئی کہ سرپٹ دوڑ پڑا۔ کب اس نے گلیاں عبور کیں، کب مین روڈ پر آیا، کیسے اس کا رخ شہر کے مضافاتی علاقے کی طرف ہو گیا، اور کب وہ شہر سے خاصا دور نکل آیا؟ اسے کچھ خبر نہ تھی۔ وہ تو بس سرپٹ دوڑا چلا جاتا تھا۔ دوڑتے دوڑتے بدن میں جان نہ رہی تو ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ اپنے چہرے کو ہتھیلیوں کی اوٹ میں چھپا نہ لیتا تو کچلا جاتا۔ اور ہاتھ بھی کون سا اس نے خود سے آگے کیے تھے۔ وہ تو قدرتی طور پر اس کی مدد کو آگے آئے تھے۔

ہتھیلیوں پر گہری چوٹ آئی تھی لیکن وہ اپنے حواسوں میں ہی کب تھا کہ خود کو ٹٹولتا، جانے کتنی دیر دھوپ میں سڑک پر پڑا سانسوں کی تیز گونج سنتا رہا۔ دل تو آج لگتا تھا اس کی پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ جب سانس کچھ بحال ہوئی اور تھوڑی توانائی وجود میں جاگی تو بدقت تمام اٹھا اور سائے کی تلاش میں ادھر سے ادھر اس کی نگاہیں بھٹکنے لگیں۔ پکی اینٹوں کی سولنگ کے اس پار نشیب میں اسے جال کا ایک قدیم درخت دکھائی دیا جو اونچے ٹیلے پر فاتحانہ انداز سے اپنا وجود پھیلائے کھڑا تھا۔ بے اختیار اس کے قدم اس جانب اٹھ گئے۔ دو قدم اٹھائے تھے کہ ٹانگوں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ گرنے سے خوب مجروح ہوئی تھیں۔ لنگڑاتا ہوا جیسے تیسے جال کی آغوش میں پہنچ کر زمین پر ڈھے سا گیا۔ بھوک کا عذاب کیا کم تھا کہ درد بھی اس کا ساتھی بن کر آ گیا تھا۔ بوجھ لگنے والی زندگی اب کسی عذاب سے بڑھ کر محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کاش اسے نیند آ جائے اور وہ ایسا سوئے کی کبھی آنکھ نہ کھلے۔

جوڑ جوڑ ہل گیا تھا۔ سائے کی ٹھنڈک نے اس کے کچھ اوسان بحال کیے تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جال کی سمت نگاہ دوڑائی تو کچھ آگے اندر کی طرف ایک قبر دکھائی دی۔ ایک سبز غلاف اس پر پڑا تھا اور اس پر کسی نے اس خیال سے جگہ جگہ مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے رکھ دیے تھے کہ غلاف ہوا سے اڑ نہ جائے۔ شاید کسی بزرگ کا مزار تھا۔ کسی غیر معروف گمنام بزرگ کا مزار۔ جبھی تو اس ویرانے میں ایک سبز سا غلاف ہی کچھ امتیاز پیدا کر رہا تھا۔ ہاں قبر کے پاس ہی ایک لکڑی کا بکس ضرور موجود تھا۔ خستہ سی اس صندوقچی کا سبز رنگ اڑ سا گیا تھا اور اب وہ ایک نئی لک دے رہا تھا۔ صندوقچی پر ایک بڑا سا زنگ آلود تالا پڑا تھا۔ بزرگ کی مزار کے اوپر جال کی جھکی ٹہنیوں پر مختلف رنگوں کے کپڑے کی دھجیاں سی بندھی تھیں۔ شاید عقیدت مندوں نے منتیں مانگی ہوں گی۔

وہ بے اختیار اٹھا اور بزرگ کی قبر کے سرہانے آ بیٹھا۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

اسے خود پر حیرت ہو رہی تھی کہ اسے اس ویرانے سے ڈر کیوں نہ لگ رہا تھا۔ اتنا بہادر وہ کب سے ہو گیا تھا کہ قبرستان میں بھی مطمئن سا تھا۔ ایسا اطمینان تو اسے اپنے دونوں گھروں میں بھی کبھی محسوس نہ ہوا تھا۔ گھر کی یاد کیا آئی جی بھر آیا۔ آنکھوں کے کنارے بھیگ سے گئے۔ ساتھ ہی بھوک بھی یاد آئی اور درد کی ٹیسیں بھی جو وہ وقتی طور پر بھلا بیٹھا تھا۔ پھر اس کا سر جھکتا چلا گیا۔ اور بزرگ کی قبر کے عین اس مقام پر ٹک سا گیا جہاں ان کا سینہ ہو سکتا تھا۔ سر کا لگنا تھا کہ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگ گئیں۔ اتنے بہت سے آنسو اس کی آنکھ میں جانے آئے کہاں سے تھے؟۔ وہ تو بے تحاشا پٹنے پر بھی کبھی اتنا رویا نہیں تھا۔ پھر بے اختیار اس کے لب ہلنے لگے۔

''بابا..... بابا..... بابا جی..... آپ تو نیک لوگ ہو آپ تو ضرور میرے درد کو سمجھو گے۔ میری ماں کو تو مجھ پر کبھی ترس نہیں آیا۔ میرا باپ بھی مجھ سے پیار نہیں کرتا۔ میں یتیم ہوں بابا جی۔ ماں باپ زندہ ہیں پھر بھی یتیم ہوں۔ مجھے کہیں جگہ نہیں ملتی۔ کہیں سکون نہیں ملتا۔ روٹی کے نام پر دھکے ملتے ہیں۔ مار پڑتی ہے۔ میرا یہاں کوئی نہیں کوئی بھی نہیں۔ شاید میرا رب بھی میرا نہیں۔ اگر ہے تو اسے میں نظر کیوں نہیں آتا؟ اسے پکارتا ہوں تو میری کیوں نہیں سنتا؟ کل سے بھوکا ہوں۔ بار بار اسے پکارا ہے مگر اس نے میری ایک نہیں سنی۔ نئی امی بھی مارتی ہے اور ابو بھی۔ میں کہاں جاؤں؟ بابا کہتے ہیں جو مر جائے اپنے رب کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ آپ بھی تو مر گئے ہیں اپنے رب کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ آپ ہی میری سفارش کر دیں کہ مجھے اگر روٹی نہیں دے سکتا تو مجھے بھی اپنے پاس بلا لے۔ میں تنگ آ گیا ہوں اس زندگی سے۔ مجھے نہیں جینا۔ مجھے مرنا ہے۔ ہاں بابا جی آپ اسے کہیں مجھے موت دے دے۔ ابھی اور اسی وقت مجھے ایسا سلا دے کی پھر کبھی نہ اٹھوں۔ بابا جی آپ تو اللہ والے ہیں آپ کی وہ بہت سنتا ہے۔''

جانے وہ اور کیا کچھ کہتا رہا۔ بولتے بولتے گلہ خشک ہو گیا اور آنسو بھی۔ پھر جانے کب اس پر غشی طاری ہوئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ بے ہوشی کا وقفہ خاصا طویل تھا۔ جب کراہتے ہوئے اس کی آنکھ کھلی تو اندھیرا خاصا پھیل چکا تھا اور شاید مغرب کی اذان اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ کچھ دیر تو اسے معلوم ہی نہ ہوا کہ وہ ہاں پہنچا کیسے، اندھیرے سے گھبرا کر وہ اٹھا ہی تھا کہ اس کی نظریں قبر کے غلاف پر گویا جم کر رہ گئیں۔ جس جگہ اس کا بھی سر دھرا تھا وہاں کھجوروں کا ایک ڈھیر لگا تھا۔ تازہ تازہ پیلی پیلی خوشبودار کھجوریں۔ وہ حیرت سے اچھل ہی تو پڑا تھا۔

''ارے یہ کھجوریں یہاں کیسے آئیں؟ اور وہ بھی اس موسم میں کہ درختوں پر ابھی کچے پھل ہی ہر سو دکھتے ہیں۔''

پھر اسے کچھ یاد آیا تو اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے رب نے اس کی سن لی ہے اور اس کے کھانے کا بندوبست بھی کر دیا ہے۔ وہ نہال ہو گیا۔ اندر سے جیسے آواز آئی۔

''اب تجھے کبھی بھوکا سونا نہیں پڑے گا۔'' وہ پھر بیٹھ گیا اور بے تابی سے اس کے ہاتھ کھجور کی طرف بڑھ گئے۔

اتنی مزیدار کھجوریں تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں کھائی تھیں۔ ایک چوتھائی حصہ کھایا ہو گا کہ پیٹ بھر گیا۔ بچی ہوئی ساری کھجوریں سمیٹ کر اپنے کھیسے میں بھر لیں۔ جانے کا ارادہ کرتے ہوئے اٹھا ہی تھا کہ کچھ سوچ کر رک گیا۔ نگاہیں مسلسل قبر کو گھور رہی تھیں۔

مجھے بابا جی کا شکریہ تو ادا کرنا چاہیے۔ اگر وہ میری سفارش نہ کرتے تو اب تک تو بھوک سے مر بھی گیا ہوتا۔ لیکن میں بابا جی کا شکریہ ادا کروں کیسے؟'' اچانک وہ اچھل پڑا۔

''ارے کہیں یہ بابا سات سلام تو نہیں ہیں؟''

اب اس کی آنکھیں اندھیرے میں کچھ کھوج رہی تھیں۔ اسے ٹیلے کے آخری سرے پر کچھ قبروں کے ہیولے سے دکھائی دیے تو بے اختیار اس کا سر ہلنے لگا۔ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ بابا سات سلام ہی ہیں۔

بابا کا نام پہلی بار اس نے اپنے مدرسے کے ساتھیوں سے سنا تھا۔ مدرسے کے کچھ شریر طالب اسی راستے سے گزرتے ہوئے نہر پر نہانے جاتے تھے۔ نہر کچھ دور تھی۔ مدرسے میں جمعہ والے دن دس بجے چھٹی مل جایا کرتی تھی۔ چلبلے شرارتی لڑکے ٹولیاں بنا کر نہانے نکل جاتے۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا اور دیکھتے ہی دیکھتے شام ہو جاتی۔ اب وہ جلدی جلدی بھاگتے دوڑتے گھر کا رخ کرتے اور جب بابا سات سلام کے مزار کے قریب پہنچتے تو سولنگ پر کھڑے ہو کر سارے لڑکے باجماعت سات

www.pakistanipoint.com

سلام کرتے۔ جانے انہوں نے یہ طریقہ کس سے سیکھا یا سنا تھا لیکن تھا تیر بہدف۔ جب گھر پہنچتے تو مار سے بچ جاتے۔ یہ ٹوٹکا بارہا کامیاب رہا۔ پھر تو گویا یہ طریقہ سب کو پسند آ گیا۔ کبھی کسی کو سبق یاد نہ ہوتا تو قاری صاحب کی مار سے بچنے کے لیے مدرسے میں آنے سے قبل وہ مزار کا چکر لگاتے سات سلام کرتے اور مار سے اکثر بچ جاتے۔ یہی نہیں پھر تو اپنی روزمرہ کی پریشانی کے حل کے لیے بھی سلامی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ اور بات تھی کہ قاری عبدالرشید نے کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ اس کا خاندان سخت گیر نظریات کا حامل تھا۔ وہ مزاروں پر جانا غیر شرعی فعل گردانتے تھے۔ اگر یہ تربیت اس کے خون میں رچ بس نہ گئی ہوتی تو وہ بھی کسی دن سلامی دینے وہاں پہنچ جاتا۔

شومئی قسمت ایک دن قاری صاحب نے بچوں کو یہ حرکت کرتے دیکھ لیا۔ پھر کیا تھا پوری جماعت باجماعت مرغا بن گئے۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ کوئی طالب کوئی جواز گھڑتا۔ وہ بھی دبکے ہوئے مرغے بنے ٹھہرے تھے جنہوں نے اس مزار کو خواب میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ قاری صاحب پورے جلال میں تھے۔ سب کی سٹی گم تھی۔ پھر ایک انہونی ہو گئی۔ ایک سہما ہوا مرغا بول اٹھا اور اس نے اسی حالت میں سارا ماجرا کہہ سنایا اور مجرمین کے نام بھی پوری تفصیل سے بیان کر دیے۔ ساتھ میں اللہ پاک کی قسم کھاتے ہوئے یہ بھی کہہ ڈالا کہ وہ اگر کبھی بزرگ کی قبر پر گیا ہو تو اللہ اسے کبھی معاف نہ کرے اور جہنم سے سب سے گہرے گھڑے میں اوندھے منہ گرائے۔ قاری صاحب نے وعدہ معاف گواہ بننے پر شیدے اور کچھ اور بے گناہوں کو معاف کر دیا۔ اب وہ دم سادھے مجرمین کو پٹتا دیکھ اور دل ہی دل میں شکر کا کلمہ پڑھ رہے تھے کہ ان سے آج تک ایسا کوئی جرم سرزد نہیں ہوا۔

"آخر تمہیں سوجھی کیا تھی، اور کیا سوچ کر تم لوگ ایسی الٹی سیدھی حرکتیں کرتے پھرتے ہو۔ تمہاری کھوپڑیوں عقل نامی چیز سے خالی ہیں کیا، کسی دن نہر میں نہاتے ہوئے ڈوب گئے تو سوچا ہے کیا ہوگا، تمہارے والدین تو جیتے جی مر جائیں گے، اور قرآن کی تعلیم سے محروم رہے تو جاہل بن کر زندگی گزارو گے اور ہر سعادت تم سے چھن جائے گی۔ اب تم لوگ بتاؤ مجھے کہ بابا جی تمہارے ساتھ دوستی کر رہا یا دشمنی۔ کیا بابا نہیں چاہتا کہ تم قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرو۔ کیا وہ یہی چاہتا ہے کہ کسی روز تم لوگ ڈوب مرو۔ ارے احمقو میں بابا جی کا دشمن تو نہیں ہوں۔ میں دل سے مانتا ہوں کہ وہ اللہ والے ہیں۔ تو کیا انہیں یہ مقام کسی بزرگ کو سلامیاں دینے سے ملا ہے۔ اللہ اللہ کرتے رہے ہیں تمام عمر۔ تعلیم حاصل کی۔ قدم قدم پر اپنے بڑوں کا ادب کرتے تھے۔ یہ کوئی طریقہ نہیں جو تم لوگوں نے اپنا رکھا ہے۔ اگر تم کچھ بننا چاہتے ہو۔ مر کر بھی زندہ رہنا چاہتے ہو تو ان جیسے کام کرو۔ خبردار آئندہ میں تمہیں ایسی حرکتیں کرتا نہ دیکھوں۔"

وہ وہاں کبھی نہیں گیا تھا لیکن آج ایک حسین اتفاق اسے بابا جی کے پاس کھینچ لایا تھا۔ ان سے منسوب ساری باتیں اس کے دل نے سچ مان لی تھیں۔ وہ اچانک جھکا اور اس نے بزرگ کے سینے پر بوسہ دے دیا۔

واپس مڑنے سے پہلے اس کا ہاتھ ماتھے کی طرف بڑھ گیا اور اس نے پہلی سلامی پیش کر دی۔

آگے کی کہانی بہت سادہ ہے۔ اسے اسی دن اپنے دور پار کے اسی چچا کے ہاں پناہ مل گئی جہاں اس نے پچھلی رات گزاری تھی۔ اسے ٹھکانا بھی مل گیا تھا اور کھانا بھی۔

اس واقعے کو پچاس سے زیادہ برس ہو گئے ہیں۔ عبدالرشید آج دادا اور نانا بن چکا ہے۔ پتا نہیں یہ کھجوروں کا اثر تھا یا بابا جی کی دعائیں کا کہ وہ دن ہے اور آج کا دن اسے کبھی شدید بھوک محسوس نہیں ہوئی نہ ہی وہ کبھی ایک بھی دن بھوکا سویا ہے۔ اس نے کبھی بابا جی سے کوئی دعا نہیں کرائی۔ ہاں مگر سال چھ ماہ بعد جب اس کا دل کسی بات پر پریشان ہوتا ہے یا بابا کی یاد میں مچلتا ہے تو خود بخود اس کے قدم مزار کی طرف اٹھ جاتے ہیں۔ وہ جب مزار کے سامنے پہنچتا ہے تو بے اختیار اس کے قدم سولنگ پر رک جاتے ہیں۔ شاید اس کے مسلکی نظریات اس کے قدموں کی زنجیر بن جاتے ہیں۔ لیکن وہ دل کا کیا کرے جو اسے وہاں کھینچ لاتا ہے۔ جب وہ وہاں پہنچتا ہے تو وہ اسی دور میں واپس پہنچ جاتا ہے جب وہ نو دس برس کا بچہ تھا اور بلک بلک کر بابا جی کی قبر سے لپٹ کر حال دل سنا رہا تھا۔ اس پر رقت طاری ہے سر اور دل احترام سے جھک جاتے ہیں۔

اترن

عنبرین اختر

ہمارے مزاج میں ہے کہ ہم کسی کی اترن نہیں پہنتے اب چاہے وہ ہمارے سگے رشتے ہی کیوں نا ہو مگر زندگی کے اس سفر میں مرد اور عورت ایک ایسا لباس زیب تن کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں جو کسی کا بھی اترا ہوا ہے۔

اب لباسوں کی بھی کئی اقسام ہیں۔ اس کہانی کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ انسان اس لباس کو پہننے کے لیے کتنا بے صبرا ہوتا ہے۔

ایسے انسانوں کا احوال جن کے پاس اقداری کمی تھی

عورت اپنا گھر اپنی عزت و ناموس بچانے کے لیے سو طرح کے جتن کرتی ہے۔ حتیٰ کہ لوگوں کے پیر پڑتی ہے۔ چیخ چیخ کر سب کو بتاتی ہے کہ میں بے قصور ہوں۔ میں نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جو سب کے لیے رسوائی کا باعث بنے۔ اپنے بال نوچ ڈالے۔ یا پھر روتے روتے بے ہوش ہو جائے۔ لیکن کوئی اس کی بات سننے والا نہیں ہوتا۔

دوسری طرف مرد ایسا ہے کہ اس کی عزت و شان میں اس کے رتبے اور وقار میں ذرا سی بھی خراش نہ آنے پائے۔ مرد کبھی سر نہیں جھکاتا۔ کیونکہ اس کی عزت کے خلاف ہے۔ اگر عورت اس پر الزام لگا بھی دے تو صاف مکر جاتا ہے۔ ذرا زیادہ اصرار کرو تو سینہ تان کر فخر سے کہتا ہے۔ ہاں میں مرد ہوں۔ میں آزاد فضاؤں میں سانس لیتا ہوں۔ مجھے دوسری شادی کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ تم کون ہوتی ہو مجھے یہ سب کہنے والی۔ اپنے کرتوت پر پردہ ڈالنے کے لیے مجھ پر الزام تراشی کر رہی ہو، نکل جاؤ میرے گھر سے۔ اور اسی وقت طلاق کے تین بول کہہ کر عورت کو ہمیشہ کے

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

لیے چلتا کرتا ہے۔ چاہے عورت ہی بے قصور ہو۔

ٹی وی پر لال پٹی چل رہی تھی۔ عاصمہ بڑے غور و فکر سے یہ لائنیز پڑھتے ہوئے ماضی میں کھو گئی۔ عاصمہ اور وجاہت کا گھر کرائے پر تھا۔ وجاہت نے اسے زمانے کی ہر خوشی دے رکھی تھی۔ روز شام کو باہر گھمانے لے جاتا واپسی پر رات اکھانا بھی باہر کھاتے کبھی گھر آ کر کھاتے۔ عاصمہ کی سالگرہ وجاہت کو بڑی اچھی طرح یاد رہتی۔ وجاہت نے ہر سال کی طرح اس سال بھی اپنی بیوی عاصمہ کی سالگرہ نہایت خوب صورت طریقے سے منائی۔ وجاہت نے کلفٹن جانے کا پروگرام بنایا۔ یوں بھی رات کو ساحل پر آہستگی سے ننگے پاؤں چلنا، شور مچاتی لہروں سے باتیں کرنا کسے اچھا نہیں لگتا۔ دور پریں ساحل کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر آہ و زاری کر رہی تھیں۔ دور پانی کی رقصاں سطح پر چند کشتیاں اپنے دھندلے اور کمزور باد بانوں کی سہارے کانپ رہی تھیں۔

یکا یک لہروں کا شور بلند ہوا۔ بوڑھے سمندر کی لہریں کچوے کھانے لگی تھیں۔ وہ دونوں ہوٹل میں ایسی جگہ بیٹھے جہاں سے باہر کا دلفریب منظر با آسانی دیکھا جا سکے۔ عاصمہ نے سالگرہ کا کیک کاٹا، وجاہت نے اس کی مخروطی انگلیوں مین سونیکی رنگ پہنادی۔ جو بہت خوب صورت اور نفیس تھی۔ وجاہت ہی نہیں عاصمہ بھی اپنے شوہر کی ہر پسند اور ہر ضرورت کا خیال رکھتی۔ دونوں میاں بیوی بہت خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے۔ وجاہت بینک میں منیجر تھا۔ اسمارٹ اور خوش شکل چہرے پر گھنی مونچھوں نے اسے پر وقار اور رعب دار بنا دیا تھا۔ سب کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا اور اچھے اخلاق سے پیش آنا۔ دونوں میاں بیوی کی گزر اوقات بہت اچھی ہو رہی تھی۔ ان سے فلیٹ کے اوپر والا پورشن جو چند ماہ سے خالی پڑا تھا۔ حال ہی میں کوئی نئی فیملی آ کر رہ رہی تھی۔ اس کا اندازہ عاصمہ نے ایک دن بھاری سامان کے گھٹنے سے لگایا۔ عاصمہ نے سوچا کہ ایک دو دن تک اوپر جا کر ساری حالات معلوم کر آئے گی۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ فضہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اور طلاق یافتہ تھی۔ اس کے حالات تب معلوم ہوئے جب فضہ نے ایک شام عاصمہ کے گھر کی

naeyufaq.com

تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے

آج ہی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

ماہنامہ آنچل کراچی

ملک کی مشہور معروف قلمکاروں کے سلسلے وار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں ہے جو آپ کی آسودگی کا باعث ہو سکتا ہے اور وہ ہے اور صرف آنچل۔ آج ہی اپنی کاپی بک کرالیں۔

تیری زلف کے سر ہونے تک

خاندانی اختلاف کے پس منظر میں لکھا گیا اقراء صغیر احمد کا بہترین ناول جو آپ کی سوچ کو ایک نیا رخ دیگا

اکائی

عشنا کوثر سردار کا ایک لازاول ناول جس کا ہر لفظ انمٹ نقوش چھوڑ دیگا

عشق دی ماری میں جھلی

سائمہ قریشی کی دلکش و دل موہ لینے والی تحریر غم و خوشی سے آراستہ ایک ناقابل فراموش کہانی

Info@naeyufaq.com

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں رجوع کریں (03008264242)

ڈور بیل بجائی۔

''میں اوپر والے پورشن میں رہتی ہوں۔ میرے ابو بازار سے سودا لینے گئے تھے۔ ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے۔ میرے موبائل میں بیلنس نہیں تھا تو سوچا کیوں نہ آپ کے موبائل سے ابو کو فون کرلوں۔'' اس نے کہا تھا۔

وجاہت اسی وقت بینک سے آئے تھے۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں آپ ہماری نئی ہمسائی ہیں۔ آپ باہر کیوں کھڑی ہیں، اندر آجایئے۔'' عاصمہ نے اسے اندر آنے کو کہا۔

عاصمہ نے وجاہت کے ہاتھ سے موبائل لے کر فضہ کو دے دیا۔ وجاہت کو فضہ کا آنا برا لگا۔ لیکن وہ خاموش ہو رہا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ فضہ سانولی رنگ کی لڑکی تھی۔ آنکھیں موٹی تھیں۔ کمر باریک اور نازک تھی۔ اوپر والے ہونٹ کے بائیں جانب تل تھا۔ بال لمبے جس کی چٹیا بنائی ہوئی تھی۔ گلے میں ہلکا گلابی شیفون کا دوپٹہ لہرا رہا تھا۔ اتنی پیاری لڑکی کو پتہ نہیں طلاق کیسے ہوگئی۔ خیر وہ پہلی دفعہ عاصمہ کے گھر آئی تھی۔ اس لیے عاصمہ نے کچھ بھی پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔

فضہ فون کرنے والی تھی کہ اس کے والد کی سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی۔ باہر دیکھا تو اس کے والد کے ماتھے سے خون کی ایک پتلی دھار بہہ رہی تھی۔ فوراً باپ کے پاس آئی۔ وجاہت اور عاصمہ بھی اس کے پیچھے دوڑے آئے۔

''بابا جان یہ خون کیسا۔ کسی نے کیا مارا ہے آپ کو؟'' فضہ گھبراہٹ کے مارے پوچھے جا رہی تھی۔

''میں آپ کو ہاسپٹل لے چلتا ہوں۔'' وجاہت نے آگے بڑھ کر فضہ کے باپ کا ہاتھ تھاما اور کہا۔

مرہم پٹی ہوئی اور چند دن میں فضہ کے والد ٹھیک ہوگئے لیکن اس دن کے بعد فضہ عاصمہ کی طرف بلا جھجک آنے لگی۔ انسان کی اپنی بھی ایک دنیا ہوتی ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ کوئی دوسرا مداخلت کرنے والا نہ ہو۔

لیکن فضا کو ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ آتے ہی کہتی لایئے عاصمہ باجی میں سبزی بنادوں یا صفائی میں آپ کی مدد کردوں۔ اور عاصمہ بچاری ہمسائے کا لحاظ رکھتے ہوئے اسے کچھ بھی نہ کہتی۔ بلکہ خاموشی سے اس کے ساتھ کام کرتی رہتی۔ ایک صبح وجاحت بینک کے لیے نکلے۔ عاصمہ بیڈ روم صاف ک رہی تھی۔ فضہ نے بیل بجائی۔ دروزہ شاید کھلا ہوا تھا۔ وہ سیدھی بیڈ روم میں آ گئی۔

''عاصمہ باجی آپ کا روم تو بہت خوب صورت ہے۔'' اور بولی۔ فضہ ہر شے کو رشک بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ''ہائے اللہ عاصمہ باجی آپ کے کپڑے تو بہت خوب صورت ہیں۔ میک اپ کا سامان بھی بہت اعلیٰ ہے۔ آپ کے ہاتھوں میں جو انگوٹھی ہے بہت خوب صورت ہے۔'' اس نے ہر چیز کو دیکھتے ہوئے تعریفی الفاظ کہے۔

''ہاں، وجاہت نے میری سالگرہ پر مجھے بطور تحفہ دی تھی۔'' عاصمہ بولی۔

پھر اس نے روتی صورت بنا کر خود کو آئینے میں دیکھا۔ اور بیڈ پر بیٹھ کر لپ اسٹک لگانے لگی۔

''پتا ہے میرا شوہر بھی مجھے ایسا ہی میک اپ کا سامنا لے کر دیتا تھا، اور کہتا تھا تم ہر وقت تیار رہا کرو۔ اچھے کپڑے پہنا کرو۔ تم پر ہر رنگ اچھا لگتا ہے۔'' اس نے حسرت سے کہا۔

''پھر تمہاری طلاق کیسے ہوئی۔'' عاصمہ بولی۔

''پتا نہیں شاید میں ساس کو اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ مجھے تیار ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ کہتی اولاد تو دی نہیں تم نے اور ہر وقت کی تیاریاں کس کام کی۔ مجھے ساس کی باتوں پر بہت غصہ آتا اور خاموشی سے اپنے کمرے میں آخر آنسو بہا دیتی۔ جب کہ میرے شوہر کو گھر کا آرام سکون بہت پسند تھا۔ وہ تو کوئی کپڑا یا تولیہ ادھر ادھر دیکھ لیتا تو بہت خفا ہوتا۔ میرے سسرال میں جامن کا درخت لگا ہوا تھا۔ سرِ شام پرندے آ کر بیٹھ جاتے۔ اور خوب شور مچاتے۔ میرے شوہر کو جب پرندوں کا شور پسند نہیں تھا تو وہ دو انسانوں کا ہر وقت کا شور کیسے پسند کرسکتا تھا۔ تنگ آ کر اس نے مجھے طلاق دے دی۔'' فضہ بات کرتے ہوئے بے تحاشہ رو پڑی۔

''آج سے تم میری چھوٹی بہن ہو۔ تم جب چاہو میرے گھر آسکتی ہو۔ میرے گھر کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔'' عاصمہ نے اسے دلاسہ دیا اور کہا۔

اس دن کے بعد فضہ بلا جھجک عاصمہ کے گھر آنے

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

لگی۔ اسے دونوں کی ذاتی زندگی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ دن ہو یا رات فضہ، عاصمہ کے گھر ہوتی۔ عاصمہ اسے اپنے پہنے ہوئے کپڑے دیتی۔ جو ایک یا دو بار ہی اس نے پہنے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ جوتے اور کچھ میک اپ کا سامان بھی فضہ کو دیتی۔ جس پر وہ سوائے خوش ہونے کے کچھ نہ کہتی۔ جیسے اس کا ان سب چیزوں پر حق ہو۔ اور وہ ان چیزوں کو اپنا حق سمجھ کر ہی لیتی ہو۔ اور اگلے دن پہن کر بھی آجاتی۔

''دیکھیے عاصمہ باجی! آپ کے دیئے ہوئے کپڑے مجھ پر کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔ میں تو اب انہیں بہت سنبھال کر رکھوں گی۔ کیونکہ بڑی بہن نے جو دیئے ہیں۔''

جواب میں عاصمہ خوب ہنستی اور اس کی بلائیں لیتی۔

پہلے تو وجاہت کو فضہ کا آنا ناگوار گزرتا لیکن روز کے معمول نے اسے بھی عادی بنا دیا۔ اور رسمی بات چیت ہوتی رہتی۔

''امی کو اچانک ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ وہ ہاسپٹل میں ہیں۔ تم فوراً پہنچو۔ ہوسکے تو رات امی کے پاس ہی رہو۔ میں نے بچوں کو صبح تیار کر کے اسکول چھوڑ کر آجاؤں گی۔''

ایک دن عاصمہ کی بڑی بہن کا فون آیا۔

بڑی بہن کی باتیں سن کر عاصمہ نے فون رکھا۔ شوہر کو کال کر کے سارا پروگرام بتایا۔

''تم ناشتہ بنا دیا کرنا۔ دوپہر کو میں گھر کا چکر لگالوں گی اور شام کا کھانا بنا کر فریج میں رکھ دیا کروں گی۔ وجاہت گرم کر کے کھالیا کریں گے۔'' فضہ کو تائید کی۔

''ارے باجی آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔ کیا آپ ان کو باسی کھانا کھلائیں گی۔ میرے ہوتے ہوئے آپ کو کسی بات کی فکر نہیں ہونی چاہیے۔ بس جلدی سے آپ کی امی ٹھیک ہوجائیں میں ان کے لیے دعا کروں گی۔''

عاصمہ ساری رات ماں کے پاس جاگ کر گزارتی۔ وہ وجاہت کے لیے بھی پریشان تھی۔ اتنی راتوں سے وہ ہاسپٹل میں ماں کے پاس تھی اور وجاہت صرف ایک دفعہ ملنے آیا تھا۔ دن کو عاصمہ گھر کا چکر لگا لیتی تھی۔ وجاہت اب فضہ کے ہاتھ کی چائے پیتا۔ اس کے سانولے ہاتھوں کی باریک اور خوب صورت انگلیوں کی خوب تعریفیں کرتا۔

تقریباً دس دن ہاسپٹل رہنے کے بعد آج عاصمہ کی امی کو ڈسچارج کر دیا گیا۔ عاصمہ امی کو چھوڑ کر جب گھر پہنچی رات کے دس بج رہے تھے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ حیران ہوئی کہ اس سے پہلے تو کبھی رات کے دس بجے تک دروازہ کھلا نہیں رہا۔ ہوسکتا ہے وجاہت بند کرنا بھول گئے ہوں۔ لاؤنج میں ٹی وی دھیمی آواز میں چل رہا تھا۔ ہوسکتا ہے وجاہت کو نیند آگئی ہو اور ٹی وی بند کرنا بھول گئے ہوں۔ خود کلامی میں بولتے ہوئے اس نے کچن میں جھانکا۔ سارے برتن قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ پھر وہ دبے پاؤں قدم اٹھاتی اپنی بیڈروم کا دروازہ کھولنے لگی۔ صبح کی ہر سانس بیدار ہونے سے پہلے وہ وجاہت کو اچانک پہنچنے پر سرپرائز دینا چاہتی تھی۔

وہ حیران تھی۔ ہلکی روشنی کا بلب جگمگا رہا تھا۔ فضا میں ایک مہیب خوف سانس لے رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے خاموش قبر کی مانند روم کا جہاں مکمل سکوت طاری تھا۔ دروازہ کھولا۔

ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ وجاہت فضہ کے ساتھ، نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ عاصمہ اس خوفناک سماں کو دیکھ کر جو کمرے میں سمٹا ہوا تھا سرتاپا ارتعاش بن کر رہ گئی۔ آنکھوں میں گرم گرم آنسو امڈ آئے۔ عاصمہ کو دیکھنا تھا کہ دونوں بیڈ پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

وجاہت نے ایک خط عاصمہ کو پکڑا دیا۔ عاصمہ نے ایک سرد آہ بھری۔ ایک اور زوردار دھماکہ ہوا۔ چہرے کے بدلے ہوئے رنگ اور لرزاں ہاتھوں سے اس نے وہ کاغذ پکڑا لکھا تھا۔

''میں فضہ سے شادی کر رہا ہوں۔ میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم نے مجھے اور تو کچھ نہ دیا لیکن فضہ دے دی۔''

ساتھ ہی طلاق کے کاغذ بھی تھے۔ عاصمہ کی آنکھوں برسات رواں تھی۔

فضہ اس کے پاس آئی اور اتراتے ہوئے بولی۔

''عاصمہ باجی! آج تک آپ کی اترن میں پہنتی آئی ہوں۔ اس لیے آپ کا بہت سارا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ آپ نے اپنا شوہر بھی آج مجھے اترن کے طور پر دے دیا۔''

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

جیدی قباچہ

رانا زاہد حسین

میاں بیوی کو گاڑی کے دو پہیوں سے تشبیہ دی جاتی ہے اب اس گاڑی کے دونوں پہیے پنکچر ہی کیوں نا ہوں۔ جب ایسے گاڑی چلے گی تو اس گھر کا کیا حال ہوگا۔ہنستی مسکراتی ایک ایسی کہانی جس کے کردار آپ کو اپنے ارد گرد ضرور ملیں گے۔

ایک عجیب خلقت گھرانے کا احوال خصوصی، جہاں میاں بیوی ایک اولاد کی ضد میں تماشہ کرتے تھے

رمضان لان میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا، اس کی بیوی خالدہ اس کے پاس بیٹھی رمضان کو دیکھے جا رہی تھی کہ کب رمضان کی نظر اخبار سے ہٹے تو وہ اس سے بات کرے، لیکن رمضان اخبار میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ اسے اپنے ارد گرد کی خبر ہی نہیں تھی۔ خالدہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا، وہ کرسی سے اٹھی، اخبار رمضان کے ہاتھ سے کھینچ لیا، جس کی وجہ سے اخبار کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

''اخبار میں کون سی خاص خبر ہے جو تمہاری نظریں اخبار سے اٹھ ہی نہیں رہیں۔'' خالدہ نے اخبار کے ٹکڑے کو گول مول کر کے پرے پھینکتے ہوئے کہا۔

''میرا نے شادی کے لیے ہاں کر دی ہے۔'' رمضان نے چسکا لیتے ہوئے کہا۔

''میرا کی شادی تو پہلے بھی کئی بار ہو چکی ہے تم اپنی بیٹی شہلا کی شادی کی فکر کرو جس کی شادی کی عمر نکلتی جا رہی ہے۔'' خالدہ نے رمضان کو تلخ لہجے میں بات سنائی۔

''میرا نے اپنی کسی شادی کو تسلیم تو نہیں کیا نہیں۔'' رمضان ابھی بھی میرا کے صحر میں کھویا ہوا تھا۔

''تو کیا تم بھی میرا سے شادی کے امیدوار ہو؟'' خالدہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔

''میری قسمت میں میرا کہاں میری قسمت میں تو یہی بشیراں ہے؟'' رمضان نے خالدہ کی طرف اشارہ کیا۔

''قبر میں ٹانگیں ہیں تمہاری اور ابھی بھی تم کو میرا چاہیے۔'' میں کہتی ہوں اپنی بیٹی کی فکر کرو۔''

شہلا کی عمر ابھی صرف تیئیس سال ہے اور تم کو ابھی سے اس کی شادی کی فکر پڑ گئی۔''

''میری شادی بیس سال کی عمر میں ہو گئی تھی اور اکیس سال کی عمر میں میں ماں بن گئی تھی۔

''تمہارے باپ کو تو کوئی رشتہ نہیں ملتا تھا، میں مل گیا، جلدی جلدی اس نے یہ سیاپا میرے گلے میں ڈال دیا۔''

''تم نے میرے باپ کے جا کر پاؤں پکڑے تھے تب جا کر میرے باپ نے ہاں کی تھی۔''

''کیوں جھوٹ بولتی ہو، میں تو گلی میں کرکٹ کھیل رہا تھا میری گیند تمہارے گھر چلی گئی تھی، میں گیند لینے تمہارے گھر گیا تھا تو تمہارے باپ نے کہا تھا گیند تب واپس کروں گا جب تم میری بیٹی خالدہ سے شادی کرو گے، گیند واپس لینے کے لیے مجھے تم سے شادی کرنی پڑی تھی۔''

''اللہ میری توبہ۔ اتنا جھوٹ بولتے ہو تم۔'' خالدہ نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''وہ گیند ابھی تک میں نے سنبھال کر رکھی ہوئی ہے وہ گیند جب بھی میں دیکھتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کاش میں نے وہ گیند تمہارے باپ سے واپس نہ لی ہوتی، تمہارے باپ نے تو گیند کے ساتھ یہ فٹ بال بھی دے دیا۔''

رمضان نے خالدہ کی جسامت کی طرف اشارہ کیا۔

''میں فٹ بال ہوں اور تم وکٹ ہو۔'' خالدہ نے بھی رمضان کی جسامت پر چوٹ کی اور ہنسنے لگی۔

''کہتے ہیں میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں، لیکن ہماری جوڑی ایسی ہے ایک پہیہ رکشے کا اور دوسرا پہیہ

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

ٹریکٹر کا ہے۔'' رمضان نے خوب نقشہ کھینچا۔

میاں بیوی کی تکرار جاری تھی کہ کوئی بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ یہ بحث اور تکرار شہلا کی سہیلی انیلا کی آمد کی وجہ سے ختم ہوئی۔

''انکل شہلا کہاں؟'' انیلا نے آتے ہی پوچھا۔

''اپنے کمرے میں سو رہی ہے۔'' رمضان نے بتایا۔

''ابھی تک سو رہی ہے صبح نماز نہیں پڑھی اس نے؟'' انیلا کو حیرت ہوئی۔

''نماز تو اس کی ماں نے کبھی نہیں پڑھی وہ کیا پڑھے گی۔'' رمضان نے پھر خالدہ پر چوٹ کی۔

''تم تو اٹھ کر تہجد پڑھتے ہو نا، نام رمضان اور کبھی رمضان کے مہینے میں ایک بھی روزہ رکھنے کی توفیق نہیں ہوئی تم کو۔''

''مسافر کو روزہ معاف ہوتا ہے؟''

''پچھلے رمضان تم نے کون سا سفر کیا جو تم اپنے آپ کو مسافر کہہ رہے ہو؟''

''اس دنیا میں ہر آدمی مسافر ہے، ایک دن سب نے یہ دنیا چھوڑ کر جانا ہے۔''

''سب نے جانا ہے اور خدا کو کیا منہ دکھانا ہے یہ کبھی نہیں سوچا تم نے؟''

''انکل ویسے آپ کو روزے رکھنے چاہیے۔'' انیلا نے خالدہ کی طرف داری کی۔

''اس نے اٹھ کر کبھی سحری نہیں پکائی، میں روزے کیسے رکھوں۔'' رمضان نے صاف جھوٹ بول دیا۔

''میں کیا سحری کھائے بغیر روزے رکھتی رہی ہوں۔'' خالدہ نے جواب دیا۔

''دونوں اپنے اپنے محاذ پر ڈٹے ہوئے تھے، اس لیے انیلا نے دونوں کو ان کے اپنے حال پر چھوڑا اور شہلا کے کمرے میں چلی گئی۔ شہلا منہ پر تکیہ لیے سو رہی تھی، ہلکے ہلکے خراٹے بھی وہ لے رہی تھی۔ انیلا نے شہلا کے منہ سے تکیہ ہٹایا تو نیچے اس کا موبائل بھی پڑا تھا۔ شاید رات وہ فیس بک چلاتے چلاتے سو گئی تھی۔ انیلا نے شہلا کو کندھے سے پکڑ کر ہلایا تو وہ کروٹ بدل کر پھر سو گئی۔ انیلا نے اپنے موبائل سے شہلا کا نمبر ڈائل کیا۔ شہلا کا موبائل بجنے لگا تو شہلا نے غنودگی کی حالت میں ہی کال پک کر کے موبائل کان سے لگا لیا۔

''اب تو سونے دو یار پورے تین گھنٹے میں نے تم سے چیٹ کی۔'' شہلا غنودگی کی حالت میں بولی۔

''اچھا تو تم ساری رات ناصر سے چیٹ کرتی رہی ہو۔'' انیلا نے خود کلامی کی۔

''نہیں تو۔'' اپنے سامنے انیلا کو کھڑا دیکھ کر شہلا شرمندہ سی ہو گئی۔

''ذرا اپنا موبائل دکھاؤ میں چیک کر لیتی ہوں۔'' انیلا ابھی کہاں سہلا کو چھوڑنے والی تھی۔

''ہاں کرتی رہی ہوں تم کو کیا تکلیف ہے۔'' شہلا کو آخر اعتراف کرنا پڑا۔

''پہلے ہی صبح بکواس کرنی تھی۔ ناصر سے رات تین گھنٹے کیا باتیں ہوئیں؟''

''وہ فون پر مجھے جوانی پھر نہیں آنی کی کہانی سنا رہا تھا۔'' شہلا نے بڑے اچھے طریقے سے انیلا کو ٹالا۔

''لوڈ ویڈنگ کی کہانی بھی سن لیتی تھی۔ تمہاری بڑے کام آنی تھی۔''

''ابھی نو ویڈنگ۔'' شہلا بولی۔

''شادی کر لو۔ عمر بیت گئی تو پھر کوئی نہیں پوچھا گا۔''

''ناصر کے ہوتے ہوئے مجھے کیا فکر میرے سر میں چاندی بھی آ گئی تو وہ پھر بھی مجھے اپنا لے گا۔'' شہلا کو ناصر پر بڑا یقین تھا۔

''ناصر کے بارے میں تم نے انکل آنٹی کو بتایا۔'' شہلا نے پوچھا۔

''نہیں بتایا، بتاتے ہوئے شرم آتی ہے، یہ معرکہ بھی تم کو ہی مارنا پڑے گا۔'' شہلا نے اس کٹھن کام کی ذمہ داری انیلا پر ڈال دی۔

انیلا اور شہلا جب اپنے بیڈ روم سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آئیں تو رمضان اور خالدہ کی بحث و تکرار ابھی بھی جاری تھی۔ لیکن اب یہ شہلا کی شادی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ دونوں ہی اپنی اپنی ضد کے پکے تھے، دونوں ہی اپنی اپنی مرضی کے مالک تھے۔

''میں شہلا کا باپ ہوں شہلا کی شادی میری مرضی سے ہو گی۔'' رمضان نے خالدہ کو صاف صاف بتا دیا۔

''میں شہلا کی ماں ہوں شہلا کی شادی میری مرضی

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

سے ہوگی۔'' خالدہ بھی اپنے موقف پر ڈٹ گئی۔ انیلا نے لوہا گرم دیکھا تو وہ بولی۔

''انکل آنٹی آپ ایک دفعہ شہلا سے مرضی بھی تو پوچھ لیں، اپنے شوہر کے ساتھ ساری زندگی اس نے گزاری ہے۔''

''مجھے کسی سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں میں اپنی مرضی کا آپ مالک ہوں۔'' رمضان گرجا۔

''میں بھی اپنی مرضی کی مالک ہوں۔'' خالدہ بھی گرجی۔

اس ساری سچویشن کو شہلا دیکھ کر بڑی پریشان ہو رہی تھی اس کیس مجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ یہاں تو اس کے مالک ماں باپ کے درمیان پانی پت کی جنگ ہو رہی تھی۔ دونوں اپنے اپنے محاذ پر ڈٹے ہوئے تھے۔

''امی آپ میری بات بھی تو سنیں۔'' شہلا ڈرتے ڈرتے بولی۔

''میں تمہاری بات کیوں سنوں، میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔'' خالدہ نے شہلا کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔

''میں تمہارا مالک ہوں۔'' رمضان فوراً خالدہ سے بولا۔

''تم تو میرے نوکر بننے کے بھی قابل نہیں تھے، بس میرے باپ نے ہی تمہارے پلے باندھ دیا۔''

''انکل آنٹی آپ دونوں ٹھنڈے ہو جائیں غصے میں بندھے کا دماغ کام نہیں کرتا۔'' انیلا نے دونوں کو سمجھایا۔

''اس کا دماغ ہو تو کام کرے۔'' رمضان نے خالدہ کی طرف اشارہ کیا۔

''تم نے کون سا ایٹم بم بنایا ہے۔'' خالدہ بھی کہاں چپ رہنے والی تھی۔

''انیلا تم کرو کوئی بات یہاں تو ایٹمی جنگ شروع ہونے والی ہے۔'' شہلا پریشان کھڑی تھی۔

☆☆☆

انیلا نے ناصر اور شہلا کو اچھے سے ریسٹورنٹ میں لنچ کے لیے بلایا تھا۔ لنچ کا تو بہانہ تھا بس ناصر اور شہلا کی شادی کے بارے میں ڈس کس کرنا تھا۔ شہلا بار بار اپنے موبائل پر ٹائم دیکھ رہی تھی۔

''یہ ناصر کہاں رہ گیا۔'' شہلا کو تشویش ہو رہی تھی۔

''کال کر کے پوچھو تو سہی کہاں ہے وہ۔'' انیلا نے مشورہ دیا۔

''کال کرنے کی ضرورت نہیں بندہ حاضر ہے۔''

اچانک ہی ناصر آ گیا اور آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تم آدھا گھنٹہ لیٹ ہو اب کھانے کا سارا بل تم دو گے۔'' انیلا نے ناصر کو جرمانہ بتا دیا۔

''بڑی تیز ہو تم ویسے پارٹی تم نے ہم دونوں کو دی ہے اور بل مجھ سے دلوا رہی ہو۔'' ناصر چیخا۔

''اچھا اب مسئلہ یہ ہے کہ میری ماں میری شادی اپنی مرضی سے اور میرا باپ میری شادی اپنی مرضی سے کرنا چاہتا ہے اور میں اپنی شادی اپنی مرضی سے کرنا چاہتی ہوں اب لڑکی ایک ہے اور مرضیاں تین۔''

تمہاری مرضی کا تو مجھے پتا ہے تمہاری ماں اور تمہارے باپ کی مرضی کون کون سی ہے۔''

''تم نے پی ٹی وی کے پرانے ڈرامے دیکھے ہیں۔'' شہلا نے ناصر سے پوچھا۔

''پی ٹی وی کے پرانے ڈراموں کا تو میں عاشق ہوں۔'' یو ٹیوب پر میں پی ٹی وی کے پرانے ڈرامے ہی دیکھتا ہوں۔ وہ پی ٹی وی کا سنہرا دور تھا۔''

پھر تو تم میری بات آسانی سے سمجھ جاؤ گے۔ تنہائیاں، ڈرامے میں ایک کردار تھا قطب الدین قباچہ۔ یہ کردار بہروز سبزواری نے ادا کیا تھا۔ ایک ڈرامہ تھا ''انتظار فرمائیے'' اس میں ایک کردار تھا ''جیدی'' یہ کردار اطہر شاہ خان نے ادا کیا تھا۔ میرے دونوں کزنز ان کرداروں کی ہو بہو نقل ہیں، اسی لیے میں ان دونوں کو نمونے بولتی ہوں۔'' شہلا نے ناصر کو تفصیل بتائی تھی۔

''یہ ڈرامے میں نے بہت بار دیکھے ہیں اس حساب سے تو تمہارے دونوں کزنز سچ میں نمونے ہی ہیں۔'' ناصر نے شہلا کے خیالات کی تائید کی۔

''میرے ابو کے بھائی کا بیٹا ہے قطب الدین، لیکن میں اس کی حرکات و سکنات کی وجہ سے اسے قباچہ کہتی ہوں، میری ماں کی بہن کا بیٹا ہے جاوید میں اس کی حرکات و سکنات کی وجہ سے اس کو جیدی کہتی ہوں۔''

''پھر تو تم بالکل سچ ہی کہتی ہو۔'' ناصر بولا۔

''اب میرے دونوں کزنز نمونے ہیں اب میں کیا کروں۔'' شہلا پریشان تھی۔

''ویسے اس طرح کے نمونے اپنی بیویوں کے زیادہ فرماں بردار ہوتے ہیں۔'' انیلا بولی۔

www.pakistanipoint.com

''تم کو یہاں مشورے کے لیے بلایا گیا ہے تم میرا ہی پتہ صاف کررہی ہو۔'' ناصر انیلا پر بگڑنے لگا۔

''اچھا تو تم قطب الدین قباچہ سے نہیں ناصر الدین قباچہ سے شادی کرنا چاہتی ہو۔'' انیلا نے شہلا سے پوچھا۔

''ارادہ تو کچھ ایسا ہی ہے۔''

''اس کا کوئی حل سوچو ان دونمونوں سے میری جان کیسے چھوٹ سکتی ہے۔'' شہلا نے دھائی دی۔

''سوچتے ہیں تمہارا ابھی کوئی حل بے فکر رہو کنیا۔'' انیلا نے شہلا کو تسلی دی۔

''میرے کنیا دان کے بارے میں کچھ سوچو۔''

☆☆☆

''بس میں نے فیصلہ کرلیا ہے میں اپنی شہلا کی شادی اپنی بہن کے بیٹے جیدی سے کروں گی۔'' خالدہ نے صبح صبح ہی شہلا کی شادی کا موضوع پھر چھیڑ دیا۔

''میں نے بھی فیصلہ کرلیا ہے، میں اپنی شہلا کی شادی اپنے بھائی کے بیٹے قباچہ سے کروں گا۔'' رمضان بھی اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا۔

''کچھ ہوش کے ناخن لو جیدی اور شہلا کی جوڑی ایسے لگے گی جیسے حور کے پہلو میں لنگور۔'' رمضان نے جیدی پر طنز کیا۔

''تم بھی ہوش کے ناخن لو شہلا اور قباچہ کی جوڑی ایسے لگے گی جیسے لنگور کے پہلو میں حور۔'' خالدہ بولی۔

''میں آج یہ قصہ ہی ختم کردیتا ہوں۔'' رمضان نے جیب سے اپنا موبائل نکالا۔ قباچہ سے کال ملائی۔

''ہیلو بیٹے قباچہ کیسے ہو تم؟ رمضان کال پک ہوتے ہی بولا۔

''میں ٹھیک ہوں انکل، آپ کیسے ہیں؟'' قباچہ بڑی فرماں برداری سے بولا۔

''میں ٹھیک ہوں بیٹا تم ایسا کرو جلدی میرے گھر آجاؤ۔''

''خیریت تو ہے انکل؟ قباچہ خوش اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے لبریز ہوتے ہوئے بولا۔

''بس تم جلدی سے آجاؤ میں نے فیصلہ کرلیا ہے تمہاری شادی شہلا سے کرنے کا۔''

''انکل اکیلا آؤں یا بارات لے کر؟'' قباچہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

''ابھی تو تم اکیلے ہی آجاؤ۔''

''ٹھیک ہے انکل میں اڑ کر آپ کے پاس آیا۔'' قباچہ خوشی سے پھولے نہ سمارہا تھا۔

''بیٹا! اڑ کر نہ آنا موٹر سائیکل پر آجاؤ۔''

رمضان کی کال ختم ہوئی تو خالدہ نے جیدی کو کال ملادی۔

''جیدی بیٹا کیسے ہو تم؟'' خالدہ نے فون پر جیدی کو بڑے پیار سے مخاطب کیا۔

''میں ٹھیک ہوں آنٹی آپ سنائیں آپ کیسی ہیں؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں بیٹا تم جلدی سے میرے گھر آسکتے ہو؟'' خالدہ نے پوچھا۔

''میں تو سر کے بل چل کر آؤں گا آنٹی۔'' جیدی خوش ہوگیا۔

''بیٹا سر کے بل نہ آنا پاؤں پر چل کر ہی آنا۔''

''آنٹی خیریت تو ہے۔'' جیدی حیران تھا۔

''بیٹا میں نے فیصلہ کیا ہے تمہاری شادی اپنی شہلا سے کردوں۔''

''شہہ.....لا۔'' شہلا کا نام سن کر جیدی کا منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔

''بیٹا! تم جلدی سے آجاؤ میں تمہارے لیے پلاؤ پکا رہی ہوں۔''

''یہ خیالی پلاؤ پکانا بند کرو جو تم سوچ رہی ہو وہ میں نہیں ہونے دوں گا۔''

رمضان نے خالدہ کو خبردار کیا جو کال منقطع کرکے گھور کر رمضان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''جو تم سوچ رہی ہو وہ میں بھی نہیں ہونے دوں گی۔'' خالدہ نے رمضان کو خبردار کرلیا۔

''آپ دونوں کیوں اپنی ضد کی وجہ سے میری زندگی تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ شہلا نے ڈرائنگ روم میں آتے ہی دونوں کے درمیان سیز فائر کروانے کی کوشش کی۔

''میں نے اپنی بہشتی بہن سے وعدہ کیا تھا کہ میں اپنی شہلا کی شادی جیدی سے کروں گی۔''

''میں نے بھی اپنے بہشتی بھائی سے وعدہ کیا تھا کہ اپنی شہلا کی شادی قباچہ سے کروں گا۔''

''امی! آپ کی بہن بھی بہشتی، ابو آپ کا بھائی بھی بہشتی

Nadar Azeem www.pakistanipoint.com

مجھے کس چکر میں آپ جہنمی بنا رہے ہیں؟''
''آخر جیدی میں کمی کیا ہے؟'' خالدہ بولی۔
''آخر قباچہ میں کمی کیا ہے؟ رمضان بولا۔
''دونوں میں عقل کی کمی ہے دونوں ہونق ہیں۔''
''یہ ہونق کیا ہوتا ہے؟ رمضان نے پوچھا جس کی اردو کمزور تھی۔
''جب تم نے میرا پہلی رات گھونگھٹ اٹھایا تھا تو تم مجھے بھی ہونق ہی لگے تھے۔'' خالدہ نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی دباتے ہوئے کہا۔
''امی! اب آپ مجھے بھی جیدی ہونق کے پلے باندھ رہی ہیں۔'' شہلا بے دھیانی میں بول گی۔
''شہلا! تم بھی مجھے ہونق سمجھ رہی ہو؟'' رمضان شہلا سے خفا ہوتے ہوئے بولا۔
''ابو! سوری میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' شہلا نے اپنے جملے پر غور کیا تو باپ سے معذرت کی۔

☆☆☆

آج ناصر شہلا اور انیلا ایک پارک میں اکٹھے ہوئے موسم خوش گوار تھا ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی مارچ کے آخری دن تھے اس لیے درخت کی سائے میں بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔ تینوں ایک بینچ پر بیٹھے تھے۔ ان کے پاس سے ایک آئس کریم والا گزرا تو ناصر نے آئس کریم والے کو روک لیا اور ایک ایک کون آئس کریم کی لے کر انیلا اور شہلا کو پیش کی۔
''میرے امی ابو نے ان دو نمونوں کو گھر بلا لیا ہے۔ اب بتاؤ میں کیا کروں۔'' شہلا نے آئس کریم کھاتے ہوئے اپنا مسئلہ بیان کیا۔
''کون سے دو نمونے؟'' انیلا نے پوچھا۔
''جیدی اور قباچہ۔'' شہلا نے بتایا۔
تم اس نمونے کو اپنے گھر لے جاؤ۔ انیلا نے ناصر کی طرف اشارہ کیا۔
''میں تم کو نمونہ لگتا ہوں؟'' ناصر انیلا پر بگڑا۔
''تم ان دو نمونوں کو کسی طرح بھگا نہیں سکتے۔'' انیلا نے سوال کیا۔
''میں کیسے بھگا سکتا ہوں۔'' ناصر حیران ہوا۔
''تم شہلا کا باورچی بن کر اس کے کچن میں گھس جاؤ۔'' انیلا نے صلاح دی۔
''کچن میں گھس کر میں کیا کروں گا۔'' ناصر حیران ہوا۔
''کچن سے تم انکل اور آنٹی کے دل میں گھس جانا۔''
''ان کے دل میں تو جیدی اور قباچہ گھسے ہوئے ہیں۔''
''بس تم نے جیدی اور قباچہ کو باہر نکال کر انکل اور آنٹی کے دلوں پر قبضہ کرنا ہے۔''
''یہ کیسے ممکن ہوگا؟'' ناصر حیران تھا۔
''تم دونوں میرے مسئلے کو مذاق سمجھ رہے ہو میری جان پر بنی ہوئی ہے۔'' شہلا بولی جو پریشان تھی۔
''جان پر تو میرے بھی بنی ہوئی ہے۔'' ناصر بھی پریشان تھا کیوں کہ وہ شہلا سے محبت کرتا تھا۔
''اس کا مطلب ہے میری جان فارغ ہے۔'' انیلا ہنسی۔
''خدا کرے تم کو بھی کسی سے محبت ہو جائے۔'' شہلا نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔
''آمین۔'' ناصر اونچی آواز میں بولا۔
''ایک آئیڈیا ہے۔'' انیلا نے چٹکی بجائی۔
''کیا؟'' ناصر اور شہلا دونوں اکٹھے ہی بول پڑے تو انیلا کے قہقہے بلند ہو گئے۔
انیلا نے جب اپنا آئیڈیا شہلا اور ناصر کو بتایا تو ناصر اور شہلا نے انیلا کے آئیڈیے سے اتفاق کیا اور دونوں نے اس آئیڈیے پر عملدرآمد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

خالدہ اور رمضان لان میں بیٹھے تھے۔ خالدہ کو جیدی کا اور رمضان کو قباچہ کا انتظار تھا۔ دونوں کی نظریں گیٹ پر مرکوز تھیں کہ کون پہلے آتا ہے۔ اچانک گیٹ ہلکا سا کھلا ایک سر گیٹ کے درمیان سے نمودار ہوا یہ جیدی تھا جس نے اپنا ہیئر اسٹائل سلمان خان کی طرح بنایا ہوا تھا جو سلمان خان نے فلم ''تیرے نام'' میں بنایا تھا۔ نیلی شرٹ اور نیلی جینز میں وہ ملبوس تھا۔ سلمان خان کے اسٹائل میں وہ چلتا ہوا خالدہ کے پاس آیا۔
''ہیلو انکل، ہائے آنٹی۔'' جیدی نے آتے ہی دونوں کو سلام کیا۔
''تمہیں کوئی تکلیف ہے جو ہائے ہائے کر رہے۔'' رمضان بڑی ناگواری سے بولا۔
میرے جیدی کو کیوں تکلیف ہو، تکلیف ہو اس کے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

دشمنوں کو یہ تو میرا چاند ہے۔'' خالدہ نے جیدی کا ماتھا چوما۔

''اس کا پہلے علاج کرواؤ لگتا ہے اس کو کتا کھانسی لگی ہوئی ہے۔'' رمضان نے جیدی کی کھانسی پر طنز کی۔ خالدہ نے اسے گھورا تو رمضان نے کہا۔

''میری زندگی میں تو یہ رشتہ کبھی نہیں ہوگا۔''

''آنٹی یہ انکل کیا کہہ رہے ہیں؟''

''ان کو مار کر بھی مجھے تمہارا اور شہلا کا رشتہ کرنا پڑا تو میں ضرور کروں گی۔''

''زندہ باد آنٹی یہ ہوئی نہ بات۔ آنٹی، شہلا نظر نہیں آرہی کہاں ہے وہ۔'' جیدی نے دائیں بائیں نظریں گھماتے ہوئے خالدہ سے پوچھا۔

''اپنے کمرے میں ہے وہ۔'' خالدہ نے بتایا۔

''آنٹی! میں شہلا کو سلام کر آؤں۔''

''ٹھیک ہے بیٹا جاؤ۔''

''جیدی کھانستا کھانستا شہلا کے کمرے میں چلا گیا تو قباچہ آ گیا۔ قباچے کو دیکھتے ہی رمضان کے چہرے پر رونق آ گئی جو جیدی کو دیکھ کر اڑ چکی تھی قباچہ منہ پر رومال رکھے شرماتا ہوا آتا ہے آ کر رمضان اور خالدہ کو سلام کرتا ہے دونوں کو سلام کرتے ہوئے چھینکیں بھی مارتا ہے۔ جس طرح جیدی کو کھانسنے کی بیماری ہے، اسی طرح ہر وقت قباچہ چھینکتا رہتا ہے۔

''یا اللہ خیر یہ زلزلہ کہاں سے آ گیا۔'' خالدہ ہنستے ہوئے بولی۔

''میں زلزلہ نہیں قباچہ ہوں۔ قطب الدین قباچہ۔''

''وہ بیٹھا ہے تیرا چاچا۔'' خالدہ ناگواری سے بولی۔

☆☆☆

شہلا اپنے بیڈ روم میں ناصر سے موبائل پر باتیں کر رہی تھی کہ جیدی آ گیا تو اس نے کال منقطع کر دی۔

''کس سے باتیں کر رہی تھی سوناکشی؟'' جیدی نے کمرے میں قدم رکھتے ہی پوچھا۔

''آؤ..... چپڑ گنجو..... میں رمضان کی بیٹی ہوں شترو گھن سنہا کی نہیں جو تم مجھے سوناکشی بول رہے ہو۔'' شہلا نے جیدی کو کھری کھری سنا دیں۔

''سوناکشی میرے اور تمہارے پھیرے کب ہوں گے؟''

غزل

اپنے دکھ درد محبت کے حوالے ہوتے
اس نے ملنے کے اگر رستے نکالے ہوتے
وہ اگر غم کے حصاروں سے بچاتا خود کو
پھر یہ کمروں میں کہاں درد کے جالے ہوتے
اس کی قسمت میں اندھیرے ہی اگر لکھے تھے
اس کے زخموں سے کہیں کچھ تو اجالے ہوتے
اپنی اولاد کی خاطر ہی اگر جینا تھا
پھر محبت میں نئے روپ نہ پالے ہوتے
وہ اذیت میں مجھے چھوڑ گیا تھا راشد
ورنہ اس در پہ کبھی آج نہ تالے ہوتے

راشد ترین..... مظفر گڑھ

''تم نے پھر بکواس کی نکل جاؤ میرے کمرے سے۔'' شہلا نے جیدی کو باہر کا رستہ دکھایا۔

''سوناکشی میں نے تو منگل سوتر بھی خرید لیا ہے۔''

''تم چاہے بدھ سوتر بھی خرید لو، میں تمہاری ہاتھ نہیں آنے والی۔'' اب چپ چاپ میرے کمرے سے نکل جاؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

''آخر میں تمہارا ہونے والا.....''

''ابھی جیدی نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ شہلا نے اپنا سینڈل اٹھا کر جیدی کو مارا۔ جیدی کھانستا ہوا باہر نکل گیا۔ جیدی باہر گیا تو قباچہ آ گیا اس نے شہلا کو سلام کیا۔

شہلا کے پاس آ کر اس نے زوردار چھینک ماری اور پھر رومال ناک پر رکھ لیا۔

''جب سے تم نے مجھے یاد کیا ہے مجھے روز ہی چھینکیں آتی ہیں۔ آخر تم کو میری یاد اتنا کیوں ستاتی ہے؟''

''مجھے تمہاری یاد نہیں ستاتی اس لیے تم بھی مجھے نہ ستاؤ اور جاؤ یہاں سے۔''

''شہلا بچپن میں جب تمہاری ناک بہا کرتی تھی تو میں ہی تمہاری ناک صاف کیا کرتا تھا۔''

''میری ناک تو بچپن میں بہا کرتی تھی تمہاری جوانی میں بھی بہہ رہی ہے۔''

''تم یہاں کیا کر رہے ہو، چلو باہر۔'' خالدہ نے آتے ہی قباچہ کو باہر کا راستہ دکھایا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

''قباچہ ایک دفعہ پھر زور زور سے چھینکیں مارنے لگا اور چھینکتا چھینکتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

''امی یہ کیا آپ نے کھانسی اور دمے کے مریض گھر بلا لیے ہیں۔ آپ ان دونوں بیماریوں کو گھر سے نکالیے ورنہ میں ان بیماریوں کا شکار ہو جاؤں گی۔'' اتنا کہہ کر شہلا واش روم میں چلی گئی۔

☆☆☆

لان میں رمضان اور خالدہ بیٹھے تھے دونوں اپنی اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے، جس کی وجہ سے شہلا بہت ڈسٹرب تھی۔ شہلا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان دونوں سے کیسے جان چھڑائے۔

''تم اپنے لاڈلے جیدی کو کہو واپس چلا جائے ایک ہفتہ ہے یہاں آئے ہوئے، شہلا نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے وہ جیدی کو پسند نہیں کرتی۔''

''تمہارے قباچہ کو بھی ایک ہفتہ ہو گیا ہے یہاں آئے ہوئے شہلا نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے وہ قباچہ کو پسند نہیں کرتی۔''

انیلا، شہلا اور ناصر کے پلان کے مطابق ناصر، شہلا کے گھر آ گیا اس نے آتے ہی رمضان اور خالدہ کو باری باری سلام کیا۔

''کون ہو تم؟ یہ منہ اٹھائے اندر کیوں آ گئے ہو۔'' رمضان نے ناصر کو دیکھا تو غصہ سے بولا۔

''میں جی ایک بے روزگار نوجوان ہوں بی اے پاس ہوں۔'' ناصر نے اپنا تعارف کروایا۔

''بی اے کی ڈگری جعلی تو نہیں۔'' خالدہ نے پوچھا۔

''نہیں جی بالکل اصلی ہے اگر اصلی ہوتی تو میں اس وقت نوکری کے لیے دھکے نہ کھا رہا ہوتا بلکہ اسمبلی میں ہوتا۔''

''یہاں کیا لینے آئے ہو؟'' خالدہ نے پوچھا۔

''میں نے جی ککنگ کورس کر رکھا ہے بڑے اچھے کھانے بنانا جانتا ہوں، آپ مجھے اپنا خانساماں رکھ لیں میں آپ کو بڑے اچھے اچھے کھانے پکا کر کھلایا کروں گا، تین سال میں نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں بطور کک کام کیا ہے۔''

''تم تو بہت بڑے کک لگتے ہو، تنخواہ بھی بہت زیادہ مانگو گے۔'' رمضان نے اندازہ لگایا۔

''آپ مجھے دو وقت کی روٹی دے دیں گے تو میں آپ کا کام ہنسی خوشی کروں گا۔''

''اچھا یہ بات ہے تو پھر آج سے ہی کچن سنبھالو۔'' خالدہ خوش ہوئی۔

''آؤ بھئی میں تم کو کچن دکھا دوں۔'' شہلا خوش ہوتے ہوئے ناصر کو کچن میں لے آئی۔

''میں نے تو کبھی انڈا نہیں ابالا۔'' ناصر پریشان تھا۔

''رانجھے نے ہیر کے بھینس چرائی تھی، تم میرے لیے کھانے نہیں پکا سکتے۔'' شہلا بولی۔

''میں کھانا جلا تو سکتا ہوں پکا نہیں۔''

''میں تمہاری ہیلپ کر دیا کروں گی۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔ بس جو دو بیماریاں لگ گئی ہیں نزلہ اور کھانسی بس ان کا علاج ہو جائے تو پھر میں امی ابو سے اپنی شادی کی بات کروں گی۔'' شہلا نے ناصر کو تسلی دی۔

''یہ انیلا کی بچی کہاں ہے۔ مجھے یہاں پھنسا کر خود غائب ہے۔''

''وہ بھی گاہے بگاہے چکر لگاتی رہے گی۔''

''اچھا تو تم لوگ مجھے یاد کر رہے تھے؟ اچانک ہی کچن میں انیلا آ گئی۔

''لو شیطان کا ذکر کیا اور شیطان حاضر۔'' ناصر نے انیلا کو دیکھتے ہی اس پر پھبتی کسی۔

''خانساما جلدی سے میرے لیے ایک کڑک قسم کی چائے بنا کر پیش کرو۔'' انیلا ہنستے ہوئے بولی۔

''اچھا میں بنا دیتی ہوں۔'' شہلا نے دیگچی چولہے پر رکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے تو چائے خانساماں کے ہاتھوں کی بنی پینی ہے آخر یہ فائیو اسٹار ہوٹل کا کک اس کے ہاتھوں کی بنی چائے کا الگ ہی مزہ ہو گا۔'' انیلا ہنسنے لگی۔

''انیلا باز آ جاؤ تم ورنہ کیا.....''

''ورنہ کیا.....؟''

''ورنہ میں تم کو چائے بنا دوں گا۔''

☆☆☆

''مسٹر قباچہ شہلا صرف میری ہے۔'' جیدی نے قباچہ کو پکارتے ہوئے کہا۔

''مسٹر جیدی شہلا صرف میری ہے قباچہ بھی اچھلتے

www.Paksociety.com
www.Pakistanipoint.com

ہوئے بولا۔

''ٹاس نہ کرلیں۔'' اچانک ناصر بھی لان میں آ گیا اور اس نے آتے ہی دونوں کو تجویز دی۔

''جاؤ میرے لیے چائے لے کر آؤ۔'' قباچہ نے ناصر پر حکم چلایا۔

''میرے لیے ملک شیک لے کر آؤ۔'' جیدی نے بھی ناصر پر حکم چلایا۔

''میں تو صرف لسی بنا سکتا ہوں۔'' ناصر بولا۔

''بدتمیز خانساں دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' جیدی نے ناصر کو ڈانٹا تو ناصر ہنستا ہوا کچن میں آ گیا۔ کچن میں شہلا پہلے سے ہی موجود تھی اور کچھ پکا رہی تھی۔

''کیا پک رہا ہے؟ ناصر نے آتے ہی پوچھا۔

''بھیجا فرائی کر رہی ہوں؟'' شہلا بولی۔

''کس کا بھیجا؟''

''قباچہ اور جیدی کا۔''

''ان دونوں کے دماغ میں بھیجا ہے؟''

''ہاں یاد آیا ان دونوں کے سر میں تو بھیجا ہے ہی نہیں۔'' شہلا ہنسنے لگی۔

☆☆☆

آج جیدی اور قباچہ کے لیے اسپیشل ڈشز بنی تھیں ڈائننگ ٹیبل پر خالدہ نے جیدی کو اپنے پاس بٹھایا تھا۔ جب کہ رمضان کے پاس قباچہ بیٹھا تھا۔ انیلا بھی اس دعوت میں انوائٹ تھی وہ شہلا کے پاس بیٹھی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر خالدہ قباچہ کو اور رمضان جیدی کو گھور رہا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر بہت سی ڈشز بنی پڑی تھیں۔ ان سب ڈشز کو دیکھ کر سب کی بھوک چمک اٹھی تھی۔

''بیٹا یہ کھیر لو، ہم نے نیا کک رکھا ہے یہ اس نے بنائی ہے۔'' خالدہ نے کھیر والا ڈونگہ جیدی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

جیدی کے منہ میں کھیر کو دیکھ کر پانی آ گیا اور وہ للچائی ہوئی نظروں سے کھیر کو دیکھنے لگا۔

''انکل مجھے مسور کی دال بڑی پسند ہے وہ نہیں بنائی؟'' قباچہ بولا۔

''یہ منہ اور مسور کی دال۔'' خالدہ نے قباچہ کا مذاق اڑایا۔

سب کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔ جیدی اور قباچہ کو شہلا نے بریانی زیادہ سے زیادہ کھلائی۔ کیونکہ انہوں نے بریانی میں جمال گھوٹا بھی ڈال دیا تھا۔ جس کا اثر عنقریب شروع ہونے والا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی جیدی اور قباچہ کے پیٹ میں گڑ گڑ شروع ہوگئی اور دونوں کا معاملہ گڑبڑ ہو گیا۔ دونوں کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔ ان مروڑوں نے جیدی اور قباچہ کو مروڑ کر رکھ دیا تو دونوں ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کر بھاگ واش روم کی طرف بھاگے، جیدی قباچہ سے تیز نکلا۔ اس نے پہلے واش روم تک رسائی حاصل کی اور اندر جا کر چٹخنی چڑھائی۔ اب واش روم کے دروازے کے سامنے قباچہ کھڑا پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ پیٹ میں اٹھنے والے سونامی کو کنٹرول کرنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ کبھی وہ دائیں ٹانگ اوپر اٹھاتا تو کبھی بائیں ٹانگ اوپر اٹھاتا، کبھی اٹھتا تو کبھی بیٹھ جاتا۔

☆☆☆

ناصر کچن میں پیاز کاٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ انیلا اور شہلا، ناصر کی یہ صورت حال دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔

''یہ پیار کے آنسو ہیں یا پیاز کے آنسو ہیں؟'' انیلا نے ہنستے ہوئے ناصر سے پوچھا۔

پیار اور پیاز میں صرف ایک نقطے کا ہی فرق ہوتا ہے۔ اب آپ اسے پیار کے آنسو سمجھ لیں یا پیاز کے آنسو سمجھ لیں۔'' ناصر نے اپنی قمیص کے کف سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو پیاز کے آنسو لگ رہے ہیں۔'' انیلا بولی۔

''مجھے تو پیار کے لگ رہے ہیں۔'' شہلا بولی۔

''ہاں بھئی تم کو پیار کے ہی لگیں گے۔'' انیلا بولی۔

''جب تم کو کسی سے پیار ہو جائے گا پھر پوچھوں گی۔'' شہلا نے شرارت کی۔

''انیلا! جیدی اور قباچہ میں تم کو کون پسند ہے؟'' ناصر نے بھی شرارت کی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا میرے لیے، وہ دو بیماریاں ہی رہ گئی ہیں۔'' انیلا حقارت سے بولی۔

''بیماریاں سمجھ لیں ہیں ایک کھانستا ہے اور دوسرا صرف چھینکتا ہے۔'' ناصر ہنسنے لگا۔

''یہ کون سا کینسر اور ایڈز کی بیماریاں ہیں، جن کا علاج

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ممکن نہ ہو۔'' شہلا، انیلا کو زچ کرنے لگی۔

''مجھے آپ دونوں معاف کریں اور اپنا الو سیدھا کریں۔'' انیلا نے دونوں سے جان چھڑانا چاہی۔

☆☆☆

ڈرائنگ روم میں جیدی اور قباچہ ناصر کو چائے کے لیے آوازیں دے رہے تھے۔ ناصر ٹرے میں دو کپ سجائے جلدی جلدی آیا اس نے ایک کپ جیدی کے دوسرا کپ قباچہ کے آگے رکھا تو گرم گرم چائے کی بھاپ جب قباچہ کے نتھنوں تک پہنچی تو اس نے چھینکنا شروع کر دیا اور جب چائے کی بھاپ جیدی کے نتھنوں تک پہنچی تو اس نے کھانسنا شروع کر دیا۔ قباچہ نے جیب سے رومال نکالا اور ناک سے بہتا پانی صاف کیا۔

''چائے کے ساتھ تو تم نے کوئی نمک حرامی نہیں کی؟'' قباچہ چائے کا گھونٹ بھرنے لگا تھا کہ اس نے پوچھا۔

''نہیں آج تو میں نے نمک حلالی کی ہے، بلکہ شمیم ہلالی کی ہے۔'' ناصر کی یہ بات قباچہ کے پلے نہ پڑی۔

''کھانوں میں تم اتنا نمک کیوں استعمال کرتے ہو؟'' قباچہ نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''پاکستان میں نمک ہی تو سستا ہے اس لیے کھلے دل سے استعمال کرتا ہوں۔'' ناصر بولا۔

''آج کل تو آلو بھی سستے ہیں۔'' جیدی نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

''آلو والے پراٹھے آج بناؤں دوپہر کو آپ کے لیے؟'' ناصر نے دونوں کو پیش کش کی۔

''رہنے دو پراٹھوں میں بھی تم دل کھول کر نمک استعمال کرو گے اور مجھے بلڈ پریشر کا مریض بنا دو گے۔'' قباچہ نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

☆☆☆

''میری امی نے تو میری شادی کے کارڈ جیدی کے ساتھ اور میرے ابو نے میری شادی کے کارڈ قباچہ کے ساتھ چھپنے کے لیے دے دیئے ہیں۔'' شہلا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ تمہارے امی ابو اس قدر ضدی ہیں مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔'' انیلا حیران ہوئی۔

''میرے ابو نے میری شادی قباچہ کے ساتھ کرنے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔''

غزل

تیرگی بحرِ تمنا کی نکالے رکھنا
میری صبحوں میں اجالے ہی اجالے رکھنا
میں جہاں خواب رہن رکھ کے چلی آئی ہوں
بادِ طوفاں کو ادھر جانے سے ٹالے رکھنا
میں کہ جو خود کو میسر بھی نہیں آپائی
چاہنے والو میری خوشبو اچھالے رکھنا
جن کے حصے میں اثاثے ہیں میری یادوں کے
ان سے کہیے کہ یہ جاگیر سنبھالے رکھنا
کیا خبر دید میسر ہو کہاں، کب، کیونکر
میرے الفاظ کے احساس، حوالے رکھنا

تسنیم سحر۔۔۔قصور

اور تمہاری امی نے تمہاری شادی جیدی کے ساتھ کرنے کو انا کا مسئلہ بنا لیا ہوگا۔'' انیلا بولی۔

''بالکل ایسا ہی ہے۔''

''صورتحال تو کافی گھمبیر ہوتی جا رہی ہے۔''

''ضدی چکی کے دو پاٹوں میں، میں پستی جا رہی ہوں۔'' شہلا نے روتے ہوئے بتایا۔

☆☆☆

شہلا لان میں بیٹھی تھی قباچہ چھنکتا ہوا آیا اس نے پیار بھری نظروں سے شہلا کو دیکھا۔

''شہلا میری شادی تم سے طے ہو گئی ہے اب میں تم کو بہن بھی نہیں کہا کروں گا۔'' قباچہ نے ناک سے رومال ہٹا کر چھینک ماری۔

''اب تم مجھے کیا کہو گے؟''

''جان۔'' قباچہ شرم سے دوہرا ہوتے ہوئے بولا۔

''اگر تم مجھے جان کہو گے تو میں تم کو بھائی جان کہوں گی۔''

''اس طرح تو ہمارا نکاح ٹوٹ جائے گا۔'' قباچہ شرماتے ہوئے بولا۔

''تیرا میرا نکاح ہوگا تو ٹوٹے گا البتہ تمہارا سر ضرور ٹوٹ سکتا ہے۔''

قباچہ نے جب شہلا کی کھری کھری باتیں سنیں تو دم

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

دبا کر وہاں سے بھاگ۔ قباچہ کے جاتے ہی چند منٹوں بعد جیدی لان میں آ گیا، اس نے لان میں لگے ایک گملے سے گلاب کا پھول توڑا اور کورنس بجالانے کے انداز میں شہلا کو گلاب کا پھول پیش کیا اور ساتھ کھانسنا بھی شروع کر دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' شہلا نے گھور کر جیدی کو دیکھا۔

شہلا جی ہماری شادی طے ہوگئی ہے ہم ہنی مون بنانے کہاں جائیں گے؟''

''اگر تم نے اب ہنی مون کا نام لیا تو میں تمہارا خون کر دوں گی۔'' شہلا نے جیدی کا دیا ہوا گلاب کا پھول مسل دیا اور اس کی پتیاں لان میں بکھیر دیں۔

''میرا تو ارادہ ویسے سوئٹزرلینڈ جانے کا ہے۔'' جیدی ڈھٹائی سے بولا۔

''میرا ارادہ تم کو چیچو کی ملیاں بھیجنے کا ہے۔'' اچانک وہاں ناصر آ گیا۔

''یہ چیچو کی ملیا تو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔''

جب تمہاری شادی نوراں مسلن سے ہوگی پھر میں تم کو ہنی مون کے لے چیچو کی ملیاں بھیجوں گا۔''

☆☆☆

آخر اتوار کا دن آ گیا خالدہ اور رمضان اپنی اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے۔ خالدہ نے زبردستی شہلا کو دلہن بنایا اور جیدی کو دلہا بنا کر اچھی سی شیروانی پہنا کر سر پر کلاہ رکھ دیا شہلا نہ چاہتے ہوئے بھی دلہن بنی ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ جیدی کھانستا ہوا شہلا کے دائیں جانب صوفے پر بیٹھ گیا۔ رمضان نے قباچہ کو دلہا بنایا اور شہلا کے بائیں جانب لا کر صوفے پر بٹھا دیا۔ مولوی صاحب بھی آ چکے تھے۔ قباچہ نے شہلا کے پاس بیٹھتے ہی جھینکنا شروع کر دیا۔

''مولوی صاحب نکاح شروع کیجئے۔'' خالدہ گرجی۔

''کس کا کس کے ساتھ؟'' مولوی دو، دلہے دیکھ کر کنفیوز ہو رہا تھا۔ اور دلہن صرف ایک تھی۔

''شہلا کا جیدی کے ساتھ۔'' خالدہ گرجی۔

''شہلا کا قطب الدین قباچہ کے ساتھ۔'' رمضان بھی گرجا۔

''پہلے آپ فیصلہ کر لیں۔ اس دختر نیک اختر کے ساتھ کس کا نکاح پڑھوانا ہے۔'' مولوی صاحب بولے۔

''انکل آنٹی میرا ایک مشورہ ہے۔'' انیلا کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''جیدی اور قباچہ میں سے جو عقل مند ہوگا اس کی شادی شہلا سے کر دی جائے۔''

''میرا جیدی عقل مند ہے۔'' خالدہ نے بھی قباچہ کی ہاتھوں سے نظر اتاری۔

''عقل میں تو قباچہ کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔'' رمضان بولا۔

''میں ان دونوں سے ایک سوال کروں گی جو میرے سوال کا درست جواب دے دے گا اس کی شادی شہلا سے کر دیجئے گا۔'' شہلا پر اعتماد لہجے میں بولی۔

''مجھے منظور ہے۔'' خالدہ بولی۔

''مجھے بھی منظور ہے۔'' رمضان نے بھی فوراً کہا۔

''آنٹی مجھے آپ دونوں پر یقین نہیں ہے کہ آپ میری بات پر قائم رہیں گے اس لیے آپ دونوں قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں جو میرے سوال کا درست جواب دے گا آپ اس کی شادی شہلا سے کر دیں گی۔''

قرآن لایا گیا، قرآن ایک نہایت ہی خوب صورت غلاف میں بند تھا۔ خالدہ اور رمضان کے ہاتھ قرآن پر رکھوائے گئے جب خالدہ اور رمضان نے قرآن پر ہاتھ رکھ دیئے تو انیلا بولی۔

''انکل، آنٹی اب میں جو بولوں گی آپ نے بھی میرے ساتھ ساتھ بولنا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' خالدہ اور رمضان بیک زبان بولے۔

''جو بھی انیلا کے سوال کا صحیح جواب دے گا ہم اس کی شادی شہلا سے کر دیں گے۔''

اب انیلا نے ان دو ضدی شخصیتوں کو اپنے جال میں پھنسا لیا تھا۔ ناصر اور شہلا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انیلا کیا کرنے جا رہی ہے۔

''انیلا یہ تم کیا کرنے جا رہی ہو میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔''

''تم چپ کر کے خاموش ہو کر بیٹھی رہو دلہن شادی والے دن نہیں بولا کرتیں۔'' انیلا نے شہلا کو زبردستی چپ کروا دیا۔

''میری ساری زندگی کا سوال ہے کہیں مجھے کالی کھانسی

www.pakistanipoint.com
Azeem

یا چھینکو کے پلے نہ پڑوا دینا تم۔"

شہلا پریشان تھی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن اس نے انیلا پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے آپ کو انیلا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اسے یقین تھا انیلا جو بھی کرے گی اس کے حق میں بہتر ہی کرے گی۔ ناصر کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا آخر انیلا کیا کھیل کھیلنے والی ہے۔

"انیلا اب سوال پوچھو۔" خالدہ انیلا کا سوال سننے کو بے تاب تھی۔

"بیٹی جلدی سوال کرو اور یہ سسپنس ختم کرو۔" رمضان بھی سوال سننے کو بے چین تھا۔

"میرا سوال ہے جہاز لاہور سے کراچی 90 منٹ میں جاتا ہے اور جب کراچی سے لاہور آتا ہے تو ڈیڑھ گھنٹے میں آتا ہے۔"

انیلا کا سوال سن کر جیدی اور قباچہ حواس باختہ ہو گئے اور سوچنے لگے جہاز لاہور سے کراچی 90 منٹ میں جاتا اور کراچی سے لاہور واپس ڈیڑھ گھنٹے میں آتا ہے دونوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کیونکہ دونوں ہی ہونق تھے۔

"جیدی صاحب جلدی جواب دیجیے۔" انیلا نے جیدی کی طرف ہنستے ہوئے دیکھا۔

"دیتا ہوں۔ مجھے کچھ سوچنے دو۔" جیدی کھانستے ہوئے بولا۔

"قباچہ صاحب آپ کے ذہن میں جواب آیا کہ نہیں۔" انیلا نے قباچہ کو مخاطب کیا۔

"ابھی آ جاتا ہے۔" قباچہ چھینکتے ہوئے بولا۔

"ذہن ہوگا تو اس کے ذہن میں آئے گا۔" خالدہ بولی۔

"تمہارا جیدی کون سا آئن اسٹائن ہے۔" رمضان نے بھی جیدی کی کلاس لی۔

"ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، دس اور اب بس۔" انیلا نے دس تک گنتی گننے کے بعد سب کو خاموش کروا دیا۔ "ہے کسی کے پاس میرے سوال کا جواب؟" شہلا نے ناصر کی طرف دیکھا۔

"میں اس سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔" ناصر خوش ہوتے ہوئے بولا۔

"ہاں جلدی جواب دو کہیں دیر نہ ہو جائے۔" انیلا بولی۔

"جہاز جب لاہور سے کراچی جاتا ہے تو 90 منٹ میں جاتا اور جب کراچی سے واپس لاہور آتا ہے پھر بھی 90 منٹ میں ہی واپس آتا ہے اس میں فرق کیا ہے؟" ناصر بولا۔

"میں نے کہا نا جہاز جب لاہور سے کراچی 90 منٹ میں جاتا ہے اور کراچی سے لاہور واپس ڈیڑھ گھنٹے میں آتا ہے۔ آپ کو اس میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔" انیلا نے پوچھا۔

"ڈیڑھ گھنٹے میں 90 منٹ ہی ہوتے ہیں۔" ناصر بولا۔

"ناصر تمہارا جواب درست ہے اس لیے اب شہلا کی شادی تم سے ہوگی۔" انیلا اپنی چال میں کامیاب ہو چکی تھی۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔" خالدہ گرجی۔

یہ نہیں ہو سکتا، رمضان بھی گرجا۔

"انکل آپ قرآن پر حلف دے چکے ہیں کہ جو اس سوال کا درست جواب دے گا آپ شہلا کی شادی اس سے کریں گے۔" انیلا نے دونوں کو یاد دہانی کروائی۔

"اگر آپ نے اپنے حلف کی پاسداری نہ کی تو آپ کو قرآن کی مار پڑے گی۔" مولوی صاحب نے خالدہ اور رمضان کو اللہ کے عذاب سے آگاہ کیا۔ انیلا اپنی گیم کامیابی سے کھیل چکی تھی۔ اس لیے خالدہ اور رمضان کو مجبوراً شہلا کی شادی ناصر سے کرنا پڑی مولوی صاحب نے ناصر اور شہلا کا نکاح پڑھوایا۔ قباچہ اور جیدی نے بطور گواہ چھینکتے اور کھانستے ہوئے نکاح نامے دستخط کیے۔

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

رازِ سربستہ

ثناء اللہ خان احسن

قدرت کی طرف سے انسان کو بے شمار ایسی اشیا عطا کی گئی ہیں جن کے بارے میں ہم اب تک لاعلم ہیں۔ بعض چیزیں ہم روز مرہ کے استعمال میں لیتے ہیں مگر ان کی ایک ہی افادیت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ مگر ہر شے کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک اچھا اور دوسرا برا اب یہ ہم پر منحصر ہوتا ہے کہ اب اس شے کو اپنے لیے فائد مند بناتے ہیں یا نقصان دہ۔

اسرار و رموز کی دنیا سے ایک انوکھی اور دلچسپ تحقیق، ثناء اللہ خان احسن کے قلم سے ایک اور راز بے پردہ

پان۔۔۔ ہندوستانی ثقافت کی جان

پان کی تاریخ ہزاروں برس پرانی ہے۔ ہندو مائتھالوجی میں بیان کیا گیا ہے لارڈ کرشنا جی پان کھاتے تھے۔ ہزاروں برس سے ہندو وید اس کو بطور دوا بھی استعمال کرواتے تھے۔ اصل پان کی تاریخ برصغیر میں مغلیہ دور اقتدار کے دور سے ملتی ہے۔ پان کو ملکہ بیگم نور جہاں جو شہنشاہ جہانگیر کی بیوی بھی تھی پان کو بطور علاج استعمال کرتی تھیں۔ ملکہ سیاسی علم و فراست و ذہانت میں اپنی مثال آپ تھیں۔ اکثر جہانگیر بادشاہ اہم ملکی امور خانہ جات میں ملکہ سے ہی مشورہ لیتا تھا۔ لیکن بادشاہ سلامت، اپنی بیگم کے منہ کی بدبو سے بڑا متنفر تھا۔ اس بیماری کے تدارک کے لئے برصغیر کے نامور حکماء کو دربار عالیہ میں مدعو کیا گیا۔ حکماء نے اپنی تدبرانہ، پیشہ وارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ایک نسخہ پیش کیا کیونکہ پان کے پودے کا پتہ بھی اس نسخہ میں شامل تھا جو پان کی شہرت کی وجہ بنا۔ پان کو بنانے کے لئے اس وقت جن خاص اجزاء کا استعمال کیا گیا ان میں چھوٹی الائچی جو پیٹ کو نرم رکھتی ہے، دو عدد، لونگ جو خون کو گرم رکھنے اور منہ سے مضر مادوں کا رفع کرتے ہیں اور حاضر دماغی کے لئے فائدہ مند ہے، ایک عدد، چونا یا کیلشیم، کتھا جو ہونٹوں کی سرخی کے لئے شامل کی گئی، میٹھی لونگ جو دانتوں اور مسوڑوں کی حفاظت کیلئے مفید ہے شامل کی گئی۔ چھالیا چند دانے جو پیٹ کے کیڑے مارنے کے لئے فائدہ مند ہے کو شامل کیا گیا اور سونف اور ناریل جو دماغی قوت کو دوام دیتا ہے۔ الغرض پان ہماری تہذیب سے اس قدر جڑا ہے کہ ہر خاص و عام اس کا دل دادہ ہے۔ ہندو مذہبی روایات میں بھی پان کا بہت دخل ہے۔ اور چھا کے رام مندر میں پان بطور تبرک دیا جاتا ہے تو جنوبی ہندوستان کے ایک مندر میں بھگوان کی مورتی کے ماتھے پر لگا مکھن پان کے پتے میں ہی لپیٹ کر زائرین کو ملتا ہے۔ پان کی جڑ پتے اور رس بھی مختلف طبی نسخوں میں استعمال ہوتے ہیں۔

کچھ دلچسپ عقائد بھی پان سے جڑے ہیں۔ بہار میں دلہا، دلہن کے ایک ہونے کی علامت کے طور پر وہ اپنے خون کا قطرہ پان پر ٹپکا کر ایک دوسرے کو دیتے ہیں گویا جب ایک دوسرے کا خون آپس میں مل گیا تو بس ایک ہو گئے۔

ہندوستان آنے والے غیر ملکی سیاحوں نے بھی پان کا ذکر بہت دلچسپی سے کیا ہے۔ بیرونی اپنی کتاب، کتاب الہند میں لکھتے ہیں کہ ہندوستانیوں کے دانت سرخ ہوتے ہیں۔ امیر خسرو نے کہا کہ پان منہ کو خوشبودار بناتا ہے۔ چینی سیاح آئی چنگ نے پان کو ہاضم قرار دیا۔ عبدالرزاق جو کالی کٹ کے بادشاہ زمورن کے دربار میں سمرقند سے سفیر بن کر آئے تھے، پان کی خوبیوں کو سراہتے دکھائی دیے۔ کہتے ہیں کہ پان کھانے سے چہرہ چمک اٹھتا ہے۔ دانت مضبوط اور سانس کی بدبو دور ہو جاتی ہے۔

فارسی میں کہیں کہیں اسے ''برگ سبز'' کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ فارسی کا ایک محاورہ ہے، جس میں پان کو ''برگ سبز'' کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے ''برگ سبز است تحفہ درویش''، یعنی سبز پتا (پان) فقیر کا ہدیہ ہے۔

Waqar Azeem Pakistanipoint www.pakistanipoint.com

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف اقسام اور مختلف سائز کے پان پیدا ہوتے ہیں، جو لذت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔ مگدھی، بنگلہ پان، مہوبا (وسط ہند) بلہری، کانپری، ساچی۔ لیکن ان پانچوں اقسام کے علاوہ اور بھی کئی طرح کے پان ہیں، جو نہایت شوق سے کھائے جاتے ہیں مثلاً مدراسی، بنارسی اور جیسوار وغیرہ۔ حیدرآباد میں بورم پہاڑ (کھمم ضلع کا پان) بہت مشہور ہے۔ یہ پان نرم اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ شمالی ہند کی طرح یہاں کے پان تیز اور خوشبودار نہیں ہوتے۔ ہاں بھونگیر (ضلع نلگنڈہ) کے پان مائل بہ سیاہی اور تیز ہوتے ہیں، جسے حیدرآباد کے لوگ ''لونگ کا پان'' کہتے ہیں۔

جب سے ہندوستان میں نوابوں، مہاراجوں اور راج واڑوں کا دور شروع ہوا غالباً اسی وقت سے یہاں پان کھانے کا رواج ملتا ہے۔ لکھنو کے تہذیبی پس منظر رکھنے والی فلموں میں کنیزوں کے ہاتھوں پان کی گلوری پیش کرنے کا تذکرہ بھی موجود ہے جبکہ کوٹھوں پر طوائفوں کو نائیکاؤں کے ہاتھوں گلوریاں پروسنے کے سین بھی کئی پرانی بھارتی فلموں میں ملتے ہیں۔ سن 1943 کی بھارتی فلم آبرو میں ''پونے سے لاء پان رے'' بڑا مشہور ہوا تھا جسے اس زمانے کی ایک گلوکارہ ستارہ دیوی نے گایا تھا۔ فلم تیسری قسم میں راج کپور اور وحیدہ رحمٰن پر پکچرائز کیا جانے والا اپنے دور کا ہٹ گانا۔ پان کھائے سیاں ہمارو، کی شہرت نے تو ان لوگوں میں بھی پان کھانے کا شوق جگا دیا جن لوگوں نے کبھی اس کا ذائقہ بھی نہیں چکھا تھا۔ لکھنو اور حیدرآباد کی تہذیب و ثقافت میں پان کو جو عظمت اور دوام حاصل ہوا اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ذیل میں علامہ اعجاز فرخ صاحب کا نثر پارہ ملاحظہ ہو۔

''چاندنی کا فرش، دیوار سے گاؤ تکیہ اور پاندان تو تمام طبقوں میں مشترک تھے۔ امراء اور رئیسوں کی بیگمات کے وقار اور مرتبہ کا اندازہ صرف ان کے پاندان سے لگایا جاتا تھا۔ امراء کے گھروں میں ڈھائی سیری کریم نگر کی مہین جالی کے دو منزلہ پاندان، بالائی منزل میں مہین تراشی ہوئی چھالیہ کی پرتیں، کچھ مشک، کچھ زعفران اور کچھ عنبر میں بسائی ہوئی سونے اور چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی۔ الائچی، لونگ، جوز، جوتری، زعفران، سونف، تراشا ہوا کھوپرا، حسب ذوق زردہ و قوام، بریلی کا کتھا اور کانپوری کتھے کی بڑی اور پپڑی اور چونا خالص عرق گلاب میں بجھایا ہوا اور مہیں ململ سے چھانا ہوا۔ پان بنانے کے انداز میں بھی ایک خاص سلیقہ ہوا کرتا تھا۔ زانو پر بچھی ہوئی سرخ صافی، خاصدان سے کلی دار پان کو چن کر پہلے باریک قینچی سے یوں تراش لیا جاتا تھا کہ کنارے یکساں ہو جائیں۔ یہی تراش تو بیگم صاحبہ کی خاص ہنرمندی تھی جو ان کی مہارت کا ثبوت تھی۔ پھر پان کی نس علیحدہ کر لی جاتی اور پان پر پان جوڑ کر حسب موسم سلائی سے چونا لگایا جاتا تھا کہ جاڑوں میں زعفران اور گرما میں گلاب یا کیوڑے میں کھلی کلی کا چونا ہو۔ بعض گھرانوں میں خشک کتھا اور بعض میں شیر بادام میں پکایا ہوا کتھا استعمال ہوتا تھا۔ چھالیہ، چکنی، سپاری، نرملی، جوز، جوتری، الائچی اور جو پسندیدہ ہو تو گل قند کے اضافہ بعد گلوری کو موڑ کر چاندی لپٹا لونگ ٹانک دیا جاتا تھا اور اس پر حسب مراتب چاندی یا سونے کا ورق لپیٹ کر چاندی کی طشتری میں سرخ مخمل اور اسپر گلوری رکھ کر پیش کی جاتی تھی۔ قبول کرنے والا اس روقد اٹھ کر تعظیم بجا لاتا اور پان قبول کر کے سلام کے عوض ڈھیروں دعاؤں کی سوغات بھی پاتا تھا۔ ادھر اُگالدان ابھی استعمال ہوا ہی تھا کہ کنیز نے فوراً اُگالدان بدل دیا۔

پاندان (جس میں سارے پان کے لوازمات ہوتے) ناگروان (جس میں ایک صاف کپڑے میں پان لپٹ کر رکھا جاتا) ایک بڑے جو اکثر پان ہی کی وضع کی ہوتی جس کے اندر ایک چین رکھی جاتی جس سے متصل چھوٹی چھوٹی چین اور بھی جڑی ہوتی اس میں تھوڑی تھوڑی دور پر لونگ کی طرح بنے ہوئے کانٹے ہوتے جس میں پان کی گلوری کو چبھویا جاتا اور ایسے مختلف ڈیزائن کی تھالیاں یا خاصدان میں رکھ کر کھانے والوں کے سامنے پیش کیا جاتا۔ سروطا جس سے چھالیہ کاٹی جاتی، ساتھ میں اُگالدان بھی رہتا۔ یہ پان کھانے کے بعد پیک کے لئے ہوتا تھا۔ اس کی خاص وضع بنی ہوتی نیچے اور اوپر سے کھلا کھلا اور بیچ میں (خوبصورت حسینہ کی طرح) کمر تنگ بنا ہوتا ہے اس وضع سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ پیک نظر نہیں آتی اور چھینٹے بھی اچھل کر کپڑوں پر نہیں آتے۔ پہلے زمانے میں نوابوں کے پاس ملازم خدمت میں مامور ہوتے تھے جہاں آنکھوں کا اشارہ اگلدان کی طرف کیا جاتا وہ دوڑ کر قریب لے آتا۔

پاندان جہیز میں دینا لازمی ہوا کرتا۔ پاندان کے ساتھ خاصدان، اگلدان، پان کی ڈبہ یا تھالی بھی دی جاتی۔ یہ پاندان مختلف ساخت کے بنائے جاتے جو مختلف سائز کے ہوا

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

کرتے اور مختلف دھات کے بنے ہوتے۔ جرمن سلور کے پاندان مرادآباد کا بنا رہتا ہے اس لئے یہ مرادآبادی پان دان ہی کہلاتا جس میں منقش اور بغیر نقش کے بھی ہوتے ہیں اور بعض میں جالی بھی بنی ہوتی یہ بنے تو جست، تلبنہ یا پیتل کے بھی ہوتے ہیں اکثر ان کے اوپر چاندی کی پالش چڑائی جاتی ہے۔ اور امیروں کے گھروں میں چاندی ہی کے پاندان رہا کرتے تھے۔ پچھلے بیس، تیس سال سے اسٹیل کے بھی پاندان بنے لگے ہیں۔

پان کھانے کے آداب بھی ہوا کرتے تھے چھوٹے بڑوں کے سامنے بنا اجازات کے پان کھانا بدتمیزی سمجھا جاتا، پان کی گلوری منہ میں ڈالتے وقت سیدھے ہاتھ سے کھانا اور دوسرا ہاتھ منہ کے اوپر رکھ کر کھانا، دینے والے اور گھر کے سب سے بڑی ہستی اگر سامنے ہو تو ان کو بھی سلام کرنا ضروری سمجھا جاتا۔ لیڈیز میں اگر کوئی بڑے آنے پر پاندان ان کے اختیار میں دے دیتے اس کو عزت دینے میں شمار کیا جاتا تھا۔ بعض لوگ اپنے ہی ہاتھ کا بنا پان کھانا پسند کرتے تو وہ میزبان کی اجازات لے کر خود ہی بنا لیتے اور امانت کی طرح پاندان میزبان کی طرف بڑا دیتے تھے۔ بغیر اجازات کے پاندان کو استعمال کرنا بدتمیزی سمجھا جاتا۔ بقول مشتاق یوسفی ایک خاص انداز سے پان لگا کر ہلکے سے جھک کر آداب کے ساتھ پان پیش کرنے کے لئے نسلوں کا رچاؤ چاہئے۔

ایک دلچسپ بات آپ کو بتاؤں کہ ملکہ ترنم نور جہاں نے پہلی بار مہدی حسن کو ایک پان کی دکان پر ریڈیو کے ذریعے سنا تھا۔ میڈم نور جہاں اکثر رات کو پان کھانے کی غرض سے لاہور گلبرگ کی ایک مشہور پان کی دکان پر جاتی تھیں جہاں بڑے بڑے فنکار آ کر پان کھاتے اور یہاں سے پان بندھوا کر لے جاتے تھے ایک دن میڈم نور جہاں مشہور کلاسیکل اور غزل سنگر اعجاز حضروی کے ساتھ اسی دکان سے پان لے رہی تھیں کہ دکان پر رکھے ہوئے ٹرانسسٹر ریڈیو سے ایک غزل نشر ہو رہی تھی جس کا مطلع تھا۔

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

میڈم یہ آواز سن کر چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گئیں پھر چپ چاپ گاڑی میں بیٹھی سنتی رہیں۔ جب غزل ختم ہوئی تو اناؤنسر نے کہا ابھی آپ نے میر تقی میر کی غزل گلوکار مہدی حسن کی آواز میں سنی تب میڈم نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اعجاز حضروی سے کہا تھا معلوم تو کرنا اعجاز یہ کہاں ہوتا ہے غزل گائیک؟ اس کی آواز نے تو ہمارے دل کے تار چھیڑ دیے ہیں۔

مہدی حسن بھی پان کے رسیا تھے اور کہتے تھے کہ پان کی خوشبو کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ اسی طرح قوال اور پان لازم و ملزوم ہیں۔ بغیر پان کھائے آواز میں غلام فرید صابری جیسا ٹانٹا پن پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ بلکہ اکثر قوال تو پان کی گلوری کلے میں دبا کر قوالی گاتے ہیں۔ چاکلیٹی ہیرو وحید مراد بھی پان کے انتہائی شوقین تھے۔ کراچی اور لاہور دونوں شہروں میں ان کے لئے پان مخصوص دکانوں سے آتے تھے۔ حتیٰ کہ اپنے انتقال کی رات بھی وہ پان منہ میں دبا کر سوئے تھے۔

پرانے وقتوں میں پان بنانے کا پیشہ تنبولن کرتی تھی پھر آہستہ آہستہ سڑکوں پر پان کی دکانیں کھلنے لگیں۔ لوگ تنبول کا لفظ ہی بھول گئے بس پان اور پان والا یاد رہ گیا۔ تنبولن نام اس لئے پڑا کہ پان کو فارسی میں برگ تنبول کہا جاتا ہے۔

عام طور پر پان کی قیمت پاکستان بھر میں پانچ روپے سے شروع ہوتی ہے اور دس بارہ روپے پر ختم ہو جاتی ہے مگر شہر قائد کے کچھ علاقے ایسے بھی ہیں جہاں کے پان مشہور تو ہیں ہی، ان کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ ان علاقوں کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتے۔ مثلاً وی آئی پی پان، وی وی آئی پی پان، سہاگ پوڑا، پان بیڑا اور ڈسکو گلوری، اور سنیئے ان پانوں کی قسمیں، سانچی پان، کولٹا پان، سیلون پان، بنگلا پان، بنارسی پان۔ شاید آپ کے لئے بھی یہ نام نئے ہوں کیوں کہ جو پان کھانے کی حد درجہ شوقین ہیں وہ بھی ان قسموں سے کم ہی آشنا ہیں۔

پان کی قسموں سے زیادہ ان کی قیمتیں حیران کن ہیں۔ مثلاً وی آئی پی پان کی قیمت تین سو روپے ہے۔ اس میں چاندی کے اصلی ورق، تازہ گلاب کے پھولوں کی تیار کردہ گلقند ڈالی جاتی ہے۔ وی وی آئی پی پان کا اندازہ آپ خود لگا لیجئے کیوں کہ اس میں اصل شہد اور پھولوں کی گلقند ڈالی جاتی ہے۔ سہاگ پوڑا چار سو روپے میں ملتا ہے اور اسے ایک بار میں کوئی بھی نہیں کھا سکتا لہٰذا تھوڑا تھوڑا اور رکھ رکھ کر کھایا جاتا ہے۔ ایک پان کا وزن ایک پاؤ ہوتا ہے۔ اس میں چھوٹی الائچی اور میوے ڈالے جاتے ہیں۔ پستا خاص کر ڈالا جاتا ہے اور چونکہ الائچی کی قیمت اس وقت تین ہزار روپے اور پستہ

www.paksociety.com

2400 روپے کلو ہے لہٰذا بقول دکاندار محمد عرفان کے پان پوڑا اگر چار سو روپے میں مل رہا ہے تو بھی سستا ہے۔ آخری قسم پچتی ہے پان بیڑے کی تو اس کی قیمت ایک سو روپے ہے۔ اس میں رنگی برنگی پھول پتیاں اور رنگ دار کھوپرا ڈالا جاتا ہے۔

پان کی پیک وہی لوگ تھوکتے ہیں جو پان میں تمباکو کا استعمال کرتے ہیں۔ ہر شخص اپنے ذوق اور شوق کے مطابق مختلف اقسام کے تمباکو پان میں ڈلواتا ہے۔ پتی تمباکو، ممتاز تیز پتی مراد آبادی، 120 نمبر، انڈین پتی، شہزادی پتی، عزیزی پتی، ظہور زعفرانی، راجہ جانی، نامی اقسام موجود ہیں۔ اس کے علاوہ قوام بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ پان کے عادی لوگ کسی ایک مخصوص دکان سے ہی پان خریدتے ہیں۔ تمباکو پان کے رسیا لوگ کہتے ہیں کہ پان کا سارا نشہ اصل میں کتھا چونا لگانے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہی تمام لوازمات والا پان اگر کسی دوسری پان کی دکان سے لیا جائے تو سرور نہیں آتا۔ پان کے نشے والا بھی ہر حال میں اپنا نشہ ضرور پورا کرتا ہے۔

تن پے نہیں لتا، پان کھاؤں البتہ

کراچی میں کریم آباد پر واقع دکان پر یہ قسمیں موجود ہیں۔ رنچھوڑ لائن، پان منڈی، کھارادر، میٹھادر اور لسبیلہ پر بھی مخصوص دکانوں پر یہ پان دستیاب ہیں۔ گارڈن کے علاقے کی سب سے مشہور اور پرانی دکان گولڈن پان شاپ ہے۔ یہ دکان اس قدر مشہور و معروف ہے کہ کہا جاتا ہے جس نے گولڈن پان شاپ نہیں دیکھی اس نے پان کھانا ہی نہیں سیکھا۔ اس کی کئی شاخیں ہیں جو گارڈن، گلستان جوہر، طارق روڈ، کلفٹن اور ڈیفنس میں واقع ہیں۔

بھارت کے شہر کلکتہ میں ایک پان کی دکان پر دلہا دلہن کے لئے اسپیشل تیار کردہ پان کی قیمت پانچ ہزار روپے ہے۔ اس پان میں خالص مشک، عنبر، زعفران، سونے کا ورق اور کچھ خاص جڑی بوٹیاں ڈالی جاتی ہیں۔ یہ پان جوان کو پہلوان اور پہلوان کو بلوان بنا دیتا ہے۔ جبکہ بوڑھے میں جوانی کی بجلی دوڑا دیتا ہے۔۔ دولہا اور دلہن کے پان کے لوازمات الگ الگ ہوتے ہیں۔ دلہن کے پان میں ایک بوٹی سفید موصلی بھی ڈالی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سات لاکھ روپے کلو والی ایک خاص خوشبو جو صرف بنگلہ دیش میں دستیاب ہے وہ بھی شامل کی جاتی ہے۔ ایک قسم 'چھوٹی موئی پان' کی بھی ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ منہ میں رکھتے ہیں چھوٹی موئی کے پھول کی طرح سکڑتا اور منہ میں گھلتا چلا جاتا ہے۔

کراچی میں خود پان کھانے کا تو رواج ہے ہی، مہمان نوازی بھی پان کے بغیر بعض جگہ ادھوری سمجھی جاتی ہے۔ اکثر گلہ بھی کیا جاتا ہے کہ 'فلاں کے گھر گئے تھے اس نے تو چائے پانی چھوڑو۔ پان کو بھی نہیں پوچھا'۔

اسلام آباد سیکٹر F8 میں ایک پان کی دکان ہے جہاں مالک دکان مغل شہنشاہوں جیسا لباس زیب تن کئے سنہری کرسی پر براجمان ہوتے ہیں۔ وہ اپنے گاہکوں کو خالص مغل اسٹائل میں پان پیش کرتے ہیں۔ گاہے بگاہے گلاب پاش سے گاہکوں پر عرق گلاب بھی چھڑکا جاتا ہے۔ اسی طرح بھارتی ریاست گجرات میں میں ایک پان کی دکان پر پان میں آگ لگا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس شعلہ زدہ پان کو منہ میں رکھتے ہی جلدی سے منہ بند کر لیا جاتا ہے جس سے آگ بجھ جاتی ہے لیکن ناک سے دھواں خارج ہوتا ہے۔ یہ پان خود مالک دکان اپنے ہاتھ سے گاہک کے منہ میں رکھتے ہیں۔ اب ایسا ہی آگ والا پان کراچی میں بھی متعارف کروا دیا گیا ہے۔ لاہور کا انارکلی بازار پان گلی بھی پان کی دکانوں کے لئے مشہور ہے۔ اسی طرح ڈیفنس لاہور کی جیدی پان شاپ بہت مشہور ہے جہاں لوگ دور دور سے پان کھانے آتے ہیں۔ جیدی کی خاص بات مختلف فلیور والے میٹھے پان ہیں جن میں ڈرائی فروٹس بھی شامل ہوتے ہیں۔ جیدی کے میٹھے پان کی قیمت پچاس روپے ہے۔

جب سے پان میں تمباکو کا استعمال شروع ہوا تب ہی سے پان میں خرابیاں نظر آنے لگی ہیں اور اسے مضر صحت ماننے لگے ہیں اور اسی کی بنا پان کا عروج زوال کی طرف آنے لگا۔ تمباکو یعنی زردہ جب پان میں ڈالتے ہیں تو تھوکنا ضروری ہو جاتا ہے اور لوگ بازار میں جب سے کھانے لگے ہیں سڑک پر جہاں جی چاہا تھوک دینے لگے ہیں جس کی وجہ سے کراہت کا باعث بن گیا ہے۔ اور تمباکو کے نقصان دہ نتائج نے اس کی شہرت اور استعمال میں کمی کر دی۔

(اس مضمون کی تیاری میں مختلف ویب سائٹس اور کتب سے مدد لی گئی ہے)

https://www.facebook.com/sana.u.khan.733

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ذوقِ آگہی

عثمان عبداللہ

کلمہ طیبہ

کلمہ طیبہ کے دو حصے ہیں
پہلا: ''لا الہ الا اللہ''
دوسرا: ''محمد رسول اللہ''
دونوں میں بارہ حروف ہیں۔
دونوں نقطے کے بغیر ہیں۔
پورے کلمے میں چوبیس حروف ہیں جو چوبیس گھنٹے زندگی گزارنے کا مقصد ہیں۔
پہلا حصہ مقصدِ زندگی سکھاتا ہے اور دوسرا حصہ طرزِ زندگی۔
مقصد زندگی اللہ پاک کی عطا ہے اور طرز زندگی نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا ہے۔ اس لیے ہمیں زیادہ سے زیادہ شکر ادا کرنا چاہیے اس ربّ کا جس نے ہمیں اتنا خوش نصیب بنایا۔ اللہ پاک ہمیں مایوسی کفر سے بچائے' آمین۔

طیبہ سعدیہ عطاریہ.....سمبڑیال

میرے لفظوں میں

ایک بار میری خالہ نے مجھے کہا سدرہ آج روٹیاں تم پکا لینا اور سنبھال کے کچن میں رکھنا۔ میں نے سوچا خالہ نے کافی عرصے بعد کہا ہے یقیناً کوئی ضروری کام ہوگا۔ میں نے روٹیاں پکائیں اور اندر رکھ دیں۔ جب خالہ آئیں تو میں بہت خوش ہوئی کہ خالہ کو کتنی خوشی ہوگی' انہوں نے دور سے مجھ سے پوچھا کہ روٹیاں پکائیں تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ سیدھا کچن میں گئیں اور وہیں سے مجھے پکارا۔ اتنی تیز آواز اور اتنا غصہ میں فوراً بھاگ کے آئی تو دیکھا کہ ساری روٹیاں جو کچھ دیر پہلے میں نے دھوپ میں بیٹھ کر پکائی تھیں بکریاں کھا گئی تھیں صرف دو ایک روٹیاں باقی بچی تھی۔ خالہ نے مجھے غصے سے دیکھا اور کہا یہ کیا ہے؟ میں نے کہا خالہ مجھے نہیں پتہ یہ سب کیسے ہوگیا تو خالہ نے کہا۔ اگر روٹیاں پکا ہی لی تھی تو ان کو محفوظ کس نے کرنا تھا۔ دروازہ کھلا چھوڑ دیا تم نے۔ اب میں ہوٹل سے روٹیاں لے آتی ہوں آئندہ خیال رکھنا۔ وہ تو یہ کہہ کر چلی گئی مگر اتنی دیر میں حیران کھڑی رہی مجھے ایسا لگا جیسے ابھی آگہی کا در کھلا ہو' میں نے سوچا اور فوراً لکھ لیا۔ ہم میں سے ایسے ہزاروں لوگ ہوں گے جن کے پاس نیک اعمال کا ڈھیر ہے اور وہ پرسکون ہیں کہ قیامت کے دن رب سائیں ان سے بہت خوش ہوگا' مگر ہم اپنی زبان کی حفاظت نہیں کرتے جس طرح میں روٹیوں کی نہ کر سکی اور وہ ساری ختم ہوگئیں اور وہاں ہمارا عمل اور نیکیاں بھی ایسے ہی ختم ہو جائیں گی ان لوگوں کو دیتے ہوئے جن کے ساتھ زیادتی کی ہوگی۔ خالہ تو ہوٹل سے روٹیاں لے آئیں مگر وہاں تو کوئی ہوٹل نہیں ہوگا اور نہ کوئی وہاں نیکی دے گا۔ یہ سوچ کر انسان کوئی غلط بات منہ سے نہیں نکال سکتا کیونکہ جس کا زبان پر کنٹرول ہے اس کے نیک اعمال محفوظ ہیں اللہ سے دعا ہے وہ عمل کی توفیق دے آمین۔

سدرہ امین.....فیصل آباد

چلی سوس

انسان کا ضمیر جاگ جائے نا' تو وہ اسے سونے نہیں دیتا۔ شکوے گلے نفرتیں کدورتیں صرف سانس چلنے تک ہی ہوتے ہیں بعد میں تو صرف پچھتاوے رہ جاتے ہیں۔

سباس گل.....رحیم یار خان

انمول موتی

- جو شخص اپنے مال کو بے جا خرچ کرتا ہے جلد غریب ہو جاتا ہے۔
- اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کر اور بدی اپنے نفس کے ساتھ کر۔
- نفس کو قابو میں رکھنے کے لیے کم کھاؤ اور کم سوؤ۔
- جو شخص علم کے باوجود بے عمل ہو اس کا شمار ان مریضوں میں ہوتا ہے جن کی دوا تو ہوتی ہے مگر علاج نہیں کر سکتے۔
- مصائب سے مت گھبرایئے کیونکہ ستارے اندھیرے میں چمکتے ہیں۔
- اصلاح نفس کی فکر میں مشغول رہ تاکہ بجائے بد صفات کے نیک صفات پیدا ہو سکیں۔
- مصائب دنیا کو سہل خیال کر اور موت کو ہر وقت پیش نظر رکھو۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

○ نماز میں قلب کی اور مجلس میں زبان کی حفاظت کر۔
○ ریب شخص امیر کا اتنا محتاج نہیں ہوتا جتنا کہ امیر شخص غریب کا کیونکہ غریب کے بغیر امیر کا کوئی کام نہیں چل سکتا۔
○ اگر آدمی کسی کے ساتھ نیکی نہیں کرسکتا تو کم از کم اتنا کرے کہ اسے اس کی برائیوں سے آگاہ کرتا رہے۔
○ زیادہ گرم کھانا سر پر گرم پانی ڈالنا' آفتاب کی طرف دیکھنا' اور نشہ آور اشیاء کا استعمال آنکھوں کے لیے نقصان دہ ہے۔
○ تمام اعضاء جسمانی میں زبان زیادہ نافرمان ہے
○ انسان صرف تدبیر کرسکتا ہے کامیابی تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔
○ صداقت انسان کو اور انسان صداقت کو عظیم بنا دیتا ہے۔

مسز نگہت غفار..... کراچی

نفرت یا محبت

کوئی مجھ سے نفرت کرے یا محبت کرے دونوں میرے حق میں بہتر ہیں کیونکہ اگر نفرت کرو گے تو میں تمہارے دماغ میں بس جاؤں گا اور اگر محبت کرو گے تو میں تمہارے دل میں بس جاؤں گا۔

ماریہ کنول ماہی..... گوجرانوالہ

اللہ تعالیٰ کی تجارت

مورخین نے کتب تاریخ میں لکھا ہے کہ ایک عورت اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا۔ ''اے اللہ کے نبی علیہ السلام آپ کا پروردگار عادل ہے یا ظالم۔''

حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا۔ ''تیرا ناس ہوا اے عورت تو کیا بات کررہی ہے رب تعالیٰ تو سراسر عدل و انصاف ہے وہ ذرہ برابر بھی کسی پر ظلم نہیں کرتا۔'' پھر اس عورت سے پوچھا کہ تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو تمہارا قصہ کیا ہے؟ اس عورت نے اپنا قصہ بیان کرنا شروع کیا۔

''اے اللہ کے نبی میں ایک بیوہ ہوں میری تین بچیاں ہیں جن کی پرورش میں اپنے ہاتھ سے سوت کاتی ہوں میں دن بھر اور راتوں کو جاگ جاگ کر سوت کاتتی ہوں گزشتہ روز میں اپنا کاتا ہوا سوت ایک سرخ کپڑے میں باندھ کر اسے بیچنے کے لیے بازار جانا چاہتی تھی کہ اس کی آمدنی سے بچیوں کے کھانے پینے کا بندوبست کروں لیکن اچانک ایک پرندہ مجھ پر ٹوٹ پڑا اور سرخ کپڑے کا ٹکڑا جس میں' میں نے سوت باندھ رکھا تھا اسے گوشت کا ٹکڑا سمجھا اور لے اڑا۔ میں یونہی حسرت و یاس سے ہاتھ ملتی رہ گئی اب میرے پاس کچھ نہیں کہ میں اپنی بچیوں کو کھانا کھلا سکوں ابھی وہ حضرت داؤد علیہ السلام سے داستان بیان کررہی تھی کہ اتنے میں آپ کے دروازے پر دستک ہوئی حضرت داؤد علیہ السلام نے آنے والے کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی اجازت ملتے ہی دس تاجر اندر داخل ہوئے جن میں ہر ایک کے ہاتھ میں سو سو دینار تھے تاجروں نے عرض کیا۔

''اے اللہ کی نبی علیہ السلام! ہمارے ان دیناروں کو ان کے مستحق تک پہنچا دیں۔'' حضرت داؤد علیہ السلام نے پوچھا۔

''میرے پاس یہ مال حاضر کرنے کا سبب کیا ہے۔''

''تاجروں نے جواب دیا۔'' اے اللہ کے نبی ہم ایک کشتی میں سوار تھے اتفاق سے ایک زوردار آندھی آئی جس سے ہماری کشتی میں ایک جانب سوراخ ہوگیا اور پانی کشتی میں داخل ہونا شروع ہوگیا۔ موت ہمیں سامنے نظر آرہی تھی ہم نے نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں اس طوفان سے نجات دے دے تو ہر شخص سو دینار صدقہ کرے گا۔ اب پانی کشتی میں تیزی سے داخل ہونے لگا۔ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے اس سوراخ کو بند کرسکیں۔ ادھر ہم نے نذر مانی ادھر اللہ تعالیٰ نے ہماری مدد کا بندوبست کردیا کہ ایک بہت بڑا پرندہ منڈلاتا ہوا کشتی کے اوپر آ گیا۔ اس کے پنجے میں سرخ رنگ کی ایک پوٹلی تھی اس نے دیکھتے ہی دیکھتے وہ پوٹلی کشتی میں پھینک دی ہم نے لپک کر اس پوٹلی کو پکڑا اس میں کاتا ہوا سوت تھا ہم نے فوراً اس سے کشتی کا سوراخ بند کیا اور اس میں داخل شدہ پانی کو ہاتھوں سے باہر پھینکا۔ تھوڑی دیر بعد طوفان تھم گیا اور یوں ہم موت کے منہ سے واپس آئے اب یہ صدقے کی رقم آپ کے ہاتھ میں ہے آپ جسے چاہیں اسے دے دیں۔ یہ قصہ سن کر حضرت داؤد علیہ السلام اس بیوہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ ''پروردگار تیرے لیے بحر و بر میں تجارت کررہا ہے تو

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

اسے ظالم گردان رہی ہے۔" پھر آپ علیہ السلام نے وہ دینار اس خاتون کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا۔ "جاؤ انہیں اپنی بچیوں پر خرچ کرو۔"

مجالس النسائی

لاریب انشال.....کھرل اوکاڑہ

انمول موتی

♦ خاموشی بغیر تخت کی بادشاہی ہے۔

♦ مصیبت کی جڑ انسان کی گفتگو ہے۔

♦ شہر دکھ اور محبتیں ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں کبھی پرانے نہیں ہوتے ہمیشہ نئے ہی لگتے ہیں۔

♦ صرف کمروں کی دیواریں نہیں ہوتی دل کی بھی ہوتی ہیں جن میں کئی خیال کئی خواب قید رہ جاتے ہیں۔

♦ دریا پہاڑوں میں سے سمٹ کر گزرتا ہے اور میدانوں میں پھیل جاتا ہے اپنے حالات کے مطابق سفر کرنا چاہئے انسان حالات سے باہر ہو جائے تو بکھر کر رہ جاتا ہے۔

♦ جو نہیں ہیں اس کا غم نہ کریں بلکہ جو ہے اس پر قناعت کریں۔

♦ دنیا تمہیں تب تک نہیں ہرا سکتی جب تک تم خود نہ جار جاؤ۔

سرور فاطمہ ہنی.....صوابی

جنت کی سم

نیو سم آفر! اگر آپ ہر پریشانی سے بچنا چاہتے ہیں تو آپ صرف نماز کی سم استعمال کریں کیونکہ نماز دیتی ہے آپ کو رب سے فری بات کے پانچ مواقع اور وہ بھی روزانہ۔ اس کے ساتھ ساتھ ان لمیٹڈ فری رحمتیں، برکتیں اور سکون ہی سکون۔ صرف یہی نہیں بلکہ تہجد پیکج سے رات بارہ بجے سے صبح چار بجے تک سب کچھ منوایئے.....تو نماز پڑھو اور سب کہہ دو۔ سبحان اللہ (یہ آفر سانس رکنے سے پہلے تک ہے)

نعمت

خوب صورتی ایک نعمت ہے لیکن سب سے خوبصورت آپ کی زبان ہے چاہے تو کسی کا دل جیت لے چاہے تو کسی کا دل چیر دے!!!

رزق

صرف پیسے کا ہونا رزق نہیں ہے نیک اولاد اچھا اخلاق اور مخلص دوست بھی بہترین رزق میں شامل ہیں۔

مدیحہ نورین مہک.....برنالی

باتیں جو دل کو چھو جائیں

* وہ شخص کبھی محتاج نہیں ہوتا جو میانہ روی اختیار کرتا ہے۔

* جب تم دنیا کی مفلسی سے تنگ آ جاؤ اور رزق کا کوئی راستہ نہ نکلے تو صدقہ دے کر اللہ سے تجارت کرو۔

* صرف اسلام ایک ایسا دین ہے جو زندگی کے ہر پہلو میں مدد دیتا ہے۔

* اس دن پر آنسو بہا جو تیری عمر سے کم ہو گیا اور اس میں نیکی نہ تھی۔

* جس نے ایک اسکول کا دروازہ کھولا۔ اس نے ایک جیل کا دروازہ بند کر دیا۔

یمنیٰ خان.....کراچی

عورت کا حسن و سنگھار

❖ عورت کے ہاتھ مہندی کے بغیر بھی اچھے لگ سکتے ہیں اگر وہ خانہ داری میں مصروف ہوں۔

❖ آنکھیں بنا کاجل کے بھی اچھی لگ سکتی ہیں اگر ان میں حیا ہو۔

❖ بال بنا اسٹائل کے بھی اچھے لگ سکتے ہیں اگر دوپٹے میں چھپے ہوئے ہوں۔

❖ چہرہ بنا میک اپ کے بھی اچھا لگ سکتا ہے اگر نقاب میں ہو۔

❖ قد بنا ہیل کے بھی لمبا ہو سکتا ہے اگر کردار میں بلندی ہو۔

❖ ایک بزرگ نے فرمایا اگر اس قوم کی عورت آج بھی حیا کی چادر اوڑھ لے تو مسلمان اپنے عروج پر پہنچ سکتے ہیں۔

نورین شفیع.....ملتان

مختصر..... مختصر

⌘ یادیں: اس عمارت کی طرح ہیں جو ایک مرتبہ ویران ہو جائیں تو دوبارہ آباد نہیں ہوتیں۔

⌘ زندگی: مانگا ہوا زیور ہے جس کو واپس کرنا اذیت ناک ہے۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

⌘ پیار: وہ جذبہ ہے جس کی پاکیزگی پر دنیا قربان کی جاتی ہے۔

⌘ تقدیر: ایک دھندلا سا ستارہ ہے جو کبھی افق پر بادلوں میں ڈوب جاتا ہے تو کبھی اتفاقات زمانہ سے ضوفشاں بن جاتی ہے۔

⌘ امید: ایک ٹھنڈی چھاؤں اور سکون بخش وادی ہے جو اپنے پُرسکون دامن میں پناہ دے کر انسان کو مایوسی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبنے سے بچاتی ہے۔

⌘ احساس: ایک عظیم جذبہ ہے جس کی عظمت و معراج انسانی بلندیوں کو چھوتی ہے۔

⌘ چاند: رات کا وہ خاموش مسافر ہے جو خود اندھیروں میں سفر کرتا ہے مگر دوسروں کو روشنی فراہم کرتا ہے۔

عائشہ پرویز.....کراچی

ادبی معلومات

⌘ اردو کی پہلی ناول نگار خاتون رشیدہ النساء بیگم تھی۔

⌘ اردو کے پہلے جاسوسی ناول نگار ظفر عمر تھے۔

⌘ دنیا کی پہلی کتاب 1457ء میں شائع ہوئی تھی۔

⌘ دور جدید میں غزل کا امام حسرت موہانی کو کہتے ہیں۔

⌘ جاسوسی کہانیوں کی ملکہ اگاتھا کرسٹی تھی۔

⌘ اردو ڈرامے کا شیکسپیئر آغا حشر کاشمیری کو کہا جاتا ہے۔

⌘ اردو کی سب سے پہلی تنقیدی کتاب مقدمہ شعر و شاعری تھی۔

ماروی یاسمین.....سرگودھا

روزی دینے والا

کہتے ہیں کہ حاتم ایک مرتبہ سفر پر جانے لگے تو اپنی بیوی سے فرمایا ''میں چار مہینے تک باہر رہوں گا' تمہارے واسطے کس قدر خرچ مہیا کر جاؤں۔''

انہوں نے جواب دیا ''جس قدر آپ کو میری زندگی منظور ہے''

حاتم نے جواب دیا ''تمہاری زندگی میرے ہاتھ میں نہیں۔''

بیوی نے جواب دیا ''تو میری روزی بھی آپ کے ہاتھ میں نہیں۔'' پس حاتم چلے گئے تو ایک بڑھیا نے ان کی بیوی سے پوچھا۔

''حاتم آپ کے واسطے کتنی روزی چھوڑ گئے ہیں؟''

انہوں نے جواب دیا ''حضرت خود بھی تو روزی کھانے والے تھے جو کھانے والا تھا' وہ چلا گیا جو دینے والا ہے وہ یہیں ہے۔'' (سبحان اللہ)

طیبہ نذیر.....شادیوال گجرات

میری بیوی

ٹیچر: ''اگر سچے دل سے ربّ سے دعا کی جائے تو وہ پوری ہوتی ہے۔''

اسٹوڈنٹ: ''رہنے دیں اگر ایسا ہوتا تو آپ میری بیوی ہوتیں۔''

رکوع اور جدید سائنس

رکوع کے متعلق سرجنز کا کہنا ہے کہ رکوع سے کمر کے درد کے مریض یا ایسے مریض جن کے حرام مغز میں ورم ہو گیا ہو' بہت جلد صحت یاب ہو جاتے ہیں۔

رکوع سے دماغ اور آنکھوں کی طرف خون کے بہاؤ کی وجہ سے دماغ و نگاہ کی کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے۔

عظمیٰ ایوب.....عارف والا

باتیں یاد رکھنے کی

✦ خواب اور خوشبو دونوں ہی آزاد ہیں' دونوں قید نہیں ہو سکتے میرے خواب اور تمہاری خوشبو۔

✦ دنیا میں بہترین انسان وہ ہے جس کے لیے کوئی روئے اور بدترین انسان وہ ہے جس کی وجہ سے کوئی روئے۔

✦ درگزر کرنا اور معاف کرنا سیکھو کیونکہ تم بھی اپنے پروردگار سے یہی امید رکھتے ہو۔

✦ اے اللہ میں تجھ سے اپنے ظرف کے مطابق مانگتی ہوں' تو مجھے اپنی شان کے مطابق عطا فرما۔

✦ کتابوں کو زمین پر نہ گرنے دینا کیونکہ کتابیں انسان کو آسمان پر لے جاتی ہیں۔

پروین افضل شاہین.....بہاولنگر

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

خوشبوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

غزل

تمہیں تو آرزو کا طور ہم سمجھتے ہیں
ہے کتنا نور تیرے چہرے پر ہم سمجھتے ہیں
جہاں میں رہنے کا قرینہ نہ ہم کو سکھلاؤ
چلا ہے کیسا یہ دستور ہم سمجھتے ہیں
ہمیں تو گردشِ دوراں نے خوب لوٹا ہے
نہ جانے تم کیوں ہو مجبور ہم سمجھتے ہیں
جھکا دیا ہے جو سر اس کے آستانے پر
قبول ہوں گی دعائیں یہ ہم سمجھتے ہیں
تیری نگاہ میں پھیلا ہے نفرتوں کا زہر
ہے پک چکا تیرا ناسور ہم سمجھتے ہیں
کوئی تو لائے گا پیغام ان کی چاہت کا
غزل بھی ہوگی یوں مسرور ہم سمجھتے ہیں

سلمیٰ غزل..... کراچی

بے بسی

بے بسی..... بے بسی
میرے چاروں طرف بے بسی..... بے بسی
راز دل میں ہیں صدیوں سے قفل ہوئے
کوئی جوشِ محبت سے کھولے انہیں
تو یہ نکلیں کہیں.....
اور سمائیں کہیں.....
تلاش ٹھہرے کہیں.....
کوئی بھی تو ایسا نہیں.....
ہے تو فقط بے بسی..... بے بسی
کچھ دکھائی نہ دے
کچھ سجھائی نہ دے
کہ ہے چار سو بے بسی..... بے بسی

عکس ہاشمی..... قصور

نادان لڑکی

نہر کے کنارے بیٹھی ہے ایک لڑکی
آنکھوں میں کاجل لگائے
ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے
جو چھوڑ کے آئی ہے اپنا گھر بار
کر کے ماں باپ کی عزت کو تار تار
اپنی جنت کو چھوڑ کے آئی تھی جس کے سنگ
اس نے دیئے بھی تو فقط کچھ لمحوں کے رنگ
نہیں تھی کی جس نے پروا بے مول چاہتوں کی
اپنے گھر میں ملنے والی بے شمار راحتوں کی
گھر بار سے ناتا توڑا تھا جس شخص کے لیے
اس نے تھاما ہاتھ تو وہ بھی فقط اپنے مطلب کے لیے
بٹھایا اسے نہر کے کنارے اور کہا میں تھوڑی دیر میں آتا
ہوں
حقیقت بتا کے ماں باپ کو تمہیں ساتھ میں لے جاتا
ہوں
نادان لڑکی بیٹھی کر رہی ہے اس کا انتظار
آنکھوں کا کاجل پھیل رہا ہے لگاتار
اپنی جنت کو چھوڑا تو خوابوں کے ہاتھوں دھوکا کھایا
اب سوچ رہی ہے وہ تنہا کہ کیا کھویا اور کیا پایا
اس کے پاس رہی نہ کوئی منزل کیسا رہا یہ سفر اس کا
اب کسی کو وہ کیا منہ دکھائی آخر ڈوبنا ہی تھا مقدر اس کا

ناصرہ جرال..... گجرات

نظم

سنو.....
اگر تم چاہتے ہو
ہماری بزم آنچل
ہمیشہ روشن رہے
تو جاناں.....
پھر آؤ مل کہ دعا کریں
یہ جو بزم آنچل کی شمعیں ہیں
خدا کرے
صدا روشن رہیں

ماہی عباس..... خانیوال

غزل

غزل کی کتاب دے گیا ہے
رتجگوں کے عذاب دے گیا ہے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

میرے بے ربط سے سوالوں کے
وہ موثر جواب دے گیا ہے
اب کدورت نہیں اسے مجھ سے
اب وہ مجھ کو گلاب دے گیا ہے
اک نظر دیکھ کر میری جانب
وہ دوبارہ شباب دے گیا ہے
مسکرایا وہ اس ادا کے ساتھ
خامشی کے رباب دے گیا ہے
میری آنکھوں کے واسطے انصر
وہ غموں کے سحاب دے گیا ہے

نعیم انصر ہاشمی.....جھنگ صدر

غزل

میری دشمنی تو ہوا سے تھی سو ہوا نے مجھ کو بجھا دیا
میں اداس شب کا چراغ تھا مجھے آندھیوں سے ملا دیا
میں اداس راتوں کا چاند تھا تری کھڑکیوں پر کھڑا رہا
تجھے اپنے خواب عزیز تھے تجھے کس نے آ کر جگا دیا
کبھی وہ بھی دن تھے کہ ہاتھ پر جو لکھا تو خوں سے لکھا کبھی
ترا نام دل کی کتاب پر کبھی جگنوؤں سے سجا دیا
جو مرے مزاج سے آشنا وہی شخص مجھ سے ہے بے خبر
میں تو اب بھی اس کا غلام ہوں مجھے جس نے دل سے بھلا دیا
تیری زندگی کا چراغ تھا جو جلا رہا تو جلا رہا
تھا ہوا کی مرضی پر منحصر جو بجھا دیا تو بجھا دیا
یہ دعا ہے ربِّ کریم سے اسے کوئی غم بھی نہ چھو سکے
اسے اتنی خوشیاں نصیب ہوں مجھے جس نے آخر دغا دیا
یہ تری محبت بھی دیکھ لی مجھے چھوڑ کر تم چلے گئے
مرے دشمنوں کو نوید ہو مجھے ہمسفر نے مٹا دیا
تجھے چھوڑ جانا ہی ٹھیک تھا وہیں شب کی کالی گھٹاؤں میں
جہاں تجھ کو راشد ترین نے ترے راستوں کا پتا دیا

راشد ترین.....مظفر گڑھ

غزل

جب ترے حسن پر لکھا تو سرِ عام لکھا
ہم نے ہر پھول کے چہرے پر ترا نام لکھا
جان جاتی ہے مگر ہاتھ نہیں آتا کچھ
کسی کافر نے محبت کا یہ انجام لکھا
ترے رخسار کا غازہ ہے مری آنکھ کا نور
ڈوبتے چاند کی کرنوں نے یہ پیغام لکھا
زندگی ہم نے گزاری ہے مسافر کی طرح
اپنی قسمت میں ازل سے نہیں آرام لکھا
چاند پھر دیکھا نہیں ہم نے کبھی اس کے بعد
جب ستاروں نے ترا نام سرِ شام لکھا
یاد آیا ہے جوانی کا زمانہ ہم کو
جب کبھی ہم نے محبت سے ترا نام لکھا

حکیم خان حکیم.....اٹک

غزل

عجب مشکل بڑی ہے شہرِ جاں پر
لگی ہے بس نگاہ آسماں پر
ہماری آزمائش لینے والو
کرو احسان قلبِ ناتواں پر
وہی آوارگی قسمت میں میری
وہی بجلی گری ہے آسمان پر
کہیں نہ ڈوب جائے دل کی دنیا
ابھی تک ضبط ہے اشکِ رواں پر
میری ماں کی دعا ہی کام دے گی
میں گھر سے چل پڑا ہوں امتحاں پر
نہیں ہرگز مجھے منظور رانا
کوئی الزام آئے مہرباں پر

قدیر رانا.....راولپنڈی

نظم

ہم سفر یہ جو آج نکلے ہیں
راستے اجنبی سے لگتے ہیں
لوگ پہلے سے اب نہیں ہیں یہاں
چاہتیں آخری دموں پہ ہے
زندگی تھکی تھکی سی لگتی ہے
سانس حیران ہے اب تلک خود پر
کیسے چلتی ہے یہ ویران دل میں
کیسے جیون تمام ہونے تک
یہ سفر بار بار کرنا ہے
گویا اس کوچۂ بے حسی میں ہمیں
روز جینا ہے روز مرنا ہے

سباس گل.....رحیم یار خان

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

غزل

کرتا ہوں تجھے یاد صبح و شام مسلسل
رقصاں ہے مرے لب پر تیرا نام مسلسل
سو بار حسینوں سے لگا بیٹھا ہوں دل کو
اک جیسا رہا پیار کا انجام مسلسل
کیوں رابطہ رکھنے سے گریزاں ہو مری جان
کتنے ہی ترے آئے تھے پیغام مسلسل
اک روز چلی آؤ اچانک مجھے ملنے
تکتے ہیں تری راہ در و بام مسلسل
آنکھوں کے دریچے میں اسے اپنے سجالوں
آئے وہ اگر سامنے گلفام مسلسل
احساس نہیں کچھ بھی اسے اپنے ستم کا
دھرتا ہے مرے سر پہ وہ الزام مسلسل
اٹھتے ہیں وہاں روز ہی معصوم جنازے
اس شہر میں مچنے لگا کہرام مسلسل
ہوجائے گی رخصت یہ کسی روز یہاں سے
کب ٹھہری کہیں گردش ایام مسلسل
دنیا میں بھگتنے گا سزا اپنے کیے کی
وہ ہونے لگا چار سو بدنام مسلسل
دکھ درد بٹایا ہے اگر میں نے کسی کا
قدرت نے دیا ہے مجھے انعام مسلسل
غالب کی طرح آئے مضا میں فلک سے
شاکر پہ ہوا شعر کا الہام مسلسل

شاکر نظامی.....سرگودھا

کچی مٹی

اک کچی مٹی ہوں میں
مجھے اپنی آنکھوں کی نمی سے سیراب کردینا
زیست مہک اٹھے گی
یہ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے
مہک اٹھے گی
ساحل کی بکھری ریت ہوں میں
بکھری ریت پہ اپنا نام لکھ جانا
تمہارا نام اس بکھری ریت کو
یکجا کردے گا
ادھورا سپنا ہوں میں
تمہارے بغیر، تمہارے بنا
تم بھی میرے سپنوں میں بھی آجانا
یوں میرا سپنا بھی مکمل ہوجائے گا
یہ جو میری آنکھیں ہیں نجانے
کب سے ویران ہیں، میری ان
ویران آنکھوں کو اپنا سراپا دکھلا دینا
جلا بخش دینا، زندگی دے دینا
شاید ان میں ویرانی کا سناٹا ختم ہوجائے
میرے لبوں پر ایک گہری خاموشی ہے
ان لبوں پر اپنے ہونٹوں کی مہر لگا دینا
تم چاہو تو میرے لبوں پر بھی مسکان
بکھیر سکتی ہو
میں بکھر رہا ہوں، تمہارے بن، تمہارے
بغیر، تمہارے بنا، اگر ہوسکے تو
تم مجھ کو سمیٹ لینا، ہاتھ بڑھانا میری
جانب اور میرے ہاتھوں میں اپنا
ہاتھ تھما دینا کہ اک کچی مٹی ہوں میں

سیف الاسلام.....لیاقت آباد کراچی

غزل

یہ درد میرے دل سے نکل کیوں نہیں جاتا
یارب میرے من کو سکون کیوں نہیں آتا
جب ازل سے جدائی بھی مقدر میں ہے ٹھہری
وہ شخص میرے دل سے اتر کیوں نہیں جاتا
ہر روز ہی اک درد کی فصیل کھڑی ہے
اک بار بھی یہ غم مجھے نگل کیوں نہیں جاتا
مصائب سے نالاں ہر فرد ہے پریشاں
اس شہر میں کوئی بھی مسیحا کیوں نہیں آتا
میں تنہا بھی حساس ہوں اس درد کو لے کر
یہ دکھ ہر دل میں اتر کیوں نہیں جاتا

عابدہ سبین.....ملتان

نظم

تیرے قرب کی خواہش مجھ میں جاگ رہی ہے
ننھی، منی، پیاری خواہش
جیسے تتلی

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

نرم و نازک پنکھون والی
نیلے پیلے، بنفشی سبز، سنہری، کالے، سرخ، عنابی
اودھے رنگوں والی
اک خواہش کی خاطر دو جی خواہش مجھ میں پیدا ہوئی
ہے

خواہش کی تکمیل کی خواہش
اس تتلی کے پانے کو کچھ جہد کروں میں
لیکن کیسے کروں میں؟
کل شب تم نے ہی تو کہا تھا
ہر اک حساس سے عاری
کاظم بوڑھی روح لگتے ہو
ہاں شاید تم سچ کہتی ہو
لیکن میرے اندر خواہش چیخ رہی ہے
اس تتلی کے پانے کو کچھ جہد کرو تم
لیکن کیسے کروں میں؟
کیسے تتلی کے پیچھے بھاگوں؟
میں بوڑھا ہوں
یہ جذبہ بے نام سا جذبہ وہم ہے میرا
تم سچی ہو
ہاں
یہ جذبہ ہے جھوٹا جذبہ!

ایم اے کاظم.....سیالکوٹ

آنکھیں تیری منتظر ہیں

ابھی سبز رُت
میرے آنگن میں ٹھہری ہے
اور وقت کے ہاتھوں کی پوروں میں ہے
ابھی سارے جذبے جواں ہیں
اور آنکھیں تیری منتظر ہیں
ابھی شام آئی نہیں
اور پاؤں بھی ٹھہرے ہوئے ہیں
ابھی لوٹ آؤ کہ پھر تم شاید
کچھ ان جانے رستوں پر پتھر سی آنکھیں
کسی من چلے کی جبیں پر ملیں

انتخاب: جاوید احمد صدیقی (راولپنڈی)

غزل

وعدے کی زنجیر سے وہ بندھا کبھی نہ تھا
میں اس کا تھا مگر وہ میرا کبھی نہ تھا
شناسائی تھی تو بس اتنی سی اس سے
وہ مجھے دیکھتا تھا پر ٹھہرا کبھی نہ تھا
گمنام تھے جو وہ سر عام آ گئے
اس طرح سے ان کا چرچا کبھی نہ تھا
کیسے میرے آنگن کو وہ روشنی دیتا
وہ شام کا ایک پہر تھا سویرا کبھی نہ تھا
ہمیں تو اپنی ہی محبت لے ڈوبی صنم
غموں نے ورنہ ہم کو گھیرا کبھی نہ تھا
اب کے تو چاند بھی جا اُترا غیر کے گھر
ورنہ مقدر میں حسن اندھیرا کبھی نہ تھا

ایم حسن نظامی.....قبولہ شریف

گواہی

وہ سیڑھی جو مرے دل سے
تمہارے دل کے گنبد پر اترتی ہے
شکستہ ہے
وہ کھڑکی جو تمہارے گھر میں کھلتی ہے
مری پہچان اور مکڑی کے جالوں سے اٹی ہے زنگ
خوردہ ہے
گواہی دے نہیں سکتے نہ وہ
لیکن مرا اک کام تو کر دو
مری پہچان میں
الجھے ہوئے مکڑی کے سب جالے
مجھے دے دو
کوئی تو ہو
جو مجھ کو میرے ہونے کی گواہی دے

شاعرہ: منصورہ احمد
انتخاب: نورین نور.....گجرات

Waqar Azeem
www.Pakistanipoint.com

عشق پیچاں

قرۃ العین سکندر

سحر و جادو، روحانی طاقت، سنسنی خیز واقعات، دلوں کی ڈھڑکن منجمد کر دینے والی ایک اچھوتی کہانی

خیر و شر کے مابین ایک انمٹ لکیر کھینچتی ہوئی ایک تحریر، جس میں خونی رشتوں اور تعلقات و روابطِ عامہ کو ایک منفرد لڑی میں پرو کر باہم جانچا و پرکھا گیا ہے۔ ''خیر'' پر یہ احسان و انعامِ ربی ہے کہ ازل سے لے کر آج تلک وہ ایک ایک شر پر فوقیت لے جاتا رہا ہے اور یہ بھی طے ہے کہ تا قیامِ حشر، شر کی تمام ترشر انگیزیوں کے باوجود آخرش فقط خیر ہی کے پھول کھلیں گے۔ یہ ایک جنگ ہے جو انسان کو سونے کی مانند تپا کر کندن بنا دیتی ہے۔

یہ کہانی درحقیقت متجسس پیرایہ، مافوق الفطرت کرداروں، بالائے فہم محسوسات، جادوئی واقعات اور ماورائے عقل قصائص کی ایک مضبوط کڑی ہے جو کھرے ترین مشاہدات و بیانات کے ذریعہ سے ہمارے عمومی معاشرتی روّیہ جات کا احاطہ کرتی ہے۔ کہیں اس میں سوالیہ نشان بھی ہے لیکن اختتام میں ہر ہر سوال کا تشفی بخش جواب ملے گا۔

رشتوں کی بنتی ٹوٹتی زنجیر، دو بہنوں کی کہانی، عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کا سفر طے کرتی ایک منفرد کہانی

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

درشہوار کی حالت آئے دن خراب رہنے لگی تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ اطراف میں بسنے والوں سے اس کی اس کیفیت کو ہر ممکن چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کے باوجود یہ باتیں کہاں چھپتی ہیں۔ جب ایک ایسا فرد موجود ہو جو گھر کا مکین ہو کر بھی دکھ درد میں نہیں خوشی میں رنج والم میں شریک نہ ہو تو پھر باتیں اسی طرح چہار سو گردش کرتی ہوئی ملتی ہیں۔ شزاء کو تو ہر وقت یوں بھی گھر کی خامیوں اور کمیوں کی ہی ٹوہ لگی رہتی تھی۔

''کچھ سمجھ نہیں آتی ہے کہ دری کو کسی کی نظر لگ گئی ہے ہمارے گھرانے کی ساری خوشیاں جیسے کسی نے کھالی ہیں۔'' آصفہ بیگم دل گیر لہجہ میں نڈھال سی پڑی تھیں۔

''بیگم صاحبہ ایسی باتیں آپ کے منہ سے اچھی نہیں لگتی ہیں۔ آپ جانتی ہیں کہ آپ ہی میری امید اور آپ ہی میری ڈھارس ہیں اور جب آپ ہی اس قدر مایوسی کی باتیں کرتی ہیں۔ تو دل میں امید و بیم کی سی کیفیت دھوپ چھاؤں کی سی ہو جاتی ہے۔'' بلال صاحب نے بھی گلوگیر انداز میں کہا تھا۔

''تو آپ اسے پیر صاحب کے آستانے پر کیوں نہیں لے جاتے ہیں۔'' وہ بے حد فکر مندی سے بولی تھیں۔

''بیگم میں نے فون کیا تھا۔ معلوم ہوا تھا کہ وہ یہاں پاکستان میں ہیں ہی نہیں۔ عمرے کے لیے تشریف لے کر جا چکے ہیں اگر وہ یہاں ہوتے تو دیر ہی کس بات کی تھی، اور فریدوں بخت کو میں نے کچھ بتایا ہی نہیں۔'' وہ پرسوچ انداز میں بولے تھے۔

''آہ، جب مشکلات پڑی ہیں تو کوئی راہ ہی سجھائی نہیں دے رہی ہے کل بھی دری چلتے چلتے لہرا کر گر گئی تھی۔ مجھ سے شزاء کرید کرید کر پوچھتی رہی تھی۔ اس بابت میں نے صاف کہہ دیا کہ دری کو کمزوری سی ہے۔ مگر اس کے چہرے کے تاثرات میں جو تجسس تھا وہ دیکھ کر میرا دل اندر تک کلس کر رہ گیا تھا۔ کیا بہو کبھی بیٹی نہیں بن سکتی ہے۔'' آصفہ بیگم

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

نے رنج سے کہا تھا بلال صاحب سیدھے ہو بیٹھے تھے۔

''سنو بیگم پہلے ہی گھر میں اس قدر پریشانی کا عالم ہے۔ اس پر مزید پریشانی کھڑی نہ کریں۔ آپ شزاء کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ مجھے یقین ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' بلال صاحب نے انہیں تسلی دی تھی، اور پھر گہری سوچ میں گم ہو گئے تھے۔

''اچھا انہیں تیار کریں دری کو اور میں گاڑی نکالتا ہوں۔ یوں ہاتھوں پر ہاتھ رکھنے سے کیا فائدہ حاصل ہوگا۔'' وہ کچھ سوچ کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

ان کے کمرے پر دستک ہوئی تھی۔ انہوں نے دیکھا حسن پریشان سا چہرہ لیے اندر داخل ہوا تھا۔

آؤ بیٹے رک کیوں گئے دروازے پر۔'' بلال صاحب نے حسن کو دیکھ کر کہا تھا۔

''جی ابا جان دراصل آپ نے مجھے جو کام سونپا تھا میں اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے لگا ہوا تھا۔'' حسن نے کچھ سوچ کر اندر آ کر دروازہ کو اندر سے کنڈی لگا دی تھی۔

''ارے یہ کیا کر رہے ہو؟'' بلال صاحب نے تعجب سے پوچھا تھا۔

''بابا جان میں نہیں چاہتا کہ شزاء کے کانوں میں ایسی کوئی بات پڑے اور ہر طرف رسوائی کا سامان ہو جائے۔ وہ پہلے ہی ہمہ وقت مجھ سے دری کے حوالے سے کرید میں لگی رہتی ہے۔'' حسن کے اس اعتراف پر بلال صاحب نے ہنکارا بھرا تھا۔ جبکہ آصفہ بیگم نے ایک جتاتی ہوئی نگاہ اپنے مجازی خدا پر ڈالی تھی گویا کہہ رہی ہوں۔ دیکھ لیا میں بھی تو یہی کہتی تھی۔

''ان باتوں کو جانے دو۔ یہ بتاؤ کیا تمہارا رابطہ ہوا کسی بزرگ سے؟'' بلال صاحب نے الجھے الجھے انداز میں پوچھا تھا۔ حسن نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ اپنی والدہ پر ڈالی تھی۔ پھر اس نے کہنا شروع کیا تھا۔

''ابا جان اگر ہم دری کو ٹھیک کروانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمیں جس کے پاس بھی لے جانا پڑے ہمیں لے جانا چاہیے۔ میرا مشورہ ہے کہ اس میں دین دھرم کی باتوں سے اوپر ہو کر ہمیں دری کا بھی سوچنا چاہیے۔ شفا تو اللہ نے ہی دینی ہے۔ جہاں سے مل جائے۔''

حسن تمہید باندھ رہا تھا۔ اس کی باتوں کو سن کر آصفہ بیگم چونک کر سیدھی اٹھ بیٹھی تھیں، اور بلال صاحب تو پہلے ہی ہمہ تن گوش تھے۔

''ابھی وقت کی طنابیں ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔ ابھی بھی دری کا علاج ممکن ہے۔ میں نے جن بزرگ سے بات کی ہے ان کا پروثوق انداز میں کہنا ہے کہ وہ دری کو بالکل ٹھیک کر دیں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ دری پر جادو کے اثرات ہیں۔ انہوں نے مزید بتایا ہے کہ یہ جادو کرانے والے کوئی غیر نہیں ہیں ہمارے اپنوں میں سے ہی کوئی ہے۔'' حسن نے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہا تھا۔

آصفہ بیگم نے دل تھام لیا تھا۔ جبکہ بلال صاحب کے چہرے کا بھی رنگ فق سا ہو گیا تھا۔ بات ہی اس قدر سنجیدہ سی تھی۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو حسن۔ میرا تو کلیجہ بھی بیٹھا جا رہا ہے کون کر سکتا ہے ایسی مذموم حرکت؟'' آصفہ بیگم نے دل میں وسوسوں کو اٹھتے دیکھ کر حیرت سے پوچھا تھا۔

''امی جان۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ ان بزرگ نے کہا ہے کہ وہ اس کا توڑ جانتے ہیں، اور اس کے لیے اب ہم سب کو دری کو ان کے پاس لے جانا ہوگا۔ کل ہی جانا ہے۔ آج رات بس خیر خیریت سے کٹ جائے۔'' حسن نے کہا تو آصفہ بیگم کے دل میں امید سے بندھ گئی تھی۔

''مگر تم اس کا مذہب کے حوالے سے کیا کہہ رہے تھے؟'' بلال صاحب کا ذہن ابھی تک اس ایک نقطے پر ٹھہر سا گیا تھا۔

''دراصل ابو اس کی شہرت سن کر ہی میں نے اس سے رابطہ کیا ہے۔ اسی کے پاس جو بھی جاتا ہے اس کا مسئلہ چٹکیوں میں حل ہو جاتا ہے، اور رہی بات مذہب کی ہم کو آم کھانے سے مطلب ہونا چاہیے پیڑ گننا فضول ہے۔'' حسن نے قطعیت سے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا میری تو جیسے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ہی مفقود ہو کر رہ گئی ہیں۔ اپنی جوان اولاد کا دکھ نہیں دیکھا جاتا ہے۔'' بلال صاحب نے ہار مانتے ہوئے کہا تھا۔

''بیٹا کل کیوں ابھی لے چلو اس کو۔'' آصفہ بیگم نے پرعزم انداز میں کہا تھا۔

''ابھی مگر امی اس وقت تو رات ہو گئی ہے ناں؟'' حسن

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

نے تذبذب سے کہا تھا۔

''صرف نو ہی تو بجے ہیں کون سا زیادہ وقت ہوگیا ہے۔ پھر ہم جس کرب سے گزر رہے ہیں اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم جلد از جلد اس کا کوئی سد باب کرسکیں۔'' آصفہ بیگم بضد تھیں۔

آصفہ بیگم کے صلاح مشورے پر ہی اسی وقت دری کو لے جانے کا فیصلہ کرلیا گیا تھا۔

''میں بھی ساتھ جاؤں گی۔'' آصفہ بیگم بضد تھیں۔

''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے آپ گھر پر ہی ٹھہریں۔ میں اور بابا جان ساتھ لے جاتے ہیں یہی مناسب ہے۔''

حسن نجانے کیوں ماں کو وہاں لے جانے سے کترا رہا تھا۔ پھر دری کو شال اوڑھا دی گئی تھی۔ بلال صاحب دری کو تھامے اسے اپنے ساتھ کار کی عقبی نشست پر بیٹھ گئے تھے۔ دری کسی معمول کی طرح ان کے ساتھ جا رہی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ بھی نہ پوچھا تھا کہ وہ اسے کہاں اور کیوں لے جا رہے ہیں۔ یہ اس کے ذہنی تناؤ اور غیر حاضر دماغی کی حالت کی انتہا تھی۔ کہ وہ کسی بھی قسم کے سوال و جواب نہ کر رہی تھی۔ بلال صاحب کا دل ان گنت اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔ آصفہ بیگم جب تک کار نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی کچھ نہ کچھ پڑھ کر پھونکتی رہی تھی۔ اسی وقت عقب سے شزاء کی آواز نے انہیں بری طرح سے چونکا دیا تھا۔

''یہ اس وقت حسن کہاں جا رہے ہیں وہ بھی مجھے بتائے بنا۔'' شزاء کے انداز میں ہلکا دبا دبا سا غصہ تھا۔

''دری کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی۔ تو اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے ہیں بلال صاحب اور حسن بیٹا۔'' آصفہ بیگم نے متانت سے کہا تھا۔

''اچھا حیرت ہے ویسے اس وقت کیا ہوگیا تھا دری کو کیا پھر گر گئی تھی۔'' شزاء نے اچنبھے سے پوچھا تھا۔

''نہیں اس کا سر دکھ رہا تھا۔'' آصفہ بیگم نے نظریں چراتے ہوئے کہا تھا۔

''ویسے سچ کہوں تو مجھے تو کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔'' شزاء نے پرسوچ انداز میں کہا تو آصفہ بیگم چونک سی گئی تھیں۔

''کیا کہہ رہی ہو۔ بہو کون سا چکر؟'' آصفہ بیگم نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''یہی کہ اس کا دل کبھی بھی زریاب سے شادی کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ وہ اس سے یہ شادی ہی نہیں کرنا چاہتی ہے۔ شاید وہ کسی اور کو پسند کرتی ہو کیا آپ نے اس سے کبھی پوچھا۔ دیکھیں ناں جوں جوں شادی کے دن قریب آرہے ہیں وہ مزید سے مزید بیمار ہوتی چلی جا رہی ہے۔'' شزاء نے بھگو بھگو کر مارتے ہوئے آرام سے گل فشانی کی تھی۔ آصفہ بیگم کا تو غصے سے برا حال ہو رہا تھا کہ شزاء کی اس قدر جرأت تھی۔

''دیکھو شزاء۔ آج تو تم نے کہہ دیا آئندہ میری پاک دامن بیٹی کے کردار پر حرف زنی نہ کرنا ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔'' آصفہ بیگم نے سخت انداز میں کہا تھا۔

''کیا کہہ دیا میں نے ایسا؟ کہ آپ مجھے دھمکیاں دینے پر اتر آئی ہیں۔ کیا میں اندھی ہوں مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ صاف دکھائی دے رہا ہے۔ اس کا ہر دوسرے دن غم میں مبتلا رہنا، اور سر چکرانا طبیعت خراب نہ کھانے پینے کا ہوش نہ کسی سے ملنے کی آمادگی۔ یہ سب یہی ظاہر کر رہا ہے۔ میری زبان تو بند کردیں گی مگر لوگوں کی زبانیں کیسے بند کریں گی۔'' شزاء نے غصے سے کہا اور پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

آصفہ بیگم اس کو جاتا دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

○○○○○

کمرے کے فرش پر دری بچھی ہوئی تھی۔ اس ملگجا سا حلیے والے شخص کے اول جلول سے حلیے سے بلال صاحب کو کراہت سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس سے زیادہ خوف اس کی آنکھوں سے محسوس ہو رہا تھا۔ وہ چہرے سے ہی کوئی کافر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنے ماتھے پر تلک لگا رکھی تھی۔ اس کا لباس دھوتی اور قمیص پر مبنی تھا۔ اس کے گلے میں مالائیں تھیں، اور اس وقت وہ اپنے سامنے ہی ایک برتن میں کچھ جلائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت بلال صاحب اور اس کے ساتھ دری اس کے سامنے ہی بیٹھے تھے۔ جبکہ حسن کچھ آگے بیٹھا ہوا تھا، اور پریشان حال دکھائی دے رہا تھا۔ اس شخص کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ اس کی عیارانہ نگاہیں دری کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ جیسے جیسے وہ اس کو دیکھ رہا تھا اس کی نگاہوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

www.pakistanipoint.com

''کیا تم لوگوں کو اس چھوکری کے ماتھے پر کالی لکیر نہیں دکھائی دے رہی۔ جو صاف بتا رہی ہے کہ اس پر جادو کیا گیا ہے۔ مہاراج کی کرپا سے یہ وردان مجھے دیا گیا ہے۔ میں نے بہتوں کو اس جادو کے اثرات سے پاک کیا ہے، اور یہ لڑکی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس پر جادو اس کی خالہ نے کروایا ہے۔ جو کرودھ کی آگنی میں جل رہی ہے۔ اس کے جی میں میل ہے۔ پردیپ کبھی غلط نہیں بتاتا۔ ایسا ہی ہے ناں؟'' پہلی مرتبہ پردیپ نے براہ راست بلال صاحب کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

''جی..... جی..... واقعی اس کی خالہ اس کا رشتہ اپنے بیٹے سے طے کرنے پر بضد تھی۔ ہم نے انکار کر دیا تھا۔ ہاں شاید یہی بات ہے۔'' بلال صاحب کو امید سی بندھ گئی تھی کہ وہ غلط جگہ پر نہیں آئے ہیں۔ کسی درست جگہ اور درست شخص کے سامنے ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔

''آپ کا کہنا بالکل درست ہے بالکل ایسا ہی ہے۔ اب اس کا کوئی حل بھی بتائیں۔'' حسن نے آس بندھے انداز میں پوچھا تھا۔

''ہم کو حل تو کرنا ہی ہوگا۔ جس نے اس پر منتر جنتر کیا ہے وہ بہت پہنچا ہوا پرش ہے۔ اس کی شکتی بہت ہی زیادہ ہے۔ اس نے جو منتر کیے ہیں اس کے حل کے لیے میں تین دن تک جاپ کروں گا۔ اس کے دوران صرف ایک بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ اس چھوکری کو گھر سے نکلنے نہیں دینا۔ یہ گھر میں ہی رہے، اور ٹھیک تین دن بعد شام ڈھلے لے آنا۔ اس کے بعد اسے مکتی مل جائے گی۔ یہ بالکل ہٹی کٹی ہو جائے گی پہلے جیسی۔'' اس شخص کی امید بندھانے کے بعد دری کی حالت سنورنے کی ایک امید سی بندھ گئی تھی۔ بلال صاحب نے اطمینان سا دل میں اترتا محسوس کیا تھا۔

''یہ مالا اس لڑکی کے گلے میں ڈال دو۔''

حسن نے وہ مالا بے حد عقیدت سے تھام لی تھی اور اسی وقت اسے دری کے گلے میں ڈال دیا تھا۔

دری نے کسی بھی قسم کی پس و پیش سے کام نہ لیا تھا۔

''اب تم لوگ جاؤ۔''

بلال صاحب نے دری کا ہاتھ تھاما ہوا تھا اور حسن آگے آگے تھا۔ سب کی سوچوں کا محور دری تھی اور خود دری کا ذہن صفاچٹ تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ کسی گہری کھائی میں گر چکی ہے۔ اس کی اپنی کوئی سوچ باقی نہ ہی تھی جیسے۔ واپسی پر شزاء حسن کی منتظر تھی۔ اسے آتا دیکھ کر سیدھا لاؤنج میں نکل آئی تھی۔

''حسن جانا ہی تھا تو کم از کم مجھے بتا کر تو جاتے۔ یہ کیا طریقہ ہے۔'' شزاء نے شتر بے مہار کی طرح سسر کا بھی ادب و لحاظ نہ رکھا تھا۔ بلال صاحب نے ایک ناگوار نگاہ بہو پر ڈالی تھی اور دری کو سیدھا اس کے کمرے میں لے گئے تھے۔

''یہ کیا انداز ہے بات کرنے کا۔ میں اس کے بعد کمرے میں ہی آنے والا تھا۔ وہاں بھی بات کی جا سکتی تھی۔'' حسن کا بھی دماغ گھوم گیا تھا۔ ایک تو دری کی وجہ سے پہلے ہی شدید ذہنی تناؤ کی کیفیت تھی اس پر شزاء کا یہ انداز اسے مزید بھڑکا رہا تھا۔ تاؤ دلا رہا تھا۔

''آپ جو رات کے بارہ بجے لوٹ رہے ہیں میں اتنا بھی نہ پوچھوں۔ میں کوئی بے زبان جانور نہیں ہوں۔ اسی گھر کا ایک فرد ہوں۔ مگر میں نے دیکھا ہے کہ اس گھر کے مکین مجھے اپنا سمجھتے ہی کب ہیں کب مجھے اپنی باتیں بتاتے ہیں۔ چھپ چھپ کر مسئلے حل کیے جاتے ہیں۔ میں تو دشمن ہوں ناں۔'' شزاء بھل بھل آنسوؤں سے رونے لگی تھی۔

حسن کا دماغ پہلے ہی خراب ہو رہا تھا۔ اس نے اس سے مزید بحث نہ کی تھی اور سیدھا کمرے میں جا کر سونے کی غرض سے لیٹ گیا تھا۔

آصفہ بیگم یہ سب سن رہی تھیں، اور ان کے اندر تاسف سا پھیل گیا تھا۔ نہ جانے اس گھرانے کی خوشیوں کو کس کی نظر کھا گئی تھی۔ سب ہی ایک دوسرے سے بدظن سے تھے اور جھگڑے ہونے لگے تھے۔ وہ بلال صاحب کے آتے ہی سیدھا ہو بیٹھی تھیں۔

''دری کو نیند آ رہی تھی وہ سو گئی ہے۔ تم اسے ڈسٹرب مت کرنا صبح مل لینا۔'' بلال صاحب نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے مگر ہوا کیا؟'' آصفہ بیگم نے بے حد فکرمندی سے پوچھا تھا۔

بلال صاحب نے ایک سخت نگاہ بیوی پر ڈالی تھی۔

''برسوں پہلے دشمنی پر محیط ایک سلسلہ جسے پیر صاحب نے ختم کروا دیا تھا، اور کہا تھا کہ آئندہ کے لیے دونوں بہنوں کا میل جول نہ ہو۔ ورنہ اس کا شاخسانہ آنے والی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

نسل کو بھگتنا ہوگا۔ تو دیکھ لو بھگت رہی ہے اب ہماری ہی نسل۔ کاش تم اسے ایسے نہ بلاتی۔ اس کو گھر کا رخ ہی نہ کرواتی تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔'' بلال صاحب نے شکوہ کناں لہجہ میں کہا تھا۔ آصفہ بیگم کا حیرت سے برا حال تھا۔ اس نکتے پر تو ان کی سوچ جا بھی نہیں سکی تھی۔

''تو کیا یہ سب ساشا کا کیا دھرا ہے اس نے یہ سب کیا ہے۔ وہ بھی اپنی بھانجی اپنے ہی خون کے ساتھ۔'' آصفہ بیگم کا تاسف سے برا حال تھا۔

''کون سا خون بیگم۔ تم کو انہوں نے اپنا گردانا ہی کب تھا۔ تم تو ایک اضافی شے تھی۔ جسے گھر سے بھی نکال پھینکا گیا تھا۔ جب تمہاری یہ قدر و منزلت تھی تو تمہاری اولاد کی بھلا کیا وقعت ہوگی۔ بہر حال اس کا یہی کہنا تھا کہ یہ سب ساشا نے کروایا ہے، اور دری کی حالت کا سبب وہی ہے۔'' بلال صاحب نے واشگاف لفظوں میں بتایا تھا۔

''پھر اب کیا کیا جائے۔ میں تو اب اس ساشا کی شکل بھی دیکھنے کی روادار نہیں ہوں اور وہ لڑکی عروش کس طرح ہنس ہنس کر گھر میں آجا رہی تھی۔ آہ میری بچی۔'' آصفہ بیگم پچھتاوؤں کی زد پر تھیں۔

''ہاں اس لڑکی کا داخلہ اس گھر میں ہمیشہ کے لیے منع ہے۔ نہ صرف اس لڑکی عروش کا بلکہ اس سے جڑے ہر شخص کا خواہ وہ ارسل ہی کیوں نہ ہو۔'' بلال صاحب کا لہجہ بے حد قطعیت بھرا تھا۔

''ارسل؟ مگر اس طرح تو حسن کی زندگی خراب ہوگی۔ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔'' آصفہ بیگم نے تحیر زدہ انداز میں پوچھا تھا۔

''پہلے کون سا اس کی زندگی سنوری ہوئی ہے۔ بہو کو تو اتنا بھی لحاظ نہیں کہ سسر کے سامنے ہی زبان کو لگام دے دے۔ اس نے تو بدزبانی اور بدلحاظی کی ہر حد پار کرلی ہے۔ تو پھر ہم بھی اپنی بیٹی کے لیے جو سوچیں گے جو فیصلہ کریں گے وہ بہتر ہی ہوگا۔ ارسل سے ملنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ بہو کا جب جی چاہے سو بار جا کر مل آئے۔ مگر ان کا یہاں آنا ضروری نہیں۔'' بلال صاحب کے فیصلے سے روگردانی کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ آصفہ بیگم نے بھی۔

''ٹھیک ہے جیسا آپ مناسب سمجھیں۔'' آصفہ بیگم نے ہارے ہوئے لہجہ میں کہا تھا اس کے علاوہ اب کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔

دری ان تین دنوں میں پہلے جیسی ہی رہی تھی۔ اس کا وہی معمول تھا اپنے کمرے میں بند پڑی رہتی تھی۔ نماز اور ذکر و اذکار کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہ رہا تھا۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کے معاملے میں سختی کر کے بامشکل دو تین لقمے دے کر کھلائے جاتے تھے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ چکے تھے۔ وہ بے حد کمزور ہو چکی تھی۔ اس کا سارا حسن ماند سا پڑ گیا تھا۔ وہی ستارہ آنکھیں جن میں کبھی جگنوؤں کا بسیرا ہوا کرتا تھا۔

ان آنکھوں میں رت جگے اتر آئے تھے۔ وہ خوابوں میں ان دیکھے پراسرار واقعات اور بدہیبت شکلوں سے خوف محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کا سونے کا ہی جی نہیں چاہتا تھا۔ اس کا رویہ اہل خانہ سے بے حد اکھڑا اکھڑا سا رہنے لگا تھا۔ یہ دوسری شام کا واقعہ تھا جب زریاب اس سے ملنے آیا تھا۔

''میں دری کے لیے تحائف لایا ہوں۔ بہت دنوں سے اس سے فون کال پر بھی رابطہ نہیں رہا تھا۔ امی بھی پریشان ہو رہی تھیں۔ پھر امی نے ہی کہا جا کر خیر خبر لاؤ۔ دراصل ہم لوگ تو شادی کی تیاریوں میں بے حد مصروف ہیں۔ اس لیے وقت ہی نہیں مل رہا تھا آنے کا۔ یہ کنگن دیئے ہیں امی نے کہ ایک مرتبہ دری پہن کر دیکھ لے۔'' زریاب اس وقت حسن کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔

''اچھا کیا یار بہت اچھا کیا۔ امی بتائیں کیا دری جاگ رہی ہے۔ دراصل اسے کچھ بخار سا تھا تو اس وقت شاید سو رہی ہوگی۔'' حسن نے کسی مصلحت کے تحت ہی کہا تھا۔

دری اس قدر کمزور اور مضمحل سی ہو رہی تھی کہ اسے دیکھنے والی پہلی آنکھ ہی اس کی خراب حالت اور دگرگوں حالات جان لیتی تھی، اور اس وقت حسن کی کوشش تھی کہ زریاب واپس لوٹ جائے۔ اس کو مکمل یقین تھا کہ دو دن بعد تو مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو ہی جانا تھا۔

''ارے میں نے خود دیکھا ہے وہ لاؤنج میں بیٹھی ہوئی ہے۔ ٹی وی دیکھ رہی ہے آپ جائیں ناں وہیں مل لیں، اور حسن آپ کیوں ظالم سماج بن رہے ہیں۔'' شزاء نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

حسن نے اسے خونخوار نگاہوں سے دیکھا تھا۔ شزاء نے اس کی نگاہوں میں خاطر میں نہ لاتے ہوئے مزید گل

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

فشانی کی تھی۔

''آؤ میں تمہیں لے جاتی ہوں۔'' شزاء نے زریاب سے پوچھا تھا۔

''نہیں بھابی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود جا کر مل لیتا ہوں۔'' زریاب کے دل میں ہزاروں پھول سے کھل گئے تھے۔ وہ سارے شاپرز تھام کر سیدھا لاؤنج میں آ گیا تھا۔ جہاں اس وقت درشہوار اکیلی ہی بیٹھی ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہی تھی۔ اس نے قریب جا کر سلام کیا تھا۔

''السلام علیکم کیسے مزاج ہیں۔''

درشہوار نے بری طرح سے چونک کر اسے دیکھا تھا، اور سنبھل کر بیٹھ گئی تھی۔

''جی بس ٹھیک ہوں۔'' دری نے سنجیدگی سے کہا تھا، اور بدستور ٹی وی پر نگاہیں گاڑے بیٹھی تھی۔ یوں جیسے اس کی آمد اس کے لیے بالکل ہی اہم نہیں ہو۔ اس بات سے زریاب کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

''کیا بات ہے کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟'' زریاب نے الجھن زدہ انداز میں دریافت کیا تھا۔

''ناراض..... کس بات سے اور آپ سے ایسا ناطہ ہی کیا ہے کہ میں ناراض ہونے لگوں؟'' دری نے سپاٹ لہجہ میں کہا تھا۔ اس کا انداز دیکھ کر زریاب پریشان سا ہو گیا تھا۔ اب تو اسے پورا یقین ہو چلا تھا کہ اس کی کسی بات کو لے کر دری کے دل میں کوئی خفگی چل رہی ہے، اور اس نے دل میں مصمم ارادہ باندھ لیا تھا کہ اس کی خفگی دور کر کے ہی دم لے گا۔

''یہ میں کچھ زیورات لایا ہوں۔ یہ دیکھ لیں۔'' زریاب نے اس کے سامنے زیورات کھول دیئے تھے۔ سارے ڈبے کھول کر اس کے سامنے میز پر سجا دیئے تھے۔ دری نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ان زیورات پر ڈالی تھی۔ مگر کسی بھی قسم کی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ''یہ کنگن میں نے پسند کیے ہیں یہ پہن کر تو دکھاؤ۔ تمہارے ہاتھوں میں خوب سجیں گے۔ بخدا یہ میری محبت کا پہلا تحفہ سمجھ کر قبول کر لو۔''

زریاب نے اسے اکیلا جان کر اور کچھ خفا سا دیکھ کر اس کا ہاتھ تھام کر اسے کنگن پہنانے کی جسارت کی تھی۔ اس کی کلائی تھام لی تھی۔ اس کی مرمریں کلائی اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ اسے کنگن پہنانے ہی والا تھا جب دری نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے الگ کیا تھا۔ یہی نہیں پھر ایک الٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا تھا۔

''کنگن لایا ہے سالے..... کنگن پہنائے گا۔ تیری اوقات ہے مجھے چھونے کی۔ کیا سوچ کر تو نے مجھے چھوا ہے..... بتا.....'' دری میں لگتا تھا کہ اس وقت جیسے کوئی شیطانی روح حلول کر گئی تھی۔ اس کا چہرہ بے حد خوفناک ہو چلا تھا۔ سرخ انگارہ آنکھوں میں خون سوار تھا اور وہ اس وقت زریاب کو ایک تھپڑ مارنے کے بعد اس کا گریبان نوچ رہی تھی۔

زریاب اس اقتادنا گہانی پر حیران پریشان سا تھا۔ اہل خانہ اس شور و غل کو سن کر حواس باختہ سے دوڑے دوڑے چلے آئے تھے، اور سامنے کا منظر دیکھ کر ہول کر رہ گئے تھے۔ دری پر خون سا سوار تھا، اور وہ زریاب کو نوچ کھسوٹ رہی تھی۔ اس کے ناخنوں سے زریاب کا چہرہ چھل گیا تھا۔ زریاب شاید اسے عورت ہونے کی چھوٹ دے کر اس کا لحاظ کر گیا تھا۔ دوسرا وہ اس ساری اچانک سرزد ہونے والی صورتحال پر حیران سا تھا۔ اس لیے اس کی جوابی کارروائی نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کا تو ایسی کسی بھی حالات کا تصور بھی نہیں تھا۔ اس کا چہرہ خون آلود ہو رہا تھا۔ اس کی ساری نشاشت ساری خوشی اکارت چلی گئی تھی اور کلفت میں ڈھل گئی تھی۔

حسن نے آگے بڑھ کر دری کو زریاب سے الگ کرنا چاہا تھا۔ مگر لگتا تھا کہ اس وقت دری میں بہت سارے انسانوں جیسی طاقت آ چکی تھی وہ اس وقت زریاب کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔ بالآخر حسن کو دری کے منہ پر طمانچہ مارنا پڑا تھا، اور دری لہرا کر الگ ہوئی تھی، اور زریاب اس سے الگ ہوتے ہی تڑپ کر دروازے تک بھاگا تھا۔

''زریاب بیٹا میری بات سنو۔'' آصف بیگم معاملہ خراب ہوتے دیکھ کر روہانسی ہو کر بولی تھیں۔ مگر زریاب اس وقت شدید پریشانی کے عالم میں صرف واپسی کے لیے جلدی کر رہا تھا۔ اس کا ارادہ ایک پل کے لیے یہاں رکنے کے لیے نہ تھا۔ ایک بات تو اس پر آشکار ہو چلی تھی کہ دری اس سے بے پناہ نفرت کرتی تھی۔ اس کا چہرہ بھی دیکھنے کی روادار نہ تھی۔ اس سے بے پناہ نفرت تھی۔ یہ اس کے چہرے ہی نہیں اس کی باتوں اس کی آنکھوں سے بھی عیاں

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

تھی۔ زریاب کے جاتے ہی آصفہ بیگم دری کو مارنے کے لیے لپکی تھیں، اور اسے کمر پر دھمو کے رسید کر کے رونے لگ گئی تھیں۔

''نانہجار اولادیہ دکھ بھی لکھے تھے نصیب میں۔ ارے اب کیا ہوگا وہ جا کر ماں کو بتائے گا یہ رشتہ اب نہیں رہ سکتا۔ حسن جا کر اپنے باپ کو فون کرو۔ ان سے بولو جلدی آفس سے سیدھا گھر آئیں۔ یہاں یہ حالات ہو گئے ہیں۔'' آصفہ بیگم کا رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔

''امی خود کو سنبھالیں، اور پلیز دری کو مت ماریں۔ ان سب میں دری کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس کا ذہن اس کے قابو میں ہے ہی کہاں؟'' حسن نے ماں کو سمجھانے کی بہتیرے کوشش کی تھی مگر وہ کچھ بھی سمجھنے کی روادار نہ تھیں، اور مسلسل دری کو کوسنے دیئے جا رہی تھیں۔

''اگر کسی کو برا بھلا کہنا ہے تو اپنی بہو کو کہیں جس نے زریاب کو کہا کہ جا کر اکیلے میں دری سے مل لے۔ میں نے تو پوری کوشش کی تھی کہ زریاب ابھی واپس لوٹ جائے۔ میں نے شزاء کو اشارہ بھی کیا منع بھی کیا۔ مگر اس شاطر لڑکی نے یہ سب کروا دیا۔ امی میں نے بہت سہہ لیا ہے شزاء کو میں اب اس کے ساتھ مزید نہیں رہ سکتا۔ جب تک کہ اسے اپنی غلطیوں کوتاہیوں کا احساس نہیں ہو جاتا ہے۔''

حسن کا اس وقت بہت غصے سے شزاء پر اشتعال تھا۔ آصفہ بیگم نے رونا بند کر دیا تھا۔

''نہ بیٹا اپنے بابا کے کہنے کے مطابق چلنا کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ان سے پوچھ لو۔'' وہ یہی کہہ پائی تھیں سارا ذہن پراگندہ ہو رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک پریشانی سر ابھارے کھڑی تھی۔

''ٹھیک ہے امی۔ آپ مزید پریشان نہ ہوں، اور دری کو کچھ مت کہیں۔''

آصفہ بیگم دری کو گلے سے لگا کر رونے لگ گئی تھیں۔ دری اب بالکل پرسکون بیٹھی ٹکر ٹکر ماں کو دیکھ رہی تھی۔

○○○○○

''کیا بات ہے بھیا اس قدر اداس کیوں لگ رہے ہیں۔ میں بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔ کتابوں میں بھی سر دیئے نجانے کن خیالات میں گم رہتے ہیں۔''

ہما نے فریدوں بخت سے پوچھا تھا۔ جو بہت دنوں سے گم صم سا تھا، اور خالی الذہنی کی کیفیت سے دوچار محض کتابوں کو تکتا رہتا تھا، اور اس کی سوچ کے تانے بانے نجانے کہاں جا جڑتے تھے۔ ورق سادہ رہ جاتے تھے۔

''ہما اس دن دری کی حالت دیکھ کر دل بہت کڑھتا ہے۔ اس کے بعد بھی بلال انکل کا فون آیا تھا کہ اس کی حالت مزید بگڑتی چلی جا رہی ہے۔ نامعلوم اس سب کے پیچھے کون ہے۔ مگر مجھے ان باتوں سے سخت رنج پہنچتا ہے۔'' فریدوں نے اداس لہجہ میں کہا تھا۔

ہما نے گہری نگاہوں سے بھائی کے متورم چہرے کو دیکھا تھا۔ جو اس کے اندرونی جذبات کی چغلی کھا رہا تھا۔

''ایک بات پوچھوں بھیا۔'' ہما نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں پوچھو۔'' فریدوں بخت نے کتاب بند کر کے سیدھا ہما کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

''دوست تو وہ میری ہے اور آپ اس کی فکر میں گھل رہے ہیں۔ کیا یہ کوئی اور ہی ناطہ ہے۔ کیونکہ بھیا کچھ ناطے دل سے جڑے ہوتے ہیں۔ وہ تو اگلے ماہ وداع بھی ہو رہی ہے۔ بھیا کاش آپ پہلے بتا دیتے۔ کیا آپ؟'' کچھ یاس تھا کہ وہ لفظوں کو زبان دے سکی تھی۔

''گڑیا یہ نصیبوں کی بات ہے۔ ہر شے کے حصول کی تمنا نہیں کی جا سکتی ہے۔ کچھ چیزیں ہمارے لیے نہیں ہوتی ہیں۔ مگر ہم ان کی دل سے توقیر کرتے ہیں انہیں سراہتے ہیں۔ وہ سب کچھ ہمارا نہیں ہوتا ہے۔ پھر محبت تو ایسا الوہی جذبہ ہے۔ میں نے کبھی اسے ایک پل کے لیے بھی اپنا بنانے کا نہیں سوچا ہے۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ وہ سدا سکھی رہے۔'' فریدوں بخت ایک بہت ہی نیک انسان کا بیٹا تھا۔ اس لیے اس کے نزدیک اپنی ذات سب سے پیچھے تھی اور باقی ساری انسانیت آگے تھی۔

''بھیا اب کیا ہوگا دری کے ساتھ۔ انکل کا فون آیا تھا۔ وہ بے صبری سے بابا جان کی واپسی کے منتظر ہیں۔ مگر ابھی تو شاید بابا جان بہت دنوں تک نہیں لوٹنے والے۔ بھیا آپ کچھ کیوں نہیں کرتے اس سلسلے میں۔'' ہما نے فریدوں بخت سے کہا تھا۔

''میں..... میں کیا کر سکتا ہوں ہما۔ ابھی تو بابا جان کی ہی واپسی کا منتظر ہوں۔ میرے اختیار میں بھلا کیا ہے۔''

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

فریدوں بخت نے بے حد متعجب ہو کر بہن سے پوچھا تھا۔

''بھیا آپ سب کر سکتے ہیں۔ کراماتی تسبیح ابھی بھی بابا یہیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ اس کا ورد کا طریقہ بھی آپ جانتے ہیں۔ جہاں تک میری معلومات بتاتی ہیں آپ نے ایک دو مرتبہ اسی طرح کچھ غم زدوں کی مدد کی تھی ہے۔ تو پھر دری کے لیے اتنی بے اعتنائی کی۔ وہ پل پل سسک رہی ہے۔ اندر ہی اندر گھٹ رہی ہے۔'' ہما کی بات پر فریدوں نے سر جھکا لیا تھا۔

''ہما تم بھول رہی ہو میری بہن کہ وہ معاملات یکسر مختلف تھے۔ پھر ان میں میری خوابیدہ صلاحیتوں سے زیادہ اسی کراماتی تسبیح اور بابا جان کی اصلاح کا اثر تھا، اور دری کے معاملے میں شاید میں کچھ نہ کر سکوں۔ میرا مطلب ہے میں تو دری کی ایک ذرا سی سسکی بھی برداشت نہیں کر سکتا ہوں۔ کجا یہ کہ وہ روئے اور اس معاملے میں یہ سب ہوگا۔ دل سخت کرنا ہوگا جسے بھی دری کو ان مصائب سے نکالنا ہوگا اسے دری کو شاید کچھ درد سے بھی دوچار کرنا پڑے کہ وقتی اذیت ہمیشہ کے دکھ سے کچھ کم ہی لگتی ہے۔ لیکن میرے لیے اس کی ہر آہ اندر تک کرلانے والی ہے۔''

فریدوں بخت کے اعتراف میں بھی بے پناہ سادگی اور معصومیت تھی۔ وہ کس قدر اپنائیت سے اس کے درد کو محسوس کر رہا تھا، اور اس کے دکھوں کا مداوا کرنا چاہتا تھا۔ مگر افسوس تو یہ تھا کہ وہ چاہ کر بھی کچھ نہ کر پا رہا تھا۔ اسے قوی یقین تھا کہ ابا جان اس معاملے کو آرام سے حل کر لیں گے، اور ان کی واپسی میں صرف ایک ہفتہ ہی رہ گیا تھا، اور اسے اس دوران ہمت سے ہی کام لینا تھا۔

''بھیا ٹھیک ہے پھر دعا کرتے ہیں اللہ میری پیاری دوست کی مشکلات حل فرما دے کہ وہ رب العالمین مشکل کشا بھی ہے۔'' ہما نے کہا تو فریدوں بخت کی آنکھ کا ایک گوشہ نم سا ہو گیا تھا۔ مگر لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ یہی تو اعلیٰ وصف والوں کی خوبی ہوا کرتی ہے۔ صابر بن ہوتے ہیں، اور فریدوں بخت بھی اسی راہ پر گامزن تھا۔ بہتری کا خواہاں تھا۔ مگر صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا تھا۔ تھامے ہوئے کھڑا تھا۔

○○○○○

ٹھیک تین دن بعد وہ لوگ دوبارہ حاضر ہو چکے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ اکا دکا لوگ ان کھنڈرات میں قرب و جوار میں موجود تھے۔ یہ ایک تاریک سا علاقہ تھا۔ جہاں بود و باش ناپید تھی، اور یہاں کسی کا زیادہ گزر بھی نہیں تھا۔ یہ ایک ہندو بستی تھی۔ اس کے انتہا پر آگے جا کر بہت سارا ویران علاقہ تھا، اور انہی میں کچھ کھنڈر بھی تھے، اور اس جگہ کو اس شخص نے اپنی آسن کا مرکز بنایا ہوا تھا۔ وہ شخص ان کی آمد کا ہی منتظر تھا، اور اس وقت ان کو آتا دیکھ کر زیر لب مسکرا دیا تھا۔

''ٹھیک سمے پر آ گئے ہو۔ بالکل ٹھیک سمے پر۔'' وہ زیر لب مسکرا کر بولا تھا لگتا تھا کہ وہ خود کلامی کر رہا ہو۔

''یہ دیکھو ہانڈی تیار ہے۔ صرف اس میں اس چھوکری کا خون ڈالنا ہوگا۔ یہ قربانی مانگتی ہے۔ ورنہ سارا کیا کرایا برباد ہو جائے گا۔''

بلال صاحب نے گھبرا کر حسن کی طرف دیکھا تھا۔ اس وقت اس اول جلول حلیے والے شخص پر دیپ کے سامنے آگ پر ہانڈی دھری تھی۔ وہ مٹی کی ہانڈی تھی۔ اس میں نجانے کیا پک رہا تھا۔ مگر اس میں پکنے کی آوازیں صاف سنی جا سکتی تھیں، اور نا معلوم کیوں اس طرح کی آوازوں سے بلال صاحب کا دل الٹنے لگ گیا تھا۔

''خون۔ مگر وہ کس لیے۔ دری کیسے دے گی اپنا خون۔'' بلال صاحب نے ہراساں ہو کر پے در پے سوالات کیے تھے۔

''منش میں حوصلہ ہونا چاہیے کٹھنائیوں کا سامنا کرنے کا حوصلہ اگر ساری عمر اس طرح روگ میں جینا ہو تو ٹھیک ہے۔ مرضی ہے۔ ورنہ خون تو دینا ہی ہوگا۔'' پردیپ نے نروٹھے پن سے کہا تھا۔ حسن نے مصالحتی انداز میں بلال صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ یوں جیسے ان کا حوصلہ بڑھا رہے ہوں۔ بلال صاحب کے چہرے پر بے بسی چھائی تھی۔

''جی ٹھیک ہے آپ جیسا ٹھیک سمجھتے ہیں میں وہ کریں۔ مگر میری بہن اس کے بعد اچھی تو ہو جائے گی ناں؟'' حسن نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا تھا۔ یوں بھی خود بلال صاحب فیصلہ کرنے سے عاری تھے۔ ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو رہی تھیں۔ دماغ شل ہو رہا تھا۔ پردیپ اجازت ملتے ہی تیزی سے کچھ پڑھنے میں لگ گیا تھا۔ ورد تیز ہو گیا۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

لگتا تھا کہ وہ کوئی مخصوص جاپ کر رہا تھا۔ جس کی مدت کوئی دس پندرہ منٹ تھی۔ اس کی مدھم سی سرگوشی لفظوں سے ناآشنائی کا احساس دلا رہی تھی۔ اس وقت تک گھمبیر خاموشی کا راج رہا تھا۔ اس کے بعد اچانک اس نے دری کو ہاتھ کے اشارے سے قریب آنے کو کہا تھا۔ بلال صاحب نے ہراساں ہو کر حسن کو دیکھا تھا حسن نے بلال صاحب کی جانب دانستہ دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس وقت ان کو حوصلہ اور تشفی دینے سے کہیں زیادہ اہم تر دری کو دیکھنا اور سنبھالنا تھا۔ حسن نے دری کی کلائی تھامی تھی اور پردیپ کے پاس لے گیا تھا۔ اسے خود معلوم نہیں تھا کہ پردیپ کیسے اس کا خون حاصل کرے گا۔ پردیپ نے اچانک ہی دری کی شہادت کی انگلی پر ضرب لگائی تھی۔ نوکدار خنجر لگتے ہی ٹپ ٹپ خون گرنا شروع ہو چکا تھا۔ لیکن پردیپ جو ذہنی طور پر بالکل چوکنا تھا۔ اس کا خون گرنے نہیں دیا تھا، اور اسے ایک پیالے میں بھرنے لگا تھا۔ خون مسلسل قطرہ قطرہ تیزی سے نیچے گر رہا تھا۔ بلال صاحب اس منظر کی تاب نہ لا سکے تھے۔ اس لیے بے بسی سے اپنی آنکھیں پھیر لی تھیں۔ اولاد کا کرب سہنا سہل نہیں ہوتا ہے، اور دری اس وقت صرف سی کی آواز کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ دری نے کسی بھی قسم کا اعتراض یا شور نہیں کیا تھا۔

پیالہ آدھا بھر چکا تھا۔ خون بھی اب اس روانی سے نہیں گر رہا تھا۔ اس نے پیالہ سیدھا ہانڈی میں ڈال دیا تھا۔ اس کا خون ہانڈی میں جھونکنے کی دیر تھی کہ ہانڈی تیزی سے حرکت کرنے لگ گئی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ ابھی اوندھے منہ جا گرے گی۔ لیکن ہانڈی بجائے گرنے کے تیزی سے خلا میں معلق ہو گئی تھی، اور ان سب کے سروں پر گول گول دائرے میں ناچنے لگی تھی۔ اس دوران پردیپ کے لبوں پر کوئی منتر بہت ہی تیزی سے چلنے لگا تھا۔ ہانڈی نے گول گول دائرے میں تیرنا بند کر دیا تھا، اور ایک سمت میں جا کر ٹھہر گئی تھی۔ پردیپ نے پھونک مار کر ہانڈی کی سمت کا تعین کیا تھا، اور ہانڈی تیزی سے اپنی جگہ چھوڑتی حرکت میں آتی ہوئی ایک سمت اڑنے لگی تھی، اور اڑتے اڑتے نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

حسن نے اپنا رومال دری کے زخم پر کس کر باندھا تھا۔ بلال صاحب تذبذب کے عالم میں بیٹھے ہوئے سوچ رہے تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ پانچ منٹ بھی پورے نہ گزرے تھے کہ ہانڈی اسی تیزی اور اسی روانی سے واپس پلٹتی دکھائی دی تھی۔ یہ دیکھ کر پردیپ کے حواس جیسے کھونے لگے تھے۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ اس کو اپنی موت اپنے سر پر ناچتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، اور ہانڈی اچانک ہی خلا میں گھم سی گئی تھی۔ گھمبیر خاموشی چھائی تھی۔ جب اچانک ہی جگن بابا کے قدموں کی دھمال سنائی دی تھی۔ اس کا قدم زمین پر پڑتا تھا، اور لگتا تھا کہ زمین تھر تھرانے لگی ہے۔ جگن کے چہرے پر شدید اشتعال دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آمد بے سبب تو نہ رہی تھی۔

حسن اور بلال صاحب اب اس نئی ناگہانی افتاد پر پریشان حال تھے۔ ابھی اس شخص کی آمد ہی پریشانی کا سبب تھی کہ اچانک ہی دری نے دوڑ کر جگن کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا تھا، اور سر رکھے اس کے قدموں پر ہی لوٹنے لگی تھی۔ یوں جیسے وہ اس جگن کی بے دام غلام ہو۔

”دیکھ لیا مورکھ؟ یہ چھوکری کس طرح میرے قدموں میں رل رہی ہے۔ ارے کسی کی اتنی ہمت ہے کہ میری شکتی کو للکارے۔“ جگن کے لہجہ میں غصہ تھا۔ بے پناہ اشتعال۔

”جے ہو مہاراج۔ میں نے آپ کا استھان پہچان لیا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی ہے۔ ایک بڑی چوک کر بیٹھا ہوں۔ مجھے معاف کر دو مہاراج۔“

پردیپ اچانک ہی اپنی جگہ سے اچھلا تھا، اور دوڑ کر جگن کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ لیکن لگتا تھا کہ کوئی غیر مرئی طاقت اسے جگن تک جانے کا راستہ نہیں دے رہی تھی۔ ایک مخصوص مقام سے آگے اس کا جانا ہو ہی نہیں رہا تھا۔

”بہت ہی عیار ہے تو پہلے تو یہ ہانڈی ہماری طرف بھیجتا ہے کہ اس ہانڈی سے میری موت ہو جائے، اور اب جبکہ تجھے میری اصل شکتی کا علم ہو گیا ہے تو کس طرح سے گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہا ہے تو بھی میرے قدموں میں لوٹنا چاہتا ہے۔ مگر مورکھ یہ وردان بھی ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتا ہے۔ تو نے ہمارے ہی مذہب کا ہو کر اس دوسرے مذہب کی سہایتا کر کے ہی گھور انیائے کیا ہے۔“ جگن کا لہجہ بے حد غضبناکی لیے تھا۔

”یہ شخص کون ہے پردیپ جی، اور یہاں کیا کر رہا ہے۔“ حسن نے درمیان میں ٹوک کر ساری صورتحال کو

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

سمجھنا چاہا تھا۔ اسی دوران پہلی مرتبہ دری اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''ارے بھیا ان کو نہیں جانتے یہ مہان پنڈت ہیں۔ ان کے کرم سے سارے کام سہل ہو جاتے ہیں۔ ان کا مجھ پر سایہ ہے۔ سمجھ لیں آشیر باد ہے، اور میں ان کے چرنوں میں بہت شانتی محسوس کر رہی ہوں۔''

پردیپ کے انداز گفتگو کو سن کر بلال صاحب دنگ رہ گئے تھے، اور خود حسن کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

''سن لیا بالک؟ یا اور کچھ سننا باقی ہے۔ نہیں تم لوگ ایسے نہیں مانو گے۔ تو دیکھو جس کے بل پر تم لوگ مجھے مارنے چلے تھے۔ اب اس کی موت کا کارن بھی تم ہی لوگ بن رہے ہو۔''

جگن نے ہانڈی کی طرف انگلی کر دی تھی۔ پردیپ اپنی موت دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ لگتا تھا کہ پردیپ کو کسی نے شکنجے میں قید کر لیا تھا۔ کچھ ان دیکھی قوتوں نے پردیپ کے ہاتھ پاؤں جکڑ لیے تھے۔ ہانڈی گردش کرتی تیزی سے پردیپ کے سر پر جا گری تھی۔ پردیپ کی دلخراش چیخیں غضب ڈھا رہی تھیں۔ کھولتا ہوا وہ آمیزہ جو نجانے کب سے پک رہا تھا پردیپ پر پڑتے ہی اس کا سارا جسم منٹوں میں جھلسا کر راکھ کر گیا تھا۔

زندہ انسان کے جلنے کی بو چہار سو پھیل گئی تھی۔ اس کا انجام دیکھ کر بلال صاحب اور حسن کی گھگھی بندھ گئی تھی۔ جبکہ دری اس ساری افتاد سے ناواقف محض ایک تماشے کی مانند دیکھ رہی تھی، اور اس کے چہرے پر مسکان سی تھی۔ جو شیطانی سی تھی۔

''اگر ہم چاہیں تو ابھی اس چھوکری کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ ساری عمر ڈھونڈتے رہو۔ مورکھو۔ مگر ہمیں کسی شریر کی کیا ضرورت ہے۔ ہم نے یہ تم لوگوں کو دی۔ یہ ساری عمر تم لوگوں کی نظروں کے سامنے ہی رہے تو اچھا ہے۔ یہی اس عورت ساشا کا انتقام ہے، اور یہ بے جان مورت لے جاؤ۔'' جگن کہتا سیدھا واپسی کے لیے مڑ گیا تھا، اور تھوڑی دیر بعد ہی اندھیرے میں گم ہو گیا تھا۔ اس طرح کے اندھیرے کا ہی حصہ معلوم ہونے لگا تھا۔ مگر اب یہاں مزید کچھ بھی باقی نہ رہا تھا کہ مزید رکا جاتا۔ یوں بھی بلال صاحب کو پردیپ کی جھلستی ہوئی شکل سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ دل بیٹھا جا رہا تھا۔ حسن نے ہی ہمت کر کے باپ کا ہاتھ تھاما تھا سہارا دے کر گھر کا رخ کیا تھا۔ دری از خود ساتھ چلنے لگی تھی۔

○○○○○

''نجانے کیوں مجھے تمہاری باتوں پر یقین نہیں آ رہا ہے۔ درشہوار ایسا کیسے کر سکتی ہے۔ وہ کس طرح تم پر ہاتھ اٹھا سکتی ہے۔ جہاں تک میں اس بچی کو جانتی ہوں وہ بے حد سلیقہ شعار اور باادب سی بچی ہے۔ اس نے تو کبھی پلٹ کر اپنے والدین کو بھی جواب نہیں دیا۔''

ریحانہ بیگم کا انداز بے حد الجھن بھرا تھا۔ ان کے سامنے اس وقت زریاب بیٹھا ہوا تھا، اور اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس نے آ کر ریحانہ بیگم کو پہلے تو کچھ نہیں بتایا تھا کمرے میں بند رہا تھا۔ جب ریحانہ بیگم نے بہت زیادہ کرید کی تو یہ بات معلوم ہوئی تھی۔ یہ بات ان کو کسی طور ہضم ہی نہ ہو رہی تھی۔ وہ حیران ہو رہی تھیں، اور جتنا وہ اس بات سے انکار کر رہی تھیں زریاب کا غصہ اتنا ہی بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

''میں جانتا تھا کہ آپ میری بات کا یقین ہی نہیں کریں گی۔ مانا وہ حسین ہے۔ میں نے بھی سوچا کروڑوں کی جائیداد کی مالک ہے۔ کیا کمی ہے۔ میری ماں کی بھی یہی آرزو ہے، اور پھر میرے دوست بھی میرے اتنے اچھے خاندان اور اونچے گھرانے میں رشتہ پر مجھ سے رشک کرنے لگے تھے۔ مگر امی میں ایسی کسی بھی لڑکی کا ساتھ قبول نہیں کروں گا جو مجھ پر ہاتھ اٹھائے گی۔ آپ جانتی ہیں کہ مجھے اپنی عزت نفس کس قدر پیاری ہے۔ اگر اسے مجھ سے شادی پر اعتراض تھا تو منہ پر طمانچہ رسید کرنے کی کیا ضرورت تھی جب کہ لفظوں کی مار تو وہ مار ہی رہی تھی۔'' زریاب کا انداز بے حد جارحانہ تھا۔

''میں جاؤں گی کل ہی اور تم بھی ساتھ چلنا۔ میں تو حیران اس بات پر ہوں کہ اگر یہ سچ ہے بھی تو بھائی صاحب اور آصفہ نے کچھ بھی نہ کہا اسے، اور تم سے معافی تلافی کے لیے ایک فون کال بھی کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ حد ہے بھئی بے حسی کی۔ میں اب اس بات کو اس کے انجام تک پہنچا کر ہی دم لوں گی۔ تم کل تیار رہنا۔ اگر میرے بیٹے کی ہتک ہوئی ہے تو مجھے اس ہتک کا بدلہ چکانا بھی پوری طرح سے آتا ہے۔'' ریحانہ بیگم جو اصل حالات و واقعات سے ناواقف

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی چلی جائے۔ مگر اس نے سوچ کر ہی کل جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر وہ چاہتی تھی کہ ویک اینڈ پر جائیں جب سب اہل خانہ گھر میں ہی ہوں گے۔ یوں بات با آسانی آمنے سامنے بھائی صاحب کے بھی سامنے ہو جاتی۔ وہ یہی سوچ کر کڑوا گھونٹ پی گئی تھیں، اور زریاب کا موڈ بے حد خراب سا تھا۔

''اچھا اب غصہ تھوک دو۔ منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔ میں نے تمہاری پسندیدہ نہاری بنائی ہے۔ مل کر کھاتے ہیں۔ ریحانہ بیگم نے زریاب کو پچکارتے ہوئے کہا تھا۔

''امی ان باتوں کی بھنک فی الحال گل افشاں کو نہ ہی ہو تو بہتر ہے۔ وہ تو یوں بھی دری دری کرتی اس کے آگے پیچھے پھرتی رہتی ہے۔ اس مرتبہ بھی اس کی وکالت کرے گی۔ امی ایک بات بتائیں اگر میں نے کنگن پہنانے کے لیے اس کا ذرا سا ہاتھ تھام لیا تھا تو کیا منہ پر تھپڑ مارنا جائز تھا۔''

زریاب نے جو بات اب تک نہیں بتائی تھی بالآخر اس نے سر کھجاتے ماں کے گوش گزار کر ہی دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ بات اس کے خلاف بھی جا سکتی تھی۔ اسے ماں کو کم از کم پوری بات ضرور بتا دینی چاہیے۔ اس کی بات سن کر ریحانہ بیگم نے اپنا ہاتھ پیٹ لیا تھا۔

''زریاب تو نے کیوں پکڑا اس کا ہاتھ۔ دیکھ اس حوالے سے میں تیرا ساتھ نہیں دوں گی نہ ہی تیری طرف داری کروں گی۔ کل کلاں کو منگنی کے بعد کوئی تیری بہن کا ہاتھ تھام کر کنگن پہنانے بیٹھ جائے۔ تو تمہیں کیسا لگے گا؟''

ریحانہ بیگم نے سخت برا مناتے ہوئے صاف لفظوں میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ بلکہ اسے تو اب یہ بھی خوف دامن گیر تھا کہ کہیں اس کے بھائی اس کی تربیت پر حرف زنی نہ کریں۔

''امی! میں نے کوئی معیوب حرکت نہیں کی تھی۔ اس محترمہ سے پہلے پوچھا تھا کہ کیا میں اس کی کلائی میں کنگن ڈال سکتا ہوں۔ تب تو محترمہ منہ میں گڑ ڈالے بیٹھی رہی تھیں، اور جب پہنانے لگا تو تڑاخ سے منہ پر طمانچہ دھر دیا۔ یہی نہیں اس کے بعد منہ سے مغلظات کا ایک جم غفیر نکلا تھا۔ جس کے گن گاتے آپ کی زبان نہیں تھکتی ہے۔ بہر حال ایک بات صاف بتا دوں۔ اگر دری مجھ سے معافی مانگتی ہے تو میں اس رشتے کو اب بھی لے کر چلنا چاہوں گا۔ ورنہ میں مزید اس رشتے کا بوجھ نہیں ڈھو سکتا ہوں۔'' زریاب نے بھی اب صاف صاف بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔

''ویسے میں سوچ رہی ہوں اگر بھائی صاحب کے علم میں یہ بات ہوتی تو وہ ضرور اب تک کال کر لیتے۔ ضرور اپنی بیٹی کے کرتوت پر آصفہ پردہ ڈالے بیٹھی ہوگی۔'' ریحانہ بیگم دور کی کوڑی لائی تھی۔ اس مرتبہ وہ بھی چونک گیا تھا۔

''جی امی ایسا ممکن ہے۔ کیونکہ تب بلال انکل بالکل بھی گھر پر نہ تھے۔ آفس میں تھے۔'' زریاب نے بھی ماں کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

گل افشاں ساری بات نہ صرف سن چکی تھی بلکہ حیران پریشان بھی ہو رہی تھی۔ اس کے خیال میں دری ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ایک بولڈ اور آزاد خیال لڑکی ہرگز نہیں تھی۔ بلکہ بے حد شرمیلی اور ہنس مکھ سی تھی۔ وہ طے کر چکی تھی کہ کل وہ بھی ہر صورت میں ماں کے ساتھ جائے گی۔ کسی بھی بہانے سے۔ آخر پتہ تو چلے کہ ماجرا کیا ہے؟ تبھی ریحانہ بیگم نے اسے پکارا تھا وہ بھی کھانے کے لیے نکل کھڑی ہوئی تھی۔

○○○○○

دوسری شام ریحانہ بیگم جانے لگی تو گل افشاں نے بھی ساتھ جانے کی ضد باندھ لی تھی۔ مگر انہوں نے بھی اسے صاف منع کر دیا تھا، اور یوں وہ اکیلی ہی زریاب کے ساتھ بلال صاحب کے گھر پہنچی تھیں۔ بلال صاحب اور اہل خانہ لان میں ہی شام کی چائے پی رہے تھے جب دروازے پر کار کا ہارن سن کر چونک گئے تھے۔ ریحانہ کی آمد اور زریاب کے ساتھ سب ہی چوکنے سے ہو گئے تھے۔ بلال صاحب اپنی بیٹی کے فکر میں مبتلا تھے اور کچھ زریاب کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر دل سے شرمندہ بھی تھے اس لیے انہوں نے بہن سے کوئی بھی رابطہ نہ کیا تھا۔ اب بہن کی آمد پر وہ چونک سے گئے تھے۔ آصفہ بیگم نے بھی ہراساں نگاہوں سے مجازی خدا کو دیکھا تھا۔ ریحانہ بیگم بہ ظاہر ہنستی مسکراتی پہلے کی طرح ہی بھائی اور بھابی سے ملی تھی۔

''میں نے سوچا بھائی صاحب اور بھابی صاحبہ تو ہمیں بھول ہی گئے ہیں اور یہ بھی شاید بھول گئے ہیں کہ ہمارا بہن بھائی کے علاوہ بھی اب ایک اور ہی رشتہ استوار ہونے والا

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ہے تو کچھ میل ملاقات ہی رکھ لیں۔ بھائی صاحب بھابی کی تو خیر ہے وہ تو پرائی ہیں مگر آپ تو اپنے ہی ہیں ناں۔ آپ تو گزرتے گزرتے کبھی بہن کا احوال ہی دریافت کرلیا کریں۔'' ریحانہ بیگم نے یہ ظاہر ہنستے ہوئے کہا تھا۔ مگر وہ بھائی اور بھابی کو طنز کے وار بھگو بھگو کر مار رہی تھیں۔

''چھری تلے دم تو لو۔ آتے ہی حملے شروع کردیتی ہو۔ آرام سے بیٹھو تو بات چیت ہو۔'' بلال صاحب نے بھی ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''بیٹھنے تو میں آئی ہوں، اور بات کرنے ہی آئی ہوں۔ دیکھیں یہ تو ناانصافی ہے۔ میرا بچہ اتنی چاہت سے سارے زیورات لایا اور آپ کی صاحبزادی نے اس کے منہ پر مار دیئے۔ واہ کیا محبت کا جواب یہی ہے آپ کے پاس؟'' ریحانہ بیگم نے صاف صاف بات کرنے کی ٹھان لی۔

بلال صاحب کل رات ہی اپنی بیوی آصفہ سے اس سارے معاملات طے کرچکے تھے کہ وہ ریحانہ بیگم سے اپنی بچی کے اوپر کسی کے اثرات کا ذکر نہیں کریں گے۔ ان کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ اس طرح تاعمر ریحانہ کے دل میں یہ وسوسہ رہے گا کہ ان کی بہو آسیب زدہ یا جادو کے اثرات میں ہے، اور اسے کسی طرح بھی اپنی بہو بنانے پر آمادگی کا اظہار نہیں کریں گی۔ ان کے دل میں ایک امید تھی کہ جلد ہی چند دن میں پیر صاحب لوٹ آئیں گے اور یہ معاملہ جو اس قدر مشکل دکھائی دے رہا ہے سلجھ جائے گا، اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے طے کیا تھا کہ ریحانہ کے سامنے بھرم قائم رکھا جائے، اور اسی سوچ کے مطابق آصفہ بیگم لبوں پر قفل لگائے بیٹھی تھیں، اس وقت بھی وہ تابعداری کررہی تھیں۔ ان کی خاطر مدارت میں جتی ہوئی تھیں۔

''ریحانہ جو ہوگیا اسے بھول جاؤ۔ کل کی بات کو جانے دو۔ دری تو خود بہت نادم ہے۔ اس دن کے بعد سے کمرے سے نہیں نکلی، اور بہن برا نہ منانا ابھی اس بات کا وقت نہیں آیا تھا کہ زریاب اس کا ہاتھ تھام کر اسے کنگن پہنانے لگ جاتا۔ بہرحال اقدار و روایات اپنی جگہ ہوتی ہیں۔ اس نے جو بھی کیا وہ اس کے عمل کا ہی ردعمل تھا۔'' بلال صاحب نے اپنے طور پر مصالحتی انداز میں اپنی ہی بچی کا بھرپور دفاع کرنا چاہا تھا۔ مگر ریحانہ کو یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔ بھی ناک بھوں چڑھانے لگ گئی تھی۔

''یہ تو خوب کہی آپ نے اقدار و روایات کیا یہ سکھاتی ہیں کہ اپنے ہونے والے شوہر کے منہ پر طمانچہ رسید کردیا جائے۔'' ریحانہ بیگم نے بھی بے حد تضحیک آمیز انداز میں کہا تھا۔

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ ایسی باتوں کا کیا فائدہ جن سے دلوں میں میل آجائے۔ بہتر ہے کہ یہ معاملہ بچوں کے سپرد کردیا جائے اور ان کو یہ معاملہ خود ہی حل کرنے دیا جائے۔'' بلال صاحب کی بات پر ریحانہ چپ کرگئی تھیں۔

''اچھا چلیں ان باتوں کو تو جانے دیں۔ یہ سب کھائیں۔ میں ابھی نوری کے ساتھ مل کر آپ کے لیے اچھا سا کھانا بنواتی ہوں۔'' آصفہ نے بات کو دبتے دیکھ کر جلدی سے اپنی نند کو رام کرنے کی کوشش کی تھی، اور اس طرح وہ ٹھنڈی پڑ گئی تھی، اور چائے کی چسکیاں لینے لگ گئی تھی۔

''اب کیا دری اپنی پھوپھو کو سلام کرنے بھی نہیں آئے گی۔'' ریحانہ بیگم نے چبھتے ہوئے کہا تھا۔

آصفہ بیگم فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں تھی، اور کچھ دیر میں دری ان کے ساتھ ہی باہر لان میں آگئی تھی۔ آنکھوں کے گرد گہرے ہلکے اس کی بے خوابی کا اظہار کررہے تھے، اور اس کی نگاہوں میں ایک عجیب سی یاسیت گھلی تھی، اور کمزوری اس کے چہرے سے عیاں ہورہی تھی۔ اس کا رنگ بالکل ہی زرد اور پیلا سا ہورہا تھا۔ ریحانہ بیگم کو احساس ہوا تھا کہ وہ واقعی شاید بہت بیمار رہی ہے۔ اس لیے انہوں نے دری سے کچھ بھی سخت کہنے کی بجائے نرم رویہ رکھنے کا ہی طے کیا تھا۔ دری آرام سے آئی تھی۔ یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر پھوپھو کو بھی سلام کیا تھا، اور پھر زریاب کو بھی سلام کیا تھا۔

''کیا بات ہے بچی اب کی بار تو تم پہلے سے بھی زیادہ کمزور دکھائی دے رہی ہو۔ کیا کھائی پیتی نہیں ہو، اور تمہارے پیپرز کب تک ہیں؟'' پھوپھو نے اس سے پوچھا تھا۔ وہ ایک دم چپ سی کرگئی تھی۔

''پیپرز میرا دینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میرا اب کسی بھی چیز میں دل نہیں لگتا ہے۔ نجانے کیوں؟'' دری کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔

''ویسے پیپرز کب ہیں؟'' پھوپھو صاحبہ کی تان اسی

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

ایک سوال پر ٹوٹی تھی۔ دری بالکل چپ تھی اور اس کے لب بستہ رہنے پر ہی آصفہ بیگم نے جھٹ سے جواب دیا تھا۔

''ہم نے سوچا ہے کہ اس کی صحت اجازت نہیں دے رہی تو اگلے سال دے لے گی پیپرز بھی۔ کچھ تو ہو بھی چکے ہیں۔ ہم نے اس کو زور ہی نہیں دیا۔''

''ٹھیک ہے پھر کرلے گی پڑھائی بھی جیسے اس کی مرضی ہوگی۔'' ریحانہ بیگم نے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں پرسوچ انداز میں کہا تھا۔ مگر اسے کوئی نہ کوئی گڑبڑ لگ رہی تھی۔ دل میں سو طرح کے وسوسے جنم لے رہے تھے۔ اس کی زرد رنگت اس کی عین گواہ تھی۔

رات کے کھانے کا پرتکلف اہتمام کیا گیا تھا۔ دری تھوڑی دیر بعد خود ہی کمرے میں چلی گئی تھی۔ جس پر بلال صاحب اور آصفہ نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ کیونکہ دری کبھی کبھار اہل خانہ کو سرے سے پہچانتی ہی نہیں تھی، اور کبھی تو بے حد آرام سے بات کرلیتی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

کھانے کے وقت دری کو بھی بلوایا گیا تھا۔ اس نے خاموشی سے کرسی سنبھال لی تھی۔ اس کی خاموشی پر آصفہ بیگم نے ہی چپ چاپ اس کی پلیٹ میں چاول ڈال دیئے تھے۔ تھوڑے سے چاول، کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ بہت کم کھاتی ہے۔

''ارے دری بیٹا پیٹ بھر کر کھایا کرو۔ لو یہ شوربہ بھی لو، اور کباب بھی لو۔'' پھوپھو نے لہجہ میں چاشنی سموتے ہوئے کہا تھا۔

زریاب ان باتوں سے یکسر الگ ہو کر ڈٹ کر کھانے میں جتا ہوا تھا، اور اس نے ایک سرسری سی نگاہ بھی دری اور اس کی خالی پلیٹ پر نہیں ڈالی تھی۔ ایک ہی طمانچے کے بعد محبت کا طلسم جھاگ کی مانند بیٹھ گیا تھا۔

''لو ناں دری بیٹھی کیوں ہو؟'' ریحانہ بیگم نے محبت سے اصرار کیا تھا۔

دری نے ایک دم چہرہ اٹھا کر بے حد عجیب سی نگاہوں سے ریحانہ بیگم کو دیکھا تھا، اور اپنے سامنے پڑا ہوا سالن کا ڈونگا اٹھا کر ریحانہ بیگم کے منہ پر اچھال دیا تھا۔ تیز گرم مرچوں والا سالن ریحانہ بیگم کے چہرے بازو اور گردن پر چھینٹے اڑاتا ہوا ان کو جھلسا کر رکھ گیا تھا۔

''بہت کرلی تو نے بکواس، اور بہت دیر سے سہہ لی تمہاری فضولیات۔ پھوٹو یہاں سے۔ نکلو۔ ابھی کے ابھی دفعان ہو۔ اس دن تیرے بیٹے کے منہ پر چھاپڑ مارا تھا ناں۔ آج تیری درگت بننے والی ہے۔ چل دفعان ہو جا۔ پھر نہ کہنا بتایا نہیں۔'' دری کے لہجہ میں خونخوار غراہٹ تھی۔

ریحانہ بیگم دنگ رہ گئی تھی۔ اس کا وجود جل رہا تھا۔ مگر اس کی پروا نہ رہی تھی۔ وہ تو دری کے لب ولہجہ میں پنہاں شدید نفرت کو دیکھ کر ہی دم بخود رہ گئی تھی۔

اس کی نگاہوں میں پنپتی ہوئی وحشت انہیں ہراساں کر رہی تھی۔ وہ ایک دم سٹپٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''یہ یہ سب کیا ہے؟'' انہوں نے اپنے بھائی سے سوال طلبی کی تھی۔ وہ نظر چرا گئے تھے۔ کیا بتاتے کہ اولاد ہی شرمندہ کروانے پر تلی بیٹھی تھی۔

وہ تو شکر تھا کہ اس وقت حسن اور شزاء سسرال کی دعوت پر گئے تھے، اور ادھر موجود ہی نہ تھے۔ ورنہ آج پھر ایک تماشا گھر میں شزاء دیکھ لیتی۔

''شکر ہے کہ میں نے تم جیسی لڑکی کو اپنی بہو نہیں بنایا۔ میری طرف سے اس رشتے کے لیے انکار ہے۔ میں ایسی جاہل لڑکی کو اپنی بہو نہیں بنا سکتی۔ قہر خدا کا میرا چہرہ جھلس کر رہ گیا ہے۔ میں تھوکتی ہوں اس لڑکی کے منہ پر۔''

ریحانہ بیگم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ دری کا منہ نوچ لیں۔ ان کو شدید درد کی لہریں اپنے جھلسے ہوئے بدن پر محسوس ہو رہی تھیں۔ ان کی آواز میں غصہ تو تھا۔ مگر نمی بھی تھی۔ لہجہ نم آلود تھا۔ جو شدت درد کی وجہ سے تھا۔

''ارے جا جا۔ چنوری بڑھیا آجاتی ہر ہفتے یہاں ڈکارنے۔ چل بھاگ ورنہ میں اپنی جوتی سے مرمت کروں گی تیرے اس بھگوڑے بیٹے کی۔''

زریاب کا منہ کھل چکا تھا۔ پھر ایک دوسرا ہی منظر ان پر ظاہر ہوا تھا۔ دری نے اپنی چپل اتار کر زریاب کے منہ پر ماری تھی۔ جو ٹھیک نشانے پر لگی تھی۔ بلال صاحب نے جب دیکھا کہ درشہوار دوسری چپل بھی اتار کر زریاب کو مارنے کا ارادہ رکھتی ہے تو انہوں نے دری کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ریحانہ بیگم تو اس افتادنا گہانی پر ہی حیران رہ گئی تھی۔

''اللہ یہ پاگل ہے آپ کی بیٹی اسے پاگل خانے میں داخل کروائیں۔'' ریحانہ بیگم تن فن کرتی اپنی چادر سنبھالتی زریاب کا ہاتھ تھامتی باہر کو لپکی تھیں۔

www.pakistanipoint.com

بلال صاحب بہن کو آوازیں دیتے رہ گئے تھے اور دری اس سب کے بعد آرام سے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر چاول کھانے لگی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، اور باہر زریاب اور ریحانہ بیگم کی کار فراٹے بھرتی اڑن چھو ہو چکی تھی۔ آصفہ بیگم نے نڈھال وجود کو صوفے پر ڈالا تھا۔ دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اچھا خاصا رشتہ بنتے ہوئے ٹوٹ گیا تھا۔

○○○○○

ساشا کا چہرہ اس وقت کھلا جا رہا تھا۔ روشنی بیگم اس وقت عروش کے لیے اپنی طرف سے کی گئی شاپنگ دکھانے آئی تھیں۔ جو ساشا کی توقعات سے بھی زیادہ اچھی تھی۔ انہیں اپنی بیٹی کے نصیب پر رشک آ رہا تھا عروش بھی اس وقت خوشی سے سرشار بیٹھی ہوئی تھی۔

''کیا پسند آئی میری ہونے والی بہو کو یہ ساری شاپنگ۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے یہ ساری شاپنگ اپنی بیٹی شزاء کی پسند کے مطابق ہی کی ہے۔ شزاء اور عروش دونوں گہری سہیلیاں رہی ہیں اور ان کو ایک دوسرے کی پسند ناپسند کا بھی خوب اندازہ رہا ہے، اور پھر میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ میں کہاں دھکے کھاتی پھروں گی۔ نہ مجھے آج کل کے بچوں کے مزاج و پسند کا اندازہ ہے۔ اس لیے میں نے ہفتہ بھر کے لیے شزاء کو بلوا بھیجا تھا۔ اب وہ یہاں آئی ہے اور حسن اس کو یہاں چھوڑ گئے ہیں۔'' روشنی بیگم اس وقت شزاء کے ساتھ ہی آئی تھیں۔

شزاء نے ساری شاپنگ میں عروش کے من پسند رنگوں کا انتخاب کیا تھا، اور اسے پورا یقین تھا کہ اس کی یہ محنت اکارت نہیں جائے گی۔ عروش اس کی اس طرح کی گئی شاپنگ کو سراہے گی اور اس وقت عروش واقعی اس کی کی گئی شاپنگ کو بے حد دلچسپی سے سراہتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''جی آنٹی مجھے یہ سب بہت اچھا لگا ہے۔ دوست ہو تو شزاء جیسی۔'' عروش نے والہانہ لگاوٹ سے کہا تھا۔ شزاء کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

''شکر ہے کہ میری بچی خوش ہے۔'' روشنی بیگم نے بھی مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

ان کو ایک طرح سے بے حد بے فکری سی ہو گئی تھی کہ ان کی اپنی بچی کی دوستی ہونے والی بہو سے اس قدر گہری تھی۔ پھر بیٹا بھی اس پر جاں نثار کرتا تھا، اور عروش اور شزاء بھی باہم شیر و شکر رہتی تھیں۔ انہیں امید کامل تھی کہ مستقبل میں سب کچھ اچھا اچھا ہی ہونے والا تھا۔ ان کا گھر تو شاید جنت کا گہوارہ بننے والا تھا۔ اسی خوش گمانی میں وہ شادی کی تیاریوں میں مگن تھیں۔

''اب میں چاہتی ہوں کہ زیورات کے معاملے میں سب کچھ عروش کی پسند کا ہی ہو، اور ارسل کو میں نے کہہ دیا ہے کہ کل آپ کے گھر سے عروش کو پک کر لے۔ ارسل اور عروش مل کر زیورات منتخب کر لیتے ہیں۔ پھر اس کے بعد دیکھتے ہیں کچھ کام رہ گیا تو اسے بھی پورا کر لیں گے۔'' روشنی بیگم نے اپنے تئیں معاملہ حل کر لیا تھا۔

''جی ..... جی، کل جب مرضی آ جائے ارسل بیٹا۔ یوں بھی یہ اس کا ہی گھر ہے۔ میں نے تو یہ سوچا ہے کہ اب آپ رات کا کھانا کھا کر ہی جایئے گا، اور کال پر ارسل کو بھی بلا لیں۔'' ساشا نے بے حد روایتی محبت میں کہا تھا۔ روشنی نے سوالیہ انداز میں اپنی بیٹی کو دیکھا تھا جہاں اثبات میں جواب مل گیا تھا۔

''جیسا آپ کی مرضی۔ اب آپ اتنی محبت سے کہہ رہی ہیں تو ٹھیک ہے۔ مگر ارسل کو تو رہنے دیں۔ اسے گھر جا کر کھلا پلا دیں گے۔'' روشنی بیگم نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ پھر شزاء اور عروش سر جوڑے ایک کونے میں چلی گئی تھیں۔

''سچ عروش تم خوش نصیب ہو کہ ایسی سسرال مل رہی ہے۔ مجھ سے پوچھو شزاء نے منہ بنایا تھا۔

''اچھا کیوں کیا تم خوش نہیں ہو؟'' عروش ایک دم ڈرائی فروٹ کھاتے کھاتے سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

''ہاں کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔ ساس بے حد روایتی سی ہیں۔ اوپر سے میٹھی بن جاتی ہیں۔ اندر سے کڑوی کسیلی ہیں، اور وہ دری اس کو تو لگتا ہے کوئی بیماری ہے۔ ہر وقت کمرے میں بند جب باہر نکلے تو بے حد وحشت ناک نگاہوں سے گھورتی رہتی ہے، اور وہ اس کا ہونے والا شوہر اسے بھی تھپڑ جڑ دیا اس نے۔'' شزاء نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ عروش کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''ارے۔ کیا؟ سچ میں؟'' عروش تحیر زدہ رہ گئی تھی۔

''ہاں تو اور کیا۔ وہ موصوف اسے ہاتھ پکڑ کر کنگن

پہنانے لگ گئے تھے۔ اس نے تو الٹے ہاتھ کا تھپڑ مار دیا اس کے منہ پر۔" شزاء کھی کھی کرنے لگ گئی تھی۔

"توبہ.....توبہ....." عروش نے کانوں کو ہاتھ لگا دیئے تھے۔

○○○○○

گھر میں بے حد بوجھل سی فضا کا راج تھا۔ رشتہ ٹوٹ گیا تھا نہ صرف رشتہ ٹوٹ گیا تھا بلکہ بہن اور بھائی کے دلوں میں دراڑ بھی آ گئی تھی۔ بلال صاحب بے حد افسردہ سے تھے، اور آصفہ بیگم کا رو رو کر برا حال تھا۔ سارے خاندان میں زریاب اور دری کی شادی کی بابت چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ ریحانہ نے گھر کی عزت کو گھر میں نہ رکھا تھا، اور اسے روند دیا تھا۔ اس نے ہر ایک کو یہی بتایا تھا کہ دری ایک بے حد گستاخ، زبان دراز اور پاگل لڑکی ہے۔ مزید گل فشانی یہ کی کہ دری نے ان کو ماچس کی تیلی سے جلانے کی کوشش کی ہے، اور اس کے بعد ریحانہ بیگم نے اس رشتے کو اپنے تئیں توڑ دیا تھا۔ منگنی کی انگوٹھی کے ساتھ اب تک جتنے بھی تحائف کا تبادلہ ہوتا رہا تھا وہ سب واپس بھجوا دیے تھے۔

بلال صاحب ان کے جانے کے بعد متواتر فون کالز کرتے رہے تھے۔ مگر ریحانہ نے ان کا فون تک ریسیو نہ کیا تھا۔ خاندان میں دری ایک بدلحاظ لڑکی کے طور پر مشہور ہو چکی تھی۔ کچھ دن پہلے یہاں اس کے حسن کے چرچے تھے اس وقت اس کے دماغی خلل کا ذکر ہو رہا تھا۔ اس کی تعلیمی قابلیت اس کا رکھ رکھاؤ اس کا خاندانی پس منظر اس کا حسن سب طاق پر رکھ دیا گیا تھا۔ سب نے ہی ان دیکھی بات پر یقین کر لیا تھا، اور کسی نے بھی اس کی تصدیق کرنا ضروری خیال نہ کیا تھا۔ ہاں پوچھنے والے صرف اتنا پوچھتے تھے کہ دری کو ہوا کیا ہے؟ کیا اسے دماغی ہسپتال میں داخل کروانے کی ضرورت ہے؟ آصفہ بیگم کا تو دل بیٹھا جا رہا تھا۔

حسن جب واپس لوٹا تو گھر میں چھائی افسردگی اس سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ پھر آصفہ بیگم نے روتے روتے حسن کو سارا قصہ کہہ سنایا تھا، اور حسن نے بھی اپنا سر تھام لیا تھا۔ زندگی میں مشکلات اتنی زیادہ ہو گئی تھیں کہ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ سب سے پہلے کونسی الجھن کو سلجھایا جائے۔

"بیگم، دری نے صبح سے کچھ نہیں کھایا جا کر دیکھیں۔ اس کی کیا حالت ہے اب رات کا کھانا تو کھا لے۔"

رات کے کھانے پر سب ہی اہل خانہ جمع تھے۔ شزاء اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ آصفہ بیگم نے حسرت بھری نگاہوں سے اپنے مجازی خدا کو دیکھا تھا۔

"ایسی اولاد جو صرف دکھ دینے کا سبب بن جائے۔ اس سے اس کا نہ ہونا ہی اچھا۔" آصفہ بیگم لوگوں کے سوالوں سے شاید تھک گئی تھیں۔ ہمت ہار گئی تھیں۔

"بیگم آج تو تم نے یہ بات کہہ دی۔ آئندہ میں تمہارے منہ سے یہ سب نہ سنوں۔ وہ بیمار ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی۔" بلال صاحب نے تاسف سے کہا تھا۔

"ٹھیک ہو بھی گئی تو اب کون کرے گا اس سے شادی؟" آصفہ بیگم کا لہجہ بے حد آزردہ تھا۔

"بیگم بھلے نہ ہو اس کی شادی۔ میں ابھی زندہ ہوں اور سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ جس طرح پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوا کرتی ہیں۔ کوئی تو ہوگا جو اس کی روح میں اتر کر دیکھے گا۔ اس کے اندر لگے زخموں کو کھرچنے کی بجائے ان پر مرہم رکھے گا۔ مجھے امید ہے تو صرف ایک رب پر۔" بلال صاحب نے بے حد تھکن زدہ لہجہ میں کہا تھا۔ مگر آس کی ایک ڈوری ابھی بھی رب سے منسلک تھی۔

"اللہ کرے جیسا آپ سوچ رہے ہیں ویسا ہی ہو جائے۔ کیونکہ اس میں بھی میری ممتا کی ہی جیت پوشیدہ ہے۔" آصفہ بیگم نے تھکن زدہ لہجہ میں کہا تھا۔

پھر اٹھ کر اپنی بیٹی کی تلاش میں اسی کے کمرے میں گئی تھیں۔ جہاں وہ بیڈ پر موجود ہی نہیں تھی۔ انہوں نے بالکونی بھی دیکھ ڈالی تھی واش روم بھی چیک کیا تھا مگر وہ کہیں نہیں تھی۔ وہ گھبرا سی گئی تھیں۔ پھر وہ اس کو آوازیں دیتی باہر کی جانب لپکی تھیں۔

"دری دری بیٹا کہاں ہو؟" آصفہ بیگ کا انداز پریشانی لیے تھا۔ ان کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔ اندیشے ان کے دل میں سر اٹھا رہے تھے۔

حسن کا کمرہ بھی بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ کوریڈور میں بھی وہ نہ تھی۔ پھر کس خیال کے تحت وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی منزل پر گئی تھیں۔ دری کو فارغ وقت میں پینٹنگ کرنے کا جنون تھا، اور وہ اس وقت عین ممکن تھا کہ وہاں ہوتی۔ آصفہ بیگم دل میں موہوم سی امید باندھے

www.pakistanipoint.com

سیدھا وہیں گئی تھیں۔ کمرہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جو اکثر لاک ہی ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے تیزی سے اندر جھانکا تھا، اور قدم کمرے میں دھر دیئے تھے۔ دری ایک جانب کھڑی پینٹنگ میں مصروف تھی۔ آصفہ بیگم کی آہٹ اور ان کے پکارنے پر بھی اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ پریشان سی اس کی جانب لپکی تھیں۔ تب انہیں قریب جانے پر احساس ہوا تھا کہ وہ تیز تیز ہانپتے ہوئے برش پھیرتی چلی جا رہی تھی۔ جبکہ وہ اچھی مصوری کرتی تھی۔ مگر اس وقت وہ بے حد جنونی انداز میں برش پھیرتی چلی جا رہی تھی۔

آصفہ بیگم نے آگے سرک کر دیکھا تو تصویر دیکھ کر ان کا دل دھک کر کے رہ گیا تھا۔ ایک لڑکی کی تصویر تھی۔ جس کا دھڑ تن سے جدا تھا۔ تصویر میں لڑکی نے اپنا ہی سر اپنے ہاتھوں پر اٹھا رکھا تھا، اور سر کے پاس گردن لہو میں ڈوبی ہوئی تھی، اور تصویر پہچاننے میں انہیں لمحہ بھر بھی نہیں لگا تھا۔ یہ دری کی اپنی تصویر تھی۔

''آہ.....'' بے اختیار آصفہ بیگم کے منہ سے نکلا تھا۔ ایک ماں کے لیے اس سے زیادہ تکلیف دہ امر اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی جوان اولاد خود اپنے ہی موت کا یقین اور پتہ دے جائے۔

یوں بھی ہر گزرتے دن کے ساتھ دری موت کے قریب ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس کا پل پل مرنا سسکنا سب کچھ عیاں تھا۔ آصفہ بیگم نے برش دری کے ہاتھوں سے لینا چاہا تھا۔ کیونکہ وہ اب بھی رک نہیں رہی تھی۔ لال رنگ گردن کے نیچے ٹپکاتی چلی جا رہی تھی۔

جب آصفہ بیگم نے اس سے برش کھینچنے کی سعی کی تھی تو دری نے ہذیانی انداز میں چلا کر آصفہ بیگم کو پوری قوت سے دھکا دیا تھا، اور آصفہ بیگم اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی تھی، اور لہرا کر گری تھیں۔ ان کا سر کسی نوکدار چیز سے جا لگا تھا، اور کراہ کر چیخ کر وہ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ جب آصفہ بیگم کو ہوش آیا تو وہ اپنے کمرے میں موجود تھیں۔ ان کے سرہانے اس وقت حسن اور بلال صاحب بیٹھے تھے۔ متفکر چہرہ لیا۔ آصفہ بیگم کو جیسے ہی ہوش آئی تھی۔ انہیں احساس ہوا تھا کہ ان کا سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔ انہوں نے بے اختیار اپنا دایاں ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھا تھا، اور چونک گئی تھیں ان کے ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی، اور شدید درد سے ان کو تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ ٹیس اٹھ رہی تھیں۔ وہ کراہ کر رہ گئی تھیں۔

''دری کہاں ہے؟'' انہوں نے گھبرا کر پہلا سوال ہی دری کے متعلق کیا تھا۔ بلال صاحب نے کن انکھیوں سے حسن کی طرف دیکھا تھا۔

''وہ ٹھیک ہے۔ اسے شاید کوئی دورہ پڑا تھا۔ اٹھا پٹخ کر رہی تھی۔ اپنے ہی سر کے بال نوچ رہی تھی۔ جو سامنے آ رہا تھا اسے جو ہاتھ میں آتا کھینچ کر مار رہی تھی۔ مجبوراً ڈاکٹر صاحب کو بلوانا پڑا انہوں نے اسے سکون بخش انجکشن لگایا ہے۔ وہ سو رہی ہے۔ کل سے پہلے وہ نہیں جاگے گی۔'' حسن نے آصفہ بیگم کو مختصر لفظوں میں سب بتایا تھا۔ آصفہ بیگم ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی تھیں۔

''بلال صاحب میری بچی کو بچالیں میری بچی..... آہ..... لگتا ہے اب وہ نہیں بچنے والی۔ وہ قطرہ قطرہ موت کی طرف جا رہی ہے۔ وہ..... اس کی وہ تصویر..... کیا آپ نے نہیں دیکھی تھی؟'' آصفہ بیگم کا انداز بے حد دکھی کر دینے والا تھا۔

''ہاں دیکھی ہے وہ تصویر پریشان نہ ہو۔ سب اچھا ہو جائے گا۔'' بلال صاحب نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''کچھ بھی اب ٹھیک نہیں ہوگا۔ وہ جنونی ہو رہی ہے۔ اس کا دماغی توازن جا رہا ہے۔ اس میں تو اب پہچاننے کی بھی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر جس انداز میں پلٹی تھی۔ اس کی وہ خون رنگ آنکھیں جو موت کی خواہش مند تھیں۔ اس نے کس طرح نفرت سے میرا وجود پرے دھکیلا تھا، اور میں حیرت میں گم اپنا وجود ہی نہیں سنبھال سکی۔'' آصفہ بیگم کا لہجہ ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔

''آصفہ ناامیدی کی باتیں مت کرو، اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ خوش خبری یہ ہے کہ پیر صاحب آج صبح واپس لوٹ آئے ہیں۔ فریدوں بیٹا کا فون آیا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ دری کو حاضری کے لیے کل شام ہی لے آئیں۔ اب تم فکر مت کرو۔ سب اچھا ہی ہوگا۔ مجھے یقین ہے۔'' بلال صاحب نے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ جس میں اعتماد و یقین اور حوصلہ سب کچھ تھا۔

○○○○○

ریحانہ بیگم بری طرح پریشانی کا شکار تھیں۔ انہوں

www.pakistanipoint.com

نے بدگمانی کو دل میں جگہ دے دی تھی، اور بلال صاحب کے مسلسل فون بھی جو آرہے تھے۔ موصول نہیں کر رہی تھی۔ اس کا موڈ پچھلے بہت دنوں سے خراب تھا۔ اس نے سب کو اطلاع پہنچا دی تھی کہ اب زریاب کا رشتہ دری سے ختم ہے۔ بلکہ یہی نہیں انہوں نے تو رشتے والی سے کہلوا بھیجا تھا کہ کوئی اچھی لڑکیوں کی تصاویر دکھلا دے۔ تاکہ رشتہ طے ہو سکے۔ تبھی رشتے والی ہر دوسرے دن کوئی نہ کوئی رشتے کی تصویر لا رہی تھی۔ اس وقت وہ ٹی وی پر کوئی شو دیکھ رہی تھیں جب ملازم انہیں بلال صاحب کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ وہ بری طرح سے چونک گئی تھیں۔ اب دوٹوک بات کرنے کا وقت آن پہنچا تھا۔

''یہیں لے آؤ انہیں۔'' ریحانہ بیگم نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا تھا۔ قدرے توقف سے بلال صاحب نادم سے آتے دکھائی دے رہے تھے۔ ریحانہ نے رسمی انداز میں کھڑا ہو کر ان کا استقبال کیا تھا۔

''جی بیٹھیں۔ کیسے آنا ہوا؟'' ریحانہ بیگم کا انداز جتاتا ہوا سا تھا۔

''میں بات کرنے آیا ہوں۔ لیکن لگتا ہے کہ تم بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔'' بلال صاحب نے گہرے دکھ سے کہا تھا۔

''بھائی صاحب آپ نے اور بابا نے اچھا نہیں کیا۔ اس لڑکی آصفہ کو اس گھر کی بہو بنا کر بابا نے ہماری خوشیاں بھی داؤ پر لگا دی ہیں۔ اس کے قدم جب سے اس گھرانے پر آئے ہیں بچوں پر بھی مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔ نافرمانی کی حد تو یہ ہے کہ ساشا کو منع کرنے کے باوجود بھی حسن بیٹے کی شادی میں مدعو کر دیا گیا۔ دیکھ لیا پھر انجام۔ نظر لگ گئی ہے اس کی۔ میں نے جتنا سوچا یہی سمجھ میں آیا ہے کہ یہ نظر بد کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ بہر حال جو بھی ہے میں اپنے بیٹے کے مستقبل کو داؤ پر نہیں لگا سکتی تو اس لیے میں نے یہ رشتہ رد کر دیا ہے۔ میرے بیٹے کو رشتوں کی کمی نہیں ہے۔''

آصفہ کے حوالے سے ریحانہ کے خیالات بے حد تکلیف دہ تھے۔ جو بھی تھا اب وہ بلال صاحب کی شریک سفر تھیں۔ ان کے بچوں کی ماں تھیں، اور ان کے دکھ سکھ میں برابر کی شریک تھیں۔ اتنے ماہ و سال ان کا ساتھ ان کی ہمراہی حاصل کر رہی تھی۔ یہی بہت تھا۔

''ریحانہ تم نے دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ بہت سی باتوں کو غلط رنگ دے دیا ہے۔ آصفہ نے کبھی میری نافرمانی نہیں کی ہے۔ اس وقت بھی میرے کہنے پر ہی اس نے ساشا کو مدعو کیا تھا۔ میں آصفہ کا اداس چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہونی تو ہو کر ہی رہتی ہے۔ ہم نے کہاں سوچا تھا کہ یہ سب ہوگا، اور یہ نظر بد نہیں ہے بلکہ کالا جادو کا اثر ہے، اور یہ جادو کسی اور نے نہیں بلکہ ساشا نے کروایا ہے، اور اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی ہے؟'' بلال صاحب نے واشگاف لفظوں میں کہا تھا۔

''بھائی صاحب یہی تو المیہ ہے کہ آپ ہر مرتبہ اپنی بیوی کی وکالت کرنے آجاتے ہیں۔ اس مرتبہ بھی غلط تربیت اور غلط پرورش کا الزام اپنے سر پر لینے کو بھی تیار ہیں۔ جادو کیسا..... مجھے تو لگتا ہے کہ دری کو آصفہ نے سکھایا پڑھایا ہے کہ اس رشتے سے صاف انکار کر دو اور مجھے لگتا ہے کہ ان کا دل ہے کہ سہراب سے ہی رشتہ ناطہ طے کر لیا جائے۔'' آصفہ بیگم کے حوالے سے وہ اپنے خدشات کو آرام سے زبان دے رہی تھی، اور وہ ان کی سوچ پر حیران ہو رہے تھے۔

''یہ کیسی باتیں کر رہی ہو۔ میری مرضی اور میری منشا کے بغیر کیسے یہ رشتہ ناطہ ہو سکتا ہے۔ وہ بالکل بھی اس کے ساتھ رشتہ کرنے کے حق میں نہیں ہے یہ سب تمہاری اپنی سوچ کا نتیجہ ہے۔'' بلال صاحب نے گہرے الفاظ میں اس کی بھرپور تردید کی تھی۔

''اچھا تو اب یہ بتائیں آپ کا آنا کیسا ہوا؟ کیونکہ میری تو ہر بات میں آپ کو کیڑے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ صرف بیوی کی واہ واہ ہی بھائی ہے دل کو۔'' اس وقت ریحانہ بیگ نے طنز کے تیر برسائے تھے۔

''میں یہی کہنے آیا تھا کہ دری کی حالت بے حد تشویشناک ہے۔ تم گلے شکوے بھلا دو۔ مگر تم کو تو یقین ہی نہیں ہے کہ دری پر جادو ہے۔ جبکہ اس کی تصدیق بھی ہو گئی ہے مگر جب تم نے ہر بات کو اپنے ہی طریقے سے لینا ہے۔ میری ہر بات کو تو اتر سے رد کر دینا ہے۔ تو پھر میں چلتا ہوں یہاں سے۔'' بلال صاحب نے گلوگیر لہجہ میں کہا تھا۔ ان کا دل واقعی بہت زیادہ دکھا تھا۔ ان کو اپنی ہی بہن سے اس قدر غیروں والے رویئے کی امید ہرگز نہیں تھی۔

www.paksociety.com

''ٹھیک ہے جو مرضی کہہ لیں۔ بہر حال میں نے بہت جلد ہی اپنے بیٹے کی شادی کرنا ہے۔ خاندان میں سو طرح کی باتیں بنیں مجھے گوارا نہیں ہے۔ اس لیے کسی اچھے باوقار خاندان میں اپنی بیٹے کی شادی کروں گی۔ وہ بھی دھوم دھام سے۔ کارڈ آپ تک پہنچ جائے گا۔ آنا ضرور آپ؟'' ریحانہ بیگم نے بھی صاف پہلو بچاتے ہوئے واشگاف لفظوں میں اس آخری بدگمانی میں بھی کیل لگا دی تھی۔ بلال صاحب یک ٹک اپنی بہن کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔ جس کی نگاہوں میں بے اعتنائی ہلکورے لے رہی تھی۔ نفرتوں کی دبیز چادر ان کے دل پر پڑ چکی تھی۔

''ٹھیک ہے بہن جیسا تم مناسب سمجھو یوں بھی رشتے زبردستی کی بنیادوں پر طے نہیں کیے جاتے ہیں۔ یہ دل سے دل تک کا مضبوط تعلق ہوا کرتا ہے۔'' بلال صاحب یہ کہہ کر رکے نہیں تھے۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے وہاں سے چلے گئے تھے۔

○○○○○

بلال صاحب اس وقت دری کے ساتھ آستانے پر حاضری کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ آصفہ بیگم کے ماتھے پر ابھی بھی پٹی تھی۔ وہ دعاؤں اور وظائف کے بعد دری کو رخصت کر رہی تھیں۔

''اچھا ہوتا کہ حسن کو بھی ساتھ لے لیتے۔'' بلال صاحب ہنس دیئے تھے۔

''وہ آج شزاء بٹی کو لینے گیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ پریشان ہو۔ ایک بیٹی گھنٹہ بھر میں آجائے گی، اور دوسری کو میں کچھ گھنٹوں بعد لے آؤں گا۔ تم فکر مت کرنا۔ بس اپنا خیال رکھو۔ کاموں کو ہاتھ نہ لگانا نوری سے کہنا وہ سب بنا دے گی۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ سر کا خاصا خون بہہ گیا تھا۔'' بلال صاحب نے اطمینان سے کہا تھا۔ آج بہت دنوں کے بعد ان کے دل پر چھائی کثافت جیسے ڈھل رہی تھی۔ امید سی بندھ رہی تھی، اور وہ دری کا ہاتھ تھامے اسے لائے تھے۔

''بیٹھو۔'' بلال صاحب نے عقبی نشست کا دروازہ کھولا تھا جبکہ دری نے فرنٹ ڈور کھول کر اس میں بیٹھنے کو ترجیح دی تھی۔

بلال صاحب اس کی اس حرکت پر زیر لب مسکرا دیئے تھے۔ بچپن سے ہی دری کو فرنٹ سیٹ پر ہی بیٹھنا پسند تھا۔ جب کبھی آصفہ بیگم آگے بیٹھ جاتی تھیں تو وہ عقبی نشست پر منہ بنائے بیٹھی رہتی تھی۔ منہ بسورے اپنے انداز سے خفگی کا بھرپور اظہار کیا کرتی تھی، اور آج بھی اس نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے کو ترجیح دی تھی۔ یہ دیکھ کر بلال صاحب کو خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

انہوں نے اللہ کا نام لیا تھا، اور ڈرائیونگ شروع کر دی تھی۔ ان کا انداز اطمینان لیے تھا۔ مگر اندرونی اضطراب ان کے چہرے سے عیاں تھا۔ وہ دعا گو تھے کہ اب سب کچھ اچھا ہو جائے۔ اس لیے وہ مناسب رفتار میں کار چلا رہے تھے۔ دل کو منزل پہ پہنچنے کی جلدی تو تھی۔ مگر وہ کوئی بھی غلطی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کار اپنے راستہ پر گامزن تھی۔ سارے راستے جانے پہچانے سے تھے۔ منزل بے حد قریب تھی۔ جب اچانک ہی دری نے ان کے ہاتھ پر کاٹا تھا، اور اسی پر بس نہیں کیا تھا اپنے تیز لمبے ناخنوں سے ان کے چہرے پر خراشیں کر دی تھیں۔ ان کا ہاتھ اسٹیئرنگ سے ہٹ گیا تھا۔ دری نے اسے دوسری طرف گھما کر کار کا رخ بدلا تھا۔ یعنی شیطانی قوتیں نہیں چاہتی تھیں کہ دری اپنی منزل پالے، اور وہ آستانے پر حاضری دے۔ یہ دیکھ کر بلال صاحب کے اندر جذبہ ایمانی بیدار ہو رہا تھا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ کے زخم اور چہرے پر لگی خراشوں کی پروا کیے بنا جلد ہی کار دوبارہ سنبھال لی تھی، اور وہ دری کی جانب سے بھی محتاط تھے۔ دری انہیں خونخوار نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر بے حد خوفناک سے تاثرات تھے۔ اچانک ہی نوکدار خنجر بلال صاحب کی پسلیوں میں گھونپ دیا گیا تھا۔ بلال صاحب کراہ کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے دری کی طرف دیکھا جو بائیں جانب بیٹھی مزید وار کرنے کے لیے تڑپ رہی تھی مچل رہی تھی۔

شاید اب اس نے بلال صاحب کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ یہ دیکھ کر بلال صاحب کے اوسان جاتے رہے تھے۔ بلال صاحب نے پوری قوت سے دری کی کلائی تھامی تھی۔ دری نے خنجر کی نوک بلال صاحب کے چہرے کے پاس کر دی تھی۔ وہ انہیں آنکھوں میں اتار دینا چاہتی تھی۔ بلال صاحب اور دری کے درمیان باقاعدہ طور پر جیسے کشمکش سی چل رہی تھی۔ اسی دوران کار اپنے ہی حساب سے چلتی چلی

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

جارہی تھی۔ اسے ڈرائیو کرنے اور بیٹھنے والا کوئی نہ تھا۔ حتیٰ کہ سامنے سے آتے ہوئے ٹرک کو بھی وہ دیکھ نہ سکے اور زور دار دھماکے سے فضا گونج اٹھی تھی۔ کار لہرا کر ایک جانب گرتی چلی گئی تھی۔ ڈھلوان کی جانب کار الٹی ہو چکی تھی۔ اس کا پہیہ ابھی بھی گھوم رہا تھا، اور ٹرک کے ٹکر سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے بلال صاحب خون میں لت پت ہو چکے تھے، اور دری بھی چوٹیں لگنے سے بے ہوشی کی طرف جارہی تھی۔ ورنہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں خنجر کی گرفت بے حد مضبوط تھی، اور دماغ میں مسلسل مار دو مار دو کی گونج تھی۔ وہ خنجر سے بلال صاحب کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔ مگر اس ٹکر لگنے سے اس کے اپنے حواس جاتے رہے تھے، اور حواس معطل ہوتے ہی وہ ہوش سے بیگانی ہو گئی تھی۔

○○○○○

آصفہ بیگم اس وقت ہاسپٹل کے کاریڈور میں مسلسل چل رہی تھیں، اور رو رہی تھیں۔ حسن بار بار ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ان کو بٹھاتا تھا۔ مگر دل مضطرب کو قرار کہاں تھا۔ وہ بے حد متفکر سی تھیں۔ انہیں اپنی سدھ بدھ بھی بھول چکی تھی۔ اس وقت ان کے سر کا سائیں زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار موت اور زندگی کے درمیان ایک اذیت ناک جنگ تن تنہا لڑ رہے تھے۔ دری کو بھی خاصی چوٹیں آئی تھیں مگر وہ خطرے سے باہر تھی۔ مگر بلال صاحب کی حالت بے حد تشویشناک تھی۔ ان کے سر پر چوٹیں آئی تھیں، اور ان کی حالت بے حد خراب تھی۔ خاصا خون بہہ چکا تھا، اور آپریشن بھی ہو رہا تھا۔ جس کے لیے خون کی اشد ضرورت تھی۔ اس لیے بہت سے لوگوں سے ان کے خون کے طلب کی اپیل کی گئی تھی۔ کیونکہ بلال صاحب کا خون کا گروپ بے حد نایاب تھا صد شکر کے اس کا انتظام ہو گیا تھا، اور اس کے بعد ہی ڈاکٹرز آپریشن تھیٹر میں اس وقت بلال صاحب کا آپریشن کر رہے تھے۔ دو گھنٹے ہو چکے تھے مگر ابھی تک سرخ بتی جل بجھ رہی تھی۔ آصفہ بیگم کو لگ رہا تھا کہ اگر کوئی بری خبر خدانخواستہ ان کو سنائی گئی تو وہ زندہ نہیں رہ پائیں گی۔ ان کے وجود کا رواں رواں دعا گو تھا۔ وہ اچانک ہی ایک جانب بے بسی کی انتہا محسوس کر کے رونے لگ گئی تھیں۔

''امی کیا ہو گیا ہے۔ ایسا نہ کریں۔ کچھ نہیں ہوگا بابا جان کو۔'' حسن کا اپنا دل بیٹھا جارہا تھا۔

شزاء ہی تھی جو مارے باندھے ایک جانب بیٹھی تھی۔ تبھی کاریڈور میں آہٹ محسوس ہوئی تھی۔ سامنے ہی ریحانہ بیگم زریاب اور گل افشاں موجود تھے۔ ریحانہ بیگ کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

''کہاں ہے میرا بھائی، اور کتنی منحوسیت پھیلاؤ گی۔ تمہاری وجہ سے میرا بھائی وہاں پڑا ہے۔ موت سے لڑ رہا ہے۔'' ریحانہ نے آتے ساتھ ہی واویلا شروع کرایا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ پھوپھو امی کی طبیعت پہلے ہی اچھی نہیں ہے۔'' حسن نے سخت لہجہ میں انہیں تنبیہہ کی تھی۔

''ارے کیوں نہ کہوں۔ یہ سب اس کی وجہ سے ہی تو ہوا ہے، اور تم..... تم تو بات ہی نہ کرو۔ یہ کیا لگتی ہے اس شخص کی۔ ارے خونی رشتہ تو میرا بنتا ہے، اور مجھے ہی اطلاع نہیں دی وہ تو بھلا ہو شزاء بیٹی کا جس نے بتا دیا۔'' ریحانہ بیگم نے متشکر انداز میں شزاء کو دیکھا تھا، اور تب حسن نے چونک کر ایک بے حد ناگوار نگاہ شزاء پر ڈالی تھی۔

''تم..... تم سے تو میں بعد میں پوچھوں گا، اور ہاں پھوپھو نام کے رشتے خواہ خون کے بھی ہوں۔ نام کے ہی رہتے ہیں۔ میری ماں کو ایک لفظ بھی مزید نہ کہیں ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔'' حسن نے صاف انداز میں کہا تھا۔ اس کا غصہ اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ شزاء اس وقت بالکل چپ کر گئی تھی۔

''پلیز حسن بیٹا۔ چپ کر جاؤ۔'' آصفہ بیگم نے ملتجی انداز میں کہا تھا۔

حسن چپ سادھ گیا تھا۔ اسے اپنی ماں کی پریشانی کا احساس تھا، اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ مزید تناؤ کا شکار ہو جائیں۔ تبھی ڈاکٹر آپریشن تھیٹر سے باہر نکلا تھا۔ حسن لپک کر آگے بڑھا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب کیسے ہیں ابو۔'' اس کی آواز اسے خود ہی کسی گہرے کنویں سے نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''جی خون خاصا بہہ گیا تھا۔ مگر اس کے بعد بھی شکر ہے کہ آپریشن کامیاب رہا ہے۔ ابھی وہ ہوش میں نہیں ہیں۔ مگر خطرے سے باہر ہیں۔'' ڈاکٹر کی بات اس وقت آصفہ بیگم کا تن مردہ میں جسے جان ڈال دی تھی۔ ان کے آنسوؤں میں شکر گزاری عیاں تھی۔ انہوں نے اپنے

waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھے تھے۔

''اللہ تیرا شکر ہے۔ ورنہ اس عورت نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی میرے بھائی کو مارنے میں۔'' ریحانہ بیگم اس وقت بھی نہ چوکی تھی۔ طنز کے تیر برسانے اس نے جاری رکھے تھے۔

حسن نے صرف ایک سخت نگاہ ڈالی تھی۔ اس مرتبہ جواباً بولا کچھ نہیں تھا۔

''دری کے پاس لے چلو اب دری کیسی ہے میں نے تو ایک مرتبہ اس کا نہیں پوچھا۔'' آصفہ بیگم جیسے ہوش میں آ گئی تھیں مامتا بیدار ہو گئی تھی۔

''جی امی وہ اس طرف ہے۔ آئیں۔'' آصفہ بیگ اس وقت حسن کی رہنمائی میں ایک طرف چل رہی تھیں۔ مگر کسی نے بھی دری کی خبر گیری کو ضروری خیال نہیں کیا تھا۔ گل افشاں کے دل میں دبی دبی سی خواہش ضرور تھی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ اس دن جب دری نے ریحانہ بیگم کو جھلسا دیا تھا اس کے بعد دری کا نام بھی سننے کی روادار نہ تھیں۔ کجا یہ کہ وہ اس کی عیادت کرتیں اس کی خبر گیری کرتیں۔

یوں بھی زریاب بھی اب دری کا سامنا کرنے سے کترانے لگ گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے منہ پھٹ منہ زور لڑکی اب سخت بری لگنے لگ گئی تھی۔

آصفہ بیگم حسن کی سنگت میں وہاں جس کمرے میں دری داخل تھی وہاں گئی تھیں۔ دری بھی اس وقت ادویات کے زیر اثر گہری نیند میں تھی۔ اس کے ماتھے پر پٹی بندھی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے بائیں بازو پر بھی چوٹ لگی تھی۔ مگر کوئی فریکچر نہیں ہوا تھا۔ البتہ گرنے اور چوٹ لگنے کی وجہ سے وہ درد محسوس کر رہی تھی، اور اسی درد کی شدت سے وہ چیخ رہی تھی۔ تبھی اسے سکون بخش ادویات کا انجکشن لگا کر سلا دیا گیا تھا۔ تاکہ جب وہ جاگے تو بالکل فریش اور صحت مند ہو۔

''یہ کب تک جاگے گی۔'' آصفہ بیگم نے حسن سے پوچھا تھا۔

''امی آدھے گھنٹے تک ہوش میں آجائے گی۔'' حسن نے جواب دیا تھا۔

''ضرور کرم کرے گا رب۔ سب اچھا ہو جائے گا۔ آصفہ بیگم نے پرامید انداز میں کہا۔

''بیٹا تمہیں کیا لگتا ہے یہ حادثہ کیسے ہوا ہوگا۔'' آصفہ بیگم نے پریشانی سے پوچھا تھا۔

''امی مجھے کیا معلوم؟ یہ تو دری یا پھر بابا ہی ہوش میں آ کر بتا سکتے ہیں۔ بہ ظاہر تو بابا سے ڈرائیونگ کے دوران ہی ان کی پسلی میں بھی چاقو سے زخمی کیا گیا ہے، اور اب یہ تو ظاہر ہے کہ کار میں بابا کے علاوہ دری تھی، اور سارا شک اس کی طرف جاتا ہے۔ مگر دل اس پر یقین کرنے پر بالکل بھی آمادہ نہیں ہوتا۔ میں نے بڑی مشکل سے ڈاکٹر کو اس معاملے میں خاموشی اختیار کرنے پر آمادہ کیا ہے، اور اس کے لیے وہ بہت مشکل سے راضی ہوا ہے۔'' حسن نے آہستہ آہستہ ماں کو ساری بات گوش گزار کر دی تھی، اور وہ بھی اس وقت یہ سب سن کر حیران رہ گئی تھیں۔

آصفہ بیگم تو اپنا سر ہی تھام کر رہ گئی تھیں۔ یہ سب ان کے لیے حیران کن تھا، اور دل پر ضرب سی پڑی تھی سن کر۔

''امی پریشان نہ ہوں۔ ایک بات تو صاف دکھائی دے رہی ہے کہ وہ دری نہیں چاہتی تھی کہ بابا اسے پیر صاحب کے پاس لے جائیں۔ اسی لیے اس نے یہ کام کر دکھایا اور عجیب بات یہ ہے کہ چاقو کہاں سے آیا؟ اور اس نے کوئی بھی لحاظ رکھے بغیر بابا پر وار کیسے کر دیا تھا۔'' حسن کی بات پر آصفہ بیگم نے پرسوچ انداز میں اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ یہی بات ہوگی۔ ورنہ تمہارے بابا تو بے حد احتیاط سے کار چلاتے ہیں کوئی بے احتیاطی نہیں کرتے، اور یہ حادثہ جس انداز میں سرزد ہوا ہے وہ بھی حیران کن بات ہے۔''

آصفہ بیگم نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

''یہ سب تو خیر ہے ہی۔ ایک بات اور بھی ہے کہ میں اب شزاء کی حرکتوں سے سخت عاجز آ چکا ہوں اسے جس بات سے منع کرتا ہوں وہ جان بوجھ کر وہی حرکت سے کرنے کی مرتکب ہو جاتی ہے۔ جہاں تک میری سمجھ ہے۔ اس نے کسی خیر خواہی سے نہیں بلکہ منصوبہ بندی سے ریحانہ پھوپھو کو بلوایا تھا۔ تاکہ رشتے میں دراڑ آجائے۔'' حسن نے سخت برا مناتے ہوئے کہا تھا۔

''بیٹا درگزر کی عادت اپناؤ، اور جو کیا اس نے اس کا عمل ہے۔ تم سمجھدار ہو اور ایسے وقت میں مزید پریشانیاں

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

سمیٹنے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔'' آصفہ بیگم نے بے حد تکلیف دہ انداز میں کہا تھا۔

''بلال صاحب کو ہوش آ گیا ہے وہ آپ کو یاد کر رہے ہیں۔'' اسی وقت نرس روم میں داخل ہوئی تھی، اور اس کا مخاطب آصفہ بیگم تھیں۔ آصفہ بیگم فوراً ہی حسن کے ساتھ باہر لپکی تھیں۔

ایک وقت میں ایک ہی انسان مل سکتا تھا۔ اس لیے آصفہ بیگم پہلے روم میں داخل ہوئی تھیں۔ بلال صاحب کو پٹیوں میں جکڑا ہوا دیکھ کر وہ آبدیدہ سی ہو گئی تھیں مگر اپنے آنسو کو وہ اپنے اندر ہی دھکیل رہی تھیں۔ مبادا بلال صاحب کی مزید طبیعت خراب نہ ہو جائے۔ انہوں نے بلال صاحب کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اسی گردش دوراں میں انہیں احساس ہو رہا تھا کہ بلال صاحب ان کے لیے کیسی ڈھال تھے۔

''آصفہ بیگم دری کو پیر صاحب کے پاس لے جانا لازمی ہے۔ دری.....''

اچانک انہیں دری کا خیال آیا تھا، اور اسی لیے ان کے چہرے پر فکر ہویدا تھی۔

''دری کہاں ہے وہ کیسی ہے؟'' بلال صاحب نے مدھم لہجہ میں پوچھا تھا۔

''آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں۔ دری بالکل ٹھیک ہے، اور اسے خاص چوٹیں بھی نہیں آئی ہیں۔ اسے دو ایک دن میں شاید ڈسچارج بھی کر دیا جائے گا، اور رہی بات پیر صاحب کے پاس لے جانے کی۔ اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔ آپ کسی بھی بات کی چنداں فکر نہ کریں۔ آپ بس خیر خیریت سے گھر آ جائیں۔ ہمیں صرف آپ کی صحت اور زندگی پیاری ہے۔'' آصفہ بیگم نے ان کی تشفی کی خاطر آرام سے ان کو ساری بات گوش گزار کی تھی، اور وہ سمجھ گئے تھے، اور پرسکون سے ہو گئے تھے۔

آصفہ بیگم کا بہت جی چاہ رہا تھا کہ پوچھیں کہ یہ حادثہ کیسے پیش آ گیا۔ مگر چاہ کر بھی ان میں پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے چپ چاپ ان کو تکے جا رہی تھیں۔ بلال صاحب نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں پا کر اپنے ہاتھ سے ان کے ہاتھ پر دباؤ ڈالا تھا۔ جیسے اپنے تئیں کہہ رہے ہوں کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

''ریحانہ آئی بیٹھی ہے۔ ملاقات کرنے کی خواہش مند ہے۔'' آصفہ نے نپے تلے انداز میں کہا تھا۔

''مگر میں کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتا ہوں۔ اسے کہو کہ یہاں سے چلی جائے۔ جس دن اس نے میری بیٹی کے حوالے سے باتیں کی تھیں اسی دن وہ میرے لیے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی تھی۔'' بلال صاحب کے چہرے پر ناگوار سے تاثرات چھا گئے تھے۔

بلال صاحب کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔ آصفہ بیگم نے پریشان سا ہو کر اپنے مجازی خدا کی طرف دیکھا تھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ جیسا آپ چاہتے ہیں بالکل ویسا ہی ہو گا۔ آپ بس پرسکون ہو جائیں۔'' آصفہ بیگم نے گھبرا کر کہا تھا۔ تبھی نرس نے ٹوک دیا تھا۔

''اب آپ باہر جائیں۔ انہیں آرام کرنے دیں۔''

نرس کا لہجہ بے حد تیکھا سا تھا، اور آصفہ بیگم اثبات میں سر ہلا کر باہر نکل گئی تھیں۔ ریحانہ بیگم سے ان کا ٹکراؤ کمرے کے باہر ہی ہو گیا تھا۔

''میں اب مل لوں اپنے بھائی سے۔'' ریحانہ بیگم نے دروازے کی ناب گھمانی چاہی تھی۔ مگر آصفہ بیگم نے ان کا ہاتھ روک دیا تھا۔ اس پر حیرت سے ریحانہ بیگم نے آصفہ کی طرف دیکھا تھا، اور چہرے پر دبا دبا سا غصہ بھی عود کر آیا تھا۔

''ابھی ڈاکٹر نے کسی بھی قسم کے دباؤ لینے سے منع کیا ہے، اور بلال کہہ رہے ہیں وہ آپ سے بالکل بھی ملنا نہیں چاہتے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ فی الحال آپ گھر چلی جائیں۔ میں بعد میں ان کو منا لوں گی، اور آپ کی ملاقات بھی کروا دوں گی۔''

آصفہ نے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہا تھا۔ جسے سن کر ریحانہ بیگم کو جیسے پتنگے لگ گئے تھے۔

''تم ہوتی کون ہو مجھے روکنے والی۔ میرا بھائی ہے وہ۔ میں ہوں اس کی سگی۔ تم منا لوگی میرے بھائی کو۔ تم روک کر دکھاؤ مجھے اپنے بھائی سے ملنے سے۔ میں بھی تو دیکھوں کہ کون روکتا ہے۔'' ریحانہ نے خوب شور و غل مچا رکھا تھا جب ڈاکٹرز اس طرف آ گئے تھے۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے۔ آپ پلیز یہاں سے جائیں۔ یوں بھی ایک وقت میں ایک شخص ہی مل سکتا ہے، اور ان کی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

واقف ہیں یہاں پر وہ بار بار انہیں کا نام لے رہے تھے۔"

ڈاکٹر معاملہ فہم تھی۔ اس وقت سارا معاملہ سمجھ کر ہی وہ میدان میں عملاً کود ی تھی، غصے سے وہ زریاب گل افشاں کے ساتھ واپس پلٹ گئی تھیں۔ آصفہ بیگم نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ کیونکہ جس طرح ریحانہ کے ذکر سے اس وقت بلال صاحب کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ریحانہ کی اس وقت بلال سے ملاقات ہو، اور اس کے بعد کوئی بھی کسی قسم کی پیچیدگی پیدا ہو۔

بلال صاحب تیزی سے روبہ صحت ہو گئے تھے۔ آصفہ بیگم کی انتھک محنت اور توجہ نے ان کو جلدی سے صحت یاب کر دیا تھا۔ دری کی حالت بھی قدر بہتر تھی۔ اس کو جسمانی طور پر کوئی بھی اتنی گہری چوٹ نہیں لگی تھی۔ مگر ذہنی طور پر وہ بے حد پریشان سی تھی اور اس کا بار بار چلانا سمجھ سے بالاتر تھا۔ ڈاکٹرز کے مطابق وہ پاگل پن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ آصفہ بیگم اپنی لاڈلی بیٹی کو اس حال میں دیکھ کر روتی رہتی تھیں۔ اسی دوران ڈاکٹرز نے بلال صاحب کو چھٹی دے دی تھی، اور اس کے بعد حسن ساتھ ہی دری کو بھی گھر لے آیا تھا۔ دری کو اتنے دن اسی لیے ہاسپٹل میں رکھا گیا تھا کہ گھر میں اس کی دیکھ بھال کرنے والا اس پر نگاہ رکھنے والا کوئی بھی نہ تھا۔

ابھی ڈاکٹرز نے بلال صاحب کو مکمل بیڈ ریسٹ ہی بتایا تھا۔ کیونکہ آپریشن کے بعد ان میں بہت نقاہت سی آ گئی تھی۔ ذرا سا چلنے کے بعد ان کو چکر سا آ جاتا تھا، اور کمزوری کی وجہ سے ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا جاتا تھا۔ وقت گزر رہا تھا۔

○○○○○

عروش شادی کے بعد ارسل کی زندگی میں آ گئی تھی۔ بلال صاحب کی ناساز طبیعت کی وجہ سے آصفہ بیگم نے معذرت کر لی تھی۔ حسن اور شزاء نے ہی ساری تقریبات اٹینڈ کی تھیں۔ آصفہ بیگم نے فون کال پر روشنی بیگم سے معذرت کر لی تھی۔ یوں بھی آصفہ عروش تو کیا اس کے حوالے سے ذکر سننا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔ یہ سب عروش کی ماں کا ہی کیا دھرا تھا۔ وہ چاہتی بھی تو روشنی بیگم کو اس رشتے سے منع نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کا کئی مرتبہ جی چاہا تھا کہ وہ روشنی بیگم سے کہیں کہ وہ ایک مصیبت کو اپنے گھر لا رہی ہیں۔ کیونکہ عروش کے پیچھے اس کی ماں کا سایہ ہے، اور اس کی ماں کا جادو ٹونے میں کس قدر عمل دخل تھا۔ یہ بات تو اب روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی۔

آصفہ بیگم نے سب معاملات سپرد خدا کر دیئے تھے۔ جب انسان اپنے معاملات کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے تو پھر نتائج بھی مثبت ہی دکھائی دیتے ہیں۔ شزاء شادی کی تقریبات کے بعد گھر لوٹ آئی تھی۔ مگر جب عروش اور ارسل ہنی مون کے لیے گئے تو روشنی بیگم کی تنہائی کے خیال سے شزاء نے کچھ دن مزید وہاں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ حسن نے کسی بھی قسم کی روک ٹوک نہ کی تھی، اور خود آصفہ بیگم نے تو جیسے ہر قسم کے حالات میں محض خاموشی کو ہی اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنا لیا تھا۔ اسی طرح دن بے رنگ سے گزر رہے تھے۔ جب ایک دن دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

رات کے کھانے کا وقت تھا۔ بلال صاحب کی طبیعت اب سنبھل چکی تھی۔ دری بھی بہتر تھی۔ بس خالی الذہنی کی کیفیت سے دوچار رہا کرتی تھی۔ کھانے کو دے دیا تو کھا لیا۔ ورنہ فاقے کی نوبت آ جاتی تھی۔ آصفہ بیگ کو اس کی نگاہوں میں پنپتی ہوئی وحشت سے خوف آنے لگتا تھا۔

مگر وہ اس کی ماں تھیں اس کو کسی بھی حال میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھیں اس لیے ساری رات اس کے کمرے کے چکر کاٹتی رہتی تھیں، اور بلال صاحب کے لیے بھی ہر وقت چوکس رہتی تھیں کہ بلال صاحب کو کسی شے کی ضرورت تو نہیں ہے۔ رات کے وقت اس وقت اچانک دروازے کی بیل بجنا سب کو ہی چونکا گیا تھا۔ مگر سب سے زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ دری اچانک ہراساں ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی، اور اس نے اچانک اپنے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ وہ کسی شے سے خوفزدہ دکھائی دے رہی تھی۔

"ابو آپ بیٹھیں میں دیکھتا ہوں کہ دروازے پر کون ہے۔" حسن نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ قدرے توقف سے حسن کے ساتھ پیر صاحب کو آتا دیکھ کر بلال صاحب کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ دل خوشی سے بھر گیا تھا۔ وہ عقیدت سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"بیٹھے رہو بلال کھانے کے وقت اٹھنا رزق کی بے حرمتی میں شمار ہوتا ہے۔ کھانا کھاؤ اطمینان سے، میں ادھر

ہی ہوں۔'' پیر صاحب ایک جانب کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ ان کا پرنور چہرہ اس ماحول میں ایک امید افزا وجہ تھی۔

بلال صاحب نے جیسے تیسے لقمے کھائے اور سب ہی کھانے سے فراغت حاصل کر کے پیر صاحب کے اردگرد بیٹھ گئے تھے۔ اتنی دیر تک پیر صاحب کسی ورد میں مشغول رہے تھے، اور زیر لب مسکرا بھی رہے تھے۔ ان کا متبسم چہرہ پرنور تھا۔ نور کے ہالے میں لپٹا ہوا تھا۔

''گھبرا گئے ہو اس لیے دری کو کمرے میں بند کر رکھا ہے۔ خیر اسے وہیں رہنے دو۔ ابھی ملاقات کا وقت نہیں آیا۔ جب وقت ہوگا تو اسے بھی دیکھ لیں گے۔'' پیر صاحب کی بات کا مفہوم سب ہی بخوبی سمجھ گئے تھے، اور یہ تو سامنے کی بات تھی کہ دروازے پر کون ہے یہ وہ سب بعد میں جان پائے تھے۔ مگر دری کو پہلے ہی آگا ہی ہوگئی تھی اور وہ کمرے میں مقید ہوگئی تھی۔

''مگر وہ اپنے آپ کو کوئی گزند نہ پہنچالے۔'' آصفہ بیگم کا دل ایک ماں کا دل تھا۔ محبت کی مامتا سے لبریز دل پیر صاحب مسکرا دیے تھے۔

''نہیں ایسا کچھ نہیں ہوگا بے فکر رہیں بہن۔'' پیر صاحب کی تسلی سے آصفہ بیگم کے دل میں بھی اطمینان سا چھا گیا تھا۔

''میں پہلے ہی آجاتا مگر میں وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پہلے بلال بھائی روبہ صحت ہو جائیں۔ پھر اس معاملے کو بھی نبٹا لیتے ہیں۔ حسن بیٹا کدال ہے کیا؟'' اچانک ہی پیر صاحب حسن سے مخاطب ہوئے تھے۔ حسن نے چونک کر دیکھا تھا۔

''سرونٹ کوارٹر سے مل جائیگی۔ وہی مالی بابا کام کرتا رہتا ہے۔'' بلال صاحب نے جواب دیا تھا۔

''ٹھیک ہے بچے تو پھر چلو پیر صاحب اس مرتبہ پھر حسن سے ہی مخاطب تھے۔

حسن نے بھاگ کر کوارٹر سے کدال اٹھالی تھی، اور پیر صاحب باہر لان میں ہی اس کے منتظر تھے۔ پھر کچھ سوچ کر ہی دائیں جانب ایک جگہ رک گئے تھے۔

''یہاں کھدائی کرو۔'' حسن نے تحیر سے دیکھا تھا۔ مگر کہا کچھ نہیں اور خاموشی سے کدال سے نرم مٹی کو ہٹانے لگ گیا تھا۔ تھوڑی سی کھدائی کے بعد کدال کسی چیز سے ٹکرائی تھی۔

''رک جاؤ۔ پیر صاحب نے ٹوک دیا تھا۔ حسن بھی رک گیا تھا۔ ان کے آس پاس ہی بلال صاحب اور آصفہ بیگم بھی اس سارے عمل کو بے حد حیرت اور تجسس کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ پیر صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے اس شے کو اٹھانے کو کہا تھا۔ حسن نے مٹی کو ہٹا کر لکڑی کو اٹھالیا تھا۔ لکڑی کے اطراف میں بالوں کا گچھا سا تھا۔ سب اس عمل کو دیکھ رہے تھے۔

پیر صاحب نے وہ لکڑی حسن کے ہاتھ سے لے لی تھی، اور آیت کریمہ کا ورد شروع کرایا تھا، اور ہر مرتبہ پھونک مار کر اس بالوں کی گرہ کو کھولنے جاتے تھے۔ سات گرہیں تھیں جنہیں پیر صاب نے ایک ایک کر کے کھول دیا تھا۔ پھر اس وقت ماچس سے اس لکڑی اور ان بالوں کو انہوں نے خاکستر کر دیا تھا، اور تب تک وہیں کھڑے رہے تھے جب تک وہ سب جل کر راکھ نہیں ہوگیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے لمبی سانس لی تھی۔ پیر صاحب کے اس عمل سے آصفہ بیگم اور خود بلال صاحب بہت حد تک سارا ماجرا سمجھ گئے تھے۔

''دری بیٹا کو معمول میں آنے میں کچھ وقت درکار ہوگا۔ بہرحال وہ اچھی ہو جائے گی۔ مگر.....'' پیر صاحب کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئے تھے۔ ان کا یہ مگر سب کے لیے سوالیہ نشان بن گیا تھا۔

''مگر کیا پیر صاحب؟'' بلال صاحب نے احتراماً ہمت کر کے کہا تھا۔

''یہ سب وقتی طور پر اچھا ہوگا۔ اس پر بداثرات ہیں۔ وہ دو مرتبہ اس جادو کا شکار ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اس پر کچھ چیزیں حاوی ہیں۔ جو اہل خانہ کی نگاہوں سے روپوش ہیں۔'' پیر صاحب نے بے حد قطعیت بھرے انداز میں کہا تھا۔ ان کا یہ انکشاف کہ درشہوار پر کالے جادو کے ہی بداثات نہیں ہیں بلکہ کچھ اور بھی چیزیں حاوی ہیں۔ سب کو ہراساں کر گئی تھی۔

''تو پیر صاحب اس کا کوئی حل نکالیں نا۔ ہم بہت پریشان ہیں۔ بچی کی شادی ٹوٹ گئی ہے۔ یہی نہیں خاندان بھر میں اس کو لے کر منہ بھر بھر کر باتیں بنائی جارہی ہیں۔ ہماری ایک ہی بچی ہے اس کے لیے ہم بہت پریشان

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ہیں۔ یہی دعا ہے کہ وہ بھلی چنگی ہو جائے اپنے گھر بار کی ہو جائے۔ ہنستی بستی آباد رہے۔'' آصفہ بیگ ماں تھیں۔ ان کا کلیجہ ان باتوں سے بے حد دکھتا تھا۔ آج اتنے عرصے کے بعد امید کی ایک کرن دکھائی دی تھی تو وہ اس کے لیے اپنے دلی جذبات پر قابو نہ رکھ سکی تھی۔

پیر صاحب خاموش تھے۔ لگتا تھا جیسے انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں ہے اور کوئی جواب بھی نہیں دیا۔ کچھ دیر اطراف میں خلا میں دیکھتے رہے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے ان کو کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ رات کے اس سناٹے میں بھی تاریکی کی دبیز چادر میں بھی ان کو کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اللہ والے تھے، اور نہایت ہی پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ ان کی شخصیت میں سادگی کا وصف نمایاں تھا۔ صاف ستھرا بے شکن سفید لباس ان کے چہرے کے پرنور حالے کو مزید منور کر رہا تھا۔ اگر ان کو دیکھنے کی سعادت حاصل ہو جاتی تو کوئی ان کے چہرے کی روشنی کو نظر بھر سے زیادہ نظر ٹکا کر دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ان کی شخصیت میں بے پروائی تھی۔ تکبر اور خود ستائی نہ تھی۔ اس وقت بھی وہ گہری سوچ میں گم تھے۔ اس وقت ان کی خاموشی کو سب نے ہی محسوس کیا تھا، اور احتراماً سب ہی خاموش ہو گئے تھے۔ پھر اس گھمبیر خاموشی کو قدرے توقف سے خود پیر صاحب نے ہی توڑ ڈالا تھا۔

''بالکل کھوج لگانی ہوگی۔'' پیر صاحب نے ہنکارا بھرا تھا۔ فیصلہ کن انداز تھا۔ پختہ عزم لیے۔

''کھوج؟'' بلال صاحب الجھن زدہ انداز میں بولے تھے۔

''بالکل کھوج تو لگانی ہی ہوگی۔ اس نے اہل ایمان پر وار کیے ہیں پے در پے وار کیے ہیں۔ جس طرح کسی بھی شخص کے مرض کا جب تک علم نہ ہو جائے دوا تجویز نہیں کی جاتی جب تک تشخیص نہ ہو جائے، اور اس شخص کی دوا سے پہلے اس کی مرض کی تشخیص ضروری ہے۔''

پیر صاحب کی باتوں کا کسی اور کو تو سمجھ آئی ہو یا نہیں مگر بلال صاحب کو کچھ کچھ سمجھ ضرور آ گئی تھی۔

''آپ اس جگن کی بات کر رہے ہیں نا اس کے مرض کی تشخیص کرنی ہے۔'' بلال صاحب کے انداز میں دبا دبا سا جوش پوشیدہ تھا۔

''ہاں بالکل۔ مگر اس کے لیے عمل کرنا ہوگا اور اس کے لیے وقت درکار ہے، بہت ہمت اور حوصلے سے آنے والے مصائب کا سامنا کرنا ہوگا۔ صرف ایک بات کا خیال رہے کہ درشہوار بیٹی گھر سے جانے نہ پائے۔ کیسے بھی کر کے اس کو پورے تین دن کے لیے گھر سے نہیں نکلنے دینا۔'' پیر صاحب نے حکیمیہ انداز میں کہا تو سب نے ہی اثبات میں گردن ہلا دی تھی۔

''وہ کمرے میں مقید رہتی ہے۔ نہ کھانے کا ہوش رہتا ہے اور نہ پینے کا۔'' بلال صاحب کے انداز میں مایوسی ہویدا تھی۔

''اب وہ کھائے گی بھی اور پیئے گی بھی۔ مگر..... مگر اس کو مکمل تندرست جان کر اس کی کسی بھی بات پر عمل نہ کرنا۔ اسے گھر سے باہر نکلنے نہیں دینا۔'' پیر صاحب پر سوچ انداز میں بولے تھے۔

''لیکن جب اس کی حالت ویسی ہو تو کہاں کسی کے قابو میں آتی ہے۔ وہ تو بے اختیار ہو جاتی ہے، اور ہم سب مل کر بھی اسے قابو میں نہیں کر پاتے ہیں۔'' حسن نے ہارے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

پیر صاحب نے لمحہ بھر کے لیے کچھ سوچا تھا، اور پھر اپنی جیب سے ایک محلول نکالا تھا۔ وہ ایک انگلی بھر جتنی شیشی تھی۔ جس میں کوئی محلول سا تھا۔ وہ انہوں نے بلال صاحب کے داہنے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔

''جب حد سے نکل رہی ہو تو محض اس کے چند قطرے ہی اس کے وجود پر پڑنے کافی ہیں۔ طبیعت سنبھل جائے گی ان شاء اللہ جنون جاتا رہے گا۔ مگر یاد رہے صرف چند قطرے۔'' پیر صاحب کی اس شیشی کو بلال صاحب نے بے حد عقیدت اور احتیاط کے ساتھ تھامی اور اپنی جیب میں ڈال لی تھی۔

''اب چلتے ہیں۔ بہت کام کرنے ہیں اس بدروح سے نجات کے لیے بہت کام کرنا باقی ہے۔'' پیر صاحب واپسی کے لیے پلٹ گئے تھے۔

''اگر ایک نظر دری کو دیکھ لیتے۔ اس پر اپنے وجود کی نورانی کرنیں ڈال دیتے تو۔'' حسن نے تقاضا کیا تھا۔

تبھی پیر صاحب نے سیدھا ہاتھ کھڑا کر دیا تھا۔

''ہر بات کا ایک وقت معین ہوا کرتا ہے۔ مگر اس بات

www.paksociety.com

کے لیے ابھی مناسب وقت نہیں ہوا ہے۔ بنا تیاری کے جنگ کے میدان میں کودنے والے احمق ہوا کرتے ہیں۔ برسوں کی ریاضت مشقت اور جذبہ ایمانی کی تازگی ہی جیت کا سبب بنتی ہے۔ سو جیت ہوگی۔ مگر کسی اور کے ہاتھوں۔ اس کام کے لیے مجھے نہیں کسی اور کو چن لیا گیا ہے۔'' پیر صاحب مسکرائے تھے۔

''کس کو پیر صاحب؟ آپ کے ہوتے کون اتنا ذی وقار اور مقام المرتبت شخص ہے کہ اسے اس کارِ خیر کے لیے چن لیا گیا ہے۔ ہم متعجب ہیں۔ حیران ہیں۔'' بلال صاحب نے حیرت سے پوچھا تھا۔ ان کی حیرت بجا تھی، اور یہی حیرت صرف بلال صاحب کے چہرے پر ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ ساتھ آصفہ بیگم کے چہرے پر بھی رقم تھی۔

''ہمارے برخوردار فریدوں بخت کی گدی نشینی کی مشق شروع ہو رہی ہے۔ الحمدللہ یہ حکم خداوندی ہے۔ اس میں کسی بھی محبت اور نفس کی خواہش کا عمل دخل نہیں ہے۔ یہی حکم الٰہی ہے۔ ورنہ ہم تو ہر سائل کی سنوائی کے لیے حاضر ہیں۔ دیکھو آج بھی آ گئے۔ مگر یہیں آ کر ہمیں محسوس ہوا کہ اس کے لیے فریدوں بخت کو چنا گیا ہے۔ وہی اس معاملے کو دیکھے گا۔'' پیر صاحب نے بے حد اطمینان سے جواب دیا تھا۔ ان کا اطمینان قابل دید تھا۔

بلال صاحب اور خود آصفہ بیگم کے چہرے پر تفکر کے گہرے سائے دیکھے جا سکتے تھے۔ شاید وہ اپنی اولاد کو کسی مشق کا تختہ دار نہیں بنانا چاہتے تھے۔ مگر پیر صاحب کے الفاظ کے اس کے لیے حکم الٰہی ہے۔ ان سب کے لبوں پر مہر لگا گئی تھی۔ اس کے بعد کسی حیل و حجت اور بحث و تمحیص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''کل سے فریدوں بخت اس کے لیے عمل کرے گا اور ٹھیک تین دن بعد یعنی جمعہ کو یہاں آئے گا۔ تب تک میری باتوں پر عمل کرتے رہنا ضروری ہے۔ جانتے ہیں اس میں بھی رب الٰہی کی رضا یہی ہے کہ اگر فریدوں کی آنکھیں کسی مخصوص سمت میں مرکوز بند رہیں تو ہماری آنکھیں کھلی رہیں۔ خاص و عام کی ضروریات کے لیے ہم کو تین دن تک اپنی آنکھ بند کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ دکھیاروں کی فریاد اور سنوائی کے لیے یہی حکم ہے، اور حکم سے سرتابی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ اب اجازت دیں۔'' پیر صاحب بنا کسی خاطر مدارت کے کسی بھی شے کی طلب کے واپس لوٹ گئے تھے۔

ان کی موجودگی میں رات کے اس پر ہول سناٹے میں کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ مگر ان کے جاتے ہی یہاں بے حد خاموشی سی چھا گئی تھی۔ پراسراری خاموشی۔ جس میں ایک چنگھاڑ تھی۔ سب اندر کی طرف گئے تھے۔

○○○○○

عروش کی واپسی پر بھی اس کی وہی چونچلے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ ارسل بس اس کا ہی دیوانہ بنا پھرتا رہے۔ اس کے پاس ہی ٹکا بیٹھا رہے۔ ارسل کو عروش نے پچھلے تین ماہ سے آفس کا رخ ہی نہیں کرنے دیا تھا۔ جب بھی ارسل جانا چاہتا تھا وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتی تھی۔ ارسل نے اس سے محبت سے شادی کی تھی، اور اب بھی یہ محبت سر چڑھ کر ناچ رہی تھی۔ روشنی بیگم نے ایک دو مرتبہ ارسل کو نرم لفظوں میں احساس دلانا چاہا تھا کہ اب اسے گھر گرہستی کی بجائے اپنے کام پر توجہ دینی چاہیے۔ کبھی کبھار تو ان کا خوب جی جلتا تھا جب عروش کے لیے بیڈ ٹی کا حکم بھی ارسل کے ذریعے ملازم کو دیا جاتا تھا۔ کبھی عروش کو کھانا ہوتا تو بھی ملازم کو ارسل ہی کہتا تھا۔

''کیا بات ہے ارسل بیٹا یہ کیا بات ہوئی وقت بے وقت کھانا۔ جب گھر میں کھانے کے اوقات مقرر ہیں تو وہ ان اوقات میں کیوں کھانا نہیں کھاتی ہے۔'' روشنی بیگم کو اپنی بہو بیگم کے یہ انداز بالکل بھی پسند نہ تھے۔

''امی اس کا اپنا گھر ہے جب بھوک ہوگی تب ہی کھائے گی ناں اور آپ کو کیا فکر ہے۔ کھانا تو ملازم نے ہی گرم کرنا ہوتا ہے، اور ہم اسے تنخواہ کس بات کی دیتے ہیں؟'' اپنے ہی بیٹے کے منہ سے یہ کلمات سن کر روشنی بیگم کا دل ہی دکھتا تھا، اور اس پر ہی بس نہیں تھی۔

ایک مرتبہ جب آفس سے حساب کتاب میں کوئی گھپلا سامنے آیا تو روشنی بیگم سے رہا نہیں گیا وہ سیدھا اپنے بیٹے کے پاس گئی تھیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ اس مرتبہ صاف لفظوں میں بہو کو بھی جتا دیا جائے کہ اس کی خودسری کی وجہ سے کاروبار میں بھی نقصان کا اندیشہ لاحق ہے۔ اس سوچ کو لے کر وہ جب اس کے کمرے میں گئی تھیں تو سب سے پہلے جملے نے ہی ان کے قدم منجمد کر دیئے تھے۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

''امی ایسی بھی کیا ایمرجنسی تھی۔ مجھے بلوا لیتیں آپ۔ یوں کمرے میں آ کر بات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔'' یہ ارسل تھا۔ بے اعتنائی لیے۔ سرد سا لہجہ۔

''بیٹا میں ماں ہوں، اور کیا تمہارے کمرے میں آنے سے پہلے مجھے اجازت لینا ہوگی۔ برسوں سے تو آتی رہی ہوں اسی کمرے میں۔'' روشنی بیگم کے لہجہ میں دکھ بول رہے تھے۔ واضح لرزش ان کے انداز میں تھی۔ اعتماد کے ٹوٹنے کی لرزش۔

''امی پہلے میں اکیلا تھا۔ جب بھی آتیں مجھے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اب اس کمرے میں میرے ساتھ عروش بھی ہے۔ آپ کیوں بھول جاتی ہیں؟'' ارسل کا لہجہ جتاتا ہوا سا تھا۔

''اوہ تو یوں کہو ناں کہ مسئلہ تمہاری بیوی کو ہے۔ میں اس کی موجودگی میں ہی بات کرنی تھی۔ اس لیے آئی ہوں۔ مجھے بھی اس کمرے میں آ کر مداخلت کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ یہ تو احمق لڑکی ہے۔ دوسرے گھر سے آئی ہے۔ اسے اس گھر کے معاملات کا کیا معلوم؟ مگر تم۔ تم تو میرے اپنے بیٹے ہو، اور تم جانتے ہو کہ یہاں کا سارا کاروبار اس کی دیکھ ریکھ تم پر ہے، اور تم پچھلے تین ماہ سے اس کاروبار کو نظر انداز کیے جا رہے ہو۔ اچھا خاصا خسارہ ہو گیا ہے۔ اس کا ازالہ کون کرے گا۔ اس کے گھر والے؟'' روشنی بیگم نے تین ماہ بہت صبر کر لیا تھا۔ اب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا، اور اس وقت غصہ اور اشتعال ان کے چہرے پر دیدنی تھا۔

''امی یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔'' ارسل سٹپٹا گیا تھا کیونکہ ارسل نے عروش کے چہرے پر واضح طور پر اشتعال دیکھا تھا۔

''ارسل مجھے لگتا ہے کہ آپ کی امی کو بات کرنے کا ڈھنگ معلوم ہی نہیں ہے۔ مجھے احمق کہہ رہی ہیں۔ جبکہ میں نے کبھی ان سے اونچے لہجہ میں بات تک نہیں کی ہے، اور آج یہ یہاں میرے ہی کمرے میں آ کر مجھے ذلیل کر رہی ہیں۔ یہی نہیں اس میں میرے گھر والوں کو بھی گھسیٹ رہی ہیں۔ ان کو مسئلہ کاروبار سے نہیں ہے۔ آپ کے ہر وقت میرے پہلو سے لگے رہنے سے ہے۔ تو جائیں۔ میں نے اجازت دے دی۔ جائیں اماں کے ساتھ لگے رہیں۔ ایک تو مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ ساری عمر ایسی ہی اولاد کے چاؤ چونچلے کر کے ان ماؤں کا جی نہیں بھرتا جب کوئی بہو آ جاتی ہے تو اس سے دور کرنے کے لیے اپنے بیٹے پر ہر پینترا آزمایا جاتا ہے۔ اگر اتنا ہی گود میں رکھنے کا شوق تھا تو شادی ہی کیوں کی تھی؟'' عروش نے بھی ہر لحاظ بالائے طاق رکھ لیا تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ارسل اس کے گن گاتا نہ تھکتا تھا۔ اس کے سحر میں گرفتار تھا، اور وہ مزید طریقے آزما کر اتنے عرصے میں اسے اپنے قریب کر چکی تھی۔ اس وقت بھی اس کا یہ سب کہنا ارسل کو کسی طور برا نہ لگا تھا۔ بلکہ اس کا آرام سے کھڑے ہونا اس بات کا عین ثبوت تھا کہ وہ اپنی بیوی کی ہر بات سے پوری طرح سے متفق ہے، اور اس سے انکاری نہیں ہے۔

''واہ یہ دن بھی دیکھنا تھا ارسل۔ میرے مخاطب صرف تم ہو۔ تم ہی بات کرو تو بہتر ہے۔'' روشنی بیگم نے واشگاف لفظوں میں کہا تھا۔ اس پر عروش نے برا سا منہ بنایا تھا، اور ارسل بھی کھسیا سا گیا تھا۔

''ٹھیک ہے سارا مسئلہ میرا آفس نہ جانے کی وجہ سے ہو رہا ہے ناں۔ میں کل سے لازمی آفس جاؤں گا۔'' ارسل نے محض ٹالنے والے انداز میں کہا تھا۔

''دیکھو مجھے کل کی نہیں آج کی ہی خبر چاہیے۔ ابھی جاؤ تیار ہو اور آفس جاؤ، اور اب یہ روزانہ کا معمول بنا لو۔ تمہاری بیوی کو بھلا کیا پروا ہوگی۔ یہ رزق حلال ہے۔ محن یوں مفت نہیں ملا کہ اس کی دیکھ بھال ہی نہ کی جائے۔'' روشنی بیگم جاتے جاتے بھی جتانا نہیں بھولی تھی اور پھر ارسل کو آفس جاتے ہی بنا تھا۔

زندگی میں جیسے سب کچھ بدل سا گیا تھا۔ ارسل کا ہر بات میں اپنی بیوی کو زیادہ فیور کرنا روشنی بیگم کو بری طرح سے کھلتا تھا۔ مگر وہ کچھ کر ہی نہیں پا رہی تھیں۔

پھر انہوں نے ایک دن شزاء کو کہلوا بھیجا تھا۔ شزاء آ گئی تھی، اور اب ماں کے عتاب کا شکار ہو رہی تھی۔

''یہ تھی تمہاری دوست جس کی محبت میں تم مری جا رہی تھی اور اس پر فدا ہو رہی تھی اس نے کیا کیا؟ ہمارے گھر کے ماحول کو خراب کر دیا ہے۔ اسے صرف ارسل کی ہی ذات سے دلچسپی ہے۔ ہم کیا کر رہے ہیں اسے اس بات کی کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ ہماری نہ ہی پروا ہے۔ نہ بھی دو

www.pakistanipoint.com

گھڑی میرے پاس بیٹھنا گوارا کرتی ہے، اور میرے پاس بھلا کیا بیٹھنا وہ تو ارسل کا بھی میرے پاس بیٹھنا سخت برا خیال کرتی تھی۔'' اس وقت روشنی بیگم کا غصہ سے برا حال تھا، اور شزاء منہ بسورے سب سن رہی تھی۔

''امی آپ کو بھی تو اپنے رویے میں لچک پیدا کرنی چاہیے۔ آپ گھل مل جائیں تو پھر مسئلہ ہی کیا ہے۔ بچے بھی تو بڑوں کے مزاج برہم دیکھ کر اپنا رویہ بدل ڈالتے ہیں۔'' شزاء بھی نپے تلے انداز میں اپنی ہی دوست کی وکالت کر رہی تھی۔ دراصل وہ خود بھی کم و بیش عروش جیسا برتاؤ اپنی سسرال میں کر رہی تھی۔ اس لیے اسے عروش میں کوئی عیب دکھائی نہ دیتا تھا۔

دوسری طرف اس کو عروش ہر وقت فون کھڑکا کر ماں کے خلاف ہی کرتی چلی جاتی تھی، اور اب اسے بھی اپنی ماں کے رویئے میں بے حد سختی سی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسا عروش بتاتی رہی تھی بالکل ویسا ہی تھا سب۔

''لو تم بھی اس کی وکالت کرنے لگ گئی ہو۔ یہ بھی خوب رہی۔ سب ایک قطار میں کھڑے ہو گئے مجھ ماں کو تو ایک طرف ڈال دیا ہے۔'' وہ باقاعدہ رونے لگ گئی تھیں، ماں کی آنکھ میں آنسو بہر حال شزاء نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس لیے اس نے طے کیا تھا کہ چند دن یہاں رہ کر موقع دیکھ کر ہی عروش کو سمجھائے گی، اور اس کا یہاں رہنا بھی عروش کے نزدیک قابل غور نہ تھا۔ وہ اس سے لگی بندھی رسمی سی گفتگو کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ تب پہلی مرتبہ شزاء کو احساس ہوا تھا کہ اس کا رویہ بھی ایسا ہی تھا، اور اس کے اس طرح کے رویئے سے دراصل اس کی اپنی ساس بھی اسی طرح گہرے دکھ میں مبتلا رہتی ہوگی۔ اس کے سسر کا ایک بہت ہی بڑا حادثہ ہوا تھا۔ مگر اس نے کبھی بھی ان کا حال احوال دریافت نہ کیا تھا۔

کبھی بھی اس نے دری کے حوالے سے اپنی ساس سے اچھا نہیں بولا تھا۔ ان کی دلگیری نہیں کی تھی۔ ان کی تشفی نہیں کی تھی۔ اب اسے اپنے اس انداز اور اپنے اس برے رویئے کا بھی شدت سے احساس ہونے لگا تھا۔ بعض اوقات کسی اور کے ہی کردار میں، ہم اپنی جھلک پا لیتے ہیں اور ہماری اصلاح کی جانب وہ پہلا قدم ہوا کرتا ہے۔ کسی اور کے کردار میں چھپے مثبت اور منفی پہلو ہمارے اپنے ہی کردار میں پنپ رہے ہوتے ہیں۔ اس نے بھی تحیر سے اس وقت عروش کے بے اعتنائی سے بھرپور رویئے کو ملاحظہ کیا تھا۔ جسے رشتوں کا بھرم اور مان رکھنا نہیں آتا تھا۔ ایک شام جب ارسل اور عروش بنا کسی کو پوچھے بتائے گھر سے نکل رہے تھے۔

''ارسل بھیا یہ سب کیا ہے؟ کبھی ہم کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔ چلو میں تو دو دن کی مہمان ہوں امی کو بھی آپ ساتھ لے کر گئے۔ ارے ساتھ لے جانا تو دور کی بات ہے۔ آپ تو پوچھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔'' شزاء ٹوکے بنا نہ رہ سکی تھی۔

عروش اس کی باتوں پر ناک بھوں چڑھا رہی تھی۔ جبکہ ارسل بھی اس کی باتوں کو بے حد ناگواری سے سن رہا تھا۔

''تم نے کالی بلی کی طرح ہمارا راستہ تو کاٹ ہی لیا ہے۔ ارے امی کوئی بچی ہیں انہوں نے اپنی عمر کا ایک حصہ اسی طرح ہوٹلنگ میں گزارا ہے، اور پھر ان کو ہی کس نے منع کیا ہے۔ سارا مال و حساب کتاب ان کے اپنے ہاتھوں میں ہیں۔ یہیں بیٹھے بیٹھے آرڈر بک کروا سکتی ہیں تم لے جاؤ ناں امی کو۔ تم کیوں نہیں لے جاتی۔ کو ویسے تو پھرتی رہتی ہو سارے شہر میں۔'' ارسل بھی کوئی حساب کتاب باقی رکھنے کا قائل نہ تھا۔ سب سے زیادہ دکھ اور حیرت شزاء کو یہ دیکھ کر ہوئی تھی کہ ارسل کی بات پر عروش تضحیک آمیز انداز میں قہقہے لگا رہی تھی۔

''ارے ارسل آپ بھی ناں۔ شزاء کو کالی بلی سے تشبیہ دے کر ہنسا ہی دیا۔'' عروش اس کی بات سے حظ اٹھا رہی تھی۔

خود شزاء کا صدمے سے برا حال تھا۔ یہی وہ لڑکی تھی جس کے گن گاتے وہ نہ تھکتی تھی۔ اس کی ہر بات میں اس نے اپنی ہی ماں کے سامنے وکالت کی تھی، اور آج وہی اس کو اپنی ہی ماں کے سامنے بے عزت کروانے پر تلی ہوئی تھی۔ اب کہنے، سننے کو رہ ہی کیا گیا تھا۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ کچھ مان ٹوٹ سے گئے تھے۔

ارسل اور عروش ہنستے مسکراتے گھر سے نکل گئے تھے۔ جبکہ شزاء ان کے جانے کے بعد پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ روشنی بیگم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ عروش کے انداز نے اس کے اندر شدید توڑ پھوڑ پیدا کر دی تھی۔

www.pakistanipoint.com

اس نے پلٹ کر روشنی بیگم کی جانب دیکھا تھا، اور وہی ایک لمحہ تھا ادراک کا، اور ادراک کا تو ایک ہی لمحہ ہوا کرتا ہے جب سب کچھ صاف شفاف دکھائی دینے لگ جاتا ہے۔ اسے بھی اپنی ماں کے چہرے میں آصفہ بیگم کا نڈھال سا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہی سب وہ بھی کرتی چلی آرہی تھی، اور پوری ڈھٹائی سے کرتی چلی آرہی تھی۔ کسی کا دل توڑنے میں اس نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، اور اس نے بھی سب کا دل توڑ پھوڑ دیا تھا۔ مگر ابھی بھی دیر نہیں ہوئی تھی۔ دیر ہونے سے پہلے ہی اسے عقل آگئی تھی، اور اس نے اب گھر واپس جانا تھا تاکہ سب کچھ ٹھیک کردے۔

○○○○○

ساشا نے سہراب کے چڑچڑے پن کو دیکھ کر اس کے لیے کچھ خاص طور پر وظائف کروائے تھے، اور پھر اس نے بالآخر جگن بابا کی طرف رخ کیا تھا، اور جگن بابا کے ہی دیئے گئے کچھ خاص پڑیا کو وہ پانی میں کبھی چائے میں گھول کر سہراب کو پلاتی تھی۔ چند دنوں بعد ہی سہراب نے دری کا خیال اپنے دل سے نکال دیا تھا، اور اس کا رویہ بھی بدل سا گیا تھا۔ اب وہ بات بات پر ضد نہیں کرتا تھا، اور پھر جب سہراب نے باقاعدہ ایک لڑکی کی بابت اپنی ماں سے کہا تو ساشا نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

یعنی دری اب اس کے دل و دماغ سے پوری طرح سے نکل چکی تھی۔ یہ ان پڑیوں کی وجہ سے ہی ممکن ہوسکا تھا۔ جو وہ دن رات اس کے لیے چائے میں پانی میں گھول کر ملا کر پلاتی رہی تھی۔ سہراب نے اپنے ساتھ آفس میں کام کرنے والی ایک سیکرٹری کو پسند کیا تھا۔ اس کا نام سیماب تھا۔ وہ بے حد خوبصورت لڑکی تھی، اور یہ تو سچ تھا کہ سہراب حسن پسند تھا۔

سیماب ایک ایسے گھرانے کی لڑکی تھی۔ جس کے گھر میں بہنوں کی ایک لمبی قطار نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ بھی اپنے گھر کے بوجھ میں اپنے باپ کا قوت بازو بنے۔ اسے اپنی خوبصورتی پر بھی ناز تھا۔ اس لیے اس نے سہراب کی پیش قدمی کو سراہا تھا۔ اس کی حوصلہ شکنی نہیں کی تھی، اور پھر سہراب نے ماں سے باقاعدہ سیماب کو گھر بلوا کر ملوایا تھا۔

''امی یہ سیماب ہے۔'' سہراب پہلے ہی سیماب کے حوالے سے ماں سے بات تفصیلی کر چکا تھا۔

ساشا نے ایک گہری نگاہ سیماب پر ڈالی تھی۔ سفید رنگت پر دل کو چھوتے ہوئے دلکش نقوش اسے بے پناہ دلکشی عطا کر رہے تھے۔ وہ مبہوت سی اسے دیکھ رہی تھیں۔ سہراب نے دری کے بعد جس لڑکی کا انتخاب کیا تھا۔ وہ حسن میں دری سے اگرچہ کم تھی مگر تھی خوبصورت ہی، اور دری کو جس حال میں اس وقت ساشا نے پہنچا دیا تھا۔ اسے خوشی تھی کہ اس کے مقابلے میں تو سیماب بے حد حسین تھی۔

''ہاں مجھے سیماب اچھی لگی ہے۔'' سیماب کے حوالے سے ماں کا مثبت جواب اسے بے حد خوشی دے گیا تھا، اور اسی دوران میں آناً فاناً ساشا نے سیماب سے سہراب کی منگنی کردی تھی۔

سہراب بے تحاشا خوش تھا، اور خوش تو خود ساشا بھی تھی۔ اس نے کچھ سوچ کر کار میں ڈرائیور کو آصفہ کے گھر چلنے کا کہا تھا۔ کار اپنے جانے پہچانے راستوں پر رواں دواں تھی۔ راستے میں باقاعدہ طور پر ساشا نے مٹھائی کا ٹوکرہ بھی لے لیا تھا، اور ایک شان سے آصفہ کے گھر میں داخل ہوئی تھی۔

آصفہ اپنے سامنے ساشا کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ ساشا نے اس وقت بے حد بھڑکیلی سی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس کا میک اپ اس کے تراشیدہ بال اس کا بناوٹی انداز سب دیکھ کر آصفہ کا جی کلس کر رہ گیا تھا۔ اس کی بیٹی آج اس کی وجہ سے ان حالات کا شکار تھی، اور اب کل سے جب کہ دری کی حالت کچھ سنبھل گئی تھی۔ اس کی آمد بے حد گراں گزر رہی تھی۔

''لو بھئی منہ میٹھا کرو۔ میرے شہزادے بیٹے سہراب کا رشتہ طے ہوگیا ہے۔ ایک بے حد حسین لڑکی سے اس کا رشتہ طے کیا ہے۔'' ساشا نے بے حد خوشدلی سے کہا تھا۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے گھر کی دہلیز پار کرنے کی۔'' آصفہ کا خون ہی تو کھول گیا تھا۔

''ارے ہمت کی تو بات ہی نہ کرو۔ یہ ہمت ہی تو ہے کہ تمہاری بیٹی اس وقت زندگی کو ترس رہی ہے۔'' ساشا نے زہر خند انداز میں کہا اور قہقہہ لگایا تھا۔ اس وقت بلال صاحب بھی وہاں آگئے تھے۔

''یہ یہاں کیا کرنے آئی ہے؟'' بلال صاحب کا مخاطب آصفہ بیگم تھیں۔ آصفہ بیگم لب بستہ رہ گئی تھیں۔ اب

www.pakistanipoint.com

کہنے کو تھا ہی کیا۔

''ارے ان سے کیا پوچھ رہے ہیں۔ میں بتاتی ہوں بہت مان تھا نا آپ کو اپنی بیٹی پر۔ اس کی اعلیٰ تعلیم پر اور اس کی خوبصورتی پر اس خاندان کے اعلیٰ حسب نسب پر۔ تو پھر اب کہاں رہ گیا اس لڑکی کا نام اس کا مقام اور حسن اس کی آنکھوں میں پڑی وحشت کے نذر ہو گیا۔ آہ۔ افسوس ناک۔ بہر حال میں تو خوش ہوں مجھے اس لڑکی سے بہتر لڑکی مل گئی ہے اپنے بیٹے کے لیے۔ سہراب کی شادی ہے اگلے ہفتے، اور یہ رہا اس کا کارڈ۔'' ساشا کا انداز دیکھ کر بلال صاحب کا جی چاہا تھا کہ اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیں۔ مگر ان کو ابھی بھی مروت اور لحاظ رکھنا آتا تھا۔

''ابھی اور اسی وقت یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ اس سے پہلے کہ میں بھول جاؤں کہ تم ایک عورت ہو۔'' بلال نے مٹھائی کا ٹوکرا اٹھا کر دروازے سے باہر پھینک دیا تھا۔ ساشا تن فن کرتی بولی تھی۔

''جا رہی ہوں میں مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے یہاں ٹھہرنے کا۔ مگر یاد رکھنا کل تک سسک سسک کر مرنا ہوگا در شہوار کو۔ تا کہ اس کی موت سب کے لیے ایک عبرت بن جائے، اور میری ماں کو طعنہ دینے سے پہلے آپ کی زبان جکڑی جائے۔'' ساشا کا نخوت بھرا انداز دیکھ کر بلال صاحب نے نفرت بھری ایک نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

''دوسروں کی بیٹیوں کے لیے برا سوچنے والوں کی اپنی بیٹیاں برباد ہو جاتی ہیں، اور یہ ایک ماں کی بددعا ہے۔ تمہاری بیٹی بھی اسی طرح برباد ہو۔ جس طرح تم نے میری بیٹی کو برباد کیا ہے۔ مگر یاد رکھنا تمہارے تکبر سے تمہاری چالوں سے تمہارے مکر سے بڑی بھی ایک ذات باری تعالیٰ ہے۔ وہ تمہاری ہر تدبیر کا توڑ کر دے گی، اور ہاں مبارک ہو۔ تمہاری بیٹی کی بربادی کا وقت اب شروع ہو گیا۔ کیونکہ یہ ایک ماں کی آہ ہے۔'' آصفہ بیگم نے گلوگیر لہجہ میں کہا تھا۔

ساشا کا یہ سب سن کر موڈ ایک دم خراب سا ہونے لگا تھا۔ اس کا مسکراتا ہوا انداز اب بے زاری میں بدل چکا تھا۔ ساشا نے برا سا منہ بنایا تھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی وہاں سے رخصت ہو گئی تھی۔

آصفہ بیگم کا سانس پھول رہا تھا۔ دراصل بی پی ہائی ہو جانے سے اب ان میں حادثات کو برداشت کرنے کا حوصلہ بہت ہی کم رہ گیا تھا۔ اس وقت بھی ساشا کی دل شکنی باتوں سے ان کا حوصلہ ٹوٹنے لگا تھا، اور دل کو دکھ لگا تھا۔

مگر بلال صاحب کے کاندھے پر ہاتھ رکھنے سے ان میں ایک عزم سا بیدار ہوا تھا۔ وہ تن تنہا نہ تھیں۔ ان کے دکھوں اور خوشیوں میں ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر کھڑی ہونے والی شخصیت ان کے مجازی خدا کی ہی تھی۔

○○○○○

پیر صاحب کی جانب سے پیغام موصول ہوا تھا کہ کسی غیبی وجہ سے ابھی اس عمل کے کرنے میں وقت پیش آ رہی ہے۔ مگر اس میں چند دن لگ جائیں گے۔ مگر ایک دن فریدوں اچانک ہی آ جائے گا، اور اس کی آمد کے بعد فریدوں جیسے جیسے کہے ویسے ہی کرتے چلے جائیں۔

گھر میں سب تو نہیں مگر بہت کچھ اب اچھا اچھا ہونے لگا تھا۔ سب سے زیادہ خود شزاء کے اخلاق میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ شزاء اب وہ پہلے والی شزاء لگتی ہی نہیں تھی۔ لگتا تھا جیسے اس میں ایک نئی روح حلول کر گئی ہے۔ ہر وقت آصفہ بیگم کو در شہوار کی بابت تسلیاں دیتی۔ گھر میں کاموں کی طرف مائل وہ پہلے والی شزاء نہیں رہی تھی۔ اس کا پلٹ پر سب ہی حیران تھے۔ مگر سب سے زیادہ خوش حسن تھا۔ کیونکہ اب وہ جب بھی آفس سے واپسی گھر لوٹتا تھا۔ شزاء اور آصفہ بیگم کو اکثر ہنستے مسکراتے باتیں کرتا ہوا دیکھتا تھا۔ دری کی حالت بھی سنبھل چکی تھی۔ مگر وہ کبھی کبھی راتوں کو اب بھی ڈر سی جاتی تھی اور چیخنے چلانے لگتی تھی، اور جس وقت بھی دری کوئی خوفناک خواب دیکھ لیتی تھی۔ اس کے بعد اپنے ہی بال نوچنے لگتی تھی، اور خود کو زخمی کر لیتی تھی۔

اس کے برعکس عام معمولات زندگی میں وہ نارمل طریقے سے سب سے پیش آتی تھی۔ سب کے ساتھ باتیں کرتی تھی۔ مگر انہی مخصوص دنوں میں جب اس پر دورہ پڑتا تھا وہ الجھ سی جاتی تھی۔ لیکن اب اس کا رویہ پہلے جیسا نہیں تھا۔ وہ سب کو پہچان لیتی تھی۔ اس بات پر وہ شکر ادا کیا کرتی تھیں۔

''امی آپ کے لیے چائے بنا لاؤں۔'' شزاء کے منہ سے پہلی مرتبہ لفظ امی سن کر آصفہ بیگم کی نگاہیں نم سی رہ گئی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

تھیں۔

''ادھر آؤ میرے پاس۔'' آصفہ بیگم نے شزاء کو قریب بلا کر اس کا ماتھا چوم لیا تھا۔

''بیٹا تمہارا اس طرح مجھے پکارنا مجھے نئی زندگی دے گیا۔ تم جانتی ہو۔ دری تو اب اپنے گھر کی ہو جائے گی۔ مگر تم ہی میری اصل بیٹی ہو۔ میری بہو نہیں میری بیٹی ہو تم۔'' آصفہ بیگم نے اس کو گلے سے لگا لیا تھا۔

''مجھے معاف کر دیں۔ میں مسلسل آپ سے برا سلوک کرتی رہی ہوں۔ مگر مجھے اس کا احساس ہی نہیں تھا مگر جب میں نے اپنی ہی ماں کو اسی طرح روتے دیکھا بلکتے دیکھا۔ ان کو ریزہ ریزہ اس طرح ٹوٹتے بکھرتے دیکھا تو میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ میں عروش کے نقش قدم پر نہیں چلوں گی۔ پہلے تو یہ ہے کہ شادی سے پہلے بھی عروش کی ہی سکھائی ہوئی باتوں کی بازگشت میرے دماغ میں تھی۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ٹرانس میں آ گئی تھی۔ ورنہ میری ماں نے کبھی مجھے ان راستوں پر چلنے کی تلقین نہیں کی تھی۔ جن کی منزل کھوٹی ہوتی ہے۔'' شزاء کا انداز بے حد ندامت لیے تھا، اور سچ تو یہ ہی تھا کہ اسے اپنے کیے پر سخت پشیمانی تھی۔

''ہاں عروش کی تربیت جن ہاتھوں میں ہوئی ہے۔ یہی ہونا تھا۔ میں نے تو چاہا تھا کہ تم کو بتا دوں۔ مگر میں یہ سوچ کر چپ رہی کہ یہ تم لوگوں کا ذاتی معاملہ ہے۔ پھر میں بھی بیٹی والی ہوں۔ اس لیے کسی اور کی بیٹی کی برائی کیسے کر سکتی تھی۔ بہر حال تم پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' آصفہ بیگم نے اسے دلاسہ دیا تھا، اور وہ مبہم سا مسکرا دی تھی۔ اسی کی مسکراہٹ میں بھی آزردگی سی گھلی ہوئی تھی۔ دکھ سا تھا اس مسکان میں۔

○○○○○

فریدوں بخت اس وقت رات کے پچھلے پہر کراماتی تسبیح ہاتھ میں تھامے ہوئے دل کی کھڑکی کھلنے کا منتظر تھا۔ دل کی ایک آنکھ ہوا کرتی ہے۔ جو صرف اللہ والوں کو ہی نصیب ہوا کرتی ہے۔ فریدوں بخت کو پیر صاحب نے درشہوار کے معاملے میں قابل بھروسہ گردانا تھا۔

فریدوں بخت نے اس سلسلے میں عقیدت مندی اور فرماں برداری کا اظہار کیا تھا۔ اس کی فطرت میں ہی نیکی لکھی جا چکی تھی۔ اسے مزید اچھے اور نیک ماحول نے سنوار نکھار دیا تھا۔ درشہوار کے لیے اس کا دل پہلے ہی ہر وقت کڑھتا رہتا تھا۔ مگر وہ کچھ مضطرب سا تھا۔

''ابا جان میں یہ بار کس طرح اٹھا سکتا ہوں۔'' اس نے کچھ کشمکش کا شکار ہو کر کہا تھا۔ ورنہ حکم سے سرتابی کا تصور بھی محال تھا۔

''بیٹا جی جب حکم الٰہی ہو اور پھر اذان الٰہی سے روگردانی کس طرح کی جا سکتی ہے۔'' پیر صاحب نے اسے مسکرا کر جواب دیا تھا۔ فریدوں بخت نے سر جھکا دیا تھا۔

''ابا جان وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن میں شاید صرف اس معاملے میں ثابت قدم نہ رہ سکوں۔ کیونکہ.....'' فریدوں بخت کیونکہ کے آگے جملہ مکمل ہی نہ کر پا رہا تھا۔ حجاب آڑے آ گیا تھا۔ جب ماحول میں اس کی پرورش ہوئی تھی اور وہ پروان چڑھا تھا وہاں اقدار و روایات کی پاسداری کو جزو لازم قرار دیا جاتا تھا۔ اس طرح وہ کیسے اپنے دلی جذبات کا اظہار اپنے بابا جان کے سامنے کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ کیونکہ سے آگے جملہ بھی مکمل نہ کر پا رہا تھا۔

پیر صاحب نے ایک گہری نگاہ فریدوں بخت کے سرخ چہرے پر ڈالی تھی۔ جہاں تفکر ہویدا تھا۔ سوچ کے گہرے سائے تھے۔

''بیٹا کہاں یہ ممکن ہے کہ جس ادنیٰ سے شخص کو رب العالمین نے دل کی آنکھ سے زمانے کے غموں سے روشناس کروایا ہو۔ اسے اس کی اپنی ہی اولاد کے غم سے متعارف نہ کروایا ہو۔ پھر یہ اس سے الگ کر کے دیکھو تو میں ایک باپ بھی ہوں۔ جسے اپنے بچوں کی ہمہ وقت فکر رہتی ہے، اور جانتے ہو برخوردار جب تم چھوٹے سے تھے تب سے ہی تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ دیکھو حکم خداوندی اور شان کریمی نے بھی تمہیں وہیں سے پکڑ لیا جہاں سے تم کمزوری دکھا رہے تھے۔ بیٹا جی اس میں مصلحت ہے۔ سمجھو۔'' مبہم لفظوں میں کس قدر خوبصورت انداز میں پیر صاحب نے وضاحت کی تھی۔

فریدوں بخت حیرت زدہ سا رہ گیا تھا۔ اس نے جس محبت کو اپنے دل کے نہاں خانوں میں مقید رکھا تھا۔ عشق پیچاں کی جس بیل کو اس نے اپنے اندر ہی پوشیدہ رکھا تھا۔ وہ سب پر کیوں کر آشکار ہو گئی۔ رب تو وہ ہے جو دل میں بستا

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ہے۔ دل کے رازوں کا امین ہوا کرتا ہے۔ مگر اس نے حتیٰ المقدور کوشش کی تھی کہ اس کے دل کے رازوں کی خبر بابا جان کو نہ ہی ہو تو بہتر ہے۔ جس اعلیٰ نسب سے اس کا ناطہ جڑا تھا۔ وہاں عشق حقیقی کی محبت تو تھی۔ مگر عشق مجازی کی گنجائش کم ہی تھی۔ کجا یہ کہ اسے جی کا روگ بنا لیا جائے، اور ہر دوسرے دن دری کے بارے میں جان کر دل میں درد کی ٹیسیں اٹھتی محسوس کرتا تھا۔ اس سے بارگاہ ایزدی میں گڑ گڑا کر درشہوار کی سلامتی اور صحت مندی کے لیے دعا کی تھی۔ اس کا ہر مرتبہ کال پر بابا جان کو یہ یاد دہانی کروانا کہ جلد لوٹ آئیں دری بیمار ہے۔ اس کی محبت کی دلیل تھا۔

پیر صاحب چونک تو گئے تھے۔ مگر یہاں آ کر دری کے ساتھ ساتھ فریدوں بخت کا اجاڑ سا حلیہ ساری داستان عیاں کر گیا تھا، اور وہ خاموش رہ گئے تھے، اور پھر انہوں نے خلوت میں اس متعلق جاننا چاہا تھا، اور یہ جان کر دنگ رہ گئے تھے۔ پہلی مرتبہ اس سارے معاملے میں انہیں الگ رکھنے کا حکم ملا تھا، اور حکم ملا تھا کہ فریدوں بخت اس معاملے کو نبٹائے۔ وہ بار بار مراقبے میں جاتے تھے اور ہر مرتبہ ایسا ہی جواب پا کر دنگ رہ جاتے تھے۔ بالآخر انہوں نے اسے ہی مشیت الٰہی جان کر فریدوں بخت کو اس کے لیے آمادہ کیا تھا، اور اب فریداں بخت ہچکچا رہا تھا۔

''بابا جان مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں یہ کام اچھے سے نہیں کر پاؤں گا۔ آپ یہ جانتے ہیں کہ یہی میری کمزوری ہے جیسا کہ آپ نے ابھی ابھی بتایا تو میں ایک کمزور بندہ بشر کیسے اس معاملے میں کسی کی رہنمائی کر پاؤں گا۔'' فریدوں بخت نے لاچار سے انداز میں اپنی ذہنی کیفیت بیان کرنا چاہی تھی، اور وہ اس میں کسی حد تک سچا بھی تھا۔ اپنوں کو تکلیف میں مبتلا دیکھنا اور اس تکلیف سے نکالنا ایک کٹھن ترین امر اور مرحلہ ہوا کرتا ہے۔

''بیٹا اس کے لیے یہ کراماتی تسبیح لے لو۔ طریقہ کار ہم بتا اور سمجھا دیتے ہیں۔ آپ کو صرف اس پر عمل پیرا ہونا ہے۔ اس کے بعد سب کیسے کرنا ہے اس کی رہنمائی وقتاً فوقتاً اذن الٰہی سے ملتی رہے گی۔ یہ لو اسے سنبھال لو۔'' پیر صاحب نے اسے تسبیح تھمائی تھی۔

فریدوں نے عقیدت مندی سے اسے لے لیا تھا، اور اب اس نے اس معاملے میں خلوت میں جا کر عمل شروع کر دیا تھا۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ گہری دھند میں سارے منظر گم تھے۔ وہ چاہ کر بھی کچھ جان نہ پا رہا تھا۔ مگر اس نے ورد اور تسبیح جاری رکھی تھی۔ اسے یہ سب کرنا تھا۔ ایک سنگ میل عبور کرنا تھا۔ محض اور محض دری کے لیے۔ اسے اپنی محبت کی خاطر اس سفر کو دشوار گزار سے سہل ترین بنانا تھا۔ مبارک کلام اس کی زبان پر جاری و ساری تھا۔ اس دوران ان تاریکیوں میں روشنی کی لکیر سی بن گئی تھی۔ مدھم مدھم سی روشنی اچانک ہی نور بن گئی تھی، اور ایک منظر بے حد واضح سا ہو گیا تھا۔ یہ ایک ہندو بستی کا منظر تھا۔ کئی سادھو تلک لگائے گہرے جاپ میں مگن تھے۔ تپسیا لگن اور محویت وہاں دیکھنے میں مل رہی تھی۔ پھر منظر یکسر تبدیل ہو گیا تھا۔ اسی بستی میں موجود ایک شخص کے گھر کا منظر واضح ہوا تھا۔

''ارے میں تو کہتی ہوں یہ چھوکرا کسی کام دھندے سے لگ جائے مگر نہ۔ اس کو تو ہماری کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔'' رادھا نے بے حد غصے سے کہا تھا۔

''ارے کاہے کو اس کو اتنا ڈانٹتی ہو۔ دیکھ لینا وقت آنے پر یہ ایک بلوان بنے گا۔ مجھے معلوم ہے، اور ہر بات کا بھگوان نے ایک سمے رکھا ہے۔ اچھا سمے ہی آوے گا۔ فی الحال تو یہ نوعمر لڑکا ہے۔ جوانی کی دہلیز پر قدم دھرتے ہی عقل بھی آ جاتی ہے۔ بدھی مان تو ہے ہی میرا پتر ہے۔ دیالو اور شکتی مان تو ہو گا ہی۔'' موہن داس نے بے حد خوشی سے اپنے بیٹے جگدیپ کو دیکھا تھا۔ جو اس وقت ماں اور باپ کی باتوں سے بے فکر کسی اور ہی گہری سوچ میں گم تھا۔ جگدیپ من موجی لڑکا تھا۔ دوسرے بچوں کی طرح نہ تھا۔ نہ تو اسے اپنے باپ کے ساتھ لمبے لمبے جاپ کرنے میں دلچسپی تھی، اور نہ ہی اسے ماں کے گھریلو مسائل میں ہی دلچسپی تھی۔

جگدیپ کا باپ موہن شام کو بیٹھک رکھتا تھا۔ اس بیٹھک میں لوگ اپنے اپنے مسائل لے کر آتے تھے۔ وہ کچھ جادو ٹونے جانتا تھا۔ مگر کوئی بہت بڑا بدھی مان شخص نہ تھا۔ اسے چلتر بازی سے کمانا آتا تھا۔ یوں گھر کا گزر اوقات چل رہا تھا۔ دال روٹی کے لیے وہ ہر طرح کے من گھڑت جھوٹ بولتا تھا، اور دراصل یہی رنگ سازی باتوں میں ملاوٹ اس کے کام کا اصل گڑھ تھا۔ وہ یہی کچھ کر کے

www.pakistanipoint.com

چار پیسے کمالاتھا، اور لا کر اپنی بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا۔ رادھا اسی لیے موہن کو کچھ بھی نہیں کہتی تھی کہ وہ سارا دن کہاں لور لور پھرتا رہتا ہے۔ کیونکہ اسے تو صرف دھن دولت اور سرشام اپنے پتی کی صورت دیکھنے سے دلچسپی تھی۔

دن بھر میں موہن بڑے بڑے سادھوؤں سے گٹھ جوڑ کرتا تھا۔ تاکہ کچھ جادو کے اسرار و رموز سیکھ لے۔ اسی دوران جبکہ وہ زبان کی چلتر بازی سے کمارہا تھا۔ اسے واقعی ایک سادھو مل گیا تھا۔ جس کا نام راج تھا۔ سب اس سادھو کے عالی مراتب جانتے تھے۔ مگر اس سادھو کے مزاج ہی نہیں ملتے تھے۔ اتنے برسوں کی کٹھن تپسیا کے بعد وہ گھمنڈی ہوگیا تھا۔ ایک دن جب موہن بھی اپنے دن پھر جانے کا مان لیے سادھو کے پاس گیا تو اس سادھو کی آنکھوں میں جگدیپ کو دیکھ کر روشنی سی دھمکی تھی۔ دلچسپی بھی عیاں تھی اس کی آنکھوں سے۔

''یہ لڑکا تیرا ہے۔'' سادھو نے گہری نگاہوں سے جگدیپ کو دیکھا تھا۔

''جی مہاراج میرا ہی پتر ہے۔'' موہن کو اپنے اکلوتے بیٹے پر مان، ناز تھا۔

''جہاں تک میری نگاہیں دیکھ سکتی ہیں تو نہیں دیکھ سکتا۔ تو، تو شاید اب کچھ نہیں سیکھ سکتا۔ دوسرے لفظوں میں تو ہمارے کام کا نہیں ہے۔ مگر لڑکا کاج دیپ یہ دیوی کو پسند آیا ہے۔ اس نے اس لڑکے کو چن لیا ہے۔ یہ وردان قسمت کے دھنی کو ہی ملتا ہے۔ تو اسے میرے آشرم میں لے آنا میں اسے بلوان بنادوں گا۔''

موہن یہ سب سن کر خوشی سے جھوم ہی اٹھا تھا۔ اب یوں بھی اس کے آرام کے دن آنے والے تھے، اور اس کے بیٹے کا کام کے دن تھے۔ وہ جوان تھا۔ خوبصورت بھی تھا۔ مگر سارا وقت پڑا اینڈ تا رہتا تھا۔ آج اس کے ساتھ بھی وہ زبردستی ہی چل پڑا تھا۔

موہن کو کیا معلوم تھا کہ اس لڑکے کو ساتھ لانے سے اس کو اتنا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔

''پتا جی مجھے کچھ نہیں سیکھنا ہے۔'' نجانے جگدیپ کو وہ راج شخص بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عیاری عیاں تھی۔ وہ دیکھنے میں ہی ایک شاطر اور مکار شخص لگتا تھا، اور اس کی ساحرانہ نگاہیں اس کے وجود کے آر پار اتر رہی تھیں۔

جگدیپ کے انکار پر موہن ڈر کر تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ سنا تھا کہ راج سادھو کا شراپ بے حد برا ہوتا ہے۔ اس کے منہ سے نکلی ہوئی دعا اور بددعا فوراً اپنا اثر دکھاتی ہے مگر یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب راج نے اس وقت جگدیپ کو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔

''یہ چھوکرا ابھی نہیں تو کل خود چل کر ہمارے پاس آوے گا بس اس دن کا انتظار رہے گا۔ جا بالک ابھی سے نہیں آیا۔ ٹھوکر کھا۔ پھر آجانا۔''

راج نے جانے انجانے میں اپنے لبوں سے ایک بددعا دے ہی ڈالی تھی مگر اس کے ہونٹوں پر بہت ہی پراسرار مسکراہٹ تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ جگدیپ سے ناراض ہے۔ یا اس کی کسی بات کو اس نے برا منایا ہے۔

موہن کو البتہ خاصی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس نے بیچ راستے میں ہی اپنے جوان بیٹے کو کوسنا اور برا بھلا کہنا شروع کردیا اور گھر جا کر باقاعدہ اسے زدوکوب کرنے لگا تھا۔ حتیٰ کہ رادھا کو ان دونوں کے درمیان میں آکر معاملہ کو رفع دفع کرنا پڑا تھا۔

''اجی میں کہتی ہوں آج سے پہلے تو میں ہی جگدیپ کو برا بھلا کہا کرتی تھی۔ مگر آپ اس کی طرف داری کرتے نہ تھکتے تھے، اس وقت اس کو نہ صرف کوس رہے ہیں بلکہ اس کو مار بھی رہے ہیں۔ جوان اولاد ہے۔ اب بس بھی کردیں۔'' رادھا بیچ بچاؤ کرواتے ہوئے باقاعدہ ہانپنے لگ گئی تھی۔

''آج اس نے میرے تشنہ خواب کو چکنا چور کرلیا ہے۔ اس کو میں نے کتنا برداشت کیا۔ اس کے ہر انکار کو ہنس کر سہا۔ مگر اس نے آج ایک بڑے سادھو کو صاف انکار کردیا۔ بے حد نروٹھے پن سے کھڑا رہا اور وہ اتنا شکتی مان ہو کر اس کی منت سماجت کررہا تھا۔ ایسی اولاد جو میری نہیں سنتی مگر اپنے دھرم کے کرتا دھرتاؤں کا بھی پالن نہیں کرتی ہے۔ ایسی اولاد کی وجہ سے دکھ ہی ملتا ہے۔'' اب موہن بھی تھک کر ایک طرف بیٹھ گیا تھا۔

جگدیپ کے چہرے پر کوئی بھی ندامت اور شرمندگی نہ تھی۔ اس کا بس جی چاہتا تھا کہ وہ عام انسانوں کی طرح

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

زندگی بسر کرے۔ صبح سویرے کام پر جائے اور شام کو لوٹ آئے۔ اس نے دیکھا تھا کہ ہندو بستی سے آگے مسلمانوں کی بستی تھی۔ وہاں پر یہی سب ہوتا تھا۔ عام لوگوں کی زندگی میں کس قدر کشش اور خوبصورتی تھی۔

موہن ہر شام کو کچھ آنے والوں کو اپنی دانست میں الو بنا کر کچھ رقم بٹورنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ اسی طرح ایک شام جب بیٹھک لگی تھی۔ اسی وقت جگدیپ بھی گھر میں ہی کشادہ صحن میں بیٹھا ہوا نجانے کن سوچوں میں گم تھا۔ جب دو میاں بیوی جو صورت شکل سے ہی مسلمان دکھائی دیتے تھے۔ ان کے ساتھ ایک ان کی بیٹی تھی۔ جو چہرے پر نقاب ڈالے تھی۔ وہ لوگ اپنے کسی مسئلے کی وجہ سے یہاں آئے بیٹھے تھے، اور یہ لڑکی اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے گہری سوچ میں تھی۔

''نیک بخت بس اپنے کام پر توجہ دے دیکھ جہاں مرض کی شفا ہو وہی جایا جاتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ اس میں بھی مذہب کا بھید بھاؤ روا رکھا جائے۔''

شوہر نے بیوی کو ہولے سے سمجھایا تھا۔ مگر پاس ہی بیٹھے ہوئے جگدیپ نے سن لیا تھا۔ پھر وہ لوگ رکے بنا بیٹھک میں چل دیئے تھے۔ جہاں اس کے پتاجی سب کی باتوں کے حل کے لیے بیٹھے ہوئے تھے۔

اسے تجسس سا ہوا تھا کیونکہ مسلمان آبادی سے بہت کم لوگ یہاں آیا کرتے تھے۔ اس نے اسی تجسس سے مجبور ہو کر چھپ کر باتیں سننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پھر اس نے اس پر عمل بھی کر ڈالا تھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی اس کے اپنے کمرے کی جانب بھی کھلتی تھی۔ اس نے سیدھا اپنے کمرے کا رخ کیا تھا، اور نظر ٹکا کر دیکھنے لگا تھا، اور کان لگا کر سننے لگا تھا۔

''یہ ہماری بیٹی ہے۔ اس کا رشتہ اس کے ماموں کے گھر طے ہوا ہے۔ مگر میری بیوی کے دل میں اس لڑکے کو لے کر گرہ سی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ بہت سالوں پہلے جب ہاتھ دکھایا گیا تھا تو اس لڑکے کی عمر تھوڑی بتائی گئی تھی۔ اب اس لڑکی کے نصیب میں کیا ہے یہ تو نہیں جان سکتے تھے مگر.....'' باپ خاموش ہو گیا تھا۔

''کیا نام ہے آپ کا؟'' موہن نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا تھا۔

''میرا نام ریاض ہے جبکہ میری بیوی کا نام رقیہ ہے، اور میری بیٹی کا نام صبا ہے۔'' ریاض صاحب نے جواب دیا تھا۔ تو موہن نے ہنکارا بھرا تھا۔

''ہو سکتا ہے کہ آپ کے دل میں جو گرہ بیٹھی ہوئی ہے وہ جھوٹ پر مبنی ہو۔ یا یہ بھی ممکن ہے وہ سچی ہی ہو۔ دونوں صورتوں میں میرا کیا کردار ہو سکتا ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔'' پہلی مرتبہ موہن بھی ہچکچا رہا تھا۔

''آپ کی بات درست ہے۔ پہلے یہ تو معلوم ہو کہ یہ سب درست ہے بھی کہ نہیں۔ پھر اس سے بھی بڑا مسئلہ یہ ہے کہ میری بیٹی مسلسل سات دن سے ایک ہی خواب دیکھتی ہے اور گھبرا کر چیخ کر بھاگ جاتی ہے۔'' ریاض صاحب نے گلوگیر انداز میں کہا تھا۔

''اچھا بیٹی تم خود بتاؤ کہ تم نے کیا دیکھا خواب میں اور کیا محسوس نہیں کیا۔ میں یہ سب اس بچی کی زبانی خود سننا چاہتا ہوں۔'' موہن نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

صبا نے اچانک ہی اپنی ماں کے اشارے سے اپنا نقاب الٹ دیا تھا، اور پھر گھبرا کر اس نے نگاہ جھکائی تھی۔ اس کی صورت دیکھتے ہی جگدیپ کو لگا جیسا کہ وقت کی گردش تھم سی گئی ہے اتنی ہی خوبصورت اور مکمل تھی وہ..... سرخ و سپید رنگت، ستواں ناک، بڑی کشادہ آنکھوں میں پھیلا ہوا ہراس اور اس کی صراحی دار گردن جو اس کے حسن میں اضافہ پیدا کر رہی تھی۔ جگدیپ نے اپنے ہی مذہب میں کئی لڑکیوں کو دیکھا تھا۔ بلکہ پیشتر تو اس پر جان چھڑکتی تھیں۔ مگر وہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ مگر اس اجنبی لڑکی نے لمحہ بھر میں ہی ساری اجنبیت کی دیوار کو گرا کر اس کے دل میں اپنا گھر بنا لیا تھا۔ وہ شاید یک ٹک کھویا رہتا مگر صبا کی آواز سن کر وہ چونک گیا تھا۔ کس قدر دلنشین لہجہ تھا۔ اس قدر گداز کے دل میں چھید کر ڈالے۔

''میں خود کو ایک سرسبز شاداب مقام پر دیکھتی ہوں۔ ایک طرف جھرنا بہہ رہا ہے۔ میں جب اس ماحول میں گم ہو کر اسے جی بھر کر دیکھنا چاہتی ہوں تو اچانک ہی جھرنے کی آواز بہنا بند ہو جاتی ہے، اور ساری شادابی ویرانی اور اجاڑ کھنڈرات میں ضم ہو جاتی ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ وہ کھنڈرات ایک تپتے ہوئے صحرا میں بدل جاتے ہیں۔ بیابان صحرا، اکیلے پن اور تنہائی سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے، اور

میں سسکنے لگتی ہوں تبھی کہیں سے خونخوار درندہ مجھ پر حملہ کر رہا ہے اور میری آنکھ کھل جاتی ہے۔"

صبا یہ خواب سنا کر خود بھی ہانپنے لگی تھی۔ جیسے اس بھیانک خواب کے سناتے سناتے بھی اس کو وہی منظر دوبارہ دکھائی دینے لگ گیا ہو۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو رہی تھی۔ درد و اذیت کے لمحے اس کے چہرے پر تھم سے گئے تھے۔ اس کی ماں نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ جیسے اپنی دانست میں اپنی بیٹی کو حوصلہ دے رہی ہو۔ دلاسہ دے رہی ہو، اور اس کا باپ بھی پریشان حال دکھائی دے رہا تھا۔

"ہماری یہی ایک اکلوتی بیٹی ہے اور ہمارا کل سرمایہ بھی یہی ہے۔ اثاثہ بھی یہی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری بیٹی اپنے گھر میں شادی کے بعد آباد رہے۔ کہیں یہ اشارہ اس شادی شدہ زندگی کی طرف تو نہیں جاتا۔"

رقیہ لڑکی کی ماں آبدیدہ سا ہو کر پوچھ رہی تھی۔ موہن کو غالباً اس سے پہلے اس طرح کی صورتحال کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس لیے اس کا چہرہ بھی فق تھا، اور سوچ رہا تھا کہ ان مسلمانوں کو کیا کہانی بنا کر مطمئن کر دے، اور اسی سوچ و بچار میں اس کے ہونٹوں پر جامد خاموشی چھا گئی تھی۔ ذہن لڑانے سے بھی کوئی حل نہیں مل رہا تھا، اور پریشانی اس کے چہرے پر صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ جسے ریاض اور اس کی بیوی رقیہ نے کچھ اور ہی سمجھ لیا تھا۔

"دیکھیں بابو۔ اس فیس کی جملہ ادائیگی میں ہم کوئی دیر نہیں کریں گے۔ جتنا آپ مانگیں گے اس سے بہت زیادہ ہی دیں گے۔ مگر ہماری اس پریشانی کا حل نکال دیں بس۔ ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ کیا ان خوابوں کا تعلق اس لڑکے سے ہے جس کا نام زاہد ہے۔ یا پھر یہ خواب یونہی آ رہے ہیں۔" ریاض صاحب نے مدھم لہجہ میں کہا تھا۔

موہن نے خود کو فوری طور پر سنبھال لیا تھا۔ ٹھیک ہے میں سب کچھ بتا دوں گا۔ بس ذرا ستاروں کی چال دیکھنا ہوگی۔ کچھ حساب کتاب لگانا ہوگا۔ اس کے لیے مجھے کچھ وقت درکار ہے۔ آپ لوگ ایسا کریں کہ اگلے سوموار کو آ جائیں۔ کام ہو جائے گا۔" موہن نے کشش و پنج کا شکار ہو کر فی الحال تو معاملہ ٹال ہی دیا تھا۔ کیونکہ خود اس کی اپنی عقل میں یہ ساری بات اور اس کا حل نہیں سما رہا تھا۔ لیکن اب وہ سب کے سامنے اپنی کم عقلی کا اعتراف بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سو اس طرح اس نے پینترا بدل کر بات ٹال دی تھی۔

لیکن اس کی بات سن کر ریاض اور رقیہ کی امید بندھ سی گئی تھی، اور انہوں نے ایک آس سے دیکھا تھا۔

"جی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ جتنا مرضی وقت لگا لیں۔ ہم کو صرف اس پریشانی سے چھٹکارہ حاصل کرنا ہے۔ ہم سوموار کو حاضر ہو جائیں گے۔ چل نی نیک بخت گھر کی راہ لے۔" ریاض نے رقیہ سے کہا تھا، اور صبا نے بھی نقاب گرا دیا تھا۔

صبا کے نقاب گراتے ہی جگن کو لگا جیسے اس کے اردگرد موجود روشنی اندھیرے میں بدل گئی ہو۔ دل میں بے کلی نے سر ابھارا تھا، اور اسے پہلی مرتبہ ہی یہ انکشاف ہو گیا تھا کہ وہ جو اتنے عرصے سے اداس و ملول سا تھا۔ دل کسی کام میں نہیں لگتا تھا۔ زندگی نامکمل سی تھی۔ وہ صرف اسی ایک لڑکی کی کمی کی وجہ سے تھی۔ دین دھرم مذہب ذات پات رنگ و نسل سب اس وقت اس کی محبت کے سامنے ہیچ تھے۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ ریاض اور رقیہ کے ہمراہ وہ جا رہی ہے۔ تو اسے لگا کہ جیسے اس کی سانسیں رک رہی ہیں۔ وہ ان کے تعاقب میں جا لگا تھا۔ کب ہندو بستی مسلمان آبادی میں بدل گئی اسے احساس ہی نہیں ہوا۔ احساس ہوا تو تب جب صبا کسی سرمئی دروازے کے پار نظر سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اس کی تو جیسے سدھ بدھ ہی چلی گئی تھی۔ اس کا حلیہ بھی ایسا تھا کہ اسے باآسانی ہندو سمجھا جا سکتا تھا۔ اس کو دیکھ کر چند ایک لڑکے جو مسلمان گھرانوں سے تھے یہاں دیکھ کر بری طرح سے چونک گئے تھے ایسا بھی نہ تھا کہ یہاں میل جول ہی نہ تھا۔ ہندو مسلم آپس میں ملتے جلتے ہی نہ تھے۔ مگر جب سے فرقہ وارانہ فسادات نے سر اٹھایا تھا۔ تب سے اس سارے قصبے میں ایک محتاط سی فضا رچ بس گئی تھی۔ پہلے پہل جس طرح مل جل کر کھانا بھی تناول کر لیا جاتا تھا وہ سب نہ رہا تھا۔ کئی برس پہلے تو اگر ہندو کا بچہ بھوکا ہوتا تو مسلمان ماں اسے کھلا پلا دیتی تھی۔ کہ کھیل کود کے وقت سب بچے ہی تھے۔ ان کے مذہب بیچ میں حائل نہ ہوتے تھے۔ مگر اب بات ہی اور تھی۔ جب سے دشمن عناصر نے ان کی آپسی پھوٹ دلوا دی تھی تب سے ان کی آپسی دشمنی سی پڑ گئی تھی۔ مسلمان مائیں اپنے بچوں کو اب کھلم کھلا ہندوؤں کے

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

گھروں میں جانے نہیں دیتی تھی۔

جگدیپ کا جی چاہتا تھا کہ وہ وہیں دھرنا دے کر بیٹھ جائے۔ جب تک کہ اس کی محبت اس کے سامنے دوبارہ جلوہ گر نہ ہو جائے۔ مگر یہ ایک مذہبی گھرانہ تھا۔ پردہ دار گھرانہ۔ سو صبح سے شام ہوگئی۔ مگر اسے صبا دکھائی نہ دی تھی۔ مایوسی سے اس کا دم سا گھٹنے لگا تھا۔ ابھی تو محبت کی راہوں پر قدم ہی دھرے تھے کہ سانس مشکل لگنے لگا تھا۔ ظالم سماج مذہب اور بے شمار سوالات تو ابھی ناگ کی طرح پھن پھیلائے منتظر تھے۔ سو وہ واپس گھر لوٹ آیا تھا۔ اس کی غیر موجودگی کو والدین نے شدت سے محسوس کیا تھا۔ وہ اب اکثر گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ صبح کا گیا شام کو لوٹتا اور بھی کبھار تو رات گئے واپسی ہوا کرتی تھی۔ اس کا مرجھایا چہرہ اس کا کھویا سا انداز اب ماں کی بھی پریشانی کا سبب بن رہا تھا۔

جیسے تیسے ہفتہ گزر گیا تھا، اور اگلے سوموار کی آمد پر جگدیپ کا دل اچھل پھل کر رہا تھا۔ بیٹھک لگنے سے پہلے ہی وہ اس صبا کی آمد کا منتظر تھا اور پھر اسے وہ دکھائی دے گئی تھی۔ جس طرح چاند بدلیوں میں چھپا ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کا پورا وجود نقاب میں پوشیدہ تھا۔ مگر اس کی نازک اندام چال اسے دل کی آر پار محسوس ہو رہی تھی۔

باری آنے پر ریاض صاحب اور صبا اندر داخل ہو گئے تھے۔

آج نجانے کیوں صبا کی ماں ساتھ نہ آئی تھی، اور موہن نے نجانے کیا اتنے عرصے میں عذر تراشا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ مگر جگدیپ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ موہن نے یہ مہلت یونہی حاصل نہیں کی تھی۔ بلکہ اس کے پاس اپنے مسئلے کے حل کے لیے آنے والے لوگ اس کے لیے کسی گاہک کی طرح ہوتے تھے۔ ان کے لیے اس کو محنت بھی کرنی پڑتی تھی۔ جو مسئلہ جلد حل ہونے والا ہوتا تھا۔ وہ اسے فوری طور پر حل کر لیتا تھا، اور جس میں پیچیدگی محسوس ہوتی تھی اس کے لیے وہ کوئی تدبیر نکال لیتا تھا۔ جیسا کہ اس وقت اس نے یہ تدبیر نکالی تھی کہ اتنی مہلت حاصل کرنے کے بعد وہ اس کے گھر کے خفیہ افراد سے چکر لگوانے لگا۔ ساری معلومات حاصل کرنے گا، اور پھر اسے تو اس زاہد نامی لڑکے کے متعلق بھی سب معلوم کرنا تھا۔ یونہی تو مسئلہ کے حل کا نہیں بتا دینا تھا، اور اب موہن مکمل تفصیلات حاصل کر چکا تھا۔ اس لیے وہ پر اعتماد سا بیٹھا ہوا تھا، اور ریاض صاحب آس بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''یہ بتاؤ کیا صبا بیٹا کو دوبارہ خواب دکھائی دیا؟'' موہن نے لچکدار انداز میں پوچھا تھا۔

''نہیں۔ یہ تو واقعی بے حد حیران کن بات ہے کہ جب سے ہم یہاں آئے ہیں تو وہ خواب صبا کو دوبارہ نہیں دکھائی دی۔'' ریاض صاحب کے انداز میں عقیدت جھلک رہی تھی۔ اعتقاد کی کمی انسان کی یونہی کٹیا ڈبو دیتی ہے۔

''ہونہہ۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ آدھی پریشانی تو سب بتانے والے یہیں چھوڑ جاتے ہیں۔ باقی رہی بات اس لڑکے کی وہ اس چھوری کے لیے واقعی ٹھیک نہیں ہے۔ وہاں رشتہ نہیں کرنا۔ باقی جہاں رشتہ ہونا ہوگا۔ ایک مرتبہ میرے پاس آجایئے گا زائچہ بنوا دوں گا، اور پھر بتا دوں گا کہ رشتہ موزوں ہے کہ نہیں۔'' موہن نے سنبھل کر لفظوں کا استعمال کیا تھا۔ ریاض منہ کھولے ہکے بکے بیٹھے تھے۔

''مگر میں کس طرح اس کی ماں کو کہوں گا۔'' ریاض صاحب سٹپٹائے تھے۔

''جیسے بھی کہیں اگر اپنی بیٹی کی زندگی پیاری ہے تو ٹھیک ہے ورنہ کر دو وہیں شادی۔'' اب کہ موہن نے لہجہ بے حد کھردرا اور سخت بنا کر کہا تھا۔ ریاض گھبرا گئے تھے۔

''نہیں نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ دراصل اس کا بھائی ہر وقت یہاں گھر کے چکر کاٹتے رہتا ہے۔ اس کا اصرار روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس لیے میں نے یہ بات کہی ہے۔'' ریاض سنبھل گئے تھے۔

''ہونہہ۔ اس میں کیا مسئلہ ہے۔ دیکھیں بعض اوقات رشتے نبھانے اتنی ضروری نہیں ہوا کرتے جتنا کہ بچوں کی سلامتی کے لیے کیے گئے اقدامات، اور وہ خواب آنا اس لیے بند ہو جائیں گے۔ جب اس رشتے سے تعلق جاتا رہے گا۔'' موہن نے کھلے لفظوں میں کہہ بھی دیا تھا۔

''جی۔'' ریاض حیران تھے۔

''جی سمجھ رہے ہیں ناں۔ ان کے خوابوں کا تعلق کہیں نہ کہیں اس رشتے سے بھی منسلک ہے۔ سو بہتری یہی ہے کہ مناسب لفظوں میں انکار کر دیا جائے۔'' موہن نے سر کھجاتے ہوئے کہا تھا۔

''جی درست۔ آپ کی فیس؟'' ریاض صاحب نے اچانک ہی اٹھنے سے پہلے پوچھا تھا۔

www.pakistanipoint.com

جگدیپ آج بھی کھڑکی سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ سن رہا تھا۔ مگر آج نہ تو صبا نے لب کشائی کی تھی اور نہ ہی کچھ دکھائی دی تھی۔

''فیس کی کیا بات ہے۔ جتنا جی کرے دان کریں۔ ہم کون سا اپنی ذات پر خرچ کرنے والے ہیں۔ سب دھن دولت تیاگ چکے ہیں۔ بس لوگوں کی بھلائی کے لیے جمع کر لیتے ہیں۔'' موہن نے چالاکی سے کہا تھا۔ ریاض صاحب نے کچھ سوچ کر نوٹوں کی ایک موٹی گڈی جو چلتے وقت وہ ساتھ ہی لے آئے تھے۔ اس وقت بے حد عقیدت سے موہن کو دے دی تھی۔

موہن مسکرا دیا تھا۔ اس کا کیا گیا فیصلہ اس کے لیے سود مند ثابت ہوا تھا۔ اس وقت جگدیپ کو بہت غصہ آیا تھا۔ دوسروں کی بات اور تھی۔ کم از کم اس کی محبت سے اس کے اہل خانہ سے تو دھوکا دہی کے نام پر مال نہ بٹورتے اس کے پتا جی کو تو احساس بھی نہ تھا۔

اس شام بھی جگدیپ نے گھر تک اس کا رستہ دیکھا تھا۔ نجانے کیسے آج گھر سے ایک گلی پہلے ریاض صاحب نے اسے اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ شاید ریاض صاحب کو کہیں اور بھی جانا تھا۔ قسمت کی دیوی اس پر مہربان تھی۔ اس نے دل میں مصمم ارادہ باندھ لیا تھا کہ یہ موقع کسی صورت میں گنوانا نہیں ہے۔ اسے آج ہر صورت اپنے دل کی بات بتا دینی تھی۔ یہی سوچ کر صبا کے تعاقب میں اس کے قدموں کی رفتار تیز تھی۔

''صبا میری بات سنیں۔'' اگلی گلی کے موڑ پر ہی جگدیپ نے پکار لیا تھا۔

صبا جو اپنے ہی خیالات میں گم چلتی چلی جا رہی تھی۔ اپنا نام سن کر بری طرح سے چونک گئی تھی۔ اس نے تحیر سے پلٹ کر دیکھا تھا۔ اپنے سامنے ایک بانکے سجیلے مردانہ وجود کو دیکھ کر وہ دم بخود ہی نہیں کچھ گھبرا سی بھی گئی تھی۔ اپنا نام کسی نامحرم کے منہ سے سننا اسے سخت گراں گزرا تھا۔ نیک گھرانوں کی بیبیاں اپنے ناموں کی بھی اسی طرح پاسداری کرتی ہیں جس طرح اپنی حرمت کی۔

''آپ نے مجھے مخاطب کیا ہے؟'' صبا نے رک کر حیرت سے پوچھا تھا۔ تب تک جگدیپ بھی قریب آ چکا تھا۔

''جی ہاں۔ دراصل میں نے آپ کو وہاں موہن کی بیٹھک میں دیکھا تھا۔'' نجانے کیوں پتا جی کیسے کہتے وہ رک سا گیا تھا۔

''آپ بھی تھے وہاں؟'' صبا نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''مگر میں نے تو آپ کو نہیں دیکھا تھا وہاں؟'' صبا نے اب کے اسے دوبارہ از سر نو اوپر سے نیچے تک دیکھا تھا۔

''جی میں وہیں تھا آپ کی نگاہ نہیں پڑی ہوگی۔'' جگدیپ کا سانس جیسے اسی حسینہ عالم سے مخاطب ہوتے ہوئے رک رک کر چل رہا تھا۔ جیسے کسی لمحے ہی رک سا جائے گا۔

''مگر مجھے مخاطب کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی آپ کو۔ ابا نے تو ادائیگی بھی کر دی تھی۔'' صبا نے اپنی دانست میں یہی سوچا تھا کہ شاید بقیہ جات کے لیے اسے روکا گیا تھا۔

''نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ دراصل آپ کو تو میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر روکا ہے۔ آپ کا جب سے چہرہ دیکھا ہے۔ دل کہیں لگتا ہی نہیں ہے۔ ساری دنیا میں ہزار ہا چہرے ہیں۔ مگر کوئی ایک چہرہ دل کے تار کو چھو جاتا ہے۔ اس کے رنگ و روپ کی روشنی دل کو منور کر جاتی ہے۔ وہی ایک چہرہ دل کی دسترس سے بہت دور محسوس ہونے لگتا ہے۔''

جگدیپ کی باتیں سن کر پہلے تو صبا کی ہرنی جیسی آنکھوں میں بے یقینی پھیل گئی تھی۔ اس کے بعد اس میں حیا کی لالی چھا گئی تھی اور پھر گھبرا کر بنا کچھ کہے پلٹ کر تیز تیز قدموں سے گھر کی دہلیز پار کر گئی تھی۔ مگر اس کے جانے کے بعد بھی جگن کو یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا وجود ادھورا سا ہے، اور اس کا جسم تو ہے مگر روح کہیں پرواز کر گئی ہے۔ محبت کے مارے بھی کس قدر مجبور و بے بس ہوتے ہیں۔

جگن کو نجانے کیوں اب ان ہی راہوں میں قرار ملتا تھا۔ جو راہیں صبا کے گھر کو جاتی تھیں۔ اس کی معلومات کے مطابق اس کے رشتے کی بابت انکار کر دیا گیا تھا۔ مگر اس کے بہت سارے رشتے آ رہے تھے۔ کسی رشتہ ناطہ کے حوالے سے بھی رشتے آ رہے تھے، اور یہ بات جگن کے لیے تشویش کا سبب بن رہی تھی۔ اس کا اب کسی کام میں جی ہی نہیں لگتا تھا۔

''کیوں سارا وقت یوں پڑا اینڈ تا رہتا ہے۔ کسی وقت باپ کے کام دھندوں میں بھی ہاتھ بٹایا کر۔ میں نے تیرے لیے ایک چھوری پسند کی ہے۔ وہ ملکہ ہے اس کے

www.pakistanipoint.com

ساتھ تیری شادی کی بات ملے کی ہے۔'' رادھا نے ایک دن اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ وہ جو اپنے ہی جہان میں صبا کے سنگ ہاتھوں میں ہاتھ تھامے چل رہا تھا۔ اس کی زندگی کی ڈور جیسے اس تان پر رک گئی تھی۔

''میرے لیے کسی لڑکی کو دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں نے کب کہا تھا، اور کون ملکہ؟'' وہ بے حد پریشان سا ہوا اٹھا تھا۔ ابھی تو صبا کے رشتے ناطے کی بات چل رہی تھی، اور اب یہ ملکہ کہاں سے آ گئی تھی۔

''وہیں کریں گے رشتہ جہاں ہم کو اچھا لگے گا، اور تم سے کاہے کو پوچھیں۔ تم نے کون سا فرض ادا کیے ہیں۔ باپ کی کمائی کھاتے ہو، اور اس کے بعد بھی تیرے بیاہ کے لیے ہم نے ایک جگہ بات کر لی ہے تو اب تو نخرے دکھا رہا ہے۔'' رادھا اس کے تیور دیکھ کر ٹھٹک سی گئی تھی۔

''اگر میں کام دھندے سے لگ جاؤں تو جہاں میرا من ہو۔ وہاں کر دے گی تو ماں شادی میری۔''

اچانک ہی اس جگن نے بالکل ہی الٹ سوال داغا تھا۔ اس سوال سے رادھا کو پورا یقین ہو چلا تھا کہ جگن کے من میں پہلے سے ہی کوئی لڑکی ہے۔

''کون ہے وہ جس کے لیے آج تو نے کام کاج کرنے کا بھی جتن کر ڈالا ہے۔'' رادھا نے بھی اب کے اس کے پاس بیٹھ کر پوچھا تھا۔

''ہے کوئی۔ وقت آنے پر بتا دوں گا مگر میری شادی وہیں ہوگی۔ جہاں میں چاہوں گا۔''

جگن اس معاملے میں بات ختم کر دینا چاہتا تھا، اور بات ختم ہونے کی بجائے شروع ہو گئی تھی۔ رادھا نے رات کو موہن کو نجانے کیا کہا تھا کہ موہن بھی اب اس پر نظر رکھنے لگا تھا۔ اس کو محسوس ہوتا تھا کہ موہن کی نگاہیں کسی نیزے کی مانند اس کے وجود میں چبھ رہی ہیں۔ اس کے آر پار اتری جا رہی ہیں۔ مگر جگن نے بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ پوری طرح چوکنا تھا، اور اپنے تعاقب میں رہنے والے اس بندے سے بھی پوری طرح باخبر تھا۔ اسے دھوکہ دے کر پھر صبا کے دروازے پہ چلا جاتا تھا۔

لیکن کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے اور پھر وہ تو مجنوں بنا پھرتا تھا۔ ایک دن جب صبا کے لیے ایک کھاتے پیتے گھرانے سے ایک رشتہ آیا تو وہ بے طرح پریشان ہوا اٹھا اور کسی طرح کا لحاظ و پاس رکھے بنا سیدھا گھر میں گھستا چلا گیا تھا۔ کمرے کا منظر دل خراش تھا۔ سب خوش گپیوں میں مصروف تھے، اور صبا سر پہ اوڑھنی اوڑھے شرمگیں مسکراہٹ لیے بیٹھی تھی۔ اس کی ہونے والی ساس اس کو لڈو کھلا رہی تھی۔ جبکہ اس کے سسر اور ہونے والا شوہر بھی وہیں بیٹھے تھے۔ لڑکا مسلسل گہری نگاہوں سے صبا کو دیکھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر جگن کا خون کھول اٹھا تھا۔

''کون ہو تم اور بلا اجازت کمرے میں کیسے آ گئے؟''

اس وقت وہاں ریاض صاحب بھی موجود تھے اور یوں اسے شتر بے مہار منہ اٹھائے اندر داخل ہوتے دیکھ کر سخت برافروختہ ہوئے تھے۔ جگن کو سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ کیا جواب دے، اور چپ رہ گیا تھا۔

''کچھ بولو گے یا دھکے دے کر نکلواؤں۔'' ریاض صاحب متنفر سے ہو گئے تھے۔

''مجھے آپ سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا تو ریاض صاحب کچھ سوچ کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور باہر لے کر جگن کو آ گئے تھے۔

''ہاں بولو کیا کہنا ہے۔ مگر ذرا جلدی۔ میری بیٹی کی سسرالی آئے بیٹھے ہیں۔'' ریاض صاحب اس سے زیادہ دیر بات چیت کے لیے تیار نہ دکھائی دیتے تھے۔

''میں موہن جی کا لڑکا ہوں، اور انہوں نے ہی مجھے یہاں بھیجا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ رشتہ کسی طور بھی آپ کی لڑکی کے لیے اچھا نہیں ہے، اور ہاں کل اپنی لڑکی کو ضرور ان کے پاس لے آئیں۔ تاکہ زائچہ بنا لیا جائے۔''

نجانے کیوں جو منہ میں آیا جگن بولتا چلا گیا تھا۔ مگر اس کے بولنے کا ایک فائدہ ضرور ہوا تھا کہ ریاض صاحب کے تاثرات فوری طور پر اس کے لیے نرم پڑ گئے تھے، اور رویہ بدل سا گیا تھا۔

''اچھا مگر ان کو کیسے معلوم ہوا کہ ہم اپنی بیٹی کا رشتہ کر رہے ہیں۔''

موہن کو بروقت یہ خیال سوجھا تھا۔ کیونکہ جہاں تک اس کی یادداشت کام کرتی تھی۔ اس نے تو کسی کو بھی کچھ خبر نہیں ہونے دی تھی، اور اب یہ سب؟

''جی آپ درست فرما رہے ہیں ان کو خبر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ تو گیانی دھیانی ہیں ناں۔'' جگن نے مسکرا

www.pakistanipoint.com

کر کہا تو ریاض صاحب اثبات میں سر ہلا کر رہ گئے تھے۔

''لیکن میں ابھی اسی وقت ان کو رشتے سے انکار نہیں کر سکتا ہوں۔ وہ لوگ ابھی ابھی تو منہ میٹھا کرا رہے ہیں کہ رشتہ پکا ہو گیا ہے اب اچانک میرا انکار سب کو ہی چونکا دے گا۔ گھر والی بھی پوچھے گی۔ اس لیے بعد میں انکار کر دوں گا۔''

ریاض صاحب ضعیف الاعتقادی میں حد سے بڑھ چکے تھے۔ اپنے ہی مذہب سے الگ ایک اور شخص کی بابت کس قدر پختہ یقین کر چکے تھے۔ بہر حال جگن کا کام تو پورا ہو چکا تھا۔ کل صبا کا دیدار بھی ہو جاتا اور ادھر رشتے سے انکار بھی ہو جاتا۔ وہ یہاں سے سیدھا گھر گیا تھا۔ اس کے انتظار میں ماں ابھی تک بھوکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر اس کے تن مردہ میں جیسے جان پڑ گئی تھی۔

''کیوں ستاتا ہے بوڑھی ماں کو بتا کیوں نہیں دیتا کہ تجھے کیا روگ لگ گیا تھا۔ میرا پتر تو مجھے بتا کیوں نہیں دیتا ہے۔'' رادھا نے بھی آج صاف بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔

''بتا دوں گا کل تک۔''

خیر رادھا بھی فی الوقت چپ کر گئی تھی۔ پھر شام کو صبا ریاض صاحب کے ساتھ آ گئی تھی۔ موہن ان کو اچانک سامنے دیکھ کر بری طرح حیران تھا۔

''کیا بات ہے پھر کوئی مسئلہ بن گیا ہے کیا؟'' موہن حیران تھا۔

''کل ہی تو آپ نے اپنے لڑکے کے ہاتھ پیغام بھجوایا تھا کہ اس رشتے سے انکار کر دیا جائے جہاں ہم نے صبا کی بات پکی کی ہے۔'' ریاض صاحب حیران تھے تب موہن چونک پڑا تھا۔

''جگن آیا تھا۔ کب؟ مگر میں نے تو اسے کچھ نہیں کیا ایسا ویسا اور نہ ہی مجھے خبر ہے کہ آپ بیٹا کی شادی کر رہے ہیں۔'' موہن نے حیرت سے کہا تھا۔

''بہر حال اب مجھے تو یہ لگ رہا ہے کہ آپ کا لڑکا مذاق کر رہا تھا۔ مگر اس قدر گرا ہوا مذاق۔''

تبھی خود جگن کمرے میں آ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر موہن کو مزید غصہ آ رہا تھا کہ یہ لڑکا اب ان کے پیٹ پر روزی پر بھی لات مارنے لگا تھا۔

''آپ سے مذاق نہیں کیا میں نے، اور ہاں تھوڑی سی جھوٹ کی آمیزش ضرور کی ہے۔ کہ پتا جی نے ایسا کہا ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ مجھے آپ کی بیٹی پسند آ گئی ہے، اور میں اسے اپنانا چاہتا ہوں۔'' جگن کے لفظ وہاں موجود ہر شخص کی قوت سماعت پر بم پھوڑ گئے تھے۔

''پاگل ہو گئے ہو سٹھیا گئے ہو کیا؟'' ریاض صاحب نے ہونق بنے ہوئے موہن کو دیکھ کر براہ راست خود جگن سے پوچھا تھا۔

''میں نے جو کہا ہے بالکل ہوش و حواس میں کہا ہے۔ مجھے آپ کی بیٹی سے عشق ہو گیا ہے، اور اس کی شادی ہو گئی تو مجھ سے ہی ہو گی۔'' جگن نے گہری نگاہ صبا پر ڈالی تھی۔ جو اس وقت پریشان کن نگاہوں سے جگن کو ہی دیکھ رہی تھی۔

''یہ سب کیا ہے موہن جی۔ اس کا تو صاف صاف یہ مطلب ہوا کہ نہ کھوٹ زاہد میں تھی اور نہ اس رشتے میں۔ کھوٹ تھی تو آپ کے بیٹے کے ذہن میں، اور اسی لیے آپ نے ہر رشتے سے میری بٹیا کے لیے منع ہی کر دی۔ مگر اب میں صاف بتا دوں۔ اس چوکھٹ پر دوبارہ نہ آؤں گا۔ سب کو بتا دوں گا کہ آپ رنگ باز ہیں، اور آپ کا لفنگا بیٹا کیسے منہ پھاڑ کر مذہب کا پاس رکھے بنا محبت کا اظہار کر رہا ہے۔ ارے میری بٹیا کے چلتر پر تو داغ لگ جائے گا۔ الٰہی۔'' ریاض صاحب بلا تکان بول رہے تھے، اور موہن کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔

''میں بہت نادم ہوں۔ اس لڑکے نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا ہے۔ مگر میں اس کے ارادے سے ناواقف ہوں۔ بے شک جو مرضی قسم اٹھوا لیں۔'' موہن نے کھسیانی آواز میں کہا تھا سچ تو یہ تھا کہ وہ خود بھی حیران تھا۔

ریاض صاحب صبا کو لے گئے تھے۔ پیچھے رادھا اور موہن دونوں مل کر جگن پر ٹوٹ پڑے تھے۔ مگر اس کی ایک ہی ضد تھی کہ میں شادی کروں گا تو صرف صبا سے، اور مذہب اس میں حائل نہیں ہو سکتا ہے۔ ماں باپ رو دھو کر اسے اس کے حال پر چھوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کل کلاں جب صبا بیاہ کر چلی جائے گی تو یہ خود ہی سیدھا ہو جائے گا۔ مگر یہاں تو اس کی عقل میں کوئی بات ہی نہیں سما رہی تھی۔ وہ رات ماں باپ پر ہی نہیں خود صبا پر بھی بے حد کٹھن گزری تھی۔

''بابا جو مرضی قسم کھانے کو تیار ہوں میں اس شخص کو

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

جانتی تک نہیں ہوں۔'' صبا رو کر اپنا سر برا کر چکی تھی۔

OQQQO

ہفتے بعد ہی صبا کی شادی رکھ دی گئی۔ جلدی کی شادی پر سسرال والے چونکے ضرور تھے۔ مگر یہی وجہ بتائی گئی کہ ساری تیاریاں ہوگئی ہیں، اور وہ لوگ عمرے کے لیے جانے کے خواہش مند ہیں۔ اس لیے اس فرض سے جلد ہی سبکدوش ہوجانا چاہتے ہیں۔ لڑکے والوں کو صبا خوب پسند آئی تھی۔ سو کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ یہ بات خود جگن کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔ شادی کی شاپنگ کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ ایک شام جب صبا اپنی ماں کے ہمراہ بازار میں زیورات منتخب کرنے گئی تھی۔ جگن نے ان دونوں کو جالیا تھا۔

''ماں جی میں جتنا آپ کی بیٹی کو خوش رکھوں گا۔ اتنا کوئی بھی نہیں رکھ سکتا۔ میں اسے رانی بنا کر سر آنکھوں پر بٹھا کر رکھوں گا۔'' وہ ملتجی انداز میں سامنے بیچ بازار ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔

اس کا حلیہ ملگجا سا تھا، اور آنکھیں متورم سی تھیں۔ اس کا لہجہ جھوٹا نہیں تھا۔ اس کا انداز محبت بے پناہ تھا مگر اس کی یہی محبت اس وقت رقیہ بیگم کو زہر لگ رہی تھی۔ جسے کوئی لحاظ نہ پاس تھا اور نہ ہی مروت۔

''یہ کیا طریقہ ہے لڑکے یہاں کیسے تم منہ اٹھائے آگئے۔ یہ اب شادی شدہ ہے۔ اپنے گھر کی ہے۔ تم بھول جاؤ اسے۔ کیا قصور کیا ہے ہم نے جو تم ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہو۔'' رقیہ بیگم نے تیوریاں چڑھالی تھیں۔ وہ خوفزدہ بھی تھیں کہ سب ادھر ہی متوجہ ہو رہے تھے۔

''ماں جی میں صبا کے بنا ادھورا ہوں۔ میں مرجاؤں گا۔'' اس کا لہجہ بے حد بھیگا ہوا سا تھا۔ پہلی مرتبہ صبا کے دل میں اس اجنبی شخص کے لیے ہمدردی جاگی تھی۔ ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ چاہے جانا کسی کو بھی برا کب لگتا ہے۔ مگر یہ مذہب کے دائرے میں شامل نہیں ہوتا تھا کہ وہ اسے اپنا لیتی۔ اس کا اور جگن کا ملن ناممکنات میں سے تھا۔ نہ وہ اپنے مذہب سے الگ ہوسکتی تھی اور نہ ہی جگن ہندو مذہب چھوڑ سکتا تھا، اور وہ ہرگز ایسے شخص کو اپنانے کو تیار نہ تھی جو غیر مذہب سے تھا۔

''مرتے ہو تو مرجاؤ دفعان ہو یہاں سے پرسوں اس کا بیاہ ہے اور پھر تم بھی بھول جاؤ گے۔ سب بھول ہی جاتے ہیں۔ رقیہ کہہ کر صبا کا ہاتھ تھامے تیزی سے جیولری شاپ میں داخل ہوگئی تھی۔

جگن اپنے دل کے درد دل میں لیے رہ گیا تھا۔ مگر جتنا سب اسے روکتے تھے وہ اتنا ہی محبت میں پرعزم ہوجاتا تھا۔ پھر اس نے ایک خطرناک منصوبہ بنایا تھا جس کے بعد صبا اس کی ہوجاتی۔ یہ مشکل ضرور تھا۔ مگر ناممکن نہیں تھا۔

عین شادی والی شام اس نے مہمانوں کی آمد سے پہلے ہی صبا کو گھر میں جالیا تھا۔ اسے دلہن کے کمرے میں اچانک داخل ہوتے دیکھ کر لڑکیوں کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ جبکہ اس کے ہاتھ میں یہ لمبا سا خنجر تھا، اور اسے دیکھ کر سب لڑکیاں دبکی بیٹھی تھیں۔ خود صبا اس وقت بالکل تیار بیٹھی بارات کی منتظر تھی اور اسے یہاں یوں جنونی انداز میں دیکھ کر ہراس پھیل گیا تھا۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

صبا کا بنا سنورا روپ اسے بہکا رہا تھا۔ اسے صبا کا اتنے پاس اس قدر خوبصورتی سے سجا سنورا دیکھنا اسے بے قابو کر رہا تھا۔ پھر اس نے صبا کی کلائی تھام لی تھی۔ ''چلو میرے ساتھ میں یہاں سے دور لے جاؤں گا۔ یہ دنیا بہت بڑی ہے۔ میں تمہیں سر آنکھوں پر بٹھا کر رکھوں گا۔'' جگن پر جنون سوار تھا۔ صبا رو رہی تھی۔

''تم جسے مانتے ہو جس کی پرستش کرتے ہو تمہیں اس کا واسطہ ہے۔ مجھے نہ لے کر جاؤ۔ میرے بابا میری ماں رسوائی سے مرجائیں گے۔'' وہ روہانسی ہوگئی تھی۔

مگر وہ اسے کھینچتا ہوا باہر لے آیا تھا۔ رقیہ اسے یوں صبا کو تھامے دیکھ کر رونے لگ گئی تھی۔ واویلا مچانے لگ گئی تھی۔ سب لوگ یہ منظر دیکھ چکے تھے۔

رقیہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ مگر خود جگن کو لگ رہا تھا کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ اسے جلدی صبا کو یہاں سے دور لے جانا چاہیے۔ وہ دلہن بنی تھی۔ سر پر چادر بھی نہ تھی۔ وہی دوپٹہ تھا جو سر پر اوڑھے بیٹھی تھی۔ اسے حجاب آرہا تھا۔ مگر یہاں کس کو اس کی پرواہ تھی۔ وہ جو محبت کا دعویدار تھا۔ وہ تو اسے بیچ گلیوں میں خنجر کی زد پر لے جا رہا تھا۔ سب انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔ ہر شخص اس منظر کو دیکھ کر ہی صورتحال سمجھنے سے قاصر تھے۔ صبا کے رو رو کر آنسو اس کے گالوں پر جم سے گئے تھے۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

گلیوں کے موڑ مڑتے گئے تھے۔ یہاں سے مسلمان آبادی ختم ہوجاتی تھی۔ اس سے آگے ہندو آبادی شروع ہوتی تھی۔ صبا کو یاد تھا کہ یہاں سے جانے والے چوراہے پر ایک کنواں آتا ہے۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے اچانک کنواں آنے پر بھاگ کر اس میں چھلانگ لگادی تھی۔ جگن اس صورتحال کے لیے ذہنی طور پر تیار ہی نہ تھا۔ اس نے چیخ ماری تھی۔ وہ بھی صبا کے پیچھے تعاقب میں کنویں میں چھلانگ لگا دینا چاہتا تھا۔ جب اسے کسی غیر مرئی قوت نے دبوچ کر اس حرکت کے سرزد کرنے سے منع کیا تھا۔ وہ راج تھا۔ پھر راج اس کے سامنے نمودار ہو بھی گیا تھا۔ اس کے ظاہر ہوتے ہی جگن چیخنے لگا تھا۔

''مجھے جانے دو میری صبا مر رہی ہے۔'' اس کا گلا درد سے رندھ رہا تھا۔

''جانے دوں تو کیا ہوگا تو بھی موت کے منہ میں جا لگے گا۔ مگر کیا تجھے صبا مل جائے گی۔ ہرگز نہیں۔'' جگن اس کی بات سن کر خود بھی جیسے حواس آنے پر رک سا گیا تھا۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گیا تھا۔

''مگر میں اس کے بنا جی کر بھی کیا کروں گا۔'' اس نے بکھرے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

''بالک ہمت کر، تو اسے جیوت کرسکتا ہے، اور اس کے لیے بہت سے درکار نہیں ہوگا۔ بس سوا ایسے ایمان والوں کے ایمان کو گندا کرنا ہوگا جو اللہ کے نام لیوا ہوں گے۔ اس کے بعد تو صبا کو پائے گا۔ تو یہ سمجھ لے کہ یہ ایک قربانی ہے۔ یہ قربانی دیوی کے چرنوں میں دان کردے تو پھر تیری صبا تیرے پاس لوٹ آئے گی۔ وہ بھی ہنسی خوشی۔'' راج نے اسے شیشے میں اتار لیا تھا، اور جگن یہ سب سن کر جیسے راضی سا ہوگیا تھا۔

پھر راج نے اس کو مختلف عمل کے ذریعے گیانی دھیانی کردیا تھا۔ اس کو ایک ہی کام سونپ دیا گیا تھا۔ پھر اس نے مختلف لڑکیوں کو جو اپنی شادی شدہ زندگی سے پریشان تھیں۔ یا گھریلو مسائل میں مبتلا تھیں۔ ان سب کو ان پریشانیوں سے چھٹکارہ کے بدلے لالچ دلا کر ان کا ایمان خرید لیا تھا۔ ساحرہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ جو ایک چاپ کے دوران مرگئی تھی۔ اسے اس کی مزید دولت اور طاقت کے حصول کی لالچ مار گئی تھی۔ ساشا کا نمبر اٹھانوے تھا، اور اس کے بعد مزید دو لڑکیوں کے ایمان کی بھینٹ کے بعد دیوی اسے صبا دے دیتی۔ مگر ایک جیتی جاگتی لاش۔ جس کی روح نہ ہوتی۔ محض ایک کٹھ پتلی۔ ایک جسم، جس کی صورت کو صبا سے مشابہت ہوتی مگر وہ درحقیقت ہرگز صبا نہیں ہوسکتی تھی۔

کالے علم کے کالے کھوٹ ہوتے ہیں۔ جن کے نتائج بھی کالے ہوتے ہیں۔ جو زندگی پر سیاہی مل دیتے ہیں۔ جگن نے کئی لڑکیوں کو ایسے عمل کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ جو انہیں دین سے دور کر رہے تھے، اور اس طرح جانے انجانے میں وہ دین ایمانی سے دور ہوچکے تھے۔ جگن کو اس عمل کے لیے اس لیے بھی آمادہ کرنے میں راج کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی کہ اسے صرف اپنے عشق کے آگے ہر شے ہیچ دکھائی دیتی تھی۔

فریدوں بخت کو اسی روشنی میں ایک مخصوص عمل بتایا گیا تھا۔ جس کے بعد لائحہ عمل بتایا گیا تھا۔ فریدوں بخت کا ذہن دھندلانے لگا تھا، اور پھر اس کے حواس لوٹنے لگے تھے۔ مگر وہ ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد سب کچھ جان چکا تھا۔ اس کو اعتماد اور یقین بخشا گیا تھا۔ اسے قابل جانا گیا تھا۔ مزید لڑکیوں کو ایمان کی روشنی میں تاریکی میں ڈھل جانے سے پہلے بچانا از حد ضروری تھا۔ اس نے اسی رات چلہ کاٹنے کا حتمی ارادہ کرلیا تھا۔ عمل اور طریقہ کار اسے معلوم ہوگیا تھا۔ رات کے پچھلے پہر فریدوں بخت کو آنکھیں بند کیے مخصوص وظائف میں گم دیکھ کر پیر صاحب مسکرا دیتے تھے۔ ان کی سوچ کے عین مطابق ان کے بیٹے نے اس معاملے کو حل کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی لائحہ عمل ضرورت مرتب کرلیا تھا۔ جو اس وقت ان کے چہرے سے بھی عیاں ہو رہا تھا۔

OOOO

''بہو اتنا عرصہ ہوگیا شادی کو۔ ہمیں بھی خواہش ہے کہ کوئی اولاد ہو۔'' روشنی بیگم نے کہا تو عروش کو تو جیسے پتنگے لگ گئے تھے۔ وہ ہر دوسرے دن روشنی بیگم کے ان پوتے پوتی کے تقاضے سے تھک گئی تھی۔ اس نے دیکھا تھا کہ اب ارسل بھی اس کی طرف داری کم ہی لیتا تھا۔ شادی کی شروعات میں جیسا اس کا طرز عمل تھا۔ اب وہ اس سے یکسر مختلف

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

دکھائی دیتا تھا۔ لگتا تھا کہ محبت کا بھوت اس پر چڑھا تھا اور اب اترنے لگا تھا۔ اولاد نہ ہونے کا طعنہ ساس سے ملنے لگا تھا۔ بلکہ ابھی سال ہی تو ہوا تھا۔ اس نے بھی دو بدو جواب دینے شروع کر دیئے تھے، اور اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

''آپ نے تو جیسے رٹا لگا لیا ہے اسی ایک جملے کا۔'' عروش نے مضحکہ خیز انداز میں کہا تھا۔ ناشتے کی ٹیبل پر موجود ارسل کو عروش کا یہ انداز بے حد برا لگا تھا۔

''ہاں تم سے نہیں کہوں تو اور کس سے کہوں؟ میرے بیٹے میں کوئی کھوٹ نہیں ہے تم بھی اپنی رپورٹس دکھا دو۔'' روشنی بیگم نے چہک کر کہا تھا جب سے روشنی بیگم کو یہ علم ہوا تھا کہ ان کا بیٹا مکمل ہے، اور اولاد کی کمی نہیں ہے۔ ان کا تقاضا بڑھنے لگا تھا۔ عروش اسی لیے چڑتی رہتی تھی۔

''اچھا اگر مجھ میں ہی کھوٹ بھی ہے تو کیا کر لیں گی آپ کیا دوسری شادی کروائیں گی اپنے بیٹے کی؟'' عروش چیخی تھی۔ ارسل ایک دم ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''اس گھر میں تو سکون سے کھانا کھانا مشکل ہے، اور کیا سمجھتی ہو تم، کس انداز سے بولتی ہو میری ماں سے، اور یہ غرور کیسا ہے۔ واقعی اگر میری ماں کہے تو میں کر لوں گا دوسری شادی بھی۔ کسی خیال میں مت رہنا۔'' ارسل کہتا دندناتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

درحقیقت اس کا دل اب عروش سے بھر چکا تھا۔ دوسرا عروش کا انداز اسے بے حد برا لگتا تھا۔ وہ ہر بات میں فقط میں کی قائل تھی۔ اس سے بھی ناروا سلوک روا رکھتی تھی، اور اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے غلطی کی ہے بالخصوص جب سے ردا اس کی زندگی میں آئی تھی اسے لگتا تھا کہ اس نے بہت جلدی کی تھی، اور اب وہ اس سے راہ فرار اختیار کرنے لگ گیا تھا۔

عروش روتی دھوتی اپنی ماں کے گھر چلی گئی تھی۔ یوں بھی آئے دن لڑ جھگڑ کر اپنی ماں کے گھر جانا اس کی عادت تھی۔ جتنے دن یہاں رہتی تھی جھگڑا ہی کرتی تھی۔ ارسل تو جیسے اس مرتبہ اس کے جانے کا ہی منتظر تھا۔ اس نے پیچھے کورٹ میرج کر لی تھی، اور ردا کو گھر لے آیا تھا۔ ماں کو دھچکا تو لگا تھا۔ مگر ردا ایک بالکل ہی روایتی سی لڑکی تھی۔ گھر کے کام کرتی۔ ساس کی خدمت کرتی تھی، اور سارا دن ساس کے آگے پیچھے پھرتی تھی۔ ایک ماہ میں ہی اس نے ساس ہی نہیں شہزاء کو بھی رام کر لیا تھا۔ ارسل کے پاس اب عروش کو رکھنے کا کوئی جواز بھی نہیں رہ گیا تھا۔ جب دوسرے ماہ ردا نے خوشخبری بھی سنا ڈالی تو ارسل نے بھی ایک لمحہ لگائے بنا عروش کو طلاق بھجوا دی تھی۔ عروش جو سوچے بیٹھی تھی کہ اس کو منانے آج کل میں ارسل آ جائے گا۔ کیونکہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ جاتی وہ تھی منانے ارسل آ جاتا تھا۔ مگر اس مرتبہ اسے طلاق ہی مل گئی تھی۔ ساشا اور عروش گلے لگ کر رو دی تھیں۔

پہلی مرتبہ عروش کو روتا دیکھ کر ساشا کو اپنے برے اعمال کا احساس ہوا تھا، اور آصفہ بیگم کی وہ بددعا بھی یاد آئی تھی کہ ان کی بھی بیٹی اسی طرح برباد ہو گی۔ جس طرح انہوں نے دری کو بربادی کی دہلیز پر پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ دوسری جانب وہ سہراب سے بھی سخت نالاں تھیں۔ سہراب سیماب کی مٹھی میں تھا۔ سیماب ساس کو کسی خاطر میں نہ لاتی تھی۔ اس کو بے عزت کر دیتی تھی ایک دن سہراب نے بھی وقار صاحب سے جائیداد کا مطالبہ کر دیا تھا، اور وقار بھی گھریلو جھگڑوں سے تنگ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ساشا میں برداشت کی کمی ہے، اور جب سے عروش طلاق کا طوق لے کر یہاں آئی تھی۔ گھر میں ماحول بے حد تناؤ والا ہو گیا تھا، اور سب کے لیے وقار صاحب نے جائیداد دے کر سہراب کو الگ کر دیا تھا۔ اس بات پر ساشا بہت زیادہ روئی تھی۔ مگر سہراب تو پہلے ہی دلی طور پر ان کے گھر سے دور جا چکا تھا۔ یہ تو محض ایک رسمی سی کارروائی تھی۔ جس کے بعد سہراب کا جانا بھی ضروری تھا، اور سہراب نے الگ فلیٹ لے کر سیماب کو اس میں رکھا تھا۔

ساشا ٹوٹ گئی تھی۔ اپنی ہی اولاد کی توڑ پھوڑ اسے کھوکھلا کر گئی تھی۔ آئے دن بیمار رہنے لگی تھی۔ وہ جو دشمنوں کو ہرانے کا حوصلہ رکھتی تھی اور ہرانا جانتی تھی۔ آج اپنی ہی اولاد سے ہار گئی تھی۔ عروش کے لیے وہ جگن بابا کے پاس گئی تھی۔ جگن نے اسے ایک خاص عمل کرنے کا کہا تھا۔ جس کے بعد سہراب بھی قابو میں آ جاتا اور عروش کی بھی دوبارہ شادی ہو جاتی۔ مگر نجانے وہ کونسی قوت تھی جو اس مرتبہ ساشا کو ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔ اسے اپنی ماں کا انجام یاد تھا۔ اس کی ماں کی گلی سڑی لاش گھر پہنچی تھی تو وہ کیسے تڑپ تڑپ کر روئی تھی۔ ٹوٹ کر بکھری تھی، اور اب اسے بھی ایسا عمل کرنے کا کہا جا رہا تھا۔ عروش کی اولاد کی بابت

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

جگن نے صاف کہہ دیا تھا۔

''تم نے اپنی ہی لڑکی سے جادو کے کام کروائے ہیں اس کے بعد یہ اولاد جننے کی صلاحیت ختم کر چکی ہے۔ اب یہی اس کی سزا ہے کہ تاعمر اس کی اولاد نہیں ہوگی۔ اس لیے یہ پر عمل کرو تا کہ کم از کم شادی ہو جائے۔''

مگر ساشا اس قدر اچانک ہی ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہو گئی تھی کہ اس عمل کو نہ کر پا رہی تھی۔ اس کی حالت دگرگوں تھی۔ اولاد سے دوری اس کے لیے جان لیوا ثابت ہو رہی تھی۔ پھر یوں ہی ایک دن تھوکتے تھوکتے وہ مر گئی تھی۔

عروش ماں کے اس انجام پر خوب روئی تھی۔ پہلی مرتبہ اس نے اللہ کے سامنے رو کر دعا کی تھی۔ گڑگڑائی تھی۔ مگر ماں تو جا ہی چکی تھی۔ کبھی لوٹ کر نہ آنے کے لیے۔

○○○○○

رات کے پر ہول سناٹے میں فریدوں بخت گلیوں کو پار کرتا ہوا سیدھا بلال صاحب کے گھر کا رخ کیے ہوئے تھا۔ اچانک اسے اپنے سامنے سفید لباس میں ایک باریش بزرگ دکھائی دیئے تھے۔ اس نے ایک نگاہ ان پر ڈالی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے ان کی جھلک دیکھ کر فریدوں بخت کی زبان تھم سی گئی تھی۔ وہ رک گیا تھا، اور اسی لمحہ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ اس بزرگ کی آنکھیں ہی نہیں تھیں۔ ان میں سیاہ ڈیلا ہی نہیں تھا۔ پھر ایک مکروہ ہنسی اس بزرگ کے لبوں پر مچل گئی تھی۔ گونج دار قہقہہ جسے سنتے ہی فریدوں بخت کو ادراک ہو گیا تھا کہ اس کا راستہ کاٹا جا رہا ہے۔ اسے منزل تک پہنچنے کے لیے روکنے کی سازش کی گئی ہے۔ یقیناً شیطانی علوم کے ماہر نہیں چاہتے تھے کہ وہ نیکی کا ایک کام کر گزرے۔ یا اپنی منزل کو پالے۔ اس لیے اس کی راہ کھوٹی کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ یہ سوچ کر فریدوں بخت کا جذبہ ایمانی مزید پختہ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے قدموں کی رفتار مزید تیز کر لی تھی۔ راستے میں اور بھی کئی کالی شکتیوں نے اس کا راستہ روکنے کی بھرپور کوشش کی تھی مگر اس نے اپنے ارادے کو متزلزل ہونے نہیں دیا تھا۔ وہ ایک پختہ عزم کے ساتھ چلتا چلا گیا تھا۔

دروازے پر اس نے زوردار دستک دی تھی۔ دروازے کو چوکیدار نے کھولا تھا۔ اسے حکم ملا تھا کہ جیسے ہی فریدوں بخت دکھائی دے جائے دروازہ کھول دیا جائے، اور دروازہ اس کی شکل دیکھتے ہی کھول دیا گیا تھا۔ فریدوں نے ایک سرسری سی نگاہ چوکیدار پر ڈالی تھی، اور سیدھا اندر کی جانب بڑھ گیا تھا۔ اہل خانہ اس دستک سے پہلے ہی جاگے اس کی آمد کی خبر پا کر چوکنا بیٹھے تھے اور وہاں نہیں تھی تو صرف اور صرف دری نہیں تھی۔ جس کی خاطر وہ وہ اتنی لمبی مسافت طے کر کے آیا تھا۔ صعوبتیں کاٹی تھیں۔ اس نے کسی سے بھی کلام نہیں کیا تھا۔ اگرچہ اسے بلال صاحب نے سلام کیا تھا مگر اس نے سر کی جنبش سے ہی سلام کا جواب دیا تھا۔ زبان پر ورد جاری تھا۔ شاید اس ورد کو مسلسل جاری رکھنا ضروری تھا، اور درمیان میں کلام کرنا منع تھا۔ اسی ممانعت کے سبب اس نے چپ چاپ دری کے کمرے کی جانب قدم رکھے تھے۔ وہ یہاں چین سے آتا جاتا رہتا تھا۔ اس لیے راستوں سے اور کمروں سے بخوبی آگاہ تھا۔ دوسرا اس وقت اس کی باطنی قوتیں اجاگر ہو چکی تھیں جو اسے اس سمت میں لے جا رہی تھیں۔ کمرہ اندر سے بند تھا۔ اس نے ایک بھرپور ضرب سے اس کو کھول دیا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں دری سہمی ہوئی دبکی بیٹھی تھی۔ اسے فریدوں بخت کے وجود سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

فریدوں بخت نے آگے بڑھ کر اسے تھامنا چاہا تھا۔ دری نے لپک کر پاس پڑا ہوا شوپیس اس کے سر پر دے مارا تھا۔ فریدوں بخت اس حملے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا اس لیے اس نے گردن کو جھکائی دے کر اس حملے کو ناکام بنا دیا تھا۔ دری نے رکے بنا جو ہاتھ میں آتا چلا گیا تھا وہ فریدوں کی جانب پھینکا تھا۔ حتیٰ کہ فریدوں اس کے سر تک پہنچ گیا تھا، اور فریدوں بخت نے اس کی بائیں کلائی تھام لی تھی۔ اس کے کلائی تھامنے کی دیر تھی کہ دری کا جسم ہچکولے لینے لگا تھا۔ دری نے جیسے ننگی تاروں کا چھو لیا تھا۔ اس کا وجود جھٹکے کھا رہا تھا۔ دری تڑپ کر اچھلی تھی۔ مگر اس کا بازو ہنوز فریدوں بخت کی دسترس میں تھا۔ فریدوں نے اپنی جیب سے ایک محلول نکال کر اس کے چھینٹے دری پر ڈالے تھے۔ دری کا جسم جھٹکے کھانے بند ہو گیا تھا۔

وہ بالکل نارمل ہو کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ فریدوں بخت نے اس کی کلائی چھوڑ دی تھی۔ وہ فریدوں بخت کے اوپر جھول گئی تھی۔ فریدوں بخت نے اسے اٹھا کر بستر پر لٹا دیا تھا۔ جہاں جس جگہ فریدوں نے کلائی تھامی تھی۔ وہاں پر

Waqar Azeem Pakistani Point

ایک گہرا سیاہ دھبہ سا بن گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ تمام شیطانی طاقتوں سے دری کو نجات مل چکی تھی۔ کیونکہ دری کا چہرہ بالکل پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔

فریدوں کے کمرے سے نکلتے ہی بلال صاحب اور آصفہ بیگم اس کی جانب لپکے تھے۔

''کیسی ہے اب وہ دری۔'' آصفہ بیگم نے گھبراہٹ سے پوچھا تھا۔

''الحمدللہ وہ بالکل تندرست ہوگئی ہیں۔ اب اس کے بعد کوئی شیطانی قوت انہیں اپنے قابو میں نہیں کرسکے گی۔ میں نے اس کا مکمل سدباب کرلیا ہے۔'' فریدوں بخت مسکرادیا تھا۔

فریدوں بخت نے دل میں اطمینان محسوس کیا تھا۔ وہی اطمینان اس وقت دری کے والدین کے چہروں پر تھا۔

''جیتے رہو بیٹے۔ تم نے ہم پر احسان کیا ہے۔'' آصفہ بیگم نے فریدوں کے سر پر اپنے ہاتھ رکھ کر ڈھیروں ڈھیروں دعاؤں سے نوازا تھا۔

فریدوں بخت کا کام ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ ابھی اسے معلوم تھا کہ باہر دشمن گھات لگائے بیٹھا ہوا ہے، اور اپنی اس ناکامی پر پیچ وتاب کھا رہا ہے۔ وہ نورانی تسبیح کو اپنی مٹھی میں داب کر باہر نکلا تھا۔ اس کے وجود میں کوئی خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔ ایمان اور یقین محکم سے اسے مالا مال کردیا گیا تھا۔ اس نے چند قدم ہی طے کیا ہوگا کہ واپسی کے سفر میں اچانک ہی اس کے سامنے جگن اپنی تمام تر سفاکی کے ساتھ نمودار ہوگیا تھا۔

''تو کیا سمجھتا ہے کہ اس لڑکی کو صحت مند کرکے تو بلوان بن گیا ہے۔ میں نے برسوں اس گیان دھیان میں من لگایا ہے۔ تو چند برسوں میں میرے سامنے آکھڑا ہوگا۔'' جگن کا لہجہ متکبرانہ سا تھا۔

''تو نے جس کی پیروی کی ہے وہ شرک ہے اور جھوٹ ہے، اور جس کی پیروی میں نے کی ہے۔ وہ وحدانیت ہے اور سچ ہے، اور میرے سچ کے سامنے تیرے تمام تر جھوٹ ہیچ ہیں، اور اس لیے میں اپنی قوت ایمانی سے تجھے شکست فاش دے دوں گا۔'' فریدوں بخت نے پختہ لہجہ میں کہا تھا۔ وہ مسکرادیا تھا۔

''میری محبت کا مقابلہ کرسکتا ہے کیا۔ میں نے اس ایک لڑکی کی محبت میں بہت پاپڑ بیلے ہیں۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے اپنا آپ تیاگ ڈالا ہے، اور تو۔ کیا چاہتا ہے مجھے علم نہیں کہ تو اس لڑکی کے عشق میں گوڈے گوڈے ڈوبا ہوا ہے۔ مگر میری محبت کے سامنے تو کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔'' جگن نے جی کڑا کرا سے للکارا تھا۔ فریدوں ہنس دیا تھا۔

''محبت زبردستی کا نام نہیں ہے۔ میں نے بھی محبت کی ہے۔ مگر اس کے حصول کا خواب نہیں دیکھا۔ صرف اتنا چاہا کہ وہ جہاں رہے آباد رہے، اور دیکھ لو۔ اشارے بتاتے ہیں کہ اب مجھے اس کا ساتھ نواز دے گا مگر تم نے اپنی ایک محبت کے لیے کتنے دلوں کو توڑا ہے۔ کیا یہ ہے محبت؟''

کہتے ہیں کہ غصہ میں انسان ہوش گنوا دیتا ہے، اور یہی اس وقت جگن نے کہا تھا۔ وہ جو اپنے گرد حصار باندھے اپنی دانست میں عقل مند بنا کھڑا تھا۔ غصے میں اس وقت فریدوں کو مارنے کے لیے لپکا تھا، اور اس کا فریدوں بخت کے قریب آنا ہی اس کی موت کا سبب بنا تھا۔ اس نے تسبیح کے دانے اس جگن کے منہ پر مارے تھے اور وہ اس کا وجود خاکستر ہوتا چلا گیا تھا۔ وہ نورانی تسبیح اس کے غلیظ وجود کو خاکستر کرگئی تھی۔ وہ تڑپ کر گرا تھا، اور بری طرح سے مچلنے تڑپنے لگا تھا۔

فریدوں بخت نے آگے بڑھ کر محلول پر کچھ پڑھ کر تیزی سے جگن پر ڈالا تھا۔ اس محلول کے پڑنے کی دیر تھی کہ وہ منٹوں میں ختم ہوگیا تھا، اور اس کی زندگی کی ڈور ٹوٹ گئی تھی، اور خاکستر ہوکر کالے جادو کے زیر اثر اس کا وجود اڑنے لگا تھا۔ ہواؤں کا زور تھا۔ اطراف میں پتے گرنے لگے تھے اور ہواؤں سے درخت ہلنے لگے تھے۔ فریدوں بخت نے اپنا ورد شروع کردیا تھا، اور واپس گھر کی راہ لی تھی۔

○○○○○

محبت کی جہتیں ہوا کرتی ہیں، اور اس کی محبت دری کی راہ کو جاتی تھی۔ مگر دل پر پتھر رکھ کر اس نے رب کے فیصلے کو اپنا لیا تھا۔ مگر محبت کے لیے اس نے کشکول نہیں بھلایا تھا۔ ہاں بارگاہ ایزدی نے مانگا ضرور تھا۔ اس ایک واقعے کے بعد اس نے رب کو پالیا تھا، اور اس کے بعد عشق پیچاں کی حقیقی بیل اس کی روح میں لگ چکی تھی۔ ایک ایسی بیل جس نے بہتوں کا بھلا کرنا تھا، اور اس کے اندر روح میں نور بکھر گیا تھا۔ اس کے بعد اس کے تصور میں دری کا خیال

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

بھی نہیں گزرتا تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اس کے دل کے کسی خانے میں دری تھی ہی نہیں تھی۔ مگر اس نے اس محبت کو پس پشت ڈال کر راہ خدا کو چن لیا تھا۔

اس کے ذریعے بہت سوں کی بھلائی ہو رہی تھی۔ محبت کے اس سفر میں جواب کے راستے پر چلا گیا تھا۔ وہ کب کیسے گدی نشین بن گیا اسے علم ہی نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے بابا اب اکثر اوقات خلوت میں رب کے سامنے سربسجود رہتے تھے، اور اس کی جگہ وہ عوام الناس کے مسئلے حل کرتا تھا۔ ایک ایسے بھی دن میں اس نے جب آصفہ بیگم کو اپنے سامنے بیٹھا دیکھا بری طرح سے چونک گیا تھا۔

''آنٹی آپ یہاں کیسے۔ سب خیریت ہے ناں۔'' وہ متعجب تھا۔

''جی بیٹا۔ میں قسمت کی ماری اپنی بیٹی کے نصیب کے لیے آئی ہوں۔ دعا کروانے۔ اس کے نصیب رک سے گئے ہیں۔ کئی رشتے ناطے کے لیے لوگ آتے ہیں مگر اس میں کوئی بھی عیب نہیں اور لوگ رد کر جاتے ہیں۔ سب کا یہی کہنا ہے کہ یہ آسیب زدہ ہے۔'' آصفہ بیگم رو دی تھیں۔

اس کے اندر زلزلے برپا ہونے لگے تھے۔ کہیں نہ کہیں تو اس سے چوک ہو گئی تھی۔ اس نے اگر اپنا فرض جانا ہوتا۔ اس کے گدی نشین ہونے کا یہی تقاضا تھا۔ کہ وہ بڑھ کر ایک مجبور لاچار لڑکی کا ہاتھ تھام لیتا۔ مگر اس نے یہ نہیں کیا تھا۔ صرف اس ایک خوف کے زیر اثر کہ وہ اسیر محبت رہا تھا۔

آصفہ بیگم کے آنسو اس کے دل کی زمین کو تر کر گئے تھے۔ دری کو دیکھے اسے پورے دو سال کا عرصہ ہو گیا تھا۔ اس عرصے میں بہت سارے واقعات رونما ہوئے تھے۔ ہما کی شادی ریحانہ بیگم کے بیٹے زریاب سے ہو گئی تھی، اور ہما اپنے گھر میں ماشاء اللہ آباد تھی۔ گل افشاں کی بھی شادی ہو گئی تھی بیرون ملک مقیم ایک شخص سے، اور صرف دری رہ گئی تھی۔ دکھوں کی پوٹلی سر پر اٹھائے ایک لگی بندھی زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے اس کے لیے کیوں نہ سوچا۔

''آنٹی اگر میں آپ سے ایک درخواست کروں۔ کیا میں آپ کے لیے آپ کی فرزندی میں آ سکتا ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ دری کو حتی الامکان خوش رکھنے کی سعی کروں گا۔'' فریدوں بخت کی اس بات پر آصفہ بیگم پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

اس کا اور دری کا نکاح پھر سادگی کے ساتھ اسی ہفتے کر دیا گیا تھا۔ دری بیاہ کر اس آنگن کو مہکانے آ گئی تھی۔ ہاجرہ بیگم نے بچی سنوری دری کا ماتھا چوم لیا تھا۔

''جانتی ہو جس دن پہلی مرتبہ تم اس گھر میں آئی تھی۔ تب ہی میرے دل سے آواز نکلی تھی۔ کہ یہ لڑکی اپنی سی ہے۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ میرے بیٹے کی زندگی سنوارنے آ جائے گی۔'' ہاجرہ بیگم کی بات پر دری شرما گئی تھی۔

حجلہ عروسی میں بیٹھی دری اس وقت دل کی دھڑکنیں سنبھالے اپنے مجازی خدا کا انتظار کر رہی تھی۔ فریدوں بخت نے آتے ہی سلام کیا تھا۔ جس کا جواب دری نے دیا تھا۔

''دری جانتی ہو کچھ فیصلے ہمارے مقدر میں لکھے جا چکے ہوتے ہیں۔ صرف ہمارے صبر کو آزماتے ہیں، اور جب ہم صبر کرتے ہیں تو بہترین پھل انعام ملتا ہے۔ جیسا کہ تم مجھے مل گئی ہو۔ کسی صبر کے بعد انعام کے طور پر۔''

دری مسکرا دی تھی۔ جس دن سے اسے علم ہوا تھا کہ اس کی اس صحت مندی کے پیچھے فریدوں کا کردار ہے۔ وہ اس دن سے ہی اسے چاہنے لگی تھی۔ اس کی تعظیم کرتی تھی۔

جب ریحانہ بیگم نے ہما کے لیے رشتے کی بابت بات کی۔ تو ہاجرہ بیگم نے انکار کرنا چاہا تھا۔

''بیگم خسارے میں کون ہے اور کون نہیں یہ تو وقت ہی بتائے گا۔'' پیر صاحب نے ایک بات کہی تھی۔

''مگر یہ ہی تو سوچیں آصفہ بھابی کے دل پر کیا گزرے گی؟'' وہ متامل تھیں۔

''اچھا تب کیا سوچیں گی جب وہ دری ہمارے بیٹے کی دلہن بنے گی۔'' پیر صاحب مسکرائے تھے۔

''جی۔'' وہ متعجب تھیں۔

''جی ہاں ایسا ہی لکھا ہے۔''

آج واقعی سارے داغ دھل گئے تھے۔ سارے غم خوشی میں مل گئے تھے، اور اب صرف سکون تھا۔ آشتی تھی، اور اپنائیت تھی۔ دری اور فریدوں کا ساتھ اس گھر کے لیے اور اہل خانہ کے لیے بھی تقویت کا سبب تھا۔ دری کا ہاتھ فریدوں بخت نے بے حد محبت سے تھام لیا تھا۔

ختم شد

Pakistanipoint
www.pakistanipoint.com